دیہاتی زندگی

دیہاتِ پنجاب کی دانائی اور فضول خرچی

ایم۔ ایل ڈارلنگ

سی۔ آئی۔ ای۔ آئی۔ سی۔ ایس

مصنّف

پنجابی کسان و داستان دہقان

آؤ کھیت میں چلیں۔ دیہات میں سیر کریں

(نغمۂ سلیمان)

پنجاب کواپریٹو یونین لاہور

(برانچ کواپریٹو کیپٹل پریس وطن بلڈنگ لاہور)

فہرست مضامین

دیہاتی زندگی

زیب عنوان کتاب ایم۔ ایل ڈارلنگ صاحب بہادر کی لاجواب اور تازہ ترین انگریزی تصنیف کا
اُردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کی نمایاں ترین خوبی یہ ہے۔ کہ وہ ایک ایسے مصنف کے چشم دید حالات
گہرے مطالعہ۔ وسیع تجربہ اور حقیقت نگار قلم کا بہترین نتیجہ ہے۔ کہ جو امداد باہمی۔ دیہاتی اور ادبی
دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ آپ نے سنہ ۳۱-۱۹۳۰ء میں پنجاب کے دیہات کا بار دیگر سفر کیا۔
اور نقاش نقش ثانی بہتر کشند ز اوّل کے مصداق بنی ہوئی اور تجربہ کردہ باتوں کو زیادہ مؤثر۔ زوردار
اور نتیجہ خیز پیرایہ میں تحریر کیا۔ آپ نے ایک ماہر اقتصادیات کے رنگ میں واضح فرمایا ہے
کہ اجناس کے نرخوں میں کمی نے مزارعین پر کیا اثر ڈالا۔ فوجی جو جنگ سے واپس آئے۔ انہوں نے
گاؤں میں کیا تبدیلی کی۔ مستورات کی کیا حالت ہے؟ نئی تہذیب نے ان کی روش میں کیا تغیر پیدا کیا ہے
میاں بیوی کے تعلقات کیسے ہیں؟ ساس اور بہو کے روابط میں کیا انقلاب ہوا ہے۔ دھڑے بندی
کا عالم کیا ہے؟ کسان اپنی پوشاک، خوراک اور دیگر ضروریات مصارف امور رواج میں
کمی کر دینے پر کس طرح مجبور ہو گیا ہے۔ روپیہ کو زمین میں دفن کرنے کے متعلق اندنوں اس کا وطیرہ کیا
ہے۔ ساہوکار اور زمیندار کے تعلقات کا رنگ کیا ہے؟ امداد باہمی کی تحریک کیا کر رہی ہے؟۔
زمیندار کی ضروریات کیا ہیں۔ ان کی اصلاح و فلاح کی عملی تدابیر کیا ہو سکتی ہیں۔ کمیتوں کی حیثیت میں کیا
تغیر ہوا ہے؟ مسجد کے ملّاں۔ مندروں اور گوردواروں کے مہنت اور پجاری کیا کر رہے ہیں؟ مذہبی
تعلیم کی کیفیت کیا ہے؟۔ دہقان کو کس نوعیت کی تعلیم و تربیت درکار ہے؟ پیری مریدی کا ڈھنگ کیا
ہے؟ مختصر یہ کہ جن حضرات کو دیہات سے کسی قسم کا کوئی واسطہ ہے یا جو دیہات کی اصلاح کے طالب ہیں۔
انکے لئے اس کتاب کا مطالعہ لازمی ہے۔ پنجاب کواپریٹو یونین نے اس کا ترجمہ۔ کتابت اور طباعت
پر زر کثیر صرف کیا ہے۔ یقین ہے کہ اسکی یہ کوشش خاص قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھی جائیگی۔
اور پنجاب کے ہر خیر خواہِ دیہات۔ تعلیم یافتہ کی لائبریری اور کسی انجمن امداد باہمی کا کتب خانہ اس
کتاب سے خالی نہیں رہیگا:

(ایڈیٹر کواپریشن)

از
مصنف

میں نے ۱۹۲۵ء میں ایک کتاب موسومہ **پنجابی کسان** شائع کی۔ جس میں زیادہ تر زراعتی قرضہ کے مسئلہ پر بحث کی۔ اور پنجابی کسان کی حیثیت اقتصادی اور اسکے نصب العین پر بھی کسی قدر روشنی ڈالی۔ ۱۹۳۰ء میں **داستانِ دہقان** سپردِ قلم کی۔ یہ تصنیف ایک طویل سیاحت کے تذکرہ پر مشتمل تھی۔ جو میں نے گھوڑے کی پشت پر بیٹھکر کیا۔ اس سے زیادہ تر مطلوب یہ تحقیق تھی۔ کہ قرضہ کے علاوہ دیگر مسائل کے باب میں کسان کا تصور کیا ہے۔ اور جہاں کہیں ممکن ہوا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ دہقان اپنی داستان خود بیان کرے اور اسی وجہ سے اسکا نام **داستانِ دہقان** تجویز کیا گیا۔ ؎

کہاں سے لائیگا قاصد دہن میرا زباں میری
یہی بہتر ہے خود مجھ سے وہ سن لیں داستاں میری

میں نے ۱۹۳۰-۳۱ء میں اس نوعیت کا ایک سفر اور کیا۔ اور اس دفعہ دیہاتی زندگی کے ان مناظر پر خاص توجہ کی۔ جن پر قبل ازیں میں نے خاص غور نہیں کیا تھا۔ مثلاً گاؤں کے کمیں کی حیثیت۔ دیہاتی عورت کی گھریلو زندگی۔ کسان پر فوج اور مدرسہ کا اثر۔ تدفینِ زر کے باب میں دہقان کا رجحان و میلان۔ بعض علاقوں میں عداوت باہمی اور دھڑے بندی کے متعلق اس کی روش۔ نئی اور پرانی پنچایتوں کی کارروائیاں۔ دیہات سدھار کے مخصوص میں جو کوششیں کی جا رہی ہیں۔ ان کا تذکرہ۔ اور اغلباً ان تمام سے بڑھکر اقتصادی درماندگی کے اثرات۔ بالخصوص نہری نوآبادیات میں اسکے اثرات ان مسائل پر خاص توجہ دی گئی۔ میں نے یہ دونوں سیاحتیں جو قریباً ۱۶ سو میل کے سفر اور سے پنجاب کے ۲۹ میں سے ۲۲ اضلاع کے حالات پر مشتمل ہیں۔ ان دنوں کیں۔ جب میں انجمنہائے امداد باہمی پنجاب کا رجسٹرار تھا۔ اور دفتری کام بکثرت تھا۔ بدیں لحاظ اس نے اس وقت کو قدرتاً محدود کر دیا۔ جو تحقیق احوال دیکھنے و نظر کیلئے میسر تھا۔ اور دفتری فرائض نے دوسری سیاحت کے کوائف کو اس زمانے سے پہلے منظر عام پر آنے کی اجازت نہ دی۔ اصل روداد کو

بہت حد تک مختصر کر دیا گیا ہے۔ اور اسے دوبارہ مرتب کیا گیا ہے۔ اور اسے صاف و واضح کر دیا ہے۔ تاکہ پڑھنے والا اسے سمجھ سکے۔ اور جہاں تک ممکن ہو سکا۔ تکرار سے احتراز کیا گیا ہے۔ جیسا کہ "داستانِ دہقان" میں کیا گیا تھا۔ میں نے تمام حقائق کو پوری دیانت کے ساتھ حاشیہ آرائی یا اضافہ کئے بغیر بیان کر دیا ہے۔ ہاں بعض مواقع پر کچھ تنقید کی ہے۔ واقعات کو جیسے کہ تھے جوں کا توں اس لئے لکھ دیا ہے۔ کہ اس قسم کے علمی مطالعہ میں دیانت بیان لازمی اور ضروری ہے۔ اور ایسے حقائق کو ضبطِ تحریر میں لاتے ہوئے جن کا تعلق ہندوستان کی دیہاتی زندگی کے اتنے بہت بڑے طویل علاقہ اور بہت پرانے وقت سے ہے۔ متذکرہ احتیاط کو ملحوظ رکھنا دو گنا ضروری تھا۔ ایک ایسے ملک کا حال بیان کرنے والا جو اس کا اپنا وطن نہیں ہے۔ اور ایک طالب علم جس کا مقصد بیانِ صداقت ہے۔ نہ کہ اثر آفرینی مجبور ہے۔ کہ مفصل اور منظم تحقیق سے کام لے۔

ان دنوں جبکہ دیہات سدھار کا عام چرچا ہے۔ اگر دیہات سدھار کے ان طریقوں پر بہت وسعی عمل کو ضائع کرنا مقصود نہیں ہے۔ جو ان کیلئے موزوں نہیں ہیں۔ میرے نزدیک اس نوعیت کی تحقیقات کی ضرورت آگے سے زیادہ نہیں ہے۔ اور ایک مصلح کو صرف کردہ وقت پر اظہار تاسف کی حاجت نہیں۔ اس لئے کہ اگر اسے گاؤں کو ضیاع وقت و سرمایہ کے باب میں کچھ سکھانا ہے۔ تو اس کیلئے زیادہ ضروری ہے۔ کہ گاؤں کی قدیمی دانش سے بیش از بیش فائدہ حاصل کرے۔

روزانہ ڈائری کی صورت جو "داستانِ دہقان" میں اختیار کی گئی۔ اسے یہاں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ اور خواہ اس طرز کی خامیاں کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ اس میں ایک فائدہ ضرور ہے۔ کہ بیان کردہ حقائق انسانی سانچے میں ڈھلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اور اس کے بغیر وہ خشک ہڈیوں کا حکم رکھتے ہیں۔ میں نے اپنی پہلی سیاحت کی نسبت اس دفعہ اپنے آپ کو اظہار خیال کی پوری اجازت دی ہے۔ اس لئے کہ جونہی میرا مطالعہ ترقی پذیر ہوا۔ بعض نتائج برآمد ہوئے۔ اور میں نے انہیں وضاحت و صراحت سے قلمبند کر دینا ضروری جانا۔ جیسا کہ اس سے پہلے کیا گیا۔ میں کسی شخص کے جذبات کو دُکھ دینے سے اجتناب کیا ہے۔ اور مجھے ایک دفعہ اس طرزِ عمل کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ جو میری تحقیقات کے خیر مقدم میں ہر ایک جگہ اختیار کیا گیا۔ میرے ذمے محکمہ امداد باہمی کے اکثر ممبران کا شکریہ واجب ہے۔ جنہوں نے میری سیاحت کے

بعد مشتبہ و مشکوک نکات کی تصدیق و توثیق کی۔ اور میرے لئے بہت سی مزید تحقیقات کیں۔ میرے ان دیرینہ رفقائے کار کی مخلصانہ اعانت کے بغیر میری ان تین کتابوں کا ضبطِ تحریر میں لانا ممکن نہ تھا۔ میں سر آر۔ پی ہیڈو۔ سی۔ آئی۔ ای و میسرز ایچ کیلورٹ۔ سی۔ ایس آئی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ ایف۔ پی۔ ولیس۔ آئی۔ سی۔ ایس اور ایچ۔ ڈی۔ کھنوٹ کا اس اعانت کے لئے جو انہوں نے فصل بارہویں کے متعلق بہم پہنچائی۔ غایت درجے کا ممنون ہوں۔ اور مسٹر کیلورٹ کا مزید ممنون ہوں۔ کہ بعض مقامات پر اعداد و شماری فقرہ جات کے متعلق انہوں نے کارآمد ہدایات کیں۔ میں کوہستانِ نمک کے نقشہ جات کے لئے مسٹر جے۔ سی ڈبلیو یوسٹس آئی۔ سی۔ ایس اور باقیوں کیلئے کیتھولک مشن سرگودہا کے تقدس مآب فادر ڈیمین کا ممنون ہوں۔ اور میں ان دونوں کا شکر گذار ہوں۔ کہ انہوں نے ان نقشہ جات کو دوبارہ پیش کرنے کی اجازت دی۔ انڈیا آفس کی لائبریری کے ناظم و منصرم بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں۔ کہ وہ میرے ساتھ ایسا پُر اخلاق برتاؤ کیا۔ کہ جس سے وہ ہر ایک کے پیش آتے ہیں ؛

ایم۔ ایل ڈارلنگ

مارسیلز

۶ جولائی ۱۹۳۴ء

باب اوّل

سمت شمال

پہلی فصل

دریائے راوی سے چناب تک

زراعتی اشیاء کی قیمتوں میں کمی۔ پیر اور فقیر۔ سیم زدگی

۹ دسمبر ۱۹۱۰ء۔ از ننکانہ صاحب تا مانانوالہ (۱۰ میل)

گھوڑے کا سفر پھر درپیش ہے۔ اور اس مرتبہ شمال کی طرف۔ کل میں لاہور سے ۵۰ میل بذریعہ ریل آیا۔ اور دیہات اور کھیت ہی سینما کی سی تصاویر کے سوا اور کچھ نہ دیکھا۔ ان میں انسانی عنصر بالکل مفقود تھا۔ آج پھر کھیت اور دیہات پیش نظر تھے۔ لیکن ان میں دیہاتی زندگی کے قدیم ڈرامے کی روح بیدار تھی۔ یہاں ہر شخص گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے لوگوں سے گفتگو کر سکتا ہے۔ ان کے کام کاج دیکھ سکتا ہے۔ ان کے خیالات سُن سکتا ہے۔ اور شاید ان کے دلوں کا بھی مطالعہ کر سکتا ہے۔ ایک ایسے علاقے میں جہاں اب تک اونٹ۔ ٹٹو یا بیلوں کے ذریعہ سے عام طور پر سفر کیا جاتا ہے۔ اس قسم کا مطالعہ کرتے وقت ایک گاؤں میں ملی ہوئی اچھی گھوڑی کا یہی قدم قدم چلنا اور کبھی ہچکولے دینا کافی رفتار ہے۔ تیس سال گذرے یہ علاقہ جس میں سے ہم سوار ہو کر گذرے بنجر تھا۔ لیکن نہر لوئر چناب کی وجہ سے جس کی ایک شاخ

اس طرف سے گذرتی ہے۔ صرف سڑک ہی دُور دُور پھیلی ہوئی بنجر زمین کی یاد دلاتی ہے۔ یہ پختہ نہ تھی۔ اور ہمارے گھوڑے دُھول کر کری گرد میں دھنسے جاتے تھے۔ بدنصیبی تو ان سواروں کی تھی۔ جو پیچھے آ رہے تھے۔ اور ایک میل طے کرنے کے بعد کسی کی بھی داڑھی سیاہ نظر نہ آتی تھی۔

قیمتوں کا گرنا

یہ داڑھیاں سکھوں کی تھیں۔ کیونکہ ننکانہ صاحب ان کے محترم و مقدس گرو نانک کی جائے پیدائش ہے۔ اور سکھوں کا اہم مرکز ہے۔ مانانوالہ بھی میں سکھوں ہی میں تھا۔ وہاں انکان اراضیات نے شاندار گھر بنوائے ہیں۔ اور ان کے سفیدی کئے ہوئے مینارے اور پھاٹک جنگ عظیم کے بعد آنے والے نہایت ہی خوشحال ایام کے نامکمل فن تعمیر پر روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ دن گذر چکے ہیں۔ اور اب گیہوں کا بھاؤ ایک روپیہ آٹھ آنے فی من (تقریباً گیارہ شلنگ چھ پنس فی کوارٹر) ہونے کی وجہ سے وہ اپنا لگان بھی وصول نہیں کر سکتے۔ پنجاب میں جیسا کہ فلسطین میں ہے۔ لگان عام طور پر پیداوار کی ایک مقررہ نسبت سے لئے جاتے ہیں۔ اور اس طریقے کا بڑا فائدہ یہ ہے۔ کہ وہ خود بخود پیداوار کی قیمت کے ساتھ ساتھ گھٹتے اور بڑھتے ہیں۔ زمیندار کو اس سے جس نقص کا احتمال ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ جب فصل جمع کر لی جائے۔ تو اگر وہ اپنا جائز حصہ لینا چاہتا ہے۔ تو اس کی تقسیم کے وقت نہایت غور و پرداخت سے کام لے۔ اور اگر وہ غیر حاضر رہیگا۔ تو ایسا ہونا مشکل ہے۔ یہ حال مانانوالہ کے ایک کنبے کا ہے۔ اسی لئے ان کے لگان کا زیادہ حصہ نقدی کی صورت میں وصول ہوتا ہے۔ اور قیمتوں کے گرنے نے جو اس سال جلد گر گئیں واقعی انہیں دگنا کر دیا ہے۔ اس لئے وہ اسے پیداوار میں تبدیل کرنے کے خیال میں ہیں۔

یہ بات کہ قیمتیں کہاں تک گری ہیں۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے عیاں ہیں۔ جو ننکانہ منڈی کی کل کی قیمتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔

		دسمبر ۱۹۲۸ء روپے — آنے — پائی	دسمبر ۱۹۳۰ء
گیہوں (اوّل درجہ)	فی من۔	۴ — ۴ —	۱ — ۱۰ — ۰
چاول	”	۲ — ۱۴ — ۰	۱ — ۵ — ۰
کپاس (الف) امریکن		۱۲ — ۰ — ۰	۵ — ۱۲ — ۰
کپاس (ب) دیسی		۸ — ۰ — ۰	۴ — ۰ — ۰
گڑ		۵ — ۸ — ۰	۲ — ۱۲ — ۰

گیہوں کی صورت میں قیمت ۴۰ فیصدی کم ہو گئی ہے۔ اور باقی تین صورتوں میں پچاس فیصدی یا زیادہ۔

شام کو لاہور اور اسکے شہری راستوں سے تازہ دم آنے کی وجہ سے میں ایک ڈاک بنگلہ کے نزدیک نہایت خوشی سے دیہاتیوں کو ایک کچے راستے پر سے آتے جاتے دیکھتا رہا۔ پہلے ایک گدھا ایک اپنے بڑے صندوق سے لدا ہوا آیا جس میں آدمی سما سکتا تھا۔ یہ کسی شادی کا تحفہ تھا۔ اور ان جنگلیوں کی برات کی تمہید تھی۔ جو ساتھ ساتھ گھوڑے پر سوار آ رہے تھے سوائے دولہا کے جو نہایت شاندار طریقے سے تنہا بیٹھا تھا۔ باقی سب ایک ایک گھوڑے پر دو دو تھے۔ اناج کی قیمتوں کے گر جانے کی وجہ سے شادی پر صرف دو سو روپے صرف کئے گئے تھے۔ لیکن (کیا ہندوستان میں بجز مفلسی کے اور بھی کچھ ہو سکتا ہے) یہ رقم ۴۴ فیصدی سود پر قرض لی گئی تھی۔ برات کے ساتھ ہی رنگا رنگ کے کپڑوں میں خانہ بدوش سانسیوں کا ایک گروہ جا رہا تھا۔ دوران کے ساتھ فاقہ زدہ کتوں کا ایک گروہ تھا جنہیں انہوں نے بقول خویش شکار کیلئے پالا ہوا تھا۔ لیکن سب کی اسقدر پسلیاں نکلی ہوئی تھیں اور وہ اسقدر کمزور تھے۔ کہ وہ ان سے صرف جھاڑو کا کام لیا جا سکتا تھا۔

۱۰۔ دسمبر۔ مانانوالہ سے شاہ کوٹ (۱۲ میل)

چھ ماہ نہیں۔ صرف تین ماہ گذرے۔ پنجاب کی زمین دوزخ کی طرح تپ رہی تھی۔ دن کے وقت ہوا رخساروں کو شعلوں کی زبان سے چاٹتی تھی۔ اور رات کو جسم پر ہلکی سی چادر اوڑھنی بھی ناگوار خاطر تھی۔ لیکن اب صورت یہ ہے۔ کہ بھاری بھاری کپڑے ہیں۔ اور ناشتہ دھوپ میں کیا جا رہا ہے۔ ہم ۹ بجکر ۳۰ منٹ پر روانہ ہو گئے۔ اور گاؤں اور اس کے مالکان اراضیات کی عمارتوں کے باہر باہر ہوتے ہوئے ایک ایسی گرد آلود سڑک کے ساتھ ساتھ راستہ اختیار کیا۔ جسے اُن ہیچ لوگوں نے نہایت بُری طرح گندہ کیا ہوا تھا۔ جو اتنے سست تھے کہ رفع حاجات کیلئے سڑک کو عبور کر کے کھیتوں میں بھی نہ جا سکتے تھے۔ بھینسوں کے ایک گلے نے جو دن بھر چرنے کیلئے جا رہا تھا گرد و غبار کو اس طرح بلویا۔ کہ اسمیں سے ایک تاریک اور گرد سے اٹ جانے والا بادل پیدا ہو گیا۔ بہت ممکن ہے کہ ایسی صورت میں پانچوں کے پانچوں حواس باختہ ہو جائیں۔ کھلے علاقے میں داخل ہو کر اور توریا کے رائی جیسے رنگدار پھولوں کی تلخی آمیز خوشبو لیکر کچھ اطمینان حاصل ہوا۔

ایک اغوا کا معاملہ

ہم ایک گاؤں میں بنک (جسے پنجاب میں انجمن امداد باہمی کفایت شعاری و قرضہ کہا جاتا ہے) دیکھنے کیلئے ٹھہرے۔ جب ہم نزدیک پہنچے تو سکھوں کے ایک گروہ سے دوچار ہوئے۔ جو اپنے ایک پڑوسی کے خلاف ایک سکھ کی بیوی کو زیورات سمیت بھگا لیجانے کی شکایت لکھوانے تھانے جا رہا تھا۔ زیورات کا اندازہ آٹھ سو روپے کا تھا۔ میں نے دریافت کیا؟

"خاوند کے پاس کتنی زمین ہے؟

"نصف مربعہ"۔

کیا یہ ممکن ہے۔ کہ ایک ایسا شخص جس کے پاس اسقدر تھوڑی جائیداد ہو۔ اسقدر روپیہ زیورات پر خرچ کرے؟

"ہاں۔ بے شک۔ اس نے شادی پر ۲۰۰۰ روپے صرف کئے۔ اور روپیہ لینے کے اپنی زمین رہن رکھ دی۔

جب ہم گاؤں پہنچ گئے۔ اور ب کے سب کنوئیں کے چاروں طرف پورے لطف سے نشست آرا ہو گئے۔ میں نے اس معاملے کے متعلق مزید دریافت کیا۔ واقعی لڑکی کا زیورات سمیت اغوا کیا گیا تھا۔ لیکن وہ کہتے تھے۔ کہ زیورات زیادہ سے زیادہ ۱۵۰ روپے کے تھے۔ اس قسم کی باتوں کی حقیقت کو گاؤں کے لوگ خوب جانتے ہیں۔ اور دونوں اندازوں کا اس قدر مختلف ہونا موقعہ پر تفتیش کرنے کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ سُنکر بہت صدمہ ہوا۔ کہ اغوا کرنے والا ایک مرتبہ بنک کا خزانچی رہ چکا تھا۔ اور اسے انجمن کے بقایا کی ایک معمولی سی رقم کو خورد بُرد کرنے کے باعث انجمن سے خارج کر دیا گیا تھا۔

شادی اور نرخ ہائے اجناس میں کمی

اس وقوعہ کے متعلق گفتگو کرتے کرتے ہم شادی اور زیورات کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ قیمتوں کے اچانک گر جانے کا اثر دونوں پر پڑا ہے۔ ایک سکھ نے کہا کہ میں نے ۱۹۱۹ء میں اپنے بھائی کی شادی پر ۲۵۰۰ روپیہ صرف کیا۔ لیکن اکتوبر میں جب میں نے اپنے بیٹے کی شادی کی۔ تو صرف ۳۵۰ روپے خرچ کئے۔ ایک اور نے کہا۔ کہ دس برس گذرے۔ کہ میں نے

اپنی بیٹی کی شادی مبلغ پانچسو روپے میں کی۔ لیکن گذشتہ سال بیٹے کی شادی پر صرف ایک ہزار روپیہ خرچ کیا۔

ایک مسلمان دیہاتی نے کہا۔ کہ ہم اب کچھ خرچ نہیں کرتے۔ کیونکہ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ کل ہی میں نے اپنے لڑکے کی شادی کی۔ اور وہ تمام رقم جو میں نے خرچ کی۔ صرف پانچ پیسے تھی۔ جو نکاح پڑھانے پر خرچ آئی۔

میں نے پوچھا "کیا دولہا کی برات کے ساتھ کوئی نہیں آیا تھا؟"

اس نے کہا۔ "لوگ تنبول نہیں دے سکتے۔ اور شرم کے مارے دور ہی رہتے ہیں"۔ بلاشبہ پانچ پیسے کہنے میں کچھ مبالغہ تھا۔ لیکن بنکنگ یونین کے ڈائرکٹر نے جس سے ہم کل ملے تھے۔ کہا کہ اس سال میں نے اپنی چاروں لڑکیوں کی شادی مبلغ ۵ روپے میں کی۔ نہ کوئی برات تھی۔ نہ مہمان نوازی۔ نہ زیور۔ نہ جہیز۔ صرف ملاں کو نکاح پڑھوائی دی گئی تھی۔ (نیک شگونی چاہتی ہے۔ کہ یہ ایک ایسی رقم ہونی چاہیئے۔ کہ پانچ پر تقسیم ہو سکے) اور بڑی بات یہ ہے۔ کہ اور بہت سی شادیاں اس طریق پر ہوئیں۔ کسی نے کہا کہ اب نہ ڈھول بجتے ہیں۔ نہ جہانج سوا روپیہ تبیس آنے ملاں کو دیا جاتا ہے۔ اور جوڑا میاں بی بی بن جاتا ہے۔

بلاشبہ روپیہ اب آگے ہی آگے چلتا ہے۔ اور ضرورت ہے کہ کم خرچ کیا جائے۔ لیکن قیمتوں کے گر جانے سے پہلے بھی زیادہ تعلیم یافتہ زمینداروں نے جن میں سے زیادہ تر سکھ قوم سے تھے۔ زیورات پر اسقدر خرچ کرنے کی معقولیت کے متعلق سوالات اٹھانے شروع کر دیئے تھے۔

تعلیم اور زیورات

ایک سکھ کا بیان ہے کہ جب میرے لڑکے کی شادی ایک ایسی لڑکی سے ہوئی۔ جس نے کوئین میری کالج لاہور میں تعلیم حاصل کی تھی۔ تو میں نے اس کیلئے حسب دستور زیور خریدا لیکن اس نے صاف طور پر یہ کہہ دیا۔ کہ مجھے صرف ایک انگوٹھی۔ کلائی کی ایک طلائی گھڑی ایک کرن پھول اور ساڑھی باندھنے کے لئے ایک سونے کی پن درکار ہے۔ ان کے سوا اور کوئی چیز اسکے کام کی نہ تھی۔ اس نے یہ بھی کہا۔ کہ ہمارے گھرانے میں عرصے سے سونے کی اتنی بڑی بڑی چوڑیاں تھیں۔ جو کہنی سے لیکر کلائی تک آسکتی تھیں۔ اس نے بار بار میرے والد صاحب سے کہا۔ کہ

انہیں گھر میں رکھنا سراسر گلا دینا ہے۔ اور آخر کار ان کی فروخت کے لئے والد کو چار و ناچار راضی کر لیا۔ میں نے انہیں مبلغ ۸۰۰ روپے کو فروخت کیا۔ اور رقم یونین بنک میں سات فیصدی سود پر جمع کرا دی۔ پہلے سال کا سود ہی میرے والد کو رضامند کرنے کے لئے کافی تھا۔ امداد باہمی کا ایک مسلمان ممبر بتاتا ہے۔ کہ میں نے منفرداً اپنا زیور ۱۹۲۵ء میں فروخت کیا۔ اور اس وقت سے میرے گاؤں کے بہت سے لوگوں نے اس طرح کیا ہے۔ جب میں نے اپنی لڑکی کی شادی کی تو میں نے بجائے زیورات کے اسے ۸۰۰ روپیہ دیا۔ جو اس نے ساتھ ہی دیہاتی بنک میں جمع کرا دیا۔ یہ امر معنی خیز ہے۔ کہ چودہ عورتوں نے جن میں سے ۹ بیوہ ہیں۔ یونین کے پاس مبلغ ۲۹,۰۰۰ روپیہ جمع کرایا ہے۔

ایک اسلامی خانقاہ

شاہ کوٹ میں ایک خانقاہ ہے۔ جس کی بنیاد ایک پیر نے رکھی تھی۔ جو اکبر بادشاہ کے زمانے میں سنجارا کی پہاڑیوں پر سے آیا تھا۔ اس کے صرف چار چیلے تھے۔ لیکن وہ اتنے پھلے پھولے۔ کہ صرف شاہ کوٹ میں ان کی اولاد ۱۲۰ کنبوں پر مشتمل ہے۔ وہ اس خانقاہ کے مجاور ہیں۔ اور وہ خدمت جسے وہ نہایت پابندی سے ادا کرتے ہیں۔ یہ ہے۔ کہ ان زائرین کی ضیافت کے لئے جو وہاں آتے ہیں۔ ہر روز ایک وقت کھانا دیدیتے ہیں۔ انہوں نے ایک انجمن کفایت شعاری و قرضہ بنا رکھی ہے۔ جس کا میں نے معائنہ کیا۔

پیر اور اُن کے تعویذ

ہم نے پیری مریدی کے متعلق دلچسپ باتیں کیں۔ انجمن کے ۲۱۳ ممبروں میں سے ۵۰ یہی کام کرتے تھے۔ اور (انجمن کے کاغذات کے رو سے) وہ اس سے ہر سال ۵۶۰۰ روپیہ کماتے تھے۔ ایک نے کہا۔ کہ اس سال قیمتوں کے گر جانے کی وجہ سے اسے گذشتہ دورے میں صرف مبلغ ۲۵ روپے حاصل ہوئے۔ لیکن دوسروں نے قریب ہی چرتے ہوئے ایک بھورے ٹٹو کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہ اپنے ساتھ اسے بھی لایا تھا" دوسرے نے زمانے کی شکایت کرتے ہوئے بتایا۔ کہ اب ہمیں روپے میں سے صرف چار آنے ملتے ہیں۔ قیمتوں کے گر جانے سے پیشتر ہم اجناس مانگتے تھے۔ لیکن ہمیں روپیہ مل جاتا تھا۔ اب اگر نقدی مانگیں تو اناج ملتا ہے۔ لیکن اس نے

تقدس آمیز اطمینان کے ساتھ یہ بھی کہا۔ کہ ایمان سلامت ہے۔ اور انتہائی قوی ہے جتنا کہ ہو سکتا ہے۔ یہ شخص پُر رعب شخصیت کا مالک تھا۔ جو دلالت کرتی تھی۔ کہ اس نے جو کہا ہے۔ واقعی سچ ہے۔

.... میں نے دریافت کیا لوگ پیری مریدی کیوں کرتے ہیں؟

اُنہوں نے کہا۔ کہ جن لوگوں کے پاس کھانے کو ہے وہ نہیں جاتے۔ صرف وہی جاتے ہیں جن کے پاس کچھ نہیں ہے"۔

میں نے پوچھا۔ ان پیروں کا اُن کے پاس جانا.. جو انہیں نذرانے دیتے ہیں۔ کس کام کا ہے"؟ انہوں نے کہا کسی کام کا نہیں۔ لیکن اگر ہم ان کے پاس نہ جائیں۔ تو وہ ہمارے پاس آجائیں گے۔ اس بات میں کافی حقیقت ہے۔ کہ ایک تعلیم یافتہ آدمی اپنا دُکھ درد یا پشیمانی دور کرنے کیلئے فطری طور پر تعویذ گنڈے کی طرف رجوع کرتا ہے۔ لیکن ایک عجیب ذہنیت والے شخص نے اس بات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور کہا۔ کہ یہ بادشاہ کیلئے بھی مفید ہے اور غریب کیلئے بھی۔ یہاں پھر سچائی ظاہر تھی۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں۔ کہ مذہبی محتاج ایمان کی مدد سے کام لیتا ہے۔ اور ایمان امیر و غریب دونوں کی امداد کرتا ہے۔ دوسری بات ایک زاہد نے کہی۔ کہ ہم تعویذ نہیں دیتے۔ بلکہ صرف دعائیں دیتے ہیں۔

ایک سڑیل مزاج نے کہا۔ کہاں یہاں سے خاک کی چٹکی اُٹھائی جاتی ہے۔ (اس نے زمین کی طرف اشارہ کیا) اور اُن لوگوں کو دے دی جاتی ہے۔ جو بیمار ہیں۔ تاکہ وہ تندرست ہو جائیں۔ کمیٹی کے ایک سڑیل ممبر نے کہا۔ "یہ کیا داستان چھیڑی ہے؟ آؤ کچھ اور بات کریں"۔

میں نے کہا نہیں۔ مجھے اس معاملہ کے متعلق کچھ کہنا ہے۔ اس پر میں نے ان کے سامنے پیری و مریدی کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے۔ اور بتایا کہ یہ نہ پرانی تہذیب کے مطابق ہے۔ نہ نئی کے۔ اور یہ کہ میں کسی ایسے تعلیم یافتہ شخص سے نہیں ملا۔ جس نے اسے پسند کیا ہو۔ اور نہ ہی کوئی اچھا بنک ایسا دیکھا ہے۔ کہ یہ جس کے ممبروں کا شعار ہو۔ اور یہ بنک بھی کوئی استثنیٰ نہیں ہے مثال کے طور پر بھلا یہ تو بتاؤ۔ کہ کیا تمہاری کمیٹی کے ممبروں نے فنڈ میں دیئے ہوئے حصے سے کہیں زیادہ روپیہ ادھار نہیں لیا؟۔ اُنہوں نے میری باتوں کو اس خوش خلقی و توجہ سے سُنا جس سے کہ تمام پنجابی کسان ان لوگوں کی باتوں کو سنتے ہیں۔ جو سنجیدہ و غیر جانبدار ہوتے ہیں۔ یہ بات کہ اس مشکل مسئلہ پر خلوص و متانت سے بحث درکار ... ہے؟۔ میں نے کسی اور جگہ ظاہر کرنے کی کوشش کی

ہے۔ اور یہ بات کہ دوسرے بھی اسی طرح متوجہ ہیں۔ ایک انسپکٹر کی اس بات سے صاف ظاہر ہے۔ میرے والد پیری مریدی سے تقریباً ... ارروپیہ سالانہ پیدا کرتے تھے۔ یعنی یہ کہ اس رقم سے جو ایک معمولی مالک خود کاشت تمام سال اپنے کھیتوں میں کام کر کے کماتا ہے۔ دوگنا کے قریب ہے۔ جب وہ مرا۔ تو اس کے بیٹے نے تمام کتابیں اور حساب کتاب کے کاغذات جلا دیئے۔ تاکہ اس کے بچوں میں سے کسی کو یہ روش اختیار کرنے کی ترغیب نہ ہو۔ اور اس کے یہ معنی بھی تھے۔ کہ اس نے ۲ ہزار مریدوں کے ۱۰ پشتوں تک کے شجرے جلا دیئے۔ اس نے اپنے والد کے طریقوں سے تنگ آ کر ایسا کیا۔ جن کی اس نے ایک مثال دی۔ ایک دن شام کے کھانے میں مرغی پکانے کے خیال سے اس نے ایک مرید سے جسے ایک تعویذ کی ضرورت تھی۔ یہ کہا کہ یہ تعویذ مرغی کے خون سے لکھا جاتا ہے۔ چنانچہ مرغی فوراً حاضر کر دی گئی۔ اس کی دکانداری کے تمام مواد جل جانے نے بھی اسے ہر قسم کی خواہشات سے نہ بچایا۔ ایک بار وہ کسی فرض کو انجام دینے کی غرض سے شہری آبادی کے ایک گاؤں میں گیا۔ جو اس کے خاندان کے بعض مریدوں نے بسایا تھا۔ اگرچہ اسکے خاندان کا کوئی فرد تیس سال سے وہاں نہ پہنچا تھا۔ لیکن جونہی کہ دیہاتیوں نے اس کے آنے کی خبر سنی۔ وہ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اور زبردستی اسے نذرانے دیدیئے۔ وہ کسی طرح کے انکار کو نہ مانتے تھے۔ یہاں تک کہ اس نے بتایا کہ میں بہ حیثیت انسپکٹر آیا ہوں۔ اور تم اپنے نذرانے اس وقت تک اپنے پاس رکھو۔ جب تک کہ میں پیر بن کر آؤں۔

ایک نیم پاگل فقیر

ان لوگوں میں سے جو میرا استقبال کرنے کیلئے ڈاک بنگلے کے قریب انتظار کر رہے تھے۔ ایک سفید داڑھی والا اور سفید ہی لباس میں ملبوس چھوٹا عمر رسیدہ فقیر تھا۔ اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملانے پر اصرار کیا۔ اس کے ساتھ ہاتھ ملاتے وقت مجھے اس کے جسم کے ضعف اور اس کی روح کی مستعدی کا احساس ہوا۔ اس نے کہا کہ میرے بازو پژمردہ ہو رہے ہیں۔ میں دوائی پیتا ہوں۔

ایک شخص نے جو اسے جانتا تھا۔ دبی آواز سے کہا۔ "یہ نیم پاگل ہے۔ اور ایک بار پاگل خانے میں رہ چکا ہے۔ اس نے کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اب میں انسان نہیں ہوں۔ یہ بات اس نے اس طرح کہی گویا وہ اس فیصلے کی اپنے پر تصدیق کر رہا تھا کہ کوئی شئے میرے اندر ہے

اور میری زبان سے بولتی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ یہ کون ہے یا کیا ہے۔ لیکن میرے اندر نور ہے اور میں اسی کے اثر سے گفتگو کرتا ہوں۔ شاید میں پھر آدمی بن جاؤں۔ اس نے یہ الفاظ اپنے عصا پر جھک کر شریفانہ انداز میں پرزور طریق سے کہے تو

۱۱۔ دسمبر۔ شاہ کوٹ سے سانگلہ (۱۸ میل)

میں دھوپ میں ناشتہ کر رہا تھا۔ جبکہ وہی فقیر لٹھ ہوئے پھر نمودار ہوا۔ میرا ہاتھ گرمجوشی و محبت سے پکڑتے ہوئے اس نے نہایت خلوص سے سلام کیا۔ اور کہا۔ "خدا تمہیں نور رحمت فرمائے۔" مجھے نور کس طرح حاصل ہوگا؟۔

حرص آلود بھوری نگاہیں مجھ پر جما کر اور غالباً میز پر مغربی ناشتے کی افراط دیکھ کر اس نے جواب دیا۔

"چالیس دن تک اپنی خواہش سے کم کھاؤ۔ اور ایک جگہ خاموشی سے بیٹھو۔ اور اپنا کلمہ "عیسیٰ روح اللہ" بار بار پڑھو۔ ممکن ہے پھر تمہارے اندر نور پیدا ہو جائے۔ ذرا ٹھہر کر اس نے کہا۔ لیکن آپ بڑی عمر کے ہیں۔ (کیا اسے معلوم تھا کہ میں کل کے دن پچاس برس کا تھا) اور نور آپ کے اندر آہستہ آہستہ پیدا ہوگا۔ کیونکہ آپ نے یہ وظیفہ میری طرح سے شروع نہیں کیا۔ میں نے اس کی تلاش اس وقت شروع کی۔ جبکہ میں جوان تھا۔ جب کہ میں صرف ۱۸ سال کا تھا۔ ۲۶ سال تک میں نے عبادت کی۔ اور سات برس تک میں نے پتوں اور بھنگ پر گذارہ کیا۔ یہ بری بات تھی۔ اور ساڑھے پانچ برس تک میں پاگل خانے میں رہا۔ اب نور میرے اندر ہے۔ اور میں نہیں جانتا کہ یہ کیا ہے۔ یہ میرے جسم کو پژمردہ کر رہا ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے دوائی دی ہے" جب اس نے یہ بات کہی۔ اس نے اپنی پگڑی کا سرا کھولا۔ اور وہ دوائی دکھائی۔ جو اس کے پیچوں میں سے ایک پیچ میں بندھی ہوئی تھی۔ پھر میرے ہاتھ کو جھٹکا دیکر (ایک مضبوط محبتانہ گرفت) وہ مجھے انہی الفاظ کے ساتھ چھوڑ گیا۔ جن سے اس نے ابتدا کی تھی۔ "خدا تمہیں نور رحمت فرمائے" یہ پاگل نہیں ہے۔ بلکہ متلاشی ہے۔ اور اسکی آنکھوں کی چمک سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ اس نے فضول تلاش نہیں کی تھی۔ لیکن اسے وہ قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ جو ہر متلاشی کو ادا کرنی پڑتی ہے اگرچہ وہ صرف ۵۷ برس کا تھا۔ لیکن ۷۰ سے زیادہ عمر کا معلوم ہوتا تھا۔

زراعتی مزدوریاں

آج ہم لوئر چناب کی نو آبادی کے عین وسط میں تھے۔ لیکن چھوٹے چھوٹے پودوں والے روئی کے کھیتوں میں کہیں کہیں سنسان بیابان کی دھجیاں اس طرح چھپی ہوئی تھیں جس طرح کہ نوجوان کے دل میں طفلی مستور رہتی ہے۔ گنے جوانی کے عین مشابہ تھے۔ باہر سے مغرور اور خوشنما اور اندر رس دار نتوں کا ایک جنگل اور تمام کے تمام رس سے بھرے ہوئے اور دھوپ میں پوری آب وتاب دکھا رہے تھے۔ جب ہم سانگلہ منڈی کے چھوٹے سے قصبے کے قریب پہنچے تو گیہوں اور گنے نے اپنی جگہ پھول گوبھی۔ بند گوبھی اور پیاز جیسی عمدہ کاشت کی ہوئی سبزیوں سے بدل لی۔ اس کی ذمہ داری تمام تر ایک کپڑا بیچنے والے سکھ کھتری پر عائد ہوتی تھی۔ اس نے ۵۰۰ روپے میں ۲۸۔ ایکڑ زمین رہن رکھی تھی۔ اور اب تین عیسائیوں اور ایک ارائیں کو اسکی کاشت کیلئے ملازم رکھا ہوا تھا۔ ارائیں کو جو سبزی کاشت کرنے میں ماہر ہے۔ تیس روپے ماہوار اور تین آنہ روز خوراک کیلئے دیئے جاتے ہیں۔ جو اُن سب زراعتی مزدوریوں سے جو میں نے اور میرے ساتھیوں نے پنجاب میں کہیں دیکھی ہیں۔ سب سے زیادہ ہے۔ بلاشبہ یہ اتنی رقم ہے جتنی کہ بہت سے کلرک تنخواہ لیتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ دل لگا کر کاشتکاری کرنے سے سیراب شدہ رقبہ مزدور کو بھی اتنی آمدنی بہم پہنچائیگا۔ کہ وہ عمدہ معیار زندگی کے مطابق رہ سکے گا۔

فرقہ داری

ہندو مسلمان دکانداروں کیلئے یہاں علیحدہ علیحدہ امداد باہمی کی انجمنیں ہیں۔ اور وہ اس رقابت کی نشانی ہیں۔ جو شہروں میں اکثر ہندو مسلمانوں میں تفرقہ ڈال دیتی ہے۔ انتظام یہ کیا گیا کہ میں دونوں انجمنوں کو دیکھوں۔ لیکن نا عاقبت اندیشی سے اس کا انتظام ایک مسلمان کے گھر کے صحن میں کیا گیا۔ ہندوؤں کی طرف سے یہ پیغام آنا لازمی تھا۔ کہ وہ وہاں نہیں آئیں گے۔ بعض یہ ضروری خیال کرتے ہیں کہ نئی بستیوں کے شہروں میں ہندو مسلمانوں کے لئے امداد باہمی کی انجمنیں علیحدہ علیحدہ ہوں۔ اور اس کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں۔ کہ جب لوگ آباد ہوتے ہیں تو صرف اپنے فرقے کے لوگوں کو جانتے ہیں۔ اور کبھی کسی دوسرے فرقے کے لوگوں سے واقف نہیں ہوتے۔ اور اس واقفیت کے بغیر وہ ایک انجمن امداد باہمی میں شامل نہیں ہو سکتے۔ جو

اس امر کا مطالبہ کرتی ہے۔ کہ ممبروں کو ایک دوسرے کے حالات سے واقفیت ہو۔ ہوسکتا ہے کہ نو آباد قصبہ میں ایسا ہی ہو۔ لیکن اکثر یہ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ یہ صورت حسب معمول حالات میں پیش آتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک یا دو سال گذرنے سے پہلے قرب وجوار کی اسلامی انجمن نے سکھوں کی انجمن کو بنکنگ یونین میں داخل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس وقت سے اب تک ایک مشورے دیئے گئے ہیں۔ اور اب دروازہ ہر شخص کے فائدہ کیلئے کھلا ہے۔ ایسے علاقوں میں جہاں نئی آبادیاں نہیں ہیں۔ دونوں قومیں کئی کئی نسلوں سے پہلو بہ پہلو رہتی آئی ہیں۔ اور تعلقات عام طور پر کافی خوشگوار ہیں۔ جیسے ضرور ان پڑوسیوں میں ہونگے۔ جو ہمیشہ ایک دوسرے کو کاٹتے اور کھاتے نہ رہتے ہوں۔ اور حال ہی میں ایک چھوٹے قصبے میں جب میں نے مسلم دکانداروں کی ایک انجمن کے سامنے یہ پیش کیا۔ کہ تمہیں ہندوؤں سے یہ کہنا چاہیئے۔ کہ وہ اس میں داخل ہو جائیں۔

انہوں نے کہا۔ "بہت خوشی سے" ہم میں بہت اتحاد ہے۔ اور یہ اتحاد باہمی ہے بھی قدرتی اور معقول اسی لئے کہ بعض مسلمان ہندوؤں کی نسل سے ہیں۔ ایک بار میں نے رانجھا قوم کے مسلمانوں سے دریافت کیا" آیا یہ بات اسی طرح نہیں ہے" انہوں نے جواب دیا۔ ہاں جاٹوں اور راجپوتوں سے ہماری رشتہ داریاں تھیں۔ لیکن محمود غزنوی کے آنے سے پہلے۔

"پھر ہندو اور مسلمانوں میں یہ نفرت کیوں ہے"۔

"یہ اخبارات کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے"۔

سچ بات ہے۔ اگر ان سب کو ایک سال تک بند کیا جاسکے۔ تو یہ ایک اچھی بات ہوگی۔ عقب میں سے ایک آواز آئی "ہمیشہ کیلئے"۔ ایسا معلوم ہوا۔ گویا کوئی ..... (ہاتف غیبی) خود بخود بول اٹھا تھا۔

۱۲۔ دسمبر سانگلہ ہل سے سکھیکی (۲۱ میل)

جس طرح کہ اسلامی ضرب المثل یہ بتاتی ہے۔ کہ ہر فرعونے را موسیٰ۔ اسی طرح ہر گل کے ساتھ خار بھی ہوتا ہے۔ اور ہر نیکی کے ساتھ بدی ہوتی ہے۔ برائی کا بھوت، جو نہر کے کناروں کے ساتھ ساتھ لگا تا ہے۔ پانی کی سیم زدگی ہے۔ اس گاؤں میں ۰۰۰، ۷۔ ایکڑ زمین برباد ہوگئی ہے۔ اور ہر چار گاؤں میں سے ایک پر اس کا اثر ہوا ہے۔ آج ہم پر اس کا مفہوم عیاں ہوا۔ اسکی بیرونی اور نمایاں علامت شور ہے۔ وہ شور جو نہ زمین کیلئے موزوں ہے۔ نہ ابھی گوبر کے ڈھیر کے لئے۔ یہ زمین پر برف کی طرح پڑا

ہے۔ دو دن ہوئے۔ ماناں والہ میں پانی کی سطح ۵۰ فٹ گہرائی پر تھی۔ لیکن آج یہ چار یا پانچ فٹ نیچے تھی۔ یہ نتیجہ ہے لوئر چناب کی اُن دو شاخوں کا جو صرف ۸ میل پرے اس علاقے میں سے گذرتی ہیں۔ ایک کاشتکار کو اپریٹر نے دعیں کے چہرے پر جھریاں پڑی ہوتی تھیں جس کی داڑھی سرخ تھی اور جو ایک ایسا ٹٹولے ہوئے تھا جس کا سنبھالنا اس کی طاقت سے باہر تھا، یہ بتایا کہ ۱۸۹۲ء میں جب میں ان علاقوں میں آیا۔ تو پانی ۶۵ فٹ نیچے تھا۔ اور دس سال گذرے۔ جب میں نے کنواں اُتارا تھا۔ تو اس وقت بھی ۵۱ فٹ نیچے تھا۔ اس کا علاج کنوئیں نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کا پانی نمکین ہے۔ وہ زرخیز زمین کو ایسا سخت بنا دیتا ہے۔ جیسا کہ لوہا۔

سڑک کے کنارے ایک چارپائی کا ڈھانچہ دیکھ کر ہم ان جاٹوں سے باتیں کرنے کیلئے ٹھہر گئے جو وہاں کام کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ تم گاؤں چھوڑ کر یہاں کیوں رہنے لگ گئے ہو۔ انہوں نے کہا "دو یا تین سال سے دلدل پیدا ہو گئی ہے۔ جب ہمارے مویشی کھڑے ہوتے ہیں۔ تو وہ کیچڑ میں دھنس جاتے ہیں۔ ہمارے گھر گر رہے ہیں۔ اور ہماری صحت خراب ہے۔"

پھر تم اپنی بیوی بچوں کو کیوں نہیں لائے ہو؟۔

"یہاں چور ہیں"

"کیا تمہیں اپنے مویشیوں کے چوری جانے کا ڈر نہیں"۔

وہ شخص جو اپنی زمین پر رہتا ہے۔ بہ نسبت گاؤں میں رہنے کے اس میں ۲۵ فیصدی زیادہ فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔ اور اگر بہت سے لوگ اس طرح کریں۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ بڑے پیمانے پر زراعتی ترقی ہو جائیگی۔ لیکن یہاں چور ہیں۔ اور چوروں کو کوئی پسند نہیں کرتا۔ نتیجہ یہ ہے۔ کہ زراعتی ترقی کیلئے مضبوط پولیس کی ضرورت ہے۔ لیکن اُن لوگوں میں سے جو موجودہ فوجی طاقت کم یا کمزور کرینگے۔ کتنے ایسے ہیں۔ جنہوں نے کبھی اس کے متعلق سوچا ہے۔ اگرچہ ہم دن کی تیز دھوپ میں گھوڑے پر سواری کر رہے تھے۔ لیکن گرمی ہر وقت خوشگوار تھی۔ اور شمال کی طرف سخت سرد ہوا چل رہی تھی۔

اس علاقے کی سطح سراسر ہموار تھی۔ اور کہیں کہیں خار دار جنگلی کانٹے کے پودوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ ہم ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلے۔ اور اس جگہ سے جہاں نصف درجن دکانیں اور خاموش روئی بیلنے کی فیکٹری اس کھلے میدان کی خلا میں بیکسی کے عالم میں ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی واقع تھیں۔ مڑ کر ہم اس گاؤں تک سوار چلے۔ جہاں مغربی پنجاب کے لوگ یعنی بلوچ آباد تھے۔

حسب معمول میں نے اس گروہ سے جو مجھے ملنے کیلئے باہر آیا علیک سلیک کی اور کہا "سب ٹھیک ہے نہ" عام طور پر اس کا جواب اس بات سے کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔ کہ آپ کے مزاج کیسے ہیں؟ لیکن اس مرتبہ اس نے ایک پُرزور نوحے کیلئے اشارے کا کام کیا۔ انہوں نے کہا۔ سخت مشکل ہے یہ رشتوں اور پانی کی دلدل بن جانے سے تباہی آ رہی ہے۔ ہمارے گھر گر گئے ہیں۔ ہماری زمینیں تباہ ہو گئی ہیں۔ اور ہماری صحت برباد ہو رہی ہے۔ پہلے کوئی تکلیف نہ تھی۔ اب بخار پھیلتا ہے۔ یہ حال ہی میں آیا تھا۔ اور دو ماہ تک رہا۔ ہمارے مویشی بھی بیمار ہیں۔ اور اگر وہ اس راستے سے جائیں۔ (اس نے شمال کی طرف اشارہ کیا) تو وہ کیچڑ میں دھنس جاتے ہیں۔ سرکار ہمیں نئی زمین دیدے ورنہ ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔

ان کے پاس شکایت یہ تھی۔ ان کے گھروں کی کچی دیواریں وہ بڑے شفاف پانی کے تالابوں میں آئینہ کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ دو سال گذرے یہ خشک زمین تھی۔ لیکن شور کے پھیلاؤ اور رچاؤ نے ان کے کھیتوں پر برص کی طرح پپڑی جما دی ہے۔

نظم و نسق

اب بنک دیکھنے کا وقت ہو گیا تھا۔ ہم میں سے تقریباً چالیس اشخاص ایک کھلی جگہ میں جمع ہوئے۔ بعض بان کی چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ لیکن اکثر زمین پر تھے۔ اور ایک لمبی ٹانگوں والا ذیلدار ایک چارپائی پر اکیلا ہی ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اس کو چھوڑ کر باقی چالیس میں سے صرف ایک لاکھ پڑھ سکتا تھا۔ اور وہ ایک پانشتیہ (بونا) تھا جس کی اونچائی جوتوں سمیت چار فٹ تھی۔ وہ ایک درد انگیز صورت تھی جس کا سر خط و خال اور داڑھی ایک متوسط العمر آدمی جیسی تھی۔ اور وہ تھا بھی ایسا ہی) ٹھگنا سا قد اور اس کے مڑے تڑے ہوئے خشک گھٹنے بچوں جیسے تھے۔ گویا اسے بہت ہی جلد چلنے پھرنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ لیکن اسے مضحکہ بنانے کے ساتھ ہی قدرت نے اس کے بدلے میں اسے ایک عطیہ بھی مرحمت کیا ہوا تھا۔ وہ ان سب میں سب سے زیادہ ذہین شخص تھا۔ جب میں نے یہ دریافت کیا کہ صوبے میں کون کونسے بڑے افسر ہیں۔ تو کوئی بھی ڈپٹی کمشنر اور سشن جج سے زیادہ نہ بتا سکا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ایک فنانشل کمشنر بھی ہوتا ہے۔ وزراء کا کسی نے ذکر نہیں کیا۔ اور نہ ہی کسی نے وائسرائے اور گورنر میں تمیز کی۔ نہ ہی وائسرائے کا ذکر کیا گیا۔ یہاں تک کہ میں نے دریافت کیا۔ کہ وائسرائے کون ہے۔ ایک نے کہا کہ پنجاب کا لاٹ صاحب اور

بادشاہ کون ہے؟ میں نے بونے سے پوچھا۔ اس نے کہا "شہنشاہ پنجم"

گاؤں کو چھوڑ کر ہم گوجرانوالہ کی تحصیل حافظ آباد میں داخل ہوئے۔ اور راستے کی حد پر ہمیں بہت سے گھوڑے سوار ملے۔ گھوڑوں کو دُلکی چلاتے چلاتے ہم نے ایک غیر معروف کنبے کو جا لیا۔ جن میں سے بعض پیدل تھے۔ اور بعض گدھوں پر۔ گدھوں میں سے ایک کے دل میں بھی دُلکی چلنے کی اُمنگ پیدا ہوئی۔ ایک سیاہ شال والی عورت جو اس پر سوار تھی۔ آہستہ آہستہ پھسل کر زمین پر آ رہی۔ کچھ دیر تک، وہ ایک اکیلے سیاہ تودے کی طرح پڑی رہی۔ لیکن جب وہ اُٹھی تو اس کی شال کی تہ میں سے ایک چھوٹا ننھا بچہ دکھائی دیا۔ روپیہ کو دیکھتے ہی اسکی متحیر نگاہیں چمکدار مسکراہٹ سے بدل گئیں۔ لیکن غریب بچے نے جواب اپنی ماں کی گود میں تھا۔ اپنا سر اس کے کندھے کے ساتھ دبا یا۔ وہ سخت بیمار تھا۔ ایسے ملک میں جہاں نقد روپیہ کا از بس قحط ہے۔ ایک روپیہ کی طاقت یہ ہے۔ کہ ماں کی آنکھیں خوشی سے چمکتی رہیں۔ میں نے اس سے اس کے بچے کی عمر پوچھی۔ اور جب کسی نے ازراہ تمسخر یہ کہہ دیا۔ کہ تمہاری عمر کیا ہے۔ تو اس نے بہت تیزی سے بے ساختہ یہ جواب دیا۔ "پوچھو اس سے جس نے مجھے بنا۔"

یہاں کا ڈاک بنگلہ ان تمام عمارتوں میں سے زیادہ گندی عمارت ہے جن میں سے کئی سال سے مجھے ٹھہرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ سونے کے کمرے کی دری گندے پاؤں کے نشانات سے چھپی پڑی تھی۔ اور ایسی معلوم ہوتی تھی۔ کہ گویا کوئی بابو بڑے بڑے اور نہایت منتشر بروح نقشہ اپنے قلموں کے چھینٹوں سے بنا بنا کر اپنے آپ کو خوش کرتا رہا ہے۔ میں نے غیر مہذب جنگلیوں کی صفائی کا خیال کرکے آہ بھری۔

۱۳۔ دسمبر۔ سکھے کی سے پنڈی بھٹیاں (۱۸ میل)

سکھیکی کول تار کی اس سڑک پر واقع ہے۔ جو لاہور سے سرگودھا جا رہی ہے مجھے افسوس ہے۔ کہ مجھے اس کی سیاہ برف سی ٹھنڈی سطح دیکھنی پڑی۔ مگر تار کول کی ہندوستانی سڑک گھوڑے اور سوار کے لئے اس قدر غیر موزون نہیں ہے جتنی کہ ولایتی۔ کیونکہ عام طور پر اس کے دونوں طرف نرم گرد والی مٹی کی دھاریاں ہوتی ہیں۔ یہاں اس کی رنگت لندن کی آدھی پگھلی ہوئی برف کی سی تھی۔ سڑک کے شمال وجنوب کی طرف آنے جانے والوں کی آمد و رفت سے زندگی کی گوناگونی پوری طرح ظاہر تھی۔ ایک لمبی ٹانگوں والا شخص ایک چھوٹی ٹانگوں والے گدھے پر سوار تھا۔ اور ٹانگیں اوپر کھینچی ہوئی تھیں۔ تاکہ زمین سے نہ لگیں۔ ایک سائیکل والا پرانا فوجی

کوٹ اور ارغوانی رنگ کی جرابیں پہنے ہوئے تھا۔ ایک نے گیندے کے پھولوں کا ایک گچھا ہنڈال سے باندھا ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی ٹمٹمیں بل پڑے ہوئے برقعوں میں چھپی ہوئی عورتوں کو لئے کھڑکھڑاتی جا رہی تھیں۔ بڑی بڑی لاریاں (ان میں سے ایک میں میرے ملازم، سامان اور چھت پر پا و رچی کا بائیسکل لئے ہوئے تھی) گرر ڑ گرر ڑ کرتی ہوئی ہمیں گرد میں دم گھٹتے چھوڑ کر خوفناک تیزی سے چل رہی تھیں۔ اور کبھی کبھی کوئی بھیڑوں یا بکریوں کا ریوڑ آ جاتا تھا۔ جو گرد تو اڑاتا تھا لیکن اتنی آہستہ کہ وہ ہوتے ہوتے بادل کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ اور بیٹھتے بیٹھتے طلوع آفتاب کا منظر پیش کرتی تھی۔ کسان اس آمد و رفت سے بالکل بے خبر کھیتوں میں اپنا کام کر رہے تھے۔ ہم نے ایک سے دریافت کیا۔ کہ تم اپنے کھیت میں مٹی کیوں بچھا رہے ہو۔ اس نے جواب دیا۔ یہ زمین پرانی ہے۔ اور اس میں طاقت نہیں ہے۔ میں نے یہ مٹی اس ڈھیر میں سے لی ہے اور کھیت میں بچھا رہا ہوں۔ تاکہ اس میں مٹھاس آ جائے۔ فی الحال اس میں کھٹاس ہے۔

"کیا تم نے اس میں کافی ہل چلایا ہے"؟

"میں نے اس میں کئی مرتبہ ہل چلایا ہے۔ کوئی پندرہ بار اور یہ اب بھی کمزور ہے"۔ کل ہم نے نو آبادی کو چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اب بھی نہری علاقے میں تھے۔ اور سڑک کے ساتھ ایک دس یا بارہ فٹ چوڑے نالے میں پانی آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا۔ اسے گورنمنٹ نے کھدوایا تھا۔ اور یہ دلدلی علاقے کو پانی دینے والی بڑی سکیم کا ایک جزو تھا۔ کچھ دیر بعد ہم نہر لوئر چناب کی جھنگ برانچ کے نزدیک پہنچ گئے۔ اس کا پانی گرجتی ہوئی آواز سے اس پل کی محرابوں میں سے گر رہا تھا۔ جس کے ذریعے سے ہم نے عبور کیا۔ اس سے پرے ہم ایک ایسے علاقے میں داخل ہو گئے۔ جسے کنوؤں سے سیراب کیا جاتا ہے۔ اور ہم نے رہٹ کی روں روں چرڑ چرڑ کا نغمہ سنا۔ نے والی سرکنڈہ گھاس کے جھنڈ اس سے پرے دریا کے ہونے کا پتہ دیتے تھے۔ اور ایک ایسی دنیا کے معمولی بلند و پست کی خبر سناتے تھے۔ جو ہمیشہ مسطح نہیں ہوتی۔ جب ہم ان میں سے ایک کی چوٹی پر چڑھے تو چناب اور وہ دریا جسے اب تک نہ دیکھا تھا، کا دریائی علاقہ ہمارے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ سنہری سرکنڈہ گھاس قریب قریب افق تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور پنڈی بھٹیاں اور اس کی گنبد والی خانقاہیں ہمیں ایک جزیرے کی طرح باہر اٹھی ہوئی نظر آئیں۔

۱۴۔ دسمبر پنڈی بھٹیاں سے کوٹ نا کھہ (۲۱ میل)

آج مجھ پر انتہائی خوشی کے وہ جذبات تھے۔ جو ہمیشہ گھوڑے پر بیٹھے ہوئے ایک بڑے دریا کے

قریب پہنچ جانے سے میرے اندر پیدا ہو جانے چاہئیں ۔آسمان اور زمین صاف طور پر گلے لگ رہے تھے ۔اور رہٹ کے نوحے کی دھیمی پُر ترنم آواز کھیتوں کے پار سے ہوا پر تیرتی ہوئی آ رہی تھی۔ اور ایک طویل مرثیے میں ان تمام مصائب کا انکشاف کر رہی تھی ۔جو بیل اور کسان نے مختلف زمانوں میں برداشت کئے ہیں ۔پانی کا پہلا منظر جو سامنے آیا ۔دریا کے پہلو کی ایک ندی تھی ۔ جس پر تین کشتیوں کا پُل بنا ہوا تھا ۔اس سے پرے خشک سرکنڈہ گھاس کی ایک سڑک سنہری دھاگے کی طرح رتیلے بنجر علاقے میں سے جا رہی تھی ۔ہم کڑ کڑ کرتی ہوئی شاخوں پر سے دُکی چلتے رہے ۔یہاں تک کہ دریا کے سامنے پہنچ گئے ۔غروب آفتاب طوفان کی طرح زوروں پر تھا ۔اور اس نے نیچے اور اوپر آگ لگا رکھی تھی ۔کوٹ کی گہرائیوں کو توڑنے والی آواز محض بطخوں کے گذرنے کی شاں شاں اور دور بیٹھے ہوئے سارسوں کی پکار تھی ۔یہاں تک کہ ایک زرد موٹر لاری شوخ سُرخ رنگ کی اوڑھنی لئے کشتیوں کے پُل پر سے گذرنے لگی ۔نئی روشنی پرانی تہذیب کو اپنی بھڑک دکھا رہی تھی ۔اور اب بیس کشتیوں نے اپنی چڑ چڑ شروع کر دی ۔پُل کے سرے پر دیہاتیوں کا ایک گروہ آگ سینک رہا تھا ۔جو آسمان کے مقابل میں دھیمی دھیمی سلگ رہی تھی ۔کیونکہ سرد رات سر پر سے گذرتی جا رہی تھی ۔وہ سایہ میں کھڑے ہوئے گدھے اس امر کی کوشش کر رہے تھے ۔کہ ناپائیدار ہلکی ہلکی گرمی سے اپنے آپ کو گرم کر لیں اب ہم شاہ پور میں تھے ۔

باب دوم

دریائے چناب سے دریائے جہلم تک

ایک پرانی نہری نو آبادی۔ تنگی اور نو آباد کار۔ سیاست اور زرعی اجناس

۱۵ دسمبر۔ کوٹ ناجھہ سے لالو والی (۱۰ میل)

شاہ پور مع اپنے ۴۸۰۰ مربع میل رقبہ کے اپنے جاگیرداروں، مویشیوں کے چوروں اور نہر کیلئے مشہور رہا ہے۔ یہاں کے اکثر جاگیردار مقروض ہیں۔ لیکن ان کا شمار صوبے کے نہایت ہی بارسوخ جاگیرداروں میں ہے۔ مویشی چرانے والے لوگ ہر جگہ ہیں۔ اور مویشیوں کی چوری اس ضلع کا ہر دلعزیز کھیل ہے۔ حال ہی کی ایک اطلاع سے ظاہر ہے۔ کہ یہاں کا تقریباً ہر زمیندار اس عادت میں پھنسا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جھنگ میں صرف بہترین جاگیردار ہی ایسے ہیں جنہیں اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کافی جائیداد والے ایک شخص نے میرے عملے کے ایک ممبر سے کہا۔ کہیں ایک رات میں اسقدر کما لیتا ہوں۔ جتنا کہ تم سال بھر میں کماتے ہو۔ لوٹ کے مال کو چلایا جاتا ہے۔ یا جب دریا چڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ تو راتوں رات انہیں تیرا کر دریا پار کسی ایسے گاؤں میں لے جاتے ہیں جو اس ضلع کی حد پر واقع ہوتا ہے۔ اور اپنے ساتھی کے سپرد کر دیتے ہیں۔ پھر وہ بھی اس طرح کرتا ہے۔ علی ہذالقیاس منزل بہ منزل یونہی ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ کسی منڈی کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ گوجرانوالہ ہو یا امرتسر۔ ہر شخص کو اسکی تکلیف اور خطرے کے عوض پانچ روپے ملتے ہیں۔ اور اگر وہ تکالیف میں پھنس جائے۔ تو وہ کسی بارسوخ جاگیرداروں کی اعانت پر بھروسہ رکھتا ہے۔ تاکہ وہ اسے قانون کے پنجے سے نجات دلوا دے۔ یہ کھیل ان جنگلیوں کو خاص طور پر پسند ہے۔ جو کسی قدر چوپائی کرتے ہیں۔ اور جو اس وقت جبکہ یہاں کوئی نہر نہ تھی اکیلے ہی اس زمین پر قابض تھے۔ اس نہر کا نام لوئر جہلم ہے۔ اور یہ ۱۹۰۱ء میں نکالی گئی تھی۔ اور اب

پانچ لاکھ ایکڑ زمین کو سیراب کرتی ہے۔

اصلی باشندے

اُن جنگلیوں کے متعلق جو راوی اور چناب کے درمیان رہتے ہیں میں پنجابی کسان میں لکھ چکا ہوں۔ اور یہ جو چناب اور جہلم کے درمیان رہتے ہیں۔ زیادہ تر رانجھا اور گوندال نسل سے ہیں۔ اور اُن سے کچھ مختلف نہیں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں موجودہ تہذیب نے چھوا تک بھی نہیں فطرت اور رواج کے مطابق کسانوں کی نسبت چرواہوں سے زیادہ مشابہ ہیں۔ ان کی کاشتکاری تمام تر اُن قدیم لوگوں کی سی ہے۔ جن کے پاس زمین کی بہتات ہے۔ سیالکوٹ اور گجرات کے آباد کار زمین کے اندر اپنی جڑیں بٹھاتے ہیں۔ لیکن جنگلی محض اسکی بیرونی سطح کو کھرچتے ہیں۔ ان کے کھیتوں کی درمیانی مینڈھوں پر ایسی لکیریں ہیں۔ جو ہاتھ پاؤں مارنے سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور ان کے کنارے شکستہ ہیں۔ اور مٹی بجائے ہلوں کے ذریعے قابل کاشت بننے کے ڈھیلوں کی شکل میں سطح پر پڑی ہے۔ جن کیلئے سست آدمی کا یہ بہانہ کہ وہ نمی کو محفوظ رکھتی ہے۔ بجا ہے۔ کاشت کا دور نہایت ہی سادہ ہے۔ گیہوں کے بعد گیہوں اور روئی کے بعد روئی ایک سال کے وقفے سے بوئی جاتی ہے۔ صرف کہیں کہیں گنا نظر آتا ہے۔ محکمہ نہر کا ایک افسر جو ضلع کے امرت سر سے خوب واقف ہے۔ یہ کہتا ہے۔ کہ وہاں کسان پانچ ایکڑ زمین میں سے اتنی پیداوار حاصل کرتا ہے۔ جتنی کہ جنگلی پچاس ایکڑ زمین میں سے۔

لیکن اگرچہ جنگلی ایک اچھا کسان نہیں ہے۔ تو وہ کم از کم اچھا شکاری ضرور ہے۔ فساد اور بکھیڑے اس گاؤں میں عام ہیں۔ اور وہ اپنے جھگڑوں کو عدالت یا پولیس میں چارہ جوئی کئے بغیر پرانے طریق کے مطابق فیصل کرنا پسند کرتا ہے۔ ایک تعلیم یافتہ رانجھے کا بیان ہے کہ رقابت کے جھگڑوں میں یہ بات اب بھی عام ہے۔ کہ وہ مقررہ جگہ وقت پر جمع ہوتے ہیں۔ اور موگری و بلے سے لڑ کر جھگڑوں کا فیصلہ کرتے ہیں۔ سوائے بوڑھوں کے باقی سب اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اور مختصر سی نصف گھنٹے کی زور آزمائی تھا پائی شروع کر دیتے ہیں۔ پرانے زمانے کے کھیلوں کے مقابلوں کی طرح یہ مجالس خاص قوانین کی پابند ہیں۔ سوائے لاٹھی یا ہندوستانی ڈنڈے کے جسے ہر آدمی لئے پھرتا ہے۔ کوئی تیز ہتھیار نہیں استعمال کیا جا سکتا۔ مقررہ وقت سے پہلے کوئی حملہ نہیں ہوتا۔ اور لڑائی کے بعد یہ ضروری ہے۔ کہ سب کے سب اُن لوگوں کی

مدد کریں۔ جن کے چوٹیں آئی ہوں دوسرے فریق کو آگاہ کئے بغیر پولیس کو کوئی اطلاع نہیں کی جاتی۔ اور اگر وہ بن بلائے آجائیں۔ تو یہ حلف اٹھانا کہ کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ باعث عزت سمجھا جاتا ہے۔ میرے مخبر کا بیان ہے۔ کہ حال ہی میں میری والدہ کے گاؤں میں کئی نسلوں کے جھگڑے کی بنا پر ایک لڑائی ہوئی۔ متقابلتہً یہ ایک معصومانہ معاملہ جس میں ایک درجن لوگ ایک طرف تھے اور بیس دوسری طرف سوائے چند ایک فریقوں اور زخموں کے نتیجہ برابر رہا۔

نہر کا اثر

لیکن نہر مع اپنی پُرامن آبادی کے ان تمام باتوں کو آہستہ آہستہ بدل رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ کھودی جائے۔ لوگوں کا بڑا پیشہ مویشی چُرانا تھا۔ لیکن اب روئی۔ نیشکر اور گیہوں کی وجہ سے لوگوں کو تمام سال مشغول رہنے کے لئے کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔ خوشحالی نے ان کی زندگی کا معیار بلند کر دیا ہے۔ اور زیادہ ترقی یافتہ اضلاع کے لوگوں سے میل ملاپ ہونیکی وجہ سے ان میں تعلیم حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہو گئی ہے۔ کبھی وہ وقت تھا۔ کہ مشکل سے کوئی ذیلدار ایسا تھا۔ جو مویشی چرانے میں حصہ نہ لیتا ہو۔ اور اب بھی بڑے سے بڑے مرتبے کے کسی ایسے شخص کو معلوم کرنا۔ جس کے ایک یا دو رشتہ دار اس میں شامل نہ ہوں مشکل ہوگا۔ لیکن اب یہ اسقدر مقبول مشغلہ نہیں ہے۔ جتنا کہ پہلے تھا۔ اور بلا شبہ وقت آنے پر شرم کا احساس جو نوآبادکاریں پہلے ہی موجود ہے۔ جنگلیوں میں بھی پیدا ہو جائیگا۔ نہر کا کم تسلی بخش اثر یہ ہوا ہے۔ کہ شادی کی عمر میں کمی واقع ہو گئی ہے۔ پُرانے دنوں میں جیسا کہ لائل پور کے جنگلیوں میں ہے۔ لڑکیوں کی شادی بیس یا یہاں تک کہ پچیس برس تک بھی نہیں کی جاتی تھی۔ اور اب جبکہ کھانے پینے کی فراغت ہے۔ ان کی شادی چودہ یا پندرہ برس میں کی جاتی ہے۔ یہ بات کسی قدر اس شکایت کی تشریح کرتی ہے۔ کہ صحت کیوں کمزور ہو رہی ہے۔ خواہ یہ اس طرح ہے یا نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ مکھن و دودھ باجرے کی چپاتی وافر خوراک نے خشک و صاف فضا کے ساتھ مل کر اچھی نسل پیدا کی ہے۔ اب بھی صوبے میں سب سے زیادہ عمر کے وہ لوگ وہ ہیں۔ جو اب بھی جہلم اور سندھ کے درمیان صحرائے تھل میں رہتے ہیں۔ نہر کا سب سے بُرا اثر یہ پڑا ہے۔ کہ روپیہ ایسے لوگوں پر اچانک برسنا شروع ہو گیا ہے۔ جن کے لئے ایک ایک روپیہ اس قدر قیمتی تھا۔ جتنا کہ بچے کے لئے ایک آنہ

فسادات بڑھ گئے ہیں۔ کیونکہ روپیہ سے عدالتوں کے راستے کھل جاتے ہیں۔ جیسا کہ جہالت اور خوشحالی کے شانہ بہ شانہ چلنے سے ہمیشہ ہوتا ہے۔ یہاں بھی قرض قابل ذکر طور پر بڑھ گیا ہے۔ ایک چھوٹے بینک نے جس کا میں نے دن کے وقت معائنہ کیا۔ اس کے نتایج پر خوب روشنی ڈالی۔

ایک ساہوکار جو اپنی حد سے تجاوز کر گیا

قتل کے ایک معاملے نے بنک کی جڑیں بُری طرح سے ہلادی تھیں۔ اور وہ دونو اقراری قاتل میرے سامنے زمین پر بیٹھے تھے۔ جنہیں سیشن جج نے ماہ جولائی میں پھانسی کی سزا دی تھی۔ اور عدالت عالیہ نے نومبر میں رہا کر دیا تھا۔ ان میں سے ایک خوب موٹا تازہ اور ادھیڑ عمر کا تھا۔ اور ایک سیاہ پگڑی کچھ بُری طرح باندھے ہوئے نہ تھا۔ دوسرا شخص ایک نوخیز سا تھا۔ سفید پگڑی پہنے تھا۔ وہ واقعہ جو انہوں نے بیان کیا۔ یہ تھا۔ دوسرے گاؤں کے ایک ساہوکار نے اس نوجوان کے والد کو کچھ روپیہ قرض دیا تھا۔ جو اس کے والد کی وفات تک بھی قرض ہی رہا۔ اٹھارہ سو روپے کا دعویٰ کیا گیا۔ لیکن صغرسنی کی وجہ سے خارج کر دیا گیا۔ ساہوکار نے بے دھڑک ہو کر نوجوان کے خالہ زاد بھائی کو اپنے شکنجے میں لے لیا۔ اور ان کے خلاف ۱۵۰۰ روپے کی ڈگری حاصل کر لی۔ ایک دن وہ ایک بڑے مجمع کو لیکر اجرائے ڈگری اور اس کے خالہ زاد بھائی کو گرفتار کرانے کے لئے آیا۔ اس پر لڑائی شروع ہو گئی۔ اور وہ کام آیا۔ یہ ضرور وحشیانہ جنگ ہوئی ہوگی کیونکہ عدالت عالیہ کے فیصلے سے ظاہر ہے۔ کہ مقتول کو تیئیس زخم لگے۔ جن میں سے دو نے اس کی کھوپری پاش پاش کر دی۔ طرفین نے پولیس میں شکایت کی۔ لیکن چونکہ ساہوکار صاف طور پر مر چکا تھا۔ اس کی طرف سے شکایت سُن لی گئی۔ اور دوسری کو داخل دفتر کیا گیا۔ میرے واقف کاروں میں سے بھی دو اس میں ماخوذ تھے۔ اُن کے ساتھ ہی دو بوڑھے آدمی بھی پکڑے گئے۔ جن میں سے ایک بنک کا خزانچی تھا۔ وہ دونو اپنی داڑھیوں پر سیاہ خضاب کئے میرے سامنے بیٹھے تھے۔ سشن جج نے ان سب کو مجرم ٹھہرایا۔ اور پہلے دونو کو پھانسی کی سزا دی۔ اور اُن دو نیلی داڑھیوں والوں کو بیس سال کی قید کی سزا دی عدالت عالیہ نے زیادہ رحم سے کام لیا۔ اور امید ہے کہ زیادہ انصاف سے بھی

میں نے اس فربہ ادھیڑ عمر کے آدمی سے پوچھا۔
جب تمہیں پھانسی کی سزا کا حکم سنایا گیا تھا۔ تو تم نے کیا کہا تھا؟
"خدا کا یہی حکم ہے"۔
"کیا تمہیں کوئی تکلیف محسوس ہوئی تھی؟"
"نہیں۔ ہمارا وقت آ گیا تھا"۔
اور جب تم نے یہ سنا کہ تمہیں رہا کر دیا گیا ہے۔ تو اس وقت تم نے کیا کہا؟
"یہ خدا کا فضل ہے"۔
سخت سے سخت مجرم بھی اس سے زیادہ اوسان بجا رکھ کر اپنے خیالات کو ظاہر نہ کر سکتا۔ اور وہ لفظ جرم کے مغربی مفہوم کی رو سے مجرم نہ تھے۔ کیونکہ ہندوستان میں ہر وہ ساہوکار جو اپنے جھوٹے یا ظالمانہ دعویٰ میں حد سے زیادہ تجاوز کرتا ہے۔ اپنی جگہ دیہاتی قانون کے احاطے سے باہر بنتا ہے۔ اور پنجاب میں اس سال چونتیس ساہوکاروں کی رحلت کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

۱۶- دسمبر للوالی سے چوکیرا (۱۰ میل)

ہم اب نہری آبادی میں ہیں۔ جہاں تیس برس پہلے خانہ بدوش اور اونٹ چھپکلیوں کے شکاری۔ اور مویشیوں کے چور پُر خطر مگر صحت مند زندگی بسر کرتے تھے۔ قریب قریب ہمیشہ سرسبز رہنے والے سیاہ درختوں کی درمیانی لمبی راہیں نہر کی گذرگاہ کا پتہ دیتی ہیں۔ اور دور دور پھیلی ہوئی گیہوں سے جو تازہ کاٹے ہوئے گھاس کی طرح نرم اور سبز ہے۔ اور سرسوں کی سی خوشبو والے توریئے سے جس کے پھولوں کی پھلجھڑی پک رہی ہے۔ اور نئے نما گنوں کے جزیروں سے جن کے ریشے ریشے میں پختگی آ گئی ہے۔ اس کے بہنے کے اثرات ظاہر ہیں۔ چارے کے گٹھڑے بعض پٹیوں پر، کھیتوں میں نظر آتے تھے۔ مینڈھیں مضبوط اور سیدھی تھیں۔ اور بہت کم، اور چھوٹے ڈھیلے اس امر کی شہادت دیتے تھے۔ کہ سہاگہ کھلے دل سے استعمال کیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ کاشتکاری اس سے کہیں زیادہ اچھی تھی۔ جو کل ہم نے دریائی علاقے میں دیکھی تھی۔ اس کے باوجود اس کا مقابلہ لائل پور کی بستی سے نہیں کیا جا سکتا۔ اسکی ایک وجہ یہ ہے کہ بہت سے مالکان مزارعین کی مدد سے کاشت کرتے ہیں۔ اور مزارعین زیادہ تر ضلع کے اُن

حصوں سے ہو کر آئے ہوئے ہیں۔ جہاں نہروں سے آبپاشی نہیں ہوتی۔ اور جہاں کاشتکاری کا معیار پست ہے۔

گاؤں میں نقدی کی کمی

ہم ایک گاؤں میں انجمن اصلاحِ رسوم اور دو بنک دیکھنے کیلئے ٹھیرے۔ جن میں سے ایک زمینداروں یا مالکانِ ذیہہ کے لئے اور دوسرا گاؤں کے کمیوں کیلئے تھا۔

کمیّ گاؤں کی برادری کا ایسا اہم ممبر ہے۔ کہ اس کیلئے ایک علیحدہ باب کی ضرورت ہے۔ اور یہ باب بعد میں لکھا جائیگا۔ آقا و ملازم دونوں کی ایک شکایت مشترکہ تھی۔ اور وہ نقدی کی کمی تھی۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ کہ ہم اپنا ہاتھ بھی اس تک نہیں لے جا سکتے۔ اس صدی کی ابتداء سے پہلے نقدی نے دیہاتی بنک میں نہایت ہی محدود کام کیا ہے۔ اور اب اس کا استعمال چپے چپے پر مختلف ہے۔ میرے ساتھیوں میں سے ایک نیک منصف کا اندازہ یہ ہے۔ کہ بڑے شہروں کے گرد و نواح میں اور ان جگہوں میں جہاں دیہات دستکارت بر آمد سے جیساکہ نہری بستیوں میں یا نقل مکانی سے جیساکہ جالندھر میں یا فوجی خدمت سے جیساکہ راولپنڈی میں ۱۱ فیسر بن گئے ہیں۔ گاؤں کا ۷۵ فیصدی لین دین نقدی کی صورت میں ہوتا ہے۔ اور اس کے برعکس خالص علاقوں میں (جہاں ان میں سے کسی کا اثر نہیں پڑا) مثلاً اس علاقے میں جس میں سے ہم اب گذر کر آئے ہیں۔ ۷۵ فیصدی لین دین پیداوار یا خدمت کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ نقدی محض نمک۔ مصالحہ۔ تیل اور کپڑے کی اتفاقیہ خرید کیلئے درکار ہوتی ہے۔ لیکن یہ بھی اکثر تبادلہ سے یا مساوی قیمت کا غلہ دیکر لے لی جاتی ہیں۔ اور کپڑے کی ضرورت عورتوں کی کتائی کے مطابق مختلف ہے۔ شادی یا وقتاً فوقتاً عدالت میں مقدمے کیلئے کافی رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اگر ضرورت سمجھی جائے تو شادی سستے داموں کی جا سکتی ہے۔ اور مقدمے میں مصالحت کی جا سکتی ہے۔ یا اُسے ملتوی کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساہوکار کے مطالبات کا بھی شمار کرنا ہے۔ لیکن ان میں سے بہت سے ان مطالبات کو اپنی عدم استطاعت کا ہاتھ جوڑ کر اظہار کرنے یا مویشی و غلہ دیکر پورا کر رہے ہیں۔ ایک نسل پہلے اس کا لین دین جنس کی صورت میں تھا۔ اور جہاں کہیں نقدی نے اسکی جگہ لے لی ہے۔ قیمتوں کے گر جانے کی وجہ سے پھر اسکی طرف لوٹ جانے کی رغبت پائی جاتی ہے۔

گورنمنٹ کے واجبات

لیکن ایک مطالبہ ایسا ہے۔ جو مستقل ہے۔ سال میں دو مرتبہ یعنی ہر فصل کے موقع پر زمین کا لگان اور نہری علاقے میں پانی کا محصول بھی گورنمنٹ کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور دونوں کا نقدی کی صورت میں ادا کرنا ضروری ہے۔ کل ذیلدار نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے ایک راہگیر کو للکار کر کہا: "مجھے لگان جلد بھیجو"۔ اس نے موسم گرما کی قسط ۱۲-۵ ادا نہیں کی تھی۔

میں نے دریافت کیا کیوں؟

"مردود شیطان کے پاس اسے ادا کرنے کیلئے کچھ نہ تھا۔"

"پھر وہ اسے کس طرح ادا کرے گا؟"

خدا سبب پیدا کر دیگا۔ ہم کیا کر سکتے ہیں؟ اگر ہم ادا نہ کریں تو گورنمنٹ یہ خیال کرے گی۔ کہ ہم گاندھی کے پیرو ہیں۔ لیکن ہم ہیں نہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کہا۔ کہ یہ گاندھی ہی کا قصور ہے۔ کہ اس قدر سستا پن ہے۔ لیکن زمینوں کا لگان ہمیشہ باقاعدگی سے نہ دئے جانے کی وجہ محض اجناس کی ارزانی ہی نہیں ہے۔ میں ایک گاؤں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب کہ میں نے نمبردار کو نائب تحصیلدار کے ساتھ جو میرے ہمراہ تنگ اونچی دیواروں والی گلی میں سے گذر رہا تھا۔ کانا پھوسی کرتے سُنا۔

میں نے دریافت کیا یہ کہتا ہے؟

اس نے کہا وہ مجھے بتا رہا ہے۔ کہ وہ شخص جو زمین کا لگان ادا نہیں کرتا۔ اتفاق سے یہاں موجود ہے۔ اب موقع ہے کہ وصول کیا جائے۔ ہم نے موقع سے فائدہ اُٹھایا۔ اور ایک صحن کی طرف مڑے۔ جہاں ایک ادھیڑ عمر کا شخص سیاہ کوٹ پہنے اور سفید ململ کا رومال نہایت شان سے دونوں کندھوں پر ڈالے بان کی ایک چارپائی پر بیٹھا موسم سرما کے کھلے دن کی صحبت اور فرصت کے وقت کا لطف اُٹھا رہا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ یہ شخص بہت معزز ہے۔

اس پر بھی اس نے مبلغ ۲۵ روپے کی معمولی رقم دینے کیلئے دو ماہ کی ٹال مٹول کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس نے اس کا انتظام کیا ہوا تھا۔ کیونکہ وہ ایک انجن ڈرائیور تھا۔ اور تعطیل کے دن گھر بہت کم ٹھیرتا تھا۔ تحکم کے سامنے وہ مجسم ادب ہوا تھا۔ لیکن اس رقم کو چند دنوں میں ادا کرنے کی آسانی کے متعلق وہ کچھ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ مگر تحصیلدار نے

بالآخر اپنی پھلی کو پکڑ کر اسے خشکی پر لیجانے کا مصمم ارادہ کیا ہوا تھا۔ اور قصوروار انجن ڈرائیور اسکے ساتھ تحصیل میں چلنے پر مجبور ہو گیا۔

زمین کا لگان بذاتِ خود اس قدر گراں نہیں ہے۔ اچھی زمین کے کاشت شدہ ایکڑ کے لئے چند روپے ہیں۔ اور بُری زمین کیلئے چند آنے تمام صوبے کی اوسط لی جائے تو صرف دو روپے فی ایکڑ پڑتے ہیں۔ لیکن جب نہری پانی کی قیمت اضافہ کر دی جاتی ہے۔ تو دس یا بارہ روپے فی ایکڑ دینے پڑتے ہیں۔ کل ہی ایک جاگیردار نے جو مجھے ملا۔ یہ بتایا کہ اسے مبلغ سولہ ہزار روپیہ سالانہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ آخری قسط ادا کرنے کے لئے وہ اپنے گھرانے کے زیورات کو بشرح بارہ فی صدی گروی رکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

ہمارے راستے میں سب جگہ گورنمنٹ کی واجبات ادا کرنے کیلئے زیورات بیچنے اور گروی رکھنے کی داستان برابر جاری رہی..... اور میں نے اسے اتنے اچھے اور مختلف ذرائع سے سُنا ہے۔ کہ میں اس امر میں شبہ نہیں کر سکتا۔ کہ اس میں سے بہت کچھ حقیقت ضرور ہے۔ فروخت کرنے کی نسبت گروی زیادہ رکھے جاتے ہیں۔ اور دراصل بیچتے صرف وہی لوگ ہیں۔ جو تعلیم یافتہ ہیں۔ ایک تلخ مزاج پٹواری نے کہا۔ کہ زمیندار اپنی لڑکیاں فروخت کر دیں گے لیکن زیورات فروخت نہیں کرینگے۔ اس لئے کہ اس کا اکثر حصہ عورتوں کی ملکیت ہوتا ہے۔ اور وہ اسے بیوگی یا جدائی کا سہارا سمجھتے ہوئے اس کے ساتھ چمٹی رہتی ہیں۔ تاہم یہ حقیقت کہ بہت سے لوگوں کو یا تو زیور گروی رکھنا پڑتا ہے۔ یا بیچنا پڑتا ہے۔ اس امر کو ظاہر کرتی ہے۔ کہ گورنمنٹ کو اپنی واجبات میں تخفیف کی ضرورت ہے۔ اس لئے اب یہ خوش خبری مسرت بخش ہے کہ گورنمنٹ نے فیصلہ کیا ہے۔ کہ روئی اور چاولوں کی صورت میں آئندہ مطالبے کا ۲۵ فیصدی اس شرط پر اُٹھا دیا جائے۔ کہ کم سے کم شرح ۸/۷ (سات روپے آٹھ آنے) فی ایکڑ ہو۔ لیکن نو آبادکار کو ایسا کرنا مشکل ہے۔

جب تخفیف کا اعلان کیا گیا۔ تو لوگ یہ کہہ اُٹھے۔ کہ ہمارے پاس کوئی چاول نہیں ہیں۔ گنے کیلئے کیوں کچھ نہیں کیا۔ گورنمنٹ کو شکریے کے لئے نہری آبادی کے کہیں اور سے توقع رکھنی چاہیئے۔ یہاں اس نے اس قدر زیادہ کام کیا ہے۔ کہ اسے یہ کہہ کر ملامت کیا جاتا ہے۔ کہ اس نے سب کچھ نہیں کیا ہے ؟

قیمتوں کی لڑائی اور معیار زندگی

موجودہ چالیس نرالی طرز کے ممبروں میں سے سات خواندہ تھے یہ کل کی تعداد سے کچھ زیادہ ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ تھا۔ کہ فضا خوشگوار تھی۔ اس کے باوجود بھی سوائے آنریری سب انسپکٹر کے اور کسی نے گول میز کانفرنس کے متعلق نہ سنا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ہم صرف اپنے کام کے متعلق جانتے ہیں۔ وہ سوال جس میں وہ واقعی دلچسپی لیتے تھے یہ تھا۔ کہ قیمتوں کی موجودہ رفتار کے ہوتے ہوئے وہ کس طرح کی زندگی بسر کریں۔ میں نے رائے دی کہ صرف یہی طریقہ ہو سکتا ہے کہ خرچ کو کم کر دیا جائے۔ اور یہ کہ اس کے لئے کافی گنجائش ہے۔ کیونکہ کسی نو آبادی میں معمولی خرچ حد سے زیادہ نہیں بڑھی۔ اسکی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ نو آبادکار کو کاشت کرنے کیلئے ۵۶ ایکڑ زمین (دو مربع) دی گئی ہے۔ اور اس نے ان میں سے کچھ جائیداد پیدا کی ہے۔ اور کچھ اس وجہ سے کہ اس ضلع کے جاگیردار ایک ایسا معیار پیش کرتے ہیں۔ جس کی خواہش تو سب کرتے ہیں۔ لیکن خرچ کوئی نہیں اٹھا سکتا۔ کل ہی جب میرے علاقے کے دو ممبر سوار ہو کر مجھے ملنے کے لئے آئے۔ مقامی شخص ایک سفید براق پگڑی پہنے ہوئے تھا جس کے ایک سرے سے اسکے اوپر مور کے نیچے کی دم جیسی جھالر بنائی ہوئی تھی۔ اور دوسرے نے جو اس شخص کا افسر تھا۔ زیادہ کفایت شعار ضلع سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ایک معمولی پگڑی عام طریق سے باندھے ہوئے تھا یہ ایک معمولی بات ہے۔ لیکن سرداروں اور شہدوں کو ایسا سمجھنا اس ضلع کی عام خواہش کو ظاہر کرتا ہے۔ بلحقہ ضلع گجرات کے نو آبادکار کے متعلق یہ خاص طور پر سچ ہے۔ اپنے اصل گاؤں میں وہ دوسرے مالک خود کاشت کی طرح رہتا تھا۔ اور اسکی عورتیں کھاد جمع کرتی تھیں۔ اور اُپلے تھاپتی تھیں۔ لیکن اب چونکہ وہ جنٹلمین بن گیا ہے۔ ضروری ہے کہ اس کی بیوی لیڈی بن گئی ہو۔ وہ اب گیہوں نہیں پیستی۔ اور پانی شاذ و نادر لاتی ہے۔ روئی چھنٹنے میں اگر وہ کوئی حصہ لیتی ہے۔ تو وہ صرف یہ ہے۔ کہ وہ یہ دیکھے کہ مزدوری پر آئی ہوئی لڑکیاں اتنا کام جتنا کہ انہیں کرنا چاہیئے۔ کرتی ہیں یا نہیں؟۔

سیالکوٹ اور گوجرانوالہ کی عورتیں اب بھی دوپہر کا کھانا اپنے آدمیوں کے پاس کھیتوں میں لے جاتی ہیں۔ لیکن یہ کام بیگم صاحبہ کا نہیں ہے۔ اور گجرات کی بہت سی عورتیں ایسا نہیں کرتیں۔ اسلئے انہیں بہت ہی کم کام کرنا پڑتا ہے۔ نہ ہی انہوں نے سوئی کے کام میں

مہارت حاصل کی ہے۔ کہ فرصت کا مفید بن سکے۔ جب ہم ان تمام امور کے متعلق ذکر کر رہے تھے۔ تو کسی نے کہا کہ عورتوں کو تمام دن کام کرنا چاہیئے۔ کیونکہ بیکار عورت سے زیادہ بری طرح کوئی نہیں جھگڑتا۔

لیکن نو آباد کار کو اس قدر سیراب شدہ نئی زمین کاشت کے لئے دینے کا نمایاں اثر اس خرچ سے ظاہر تھا۔ جو اس نے معاشرتی رسوم پر کیا تھا۔ جن اعداد وشمار کا آج ذکر کیا گیا۔ وہ نہایت چونکا دینے والے تھے۔ دو گوجروں نے کہا۔ کہ پانچ سال گذرے جب ہم نے اپنے بچوں کی شادیاں کیں۔ ایک پر پانچ ہزار روپیہ صرف کیا۔ ساتھ ہی انجمن امداد باہمی کے ایک آنریری سب انسپکٹر نے جو یہیں رہتا ہے۔ یہ کہا کہ حال ہی میں یہ بات بالکل عام تھی۔ کہ ختنہ کے موقع پر الف ۱۰۰۰ روپے خرچ کئے جاتے تھے۔ ختنہ اس وقت ایک طرح کی شادی ہوتی تھی۔ تمام خویش واقارب کو دعوت دی جاتی تھی۔ اور گاؤں میں ہر ایک گھر کے لئے چھ پونڈ (تین سیر) گڑ دیا جاتا تھا۔ اور چار یا پانچ سو روپیہ گاؤں کے کمیوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ اور وقتاً فوقتاً اس شادمانی کا خاتمہ ناچ کی محفل یا آتشبازی پر کیا جاتا تھا۔ اگر اس کے بتائے ہوئے اعداد کا نصف بھی کر لیا جائے۔ تو بھی یہ رقم ۵۶۔ ایکڑ والے کسانوں کیلئے بے جا طور پر زیادہ ہے۔ انجمن اصلاح رسوم اور اس سے زیادہ قیمتوں کے گر جانے نے یہ سب کچھ بدل دیا ہے۔ اور اب ختنہ پر ۵۰ سے زیادہ خرچ نہیں آتا۔ سب سے زیادہ گھاٹے میں گاؤں کے کمی ہیں۔ کیونکہ وہ اس عام خوشی میں جو ان تماشوں میں پائی جاتی تھی۔ فراخ حوصلگی سے حصہ لیتے تھے۔ لیکن انہوں نے انقلاب کا فلسفیانہ پہلو نکالا ہے۔ اور اپنے لئے ایک نیا سلسلہ پیدا کر لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے اخراجات بہت زیادہ تھے۔ ہم نے وہی کچھ کیا۔ جو زمینداروں نے کیا۔

امداد باہمی کی کانفرنسیں

دوپہر کے بعد کا وقت امداد باہمی کی سالانہ کانفرنس میں صرف ہو گیا۔ تمام صوبے میں سال میں ایک مرتبہ محکمہ امداد باہمی تمام پڑوسیوں کو آرام دہ مرکزوں پر جمع کرتا ہے۔ تاکہ وہ اپنے اقتصادی ور معاشرتی مسائل اور اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے مسائل اور اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے اسباب پر غور کریں۔ اس کانفرنس میں شریک ہونے والوں کا علاقہ کبھی تحصیل سے بڑا نہیں ہوتا۔ اور صرف اتنا وسیع ہوتا ہے۔ کہ آدمی گھوڑے کی پیٹھ پر ایک دن میں آجا سکتا ہے۔ (جیسا کہ آج ہوا ہے)

عام طور پر علاقہ جسقدر چھوٹا ہوتا ہے۔کارروائی اسی قدر دلچسپ ہوتی ہے۔دوسرے فائدہ رساں محکموں کے نمائندے اپنے مشاغل کی تفصیل بیان کرنے کیلئے جمع ہوتے ہیں۔اور اگر وہ سمجھ بوجھ والے ہوتے ہیں۔تو یہ بھی سیکھ لیتے ہیں۔کہ ان ستعدیوں کا کہاں بُرا استعمال ہو رہا ہے۔یا وہ کہاں غیر موزوں ہیں۔ہو سکتا ہے۔کہ ایگریکلچرل اسسٹنٹ کسی نئی قسم کی گیہوں یا جنگلر کی خوبیاں بیان کرے۔انسپکٹر محکمہ ویٹرنری مویشیوں کو ٹیکہ لگوانے اور ناتراشیدہ بیلوں کو اختہ کرانے کے فوائد پر روشنی ڈالے۔ضلع کے سکولوں کا افسر بچوں کو تعلیم یافتہ ہونے تک سکول میں رکھنے کی ضرورت ظاہر کرے۔اور شاید ہیلتھ آفیسر یہ بتائے کہ مسہریوں کی مدد سے ملیریا بخار کو کس طرح دور رکھ سکتے ہیں۔یہ ہیں وہ اسباق جو دیہاتی کے لئے سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔لیکن تاوقتیکہ وہ اسکی اپنی بولی میں اسکی عقل کے مطابق مسالہ لگا کر اور اسکی روزانہ زندگی کی مثالوں سے تشریح کر کے نہ پڑھائے جائیں۔وہ انہیں نہیں سمجھ سکتا یا ان کی طرف سے غفلت برتتا ہے۔آج شام ہماری کانفرنس نے بتایا۔کہ اس سلسلے میں کتنا کچھ کیا جا سکتا ہے۔اور اپنے موجودہ آلات و سامان سے ایسا کرنا کتنا مشکل ہے؟۔

کھلے میدان میں ایک جلسہ

سامان سے مراد تقریباً ۲۰۰ دیہاتی تھے۔جو خاص طور پر جنگی تھے۔اور تقریباً سب ان پڑھ تھے۔ اور بہت سے ایسے تھے۔جو انجمن امداد باہمی کے ممبر بھی نہ تھے۔یہ لوگ دریائی علاقے کے ابتدائی حصے میں رہتے تھے۔اور نئی روشنی کی کوئی جھلک ان پر نہ پڑی تھی۔بلکہ صدیوں کی گرمی اسلام اور کئی نسلوں کی قومی زندگی نے ان کے دھوپ سے جھلسے ہوئے سُرخ چہروں پر ایک خاص قسم کے چال چلن کی مہر لگائی ہوئی تھی۔گھوڑوں سے اُنس رکھنے کی وجہ سے پکے شکاری تھے۔اس کے باوجود ان کی چمکدار پیاری زلفوں سے جو نہایت موہنے انداز سے ان کے کانوں کے گرد بل کھائے ہوئے تھیں۔ان کی نسوانی نزاکت دلربایانہ طور پر ظاہر تھی۔ہم میں سے چند آدمی محراب نما طاق پر لگائی ہوئی کرسیوں پر کڑا دل کئے ہوئے بیٹھے تھے۔لیکن اکثر لوگ نہری ریسٹ ہاؤس کے سامنے گھاس والے میدان میں آلتی پالتی مارے گھٹنے سے گھٹنا ملائے آرام سے دھوپ میں بیٹھے تھے۔دو غیر سرکاری افسروں نے شادیوں اور دوسری باتوں کے اخراجات کو کم کرنے کے متعلق فرسودہ تقریریں کیں۔دوسرے نے تو تقریر کو اس قدر طول دیا۔کہ اسکی قدرتی آواز سے زیادہ تیز چیختی ہوئی آواز کے باوجود ہم میں سے

بعض سر ہلانے اور دوسروں سے باتیں کرنے سے نہ رُک سکے۔
وہ بات جو حاضرین کیلئے واقعی باعث دلچسپی تھی۔ گورنمنٹ کے واجبات کا سوال تھا۔ ایک مضبوط اور اچھی طرح تراشی ہوئی داڑھی والے زمیندار نے بتایا۔ کہ میں اب ۶۵ برس کا ہوں۔ اور میں نے نہر سے پہلے اور بعد کے دونوں زمانے دیکھے ہیں۔ نہر سے پہلے کے دن اچھے تھے ہماری آمدنی کم تھی۔ لیکن ہماری ضروریات مختصر تھیں۔ اور زندگی سادہ۔ ہم باجرہ کھاتے تھے۔ (اور یہی اچھا لگتا تھا) اور دودھ پیتے تھے۔ ہم صرف چند کپڑے پہنتے تھے۔ اور پیدل چلتے تھے۔ قرض کم تھا۔ اور زمین بہت اور لگان معمولی تھا۔ اب ہم لاریوں میں جاتے ہیں۔ اور احمقانہ طور پر خرچ کرتے ہیں۔ زمین پرانی ہے اور فصل کم دیتی ہے۔ اور لگان بہت بڑھ گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے پاس زمین بھی بہت کم ہے۔ چند ایکڑ زمین لیکر انسان کیا کرسکتا ہے"۔ وہ تو خوشی کے نعروں میں بیٹھ گیا اور دوسروں نے اس پر چہ میگوئیاں شروع کردیں۔ جذبات بہت تیز تھے۔ روئی دیہاں کی بڑی پیداوار ہے، کے لگان میں کمی کا اعلان کرنیسے اس میں صرف کسی قدر کمی واقع ہوئی۔ ہر ایک کا مطالبہ یہ تھا۔ کہ گورنمنٹ کی واجبات میں بہت زیادہ کمی ہونی چاہیئے۔ لیکن اس کے نتائج کے متعلق کسی نے اپنی رائے کا اظہار نہ کیا۔ بعد میں جب اُن سے یہ دریافت کیا گیا۔ کہ روپیہ کی قیمت میں اضافہ ہونے اور نتیجۃً ادائیگی میں مشکلات پیدا ہونے کی وجہ سے ان کی انجمنیں کیوں نہ قرضوں میں تخفیف کردیں۔ آوازوں میں گڑبڑ پیدا ہوگئی۔ اب ہمیں روپیہ کی اتنی ضرورت ہے۔ کہ پہلے کبھی نہ تھی۔ ساہوکار ہمیں قرضہ نہ دیگا۔ ہم زمین کا لگان کس طرح سے ادا کرینگے۔ جیسا کہ ایک اٹلی کے مصنف بیان ہے کہ دیہاتی ضمیر ابھی تک بیدار نہیں کیگئی۔ اور ان میں دیہاتی اقتصادیات کا وہ ابتدائی سا علم بھی نہیں ہے۔ جو اب وسطی پنجاب کے سمجھدار ممبران امداد باہمی میں پایا جاتا ہے۔ تاہم بکھرے ہوئے بیج کا کچھ حصہ اچھی زمین پر پڑا۔ اور جلسے کے اختتام پر بہت سے لوگوں نے انسپکٹر کو کہا کہ آپ ہماری شادیوں کے موقعوں پر آئیں۔ اور ہمیں اخراجات کے کم کرنے میں مدد دیں۔ اس موقع پر ایک فوٹو گرافر کے دکھلائی دینے سے جسے سرگودھا سے بلایا گیا تھا۔ ہمارے خیالات اقتصادیات کے بجائے اس کے بڑے دشمن یعنی خودبینی کی طرف پھر گئے۔ اور چونکہ بے جا فخر ہی دنیا کو ایک رستہ میں جکڑتا...... ہے۔ سرپل مزاج کو خاموش ہوجانا چاہیئے۔

۱۷ دسمبر۔ چوکیرا سے سرگودھا۔ (۱۰ میل)
سپاہی بہ حیثیت کسان

ہم نے دو گھنٹوں سے زیادہ ایک ایسے گاؤں میں صرف کئے۔ جیسے راولپنڈی اور جہلم کے راجپوتوں اور گوجرانوالہ کے جٹی قوم کے لوگوں نے آباد کیا تھا۔ سات مستعفی سپاہی موجود تھے۔ اگرچہ وہ زمین جس پر وہ اس گاؤں میں موجود تھے۔ اگرچہ وہ زمین جس پہ وہ اس گاؤں میں قابض تھے۔ گورنمنٹ نے ان کی خدمات کے صلے میں انہیں دی ہوئی تھی۔ پھر بھی ان میں فوجی ملازمت کے متعلق سرگرمی نہ تھی۔ انہوں نے کہا۔ کہ اب کام پہلے سے زیادہ بھاری ہے۔ اور قواعد بہت اور کھدائی زیادہ کرائی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ کہ جب چیزوں کے نرخ گر گئے ہیں۔ گذارہ مشکل ہو گیا ہے۔ اوسطاً چار آنے خرچ کئے جاتے ہیں۔ ایک ایک آنہ صبح و شام دودھ کیلئے دو پیسے نائی۔ صابن اور دھوبی کے لئے اور باقی نصف آنہ لوٹوں اور بٹنوں کی پالش وغیرہ کے لئے۔ اور ایک آنہ کپڑوں کے لئے۔

اب نرخ گر جانے کے باوجود ہر اس شخص سے ملنا جو اسے پسند کرتا ہو۔ ان کے لئے موجب فرحت ہے) ملازمت کا معقول معاوضہ دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا عرصہ بہت کم ہے۔ صرف پانچ سال۔ جس کے بعد کام ملنا مشکل ہے۔ یہ شکایت عام ہے۔ اور دوسری پر کچھ زیادہ سنجیدگی سے غور کرنیکی ضرورت نہیں۔ کیونکہ سپاھی کے گھرانے کی خوشحالی پنجاب کی سرزمین کا سب سے نمایاں پہلو ہے۔ میں نے دریافت کیا "کیا سپاہی ملازمت چھوڑنے کے بعد اچھا کاشتکار ثابت ہوتا ہے۔ گوجرانوالہ کے ایک مضبوط کسان نے پرزور الفاظ میں کہا۔ "نہیں"۔ وہ کام پر جاتے ہوئے روتا ہے۔ ہم رات دن کام کرتے ہیں۔ اور ہمارا سارا کنبہ کام کرتا ہے۔ لیکن وہ اپنی زمین بٹائی پر دیدیتا ہے۔ وہ فوج میں جنٹلمین بن جاتا ہے۔ عمدہ کپڑے پہنتا ہے۔ اور پگڑی پر طرہ رکھتا ہے۔ ایک سپاہی نے ایسی شرمیلی آواز سے جو شاید سپاہی کے درجے سے گری ہوئی تھی۔ کہا کہ "میں کم از کم اتنا ہی اچھا ہوں۔ جتنے کہ اور زمیندار"۔ اس نے جواب دیا۔ پھر میرے مقابلے میں ہل چلاؤ۔ کونسا سپاہی ہے جو ہماری طرح روزے رکھ سکتا ہے۔ ہمارے پاس صرف دو مربعے ہیں۔ لیکن سپاہیوں کو تین تین ملے ہیں۔ یہ بات کہ فوج سپاہی کو فضول خرچ بنا دیتی ہے۔ بحث میں آگئی۔ لیکن بحث کے بعد سب اس امر پر متفق ہو گئے۔ کہ وہ روپیہ کو بہتر

طریق پر خرچ کرنا جانتا ہے۔ اور کسان سے زیادہ کفایت شعار ہے۔ لیکن وہ اپنی اور ہل سے کم کام کرتا ہے۔ سات موجودہ سپاہیوں میں سے دو اپنی زمین کو خود کاشت کرتے تھے۔ اور گاؤں کے ۱۴ سپاہیوں میں سے صرف ایک کے پاس موجودہ قسم کا زیادہ اچھا ہل تھا۔ دمیسٹن اس کے مقابلے میں بینک کے پانچ ممبروں میں سے ہر ایک کے پاس وہ دو ہیں۔ اور چار کے پاس ولائیتی سراوبن بھی ہیں۔

سیم زدگی

چلتے چلتے ہم پہاڑیوں کے ایک چھوٹے غیر آباد سلسلے کے سامنے جا پہنچے جسے کنارا کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ ہمالیہ سے بھی زیادہ قدیم معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی خشک اور دندانہ دار شکستہ چوٹیاں زرخیز میدان کی طرف متنبہ کردینے والی انگلی سے اشارہ کرتی ہیں۔ اس انتباہ کی ضرورت ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ہم نے گذشتہ ہفتے دیکھا۔ نہریں آخرکار زمین کو مردہ کرنے کا سبب بن سکتی ہیں تیس سال گذرے۔ اس علاقے میں پانی سطح زمین سے ۵۰ سے لیکر ۶۰ فٹ تک تھا۔ اب صرف دس سے تیس فٹ تک ہے۔ اور اب بھی اوپر اٹھ رہا ہے۔ قریب ہی پھالیہ واقع گجرات کی نوآبادی میں اب بھی دس دن کے اندر اندر یہ چالیس فٹ اوپر اٹھ آیا ہے۔ ۹۶ فٹ سے گر کر ۲۵ فٹ تک پہنچ گیا۔ دونوں نوآبادیوں کے بہت سے گاؤں سے یہ شکایت سنی جاتی ہے کہ زمین آہستہ آہستہ ناقابل کاشت بنتی جاتی ہے۔ اور محض پھالیہ ہی میں ۲۵۰۰۰ ایکڑ زمین دلدل بن گئی ہے۔ حالات ایسے نازک ہیں۔ کہ گورنمنٹ نے زائد پانی خارج کرنے کیلئے بے شمار نالے بنائے ہیں۔ ان میں سے ایک ۱۷ فٹ لمبا اور دس سے بارہ فٹ تک چوڑا ہے۔ کئی ہزار ایکڑ زمین لوگوں نے واپس لے لی ہے۔ لیکن زمین اب ایسی سخت ہے۔ جیسا کہ لوہا۔ اور اُسے دوبارہ قابل کاشت بنانے کیلئے مضبوط ہوں۔ اور اچھے بیلوں کی ضرورت ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی مستحکم ارادوں والے ایسے کاشتکار درکار ہیں۔ جن کے پاس دونوں چیزیں خریدنے کے لئے کافی روپیہ ہو۔

وہ کھتری جو باوجود غیر کاشتکار ہونے کے اس زمین کا ایک حصہ نہایت کامیابی سے کاشت کر رہا ہے۔ اس بات کو ظاہر کرتا ہے۔ کہ جہاں یہ شرائط پوری ہوں۔ اچھی فصلیں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس نے اس میں گنے بھی بوئے ہیں۔ جب ہم اس کے گھر کے

صحن میں داخل ہُوا۔ تو ہوا میں گُڑ کی بھینی بھینی اشتہا خیز خوشبو موجود تھی۔ جو اُبلتے ہوئے رس کی بھاپ سے پیدا ہو رہی تھی۔ رس گنّوں کے چھلکوں سے آگ سے جو اس کے نیچے جل رہی تھی اُبل رہا تھا۔ اور اس میں ایک مصلّی ایندھن ڈال رہا تھا۔ ایک بوڑھا کسان آرام سے اسکے ایک طرف بیٹھا ایک کم گہرے کڑاہے میں پڑے ہوئے رس کو لکڑی ڈنڈے سے آہستہ آہستہ ہلا رہا تھا۔

کسان اور مصلّی دونوں کو ۲/۱ ۸ پونڈ (ایک من سوا سیر) تیار شدہ گُڑ میں سے ڈیڑھ سیر ملتا تھا۔ یہاں نقدی کی کوئی ضرورت ہے۔ ان کے پہلو میں ایک اُن سے بھی زیادہ مسکین شخص بیٹھا دھوپ میں حقّہ پی رہا تھا۔ میں نے پوچھا کہ تو کیا کام کرتا ہے؟ کھتری نے جواب دیا۔ کہ یہ گرمیوں میں میرا پنکھا کھینچتا ہے۔ اور سردیوں میں یہاں بیٹھتا ہے۔

ہندوستان میں غربت کے معاوضے ضرور ہیں۔ لیکن انہیں حاصل کرنے کیلئے شہر میں نہ بسنا چاہیئے۔ میں نے اس کھتری سے جو کسی وقت راولپنڈی میں تجارت کرتا تھا۔ یہ دریافت کیا۔ کہ تم دونوں میں سے کس کو ترجیح دیتے ہو؟ اس نے بلا تردید جواب دیا۔ اگرچہ اب میں صرف چند سو روپیہ کماتا ہوں۔ لیکن مجھے دیہات پسند ہیں۔ یہاں تندرستی بھی ہے۔ اور اطمینان بھی۔

۱۹ دسمبر۔ سرگودھا سے بھلوال (۲۰ میل)

ایک ترقی کرنے والا زمیندار

اس علاقے کے زمیندار کے متعلق آگاہ ہوئے بغیر اس علاقے میں سے گذرنا بالکل ناممکن ہے۔ خاص طور پر ٹوانہ اور نون دو بڑے گھرانوں کے متعلق جن میں صوبے بھر کے بہترین اور نہایت ہی ترقی یافتہ زمیندار شامل ہیں۔ ان کی آبائی غیر مشروط جاگیریں ہمارے راستے سے پرے ضلع کے اس حصّے میں واقع ہیں۔ جہاں نو آبادی نہیں ہے۔ لیکن ان کی اپنی جاگیریں نو آبادی میں ہیں۔ جہاں وہ فوج کے لئے گھوڑوں کی نسل بڑھاتے ہیں۔ اور یہ کام وہ اتنی اچھی طرح سے کرتے ہیں۔ کہ دوسرے لوگ نہیں کرتے۔ کیونکہ وسطی پنجاب کے نو آباد کسانوں کے برعکس مغربی حدود پر رہنے والا ٹوانہ پیدائشی سوار ہے۔ اور ابتدائے شباب ہی سے سواری اور نیزہ بازی کرنے کا عادی ہے۔ ان کا ایک گاؤں سرگودھا اور

بھلوال کے درمیان واقع ہے۔ اور اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ایک جوان تعلیم یافتہ زمیندار اگر وہ مقروض نہ ہو۔ اور اُسے روپیہ مل سکتا ہو۔ تو اپنی زمین کو ترقی دینے کے لئے کیا کچھ کر سکتا ہے ملک کو بڑی فوقیت حاصل ہے۔ کہ تمام کا تمام گاؤں اس کے گھرانے کا ہے۔ اور اسکی بات قانون سمجھی جاتی ہے۔ اس نے پانی کے راستے کو چھوٹی چھوٹی نالیوں میں تقسیم کیا ہوا ہے۔ اور وہ اس کے کھیتوں کو جن میں دو ہزار آم کے پودے لگے ہوئے ہیں۔ آبپاشیں طاتی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ دیر کے پودے جنہیں چھ یا سات برس گذرے بویا گیا تھا۔ پھل دیتے ہیں۔ ان کا درمیانی فاصلہ بیس بیس فٹ ہے۔ متعلقہ مزارعین انہیں پانی دیتے اور حفاظت کرتے ہیں۔ اور انہیں پیداوار کا ۳/۵ حصہ دیا جاتا ہے۔ اس لئے اس تجربے میں طرفین دلچسپی لیتے ہیں۔ اس کے باوجود اتفاقیہ نقصانات بہت ہوتے ہیں پودوں کا ½ حصہ کھیت ہی میں ضائع ہو جاتا ہے۔ اور اس سے کہیں زیادہ ذخیرے میں ملک نے یہی تجربہ دریائے جہلم کے قریب ایک گاؤں میں کر کے دیکھا۔ لیکن سیلاب آیا اور زمین میں پانی کی سطح بلند ہو گئی۔ اور نئے پودے جڑ سے اُکھڑ گئے۔ اور مرجھا گئے۔ ایسے تجربے صرف ایک زمیندار ہی کر سکتا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ اور ایسے تجربے کئے جائیں۔ لیکن اگر زمیندار قرض میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اور مقروض جاگیردار ایک ایسے رہٹ کی مانند ہے جسکی ٹینڈیں ٹوٹی ہوئی ہوں۔ پہیہ گھومتا رہتا ہے۔ اور ٹینڈیں اوپر نیچے جاتی رہتی ہیں۔ لیکن پانی وہ ٹپک جاتی ہیں۔ یا خالی اوپر آتی ہیں۔ اور کنوئیں کے چاروں طرف کی زمین اصلی پیداوار کا صرف نصف دیتی ہے۔ اس نو آبادی کی ظاہری حالت لائل پور کی نسبت کم ترقی یافتہ نظر آنیکی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ لائل پور میں سنگترے کے درخت دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اور چھوٹے چھوٹے باغات عام ہیں۔ لیکن یہاں سفر کرتے ہوئے ایک بھی مشکل سے نظر آتا ہے۔ آدمی کی آدمی سے اور گھرانے کی گھرانے سے سبقت لے جانے کی دیوانہ وار خواہش کی وجہ سے نو آبادکار نے پڑوس کے زمینداروں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے باغوں کو سنگتروں سے سجانے کی بجائے اپنی بیویوں اور لڑکیوں کو زیور سے آراستہ کرنے کو ترجیح دی دی ہے ؛

سفر

اگر کوئی کھلے میدان کی پوری پوری خوبصورتی سے حظ اُٹھانا چاہیئے۔ تو اسے پالو

صبح سویرے یا مغرب کے وقت سواری کرنی چاہیئے۔ کیونکہ یہی وقت ہے جب خالی فضا میں رنگوں سے جان پڑ جاتی ہے۔ صبح کے وقت قرمزی رنگ سے جو عنبری میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور شام کو پیلے رنگ سے جو قرمزی سے بدل جاتا ہے۔ اور دونوں سے نوشگفتہ پھول جیسا لطف آتا ہے۔ آج مجھے گھوڑے پر چلتے چلتے دیر ہو گئی تھی۔ میں ایک نیشکر کے کھیت کے قریب پہنچا۔ جہاں نصف درجن صورتیں سفید لباس میں ملبوس گنے چھیل رہے تھے۔ اور قرمزی آسمان ان کی پشت پر تھا۔ میں ٹھہر گیا۔ اور انہوں نے فوراً ہی ایک کڑاہا کھولا۔ اور میرے پاس ایک مٹھی بھر گرم گرم گڑ لائے۔ جو گھوڑے اور دیہاتی کا من بھاتا کھاجا ہے۔ جس اطمینان بھری خوشی سے میں گھوڑے پر سوار ہو کر یہاں آیا تھا۔ ہوا اس سے گونج رہی تھی انہوں نے کہا کہ ہم سلطنت کی تابعداری کر سکتے ہیں۔ آپ کو ہماری حالت کا پتہ لگ جائیگا۔ ہم آپ سے بات چیت کر سکتے ہیں۔ ہم نے سُنا تھا کہ آپ کسانوں کے متعلق معلومات بہم پہنچا رہے ہیں۔ اگرچہ قریب قریب اندھیرا ہو چکا تھا۔ لیکن ذرا آگے کسانوں کی ایک قطار نہایت صبر سے میرے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ان کے نمائندے نے کہا۔ آپ کا قدم ہمارے لئے باعث برکت ہے۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کا شخص تھا۔ جس کی آنکھیں چمکدار اور داڑھی اتنی سُرخ تھی۔ جتنا کہ غروب آفتاب کا رنگ۔

میں نے پوچھا "تم کیوں انتظار کر رہے ہو؟"

انہوں نے کہا ہمیں شکایتیں ہیں۔ ہمارا گاؤں دلدلی زمین بن گیا ہے۔ ہمارے گھر تک بھی گر رہے ہیں۔ ہماری چار سو بیگھے زمین جاتی رہی ہے۔ (۲۰۰ ایکڑ) نہر نے ہمارے ساتھ برائی کی ہے۔ ہمیں اور کہیں زمین ملنی چاہیئے۔

۲۰ دسمبر بھلوال

بھلوال کی چھوٹی منڈی ٹھہرنے کے لئے اچھی خوشگوار جگہ ہے۔ یہاں ایک وسیع نیا مکان ہے۔ اور اس کے گرد گلاب کے پھولوں اور سنگترے کے درختوں سے بھرا ہوا ایک ذخیرہ ہے آخرالذکر کو معہ آپ کے شفق آلودہ پھلوں اور گہرے سبز پتوں کو دیکھ کر ہیسپرائڈ (Hesperides) کی کہانیوں کی دلفریبی ہلکی ہلکی یاد آتی تھی۔ شام کو منڈی کے نواح میں دو دیہاتی بنکوں کا معائنہ کیا۔ جن میں ایک زمینداروں اور مزارعوں کا تھا۔ اور دوسرا گاؤں کے ملازموں کا۔ ایک زمیندار جس نے

دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا ہے۔ موخرالذکر سوسائٹی کا آنریری سیکرٹری ہے۔ اگر زمیندار اکثر اسی قسم کے کام کریں تو ان کے میٹریکولیٹ ہونے کے متعلق بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

منڈی کا اثر

چالیس سے زیادہ کسان حاضر تھے۔ اور سب کے سب اس چھوٹے کھلے صحن میں جہاں ہم اجلاس کر رہے تھے۔ زمین پر بیٹھے تھے۔ زمیندارہ بنک کے پچیس ممبر جہلم کے وڑائچ جاٹوں سے تھے۔ تقسیم ناکردہ منافع اور سرمایہ محفوظ سمیت انیس سال میں اُنہوں نے آٹھ ہزار روپیہ جمع کیا ہے۔ لیکن
ان کے متعلق دلچسپ بات یہ تھی۔ کہ ان کی زندگی پر ایک چھوٹی لیکن بارونق منڈی نے اچھا اثر ڈالا تھا۔ مثال کے طور پر یہ کہ کل انہوں نے اپنی روئی (۶۰۰ من) مشترکہ طور پر زمینداروں کی تجارتی کمپنی کے پاس فروخت کی تھی۔ اور اس طرح اپنے آپ کو کمیشن ایجنٹ اور منڈی کے تکلیف دہ معمولی معمولی واجبات سے بچا لیا تھا۔ اور وہ گذشتہ چار سال سے روئی اس طرح فروخت کر رہے تھے (لیکن گیہوں نہیں) مزید براں یہ کہ اُن دوسرے دیہاتیوں کے برعکس جن میں سے ہم اس ماہ ملے۔ ان کے پاس بے شمار ترقی یافتہ آلات ہیں۔ حاضرین میں سے ۱۲ کے پاس میسٹن ہل ہیں۔ اور بہتوں کے پاس فصل خریف میں کیاریاں بنانے کی مشینیں ہیں۔ اور ایک کے پاس تانگہ بھی ہیں۔ بہتر قسم کا بیج مثلاً گیہوں کے لئے پنجاب ۸۔ الف اور گنے کیلئے کوئمبٹور ۲۲۳ محکمہ زراعت سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اور گذشتہ چار سال میں دو ارائیں مزارعین کے سکھانے سے ایک درجن ممبروں نے سبزیاں کاشت کرنی سیکھ لی ہیں۔ لیکن اب انکی قیمت اس قدر کم وصول ہوتی ہے۔ کہ وہ اسے چھوڑ دینے کے متعلق غور کر رہے ہیں۔ اُنہوں نے پھول گوبھی سے لدی ہوئی ایک گاڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "وہ دیکھو اس کی قیمت پانچ یا ۱۲ روپے وصول ہوتی ہے"۔ اور گذشتہ سال گوبھی کا ہر پھول دو دو پیسے لگا تھا۔ سبزیاں اور پونڈے (وہ گنے جو ہر چوسنے والے کو بہت پسند ہیں) کاشت کرنے کی وجہ سے انہوں نے کھاد کو نئی روشنی میں دیکھا ہے۔ اُپلے ہر ایک گھر میں استعمال کئے جاتے تھے۔ اور ضلع کے اکثر حصے میں اب تک یہی حال ہے۔ لیکن آج سات آدمیوں نے یہ کہا۔ کہ ہم نے اس کا استعمال قریب قریب بالکل چھوڑ دیا ہے۔ اور وہ اسکی بجائے کپاس کی چھڑیاں وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔

نڈی کا کوڑا اکرکٹ خریدنے کیلئے نو ممبروں نے شرکت کر لی ہے۔ پونڈے بونے سے پہلے یہ
رف دس روپے میں بکتا تھا۔ لیکن ۶ سال گذرے۔ جب قیمتیں زیادہ سے زیادہ چڑھی ہوئی
میں۔ تو اس کی قیمت ۱۲۰۰ روپیہ پڑتی تھی۔ اب بھی اس سے ۷۰۰ روپے حاصل ہو جاتے ہیں
نئے خریداروں میں اسکی تقسیم بذات خود سادگی ہے۔ ہر ایک اسے ایک ماہ کے لئے لیتا ہے
ورنہ طاق مہینوں میں یہ ان شخصوں کو ملتا ہے۔ جو زیادہ قیمت دیتے ہیں۔

کانگرس اور گول میز کانفرنس

ایک ممبر نے کہا۔ کہ زمیندار اس وقت تک نہیں بچ سکتے۔ جبتک خدا انہیں نہ بچائے۔ جب
ہم اس بات پر غور کر رہے تھے۔ کہ ان کی حالت کس طرح بہتر بنائی جا سکتی ہے۔ تو اس نے تلخی سے
کہا۔ گورنمنٹ نے اپنا روپیہ کھینچ لیا ہے۔ اور ہماری پیداوار کو کوئی نہیں لیتا۔ کانگرس نے تجارت
بند کر دی ہے۔ اور گورنمنٹ نے اسے سزا دینے کیلئے ایسا کر دیا ہے۔ یہ تشریح ابھی خام سیاست ہے۔
لیکن عام طور پر پھیلی ہوئی ہے۔ فی الحال کانگرلیس یا کانگریس یا نگریس جیسا کہ بہت سے لوگ اسے
حقارتاً کہتے ہیں۔ مسلمان دیہاتیوں کے لئے مکروہ شے ہے۔ دیہاتی اقتصادیات پر کانگرس کی
بائیکاٹ کی پالیسی سے جو زہر آلودہ اثرات پڑے ہیں۔ ان کے متعلق بہت سی بے غرضانہ و غیر
جانبدارانہ تنقیدیں سن رہا ہوں۔ بعض اصحاب کو خوش کرنے کے لئے ایسا کہتے ہیں۔ لیکن ایک ملک
میں چھبیس سال ملازمت کرنے پر کان اس امر سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ کہ زبان سے کہی ہوئی اور
دل سے کہی ہوئی بات میں فرق معلوم کر سکیں۔ یہ بھی ضروری نہیں۔ کہ جو کچھ دل سے کہا جائے۔
ٹھیک ہی ہو۔ افسوس انسانی دل کیسا واقع ہؤا ہے۔ نہیں۔ بلاشبہ یہاں ایسی ہی صورت تھی۔
اگرچہ سول نافرمانی اقتصادی حالات پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہی۔ لیکن دنیا میں کاروباری کسادبازاری پر اس کا
اثر کچھ معنی نہیں رکھتا۔ اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ یہ بات بنائی گئی تھی۔ اور اس پر یقین کیا گیا تھا۔
اور یہ کہ منڈی کے قریب کی وجہ سے آج ہم معمول کی نسبت زیادہ سمجھدار لوگوں کے مجمع میں تھے۔
پچیس ممبروں میں سے آٹھ تعلیم یافتہ تھے۔ تین نے مڈل کے درجے تک تعلیم پائی تھی۔ اور
ایک کالج میں پڑھتا ہے۔ اس پر بھی چالیس حاضرین میں سے صرف تین لیسے تھے۔ جنہوں
نے گول میز کانفرنس کے متعلق صرف سنا ہؤا تھا۔ دسویں جماعت پاس سیکرٹری صرف اتنا
جانتا تھا کہ انگلینڈ میں ایک کانفرنس ہو رہی ہے۔ اور یہ کہ اُسے ملک کا مفاد مقصود ہے۔

دوسرے نے یہ تنقید کی۔ کہ بڑے بڑے آدمی وہاں اپنے فائدے کے لئے گئے ہیں۔ ہم بیچاروں کیلئے مصیبت ہی مصیبت ہے۔ صرف زمیندارہ بنک کا سیکرٹری اس امر کے متعلق کچھ نہ کچھ جانتا تھا۔ کہ کانفرنس کس چیز کے متعلق ہو رہی ہے۔ اس نے کہا کہ بعض یہ کہتے ہیں۔ کہ ہندوستان اپنے معاملات کا انتظام خود کرے۔ دوسرے کہتے ہیں یہ ناممکن ہے۔ وہ اس پر بحث کرنے کے لئے جلسہ کر رہے ہیں۔

انتخابات

گاؤں میں جہالت عام ہے۔ اور یہ اس لئے ہے۔ کہ بہت کم لوگ اخبار پڑھتے ہیں مثال کے طور پر اس گاؤں میں صرف دو شخص ایسے ہیں۔ اس سے پہلے ضلع میں میرے ملاقاتیوں میں سے ایک نے بتایا۔ کہ یہ غریب کانفرنس کیا جانیں۔ انہیں تو پیٹ بھرنے کے سوا اور کوئی خیال ہی نہیں ہے۔ ایک تعلیم یافتہ زمیندار کا جو حال ہی میں میرے ساتھ تھا۔ خیال ہے۔ کہ کسان کی یہ بڑی عقلمندی ہے۔ جو وہ سیاسیات میں دلچسپی نہیں لیتا۔ کیونکہ اس صورت میں وہ کام کم کریگا۔ اور جھگڑا لیگا زیادہ۔ اس نے بتایا کہ صوبجاتی کونسل کیلئے گذشتہ ستمبر کے انتخاب میں سب نے اپنی قوم کے مطابق رائے دی۔ اور صرف وہی لوگ مقام رائے دہندگی تک پہنچے۔ جنہیں لاریوں پر بٹھا کر لے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک جگہ (اس ضلع میں نہیں) دو امیدواروں نے قرعہ ڈال لیا۔ اور قرعہ ایک ایسے شخص کے نام پڑا۔ جس نے اپنے والد کی جائیداد اوباشی کی زندگی میں اُڑا دی تھی۔ حال ہی میں میں نے بہت سے کسانوں سے پوچھا۔ کیا تم نے اس انتخاب میں رائے دی تھی۔ ان کا جواب بہت عجیب تھا " ذیلدار نے ہمیں کہا۔ کہ عمرالدین (ذیلدار کی طرح کا ایک ارائیں) کو رائے دینا اور چنانچہ ہم نے اپنی رائے اسے دیدی۔ میں نے دریافت کیا۔ کہ کونسل تمہارے لئے کیا کرتی ہے؟

اُنہوں نے کہا "اگر ہمیں کسی چیز کی ضرورت ہو۔ تو ہم کونسل والے سے کہہ دیتے ہیں۔ اور کونسل پھر سرکار سے مانگتی ہے۔ پارلیمنٹری حکومت کے متعلق لوگوں کو دھندلی سی معلومات تھیں لیکن اکثر بالکل کورے ہیں۔ اور یہاں تک کہ اپنے آپ کو بھی سرکار سے مانگ لیں گے چونکہ تقریباً ہر شخص اپنی قوم یا مذہب کے مطابق رائے دیتا ہے۔ انتخابات سے فرقہ وارانہ گرد اُٹھ کر بادلوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن کسان سیاسی جانور نہیں ہے۔ اور عام طور پر

(ہمیشہ نہیں) یہ گرد جلد بیٹھ جاتی ہے۔ بہرکیف اگر انتخاب کرنے والے کو انتخاب سے سوائے اس کے کہ جوش اور تفرقے کی فضا میں ایک سانس لے لے۔ کوئی فائدہ نہیں پہنچتا لیکن کا میاب امیدوار کم از کم اتنا فائدہ ضرور اُٹھاتا ہے کہ دیہاتی سیاست کو صوبجاتی سیاست سے بدل کر اپنے دائرہ نظر کو وسیع کر لیتا ہے۔ بعض اوقات اس کے اثرات عجیب ہوتے ہیں۔ ایک بینک کے صدر نے مجھے بتایا۔ کہ جب میں انتخاب میں آ گیا۔ تو میں نے پیر کا دامن چھوڑ دیا۔ میرے انتخاب نے میرے حقوق مجھ پر واضح کر دیئے۔" لیکن ایسی علمیت عام طور پر نہایت گراں خریدی جاتی ہے۔ انتخاب کے لئے دس ہزار روپیہ خرچ کر دینا معمولی بات ہے۔ اور جب رقابت سخت اور تھیلیاں پُر ہوتی ہیں۔ تو اس سے دوگنی اور تین گنی رقموں کا بھی اکثر ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۲ دسمبر (اتوار) بھلوال سے بھیرہ۔ (۱۵ میل)

سیاسیات

بھلوال کے نزدیک آج ہم نے تین گھنٹے چونتیس کاشتکاروں اور بہت سے سکول ماسٹروں کے ساتھ گذارے۔ جو انجمن امداد باہمی کفایت شعاری کا ہفتہ وار اجلاس کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ فہم کا دائرہ اتنا ہی وسیع تھا۔ جتنا کہ کل۔ وہ اخبار جو گاؤں میں آتا ہے۔ صرف ایک رسالہ ہے۔ جسے سکول ماسٹر خریدتا ہے۔ پانچ آدمیوں نے گول میز کانفرنس کے متعلق سُنا ہُوا تھا۔ لیکن اس کے متعلق ان کی تمام علمیت اس بات پر ختم تھی۔ کہ لیڈر حکومت مانگنے کے لئے لندن گئے ہوئے ہیں۔ اور یہ کہ ہر ایک فرقہ اپنے لئے اقتدار چاہتا ہے۔ ایک مسلمان نے کہا کہ ہم نے سُنا ہے۔ کہ ہندو زمین لینا چاہتے ہیں۔ اور وہ بادشاہ بن جائینگے۔ انہیں انتظام سلطنت کے متعلق دوسروں سے زیادہ معلومات حاصل تھیں۔ اور دیوانی و فوجداری حکومت کے افسرانہ شجرہ کی مختلف سیڑھیاں سوائے اس کے کہ فنانشل کمشنروں کے بتلانے میں غلطی کی سبب ٹھیک ٹھاک بتائی گئیں۔ ان کو انہوں نے اپنی لاعلمی کی وجہ سے سشن ججوں کی ماتحت جگہ دی لیکن پٹواری سے لیکر بادشاہ تک تمام لوگوں کو بتانے وقت کسی نے وزراء کا ذکر نہیں کیا۔ یہ ایک نمایاں حذف تھا، جب میں نے دریافت کیا کہ یہ کون ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ ہماری رائے سے بنتے ہیں۔ ہمیں اس کا علم نہیں کہ وہ کرتے کیا ہیں۔ اور نہ ہی یہ پتہ ہے۔ کہ انہیں وزیر کیوں بنایا جاتا ہے۔ ہر شخص اپنے لئے ہے۔ انہوں نے دو کا نام لیا۔ اور وہ

یہ بھی جانتے تھے۔ کہ ان میں سے ایک تعلیم کے لئے ہے۔ اور دوسرا مالیات کے لئے اس کا فائدہ ملکوں رضلع کے بڑے زمیندار۔ ان میں سے ایک وزیر ہے) کو پہنچتا ہے۔ نہ کہ ہمیں۔ وہ اپنے فائدے کیلئے جیتے ہیں۔ نہ کہ ہمارے لئے۔

مسٹر گاندھی

ہم نے مسٹر گاندھی کے متعلق باتیں شروع کر دیں۔ ہم اس کا نام جانتے ہیں۔ لیکن ہمیں اسکی تعلیم کے متعلق یقینی علم نہیں ہے۔ ہم نے اسے نہیں دیکھا ہے۔ میں نے کہا کہ بہت سے اسے مہاتما سمجھتے ہیں۔ ایک منکر نے ان لوگوں کا جن کو مسٹر گاندھی کی نسبت کسی بڑی ہستی کے اشارے کی ضرورت تھی۔ نام لیتے ہوئے یہ تنقید کی۔ کہ اگر وہ مہاتما ہے۔ تو وہ ہمارے نرخ اور دلدلی زمینیں درست کر دے۔ (گاؤں میں دلدل کی وجہ سے بُری حالت ہے) ایک اور بولا۔ جب مسٹر گاندھی کا نام لیا جاتا ہے۔ تو ہم خاموش ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے فائدے کی سوچتا ہے۔ ہمارے کی نہیں۔ یہ اسی کی کرتوت ہے۔ کہ تجارت بند ہو گئی ہے۔ مسٹر گاندھی کے متعلق ایسی باتیں کرنا واجب نہیں ہے۔ اور نہ ہی یہ صحیح اقتصادیات ہے۔ بلکہ یہ مخصوص مسلمان بھائیوں کی گفتگو ہے۔

چرخہ چلانے کے متعلق مسٹر گاندھی کے خیالات پر یہ کہا گیا۔ کہ آدمیوں کے لئے تو یہ بالکل ناممکن ہے۔ پشتہا پشت سے انہوں نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ اور نہ ہی ان کے پاس وقت ہے۔

نرخ گر جانیکے اثرات

نرخ گر جانے کے متعلق کسان کا مزاج بہت ترش ہو گیا ہے۔ عام اثرات کا ذکر کر دیا گیا تھا اوّلاً یہ کہ شادیوں کے اخراجات بہت کم ہو گئے تھے۔ آٹھ سال گذرے ایک ممبر نے اپنے بیٹے کی شادی پر تین چار ہزار روپیہ صرف کیا۔ لیکن حال ہی میں اس نے اس کی دوبارہ شادی پچاس روپے میں کی۔ کیونکہ اسکی بیوی مر گئی تھی۔ اور کل ہی اس کا دولہا حسب معمول سو آدمیوں کو ساتھ لینے کی بجائے صرف پانچ آدمیوں کی برات کے ساتھ روانہ ہوا۔ دوسرے یہ کہ مقامی کارخانے کے پاس روئی فروخت کرنے کے لئے کل والے جاٹوں کی طرح باہم شرکت کر رہے ہیں۔ اور کمیشن ایجنٹ سے بالکل بے نیاز ہو رہے ہیں۔ گذشتہ موسم گرما میں

دلالوں کی حرکات نے ان کا رُخ اس طرح پھیر دیا ہے۔ دلال ان کی خاطر ان کی گیہوں فروخت
کرتے تھے۔ اور روپیہ ادا کرنے کی بجائے اسے اپنے قرضوں کی ادائیگی میں لگا لیتے تھے۔
اور پھر انہیں گورنمنٹ کی واجبات کے لئے روپیہ دینے سے انکار دیتے تھے۔ یہاں تک
کہ وہ اپنے زیورات گرو رکھتے تھے۔

تیسرے سود کی شرح بڑھ گئی ہے۔ جب زیور گرو رکھا جاتا تھا۔ تو رواجی شرح
بارہ فیصدی تھی۔ (کبھی کبھی ۹ فیصدی بھی) لیکن اب یہ ۱۵ یا ۱۸¾ فیصدی ہے۔ اور
۲۵ فیصدی تک بھی وصول کی جاتی ہے۔ ان پانچ صورتوں میں سے جو مجھے آج بتائی گئیں
دو میں شرح سود پندرہ فیصدی دوسری دو میں ۱۸¾ فیصدی اور پانچویں میں پچیس
فیصدی تھی۔ پہلی دو صورتوں میں شرح کم تھی۔ کیونکہ مقروض اپنی گیہوں قرضخواہ
کی معرفت فروخت کرتا تھا۔ اور آخری صورت میں (شرح سود) چڑھی ہوئی کیونکہ گروی رکھے
ہوئے زیورات کی رقم ناکافی خیال کی گئی تھی۔ مجھے مطلع کرنے والے تمام لوگ اس امر پر
متفق الرائے ہیں۔ کہ گذشتہ ۶ ماہ میں آمدنی کی کمی کو پورا کرنے کے لئے اور زیادہ تر گورنمنٹ
کی واجبات ادا کرنے کے لئے زیورات کو کھلم کھلا استعمال میں لایا گیا ہے۔ اور یہ کہ
زیور فروخت کرنے کی نسبت گرو زیادہ رکھے گئے ہیں۔ اس سوال کا جواب کہ ایسا کیوں ہوا
ہے۔ یہ تھا کہ خدا نے اسے گروی رکھوا دیا ہے۔ کوئی اس سے زیادہ کیا تقدیر پر شاکر ہو سکتا
ہے۔ کچھ سناروں نے جن سے میں پچھلے ہفتہ ملا تھا۔ یہ کہا کہ ۱۸ ماہ گذر رہے۔ جب سے کسان
زیورات سے علیحدگی اختیار کر رہا ہے۔ اور اب اس کے پاس صرف ۲۵ فیصدی زیور باقی
رہ گیا ہے۔ دوسرے اُن لوگوں نے بھی جن سے مشورہ کیا گیا۔ فیصدی ۲۵ یا ۳۰ ہی بتائی۔
اور کسی نے پچاس سے زیادہ نہ بتائی۔ لیکن ایسے اندازات محض جبری قیاس ہوتے ہیں۔
اس کے ساتھ ہی کسان سے کوئی رقم وصول کرنا اس قدر مشکل ہے۔ کہ بغیر ضمانت کے قرضے
(جو پہلے سب سے زیادہ عام تھے) قریب قریب بند ہو چکے ہیں۔ پرانے مؤکلوں کا مزاج
اعتدال پر رکھنے کے لئے انہیں چھوٹی چھوٹی رقمیں دینی پڑتی ہیں۔ ورنہ قرض صرف زیورات
کے عوض دیا جاتا ہے۔ ایک غصہ ور آبادکار نے کہا۔ کہ وہ تو ہمیں اپنے گھر جانے کا کرایہ تک
نہیں دیتے۔ ہندوستان میں خاندانی رشتے اس قدر مضبوط ہیں۔ کہ آبادکار کا گھر کی طرف
سفر کرنے کیلئے روپیہ حاصل کرنے کے ناقابل ہونا اس امر کی مکمل مثال ہے۔ کہ ساکھ کی

کس قدر بگڑ چکی ہے۔

تعلیم اور کسان

اپنے تمام سفر میں میں نے دیکھا ہے۔ کہ لوگوں کو سیاست سے نفرت ہے۔ اور تعلیم کا شوق۔ کل جب میں نے مجمع سے پوچھا۔ کہ سکول کے جانے کے کیا فوائد ہیں۔ تو زبانیں کھل گئیں۔ ایک مزارع نے تعلیم حاصل کر کے انسان زمین کی پیمائش کر سکتا ہے۔ حساب سمجھ سکتا ہے۔ اور شاید ملازمت بھی حاصل کر سکتا ہے۔" ایک عمر رسیدہ ممبر نے جس نے پرائمری سکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ساتھ ہی کہا۔ آدمی انسان بن جاتا ہے۔ اور دھوکا نہیں کھاتا۔ پھر حضرت سعدیؒ کا یہ مصرع پڑھا۔ ع

کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

میں نے دریافت کیا۔ سب سے بڑا فائدہ کونسا ہے؟

انہوں نے کہا کہ وہ شخص جو تعلیم حاصل کرتا ہے۔ بادشاہ کے دربار میں بھی شامل ہو سکتا ہے۔

ایک اور کم ہوش شخص نے کہا۔ اُسے بیٹھنا اُٹھنا آجاتا ہے۔ اور اسے ملازمت مل سکتی ہے۔ ایسی میانہ روی کو مدّنظر رکھ کر سلیمان علیہ السّلام نے اپنی مشہور دعا میں یہ کہا۔ میں صرف ایک بچّے کی مانند ہوں۔ مجھے باہر سے اندر اور اندر سے باہر آنے جانے کا علم نہیں۔

میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ بعض کہتے ہیں۔ کہ تعلیم کاشتکاروں کے لیۓ اچھی نہیں ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟

اس نے جواب دیا۔ وہ آدمی جو لکھ پڑھ سکتا ہے۔ جانتا ہے کہ اُسے کیا کرنا چاہیئے۔ وہ سوچ سکتا ہے۔ اور کتابیں پڑھ سکتا ہے۔ دراصل نہ اس گاؤں میں اور نہ آج کے دیکھے ہوئے گاؤں میں مجھے تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ کسانوں میں کوئی خاص فرق نظر آیا۔ آج کا فرمان تو یہ تھا۔ کہ ہم سب ایک ہی ہیں۔ اور تحقیق کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ یہ بخیتہ طور پر صحیح تھی۔ ان سات آدمیوں سے جو میسٹن ہل رکھتے تھے۔ پانچ تعلیم یافتہ تھے۔ اور ان ۶ آدمیوں میں سے جن کے پاس چارہ کاٹنے کی مشینیں تھیں۔ پانچ

ان پڑھ تھے۔

چونکہ بہت سے سکول ماسٹر موجود تھے۔ میں نے پوچھا کہ تعلیم کا دیہاتی پر کیا اثر پڑا ہے؟ سب اس امر پر متفق تھے۔ کہ پرائمری اور ورنیکلر مڈل کے قصاب تعلیم کا کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔ لیکن اینگلو ورنیکلر مڈل کی تعلیم اسے زمین سے دور رہنے کی رغبت دلاتی ہے۔ اور ہائی سکول کی تعلیم اس سے بھی بُری ہے۔ پریذیڈنٹ نے صاف طور پر کہا "یہ تو زمین سے بالکل قطع تعلق کراتی ہے۔ یہ سوال پوچھنے پر کہ طالب علم تعطیلات میں کیوں اپنے والدین کا ہاتھ نہیں بٹاتے۔ اس نے جواب دیا۔ وہ لڑکے جو پرائمری یا مڈل سکولوں میں پڑھتے ہیں۔ امداد دیتے ہیں۔ دوسرے سکولوں میں انہیں گھر کا کام بہت دیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ان کے والدین بھی قابل ملامت ہیں۔ کیونکہ جب وہ سکول جاتے ہیں۔ تو وہ ان کی حد سے زیادہ احتیاط رکھتے ہیں۔ وہ انہیں فکر و تشویش سے دیکھتے ہیں اور اس بات کو بالکل پسند نہیں کرتے۔ کہ وہ کوئی ایسا کام کریں جس کی وجہ سے وہ امتحانات میں فیل ہوجائیں۔ حاضرین میں سے کچھ آدمیوں نے کہا۔ کہ وہ طلبا جو دسویں جماعت پاس کرتے ہیں۔ کھیتوں میں کام نہیں کرسکتے۔ لیکن انہوں نے اس بات کو تسلیم کیا۔ کہ اگر وہ اپنے آپ کو اس کام میں ڈالیں۔ تو وہ اتنی طاقت ایک سال میں پیدا کرلیں گے۔ جتنی کہ کاشتکاری کیلئے درکار ہے۔

سکول

گاؤں میں لڑکے اور لڑکیوں دونوں کیلئے سکول ہیں۔ لیکن لڑکیوں کے سکول میں اگرچہ اسے جاری کئے ہوئے سات سال ہوئے ہیں۔ طالبات کی تعداد صرف بارہ ہے۔ جب کہ اسکے مقابلے میں لڑکوں کے سکول میں پینتالیس ہے۔ دس یا بارہ اور لڑکیوں کو مسجد میں عربی زبان میں قرآن شریف پڑھنا سکھایا جاتا ہے۔ اور وہ بلاشبہ عربی عبارت کا ایک لفظ نہیں سمجھتیں۔ اُس سپاہیوں والے گاؤں میں جسے ہم نے چند دن گذرے دیکھا تھا۔ لڑکے اور لڑکیوں کو اکٹھی تعلیم دی جارہی تھی۔ میں نے دریافت کیا "کیا اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا" ابھی وہ بچے ہیں۔ جب وہ بالغ ہوجائیں گے۔ پھر بلاشبہ یہ صورت مشکل ہوجائیگی۔ پھر ہم نے پوچھا کیا تم یہ پسند کرتے ہو۔ کہ لڑکیوں کا یہاں ایک علیحدہ سکول جاری ہوجائے۔

سپاہیوں نے ہم آواز ہوکر کہا "ہاں" لیکن ایک بوڑھا بھٹی متفق نہ تھا۔ اس نے کہا

ہم اپنی لڑکیوں کو انگریزی نہیں پڑھانا چاہتے۔ اس کا کوئی رواج نہیں ہے۔ اس پر نئی نسل کا ایک ممبر بھڑک اُٹھا۔ اس نے کہا کہ یہ ستر بہتر برس کا بوڑھا ہے۔ اس کی بات درست نہیں۔ یہ اسے سمجھ نہیں سکتا۔ لڑکوں کے سکول کے متعلق (صرف لوئر پرائمری) سب کی ایک رائے تھی۔ اور یہ کہتے تھے۔ کہ ہمارے لڑکے اپنے کام کاج میں عقلمند ہوجاتے ہیں۔ ہم اندھے ہیں لیکن وہ کھتری کے حسابات اور پٹواری کے کاغذات پڑھ لیتے ہیں۔ کل لڑکیوں کے سکول کے متعلق بھی بہت کچھ باتیں کہی گئی تھیں۔ "وہ مہذب بن جاتی ہیں۔ انہیں نفع ونقصانات کی تمیز آجاتی ہے۔ اور اپنے بچوں کی نگہداشت کرنی سیکھ جاتی ہیں۔ یہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس وقت ہماری عورتیں اندھیرے میں ہیں۔ اور واقعی وہ ہیں بھی۔ کیونکہ تمام ضلع میں گراں نرخوں کے ایام میں دولتمند ہونے پر بھی) عورتوں کی ۴۷۶۰۰ آبادی میں سے ۸۰۰۰ خواندہ ہیں۔ اور ۵۰۰ نے سکول میں تعلیم پائی ہے۔ جیسا کہ ہر جگہ دیکھنے میں آتا ہے۔ لڑکوں کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔ اور قریباً ایک سو پچاس چھوٹے علاقوں میں لڑکوں کے لئے تعلیم لازمی ہے۔ اس پر بھی ان علاقوں میں ایک تہائی سے زیادہ لڑکے سکول نہیں جاتے

کفایت شعار سکول ماسٹر

تمام اُن لوگوں کی طرح جنکی آمدنیاں بندھی ہیں۔ سکول ماسٹروں کیلئے بھی نرخوں کا گرجانا ایک نعمت ہے۔ اس امر کا احساس کرتے ہوئے موجودہ سکول ماسٹروں نے نہایت عقلمندی سے انجمن کفایت شعاری میں اپنے چندے کی مقدار بڑھادی ہے۔ وہ ایک روپیہ سے لیکر پانچ روپیہ تک چندہ دیتے ہیں۔ اور انجمن سے بعض خاص مقاصد کیلئے ایک یا دو روپے زیادہ دیتے ہیں دو سال میں انہوں نے مبلغ ۵۰۰ روپیہ جمع کر لیا ہے۔ (جو ۷½ فیصدی شرح پر جمع ہے) ایسے لوگوں کیلئے جو صرف ۲۵ روپے ماہوار پر کام کرتے ہوں۔ یہ ایک معقول رقم ہے۔ وہ سب چھ میل کے اندر اندر کے دیہاتی سکولوں سے آئے ہوئے تھے۔ اور ہر ماہ اتوار کے دن اس طرح جلسہ کرتے ہیں۔

بھیرہ

نہری آبادی کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ہم لوئر جہلم کی شمالی شاخ پر سے گذرے۔ اس کا

بہ پانی یہ ظاہر کر رہا تھا۔ کہ ہم پہاڑوں کے قریب تھے۔ کیونکہ صرف ایسی جگہوں سے ان لدی
ہٹی والے اور ریتلے علاقوں میں ایسا پانی بہ سکتا ہے۔ پہاڑ ہم نے ضرور دیکھے۔ لیکن وہ
ہمالیہ کے عظیم پہاڑ نہ تھے۔ بلکہ کوہستانی نمک کی سطح چوٹی والی قطار تھی۔ جو ہمالیہ پہاڑ
سے مغرب کی طرف .. امیل تک پھیلی ہوئی ہے ساور چین کی بڑی دیوار کی طرح شمالی دلدلی
شکستہ علاقے کو پنجاب کے وسیع میدان سے علیحدہ کرتی ہے۔ اسے دیکھتے ہی ہم جہلم
کے فراخ دریائی علاقے میں داخل ہوئے۔ سڑک پر ایک ایک فٹ تک ریت پڑی
تھی۔ اور گذرتی ہوئی لاریوں کے ساتھ سمندری لہروں کی طرح بلند ہوتی تھی۔ بعض جگہوں
میں ریت اتنی گہری تھی۔ کہ اینٹوں کے چھوٹے ٹکڑوں کو گاڑ گاڑ کر موٹروں کو گذرنے میں
امداد دینے کے لئے اونچی سڑک بنائی ہوئی تھی۔ جب ہم بھیرہ پہنچے۔ تو سورج مغرب میں
بہت نیچے تھا۔ بھیرہ بیس ہزار باشندوں کا ایک شاندار شہر ہے۔ جس میں آٹھ عالی شان
پھاٹک ہیں جنہیں ساٹھ سال گذرے۔ کسی ڈپٹی کمشنر نے بنوایا تھا۔ اس کا نام (کیپٹن
ڈبلیو جی ڈیویز) اب بھی لوگوں کو یاد ہے۔ نہری آبادیوں کے نوخیز شہروں کو دیکھنے کے بعد یہ
نہایت پرانا معلوم ہوتا تھا۔ مہندی کے خضاب۔ کاریگروں اور لکڑی۔ لوہا اور پتھر میں نہایت
دانائی سے کام کرنے والوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ ریلوں کے شروع ہونے سے پہلے اس کی
فارغ البالی دریائے جہلم پر واقع ہونیکی وجہ سے تھی۔ جو اس وقت بہت بڑی شاہراہ تھی۔
اسکی موجودہ خوشحالی اس کے ان فرزندوں پر منحصر ہے۔ جنہوں نے گورنمنٹ کی ملازمت میں اچھے
کام کئے ہیں۔ گردو نواح کا علاقہ دلکش ہے۔ اتنا دلکش کہ اس کی بنا پر ایک مرتبہ تھابرن نے
فارسی کا یہ شعر دہرایا کہ ۵

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است

لیکن اب یہ شہر تفرقے نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ اس کی گلیاں گندی ہیں۔ نالیاں بدبودار
پانی سے بھری ہوئی ہیں۔ اور یہاں کی میونسپل کمیٹی نیم دیوالیہ ہے۔ اسکی عام حالت اس
قدر گندی ہے۔ کہ اس کے مستعفی افسروں میں سے ایک نے اس کی ہجو میں یہ کہا ۔ ۵
اگر بدشہر بر روئے زمین است ہمین است و ہمین است و ہمین است

۵ مسٹر تھابرن۔ سی۔ ایس۔ آئی مصنف پنجاب کے مسلمان اور ساہوکار۔

۲۲ر دسمبر۔ بھیرہ سے لیلہ (۱۲ میل)

درزیوں کی انجمن

آج کا دن درزیوں کی ایک چھوٹی انجمن سے شروع ہوا۔ ان کی تعداد بھیرہ میں تقریباً دوسو ہے۔ قریب قریب سب مسلمان ہیں۔ ان میں سے اٹھائیس بنک میں شامل ہیں۔ سترہ حاضر تھے۔ درزی جیسا کہ ہاتھ کا پھرتیلا ہے۔ ایساہی عقل کا بھی تیز ہے۔ اس لئے ہم نے خوب خوش طبعی کی باتیں کیں۔ سب انفرادی طور پر کام کرتے ہیں۔ اور چھ شاگرد بھی بٹھائے ہوئے ہیں۔ ایک سال ہوا نرخ گرنے سے پیشتر ان کا کام خوب چلتا تھا۔ اور گیارہ آدمی چھ سو روپیہ سالانہ سے زیادہ کماتے تھے۔ ایک نے اپنے بھائی اور تین شاگردوں کی مدد سے ایک ہزار روپیہ کمایا تھا۔ انہوں نے بھی وہی بات کہی۔ جو ہم نے کئی گاؤں میں سُنی تھی یعنی یہ کہ اب گھر کا بنا ہوا کپڑا زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔ میں نے پوچھا تمہیں یہ کیسے معلوم ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہم اپنے لحافوں کیلئے روئی لیکر دھنیے کے پاس دُھنئنے کے لئے لے جاتے ہیں۔ اور وہ آجکل ہمیں یہ کہتا ہے۔ مجھے فرصت نہیں ہے تمہیں انتظار کرنا پڑیگا۔ ایک درزی نے کہا۔ کہ مجھے ۲۲ دن انتظار کرنا پڑا تھا۔ اور میں اس کے پاس روزانہ جاتا تھا۔ پانچ ماہ گذرے یہ تبدیلی نرخوں کے گرجانے اور کانگرس کا بدیشی کپڑے سے قطع تعلق کرنے کے ساتھ ساتھ پیدا ہوئی۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا ہے۔ کہ قصبوں اور گاؤں میں پہلے سے کہیں زیادہ کتائی کا کام کیا جاتا ہے۔ اور یہ بات ہم تمام راستے سنتے چلے آئے ہیں۔ گھر کے کپڑے کو وہ سینے کے لئے وہ تین یا چار آنے گز سے زیادہ نہیں وصول کر سکتے۔ کیونکہ کپڑے پر بذاتِ خود زیادہ سے زیادہ دس آنے گز خرچ آتا ہے۔ کارخانے کے بنے ہوئے کپڑے پر وہ اس سے دوگنی قیمت وصول کر سکتے ہیں۔ اور ریشم کے کپڑے سینے کے لئے (جو اب نہیں پہننے چاہئیں) وہ دو روپیہ فی گز تک سلائی لے لیتے ہیں۔ زیادہ قیمتی کپڑے کا مطلب یہ بھی ہے۔ کہ اس سے زیادہ شاندار کپڑے تیار ہونگے۔ مثلاً بجائے ایک دیہاتی قمیص کے جیسے زیادہ سے زیادہ ایک کالر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ایسا قمیص جس میں کالر کف اور بٹن لگے ہوئے ہوں۔ دیہاتی قمیص اتنا سادہ ہوتا ہے۔ کہ یہ گھر بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن زیادہ شاندار اور چست آنے والے جدید قمیص کے لئے ایک ماہر فن کی ضرورت ہے

اسے کاٹئے اور سیئے۔ یہی حال دیہاتی کے بستر کا ہے۔ کارخانے کے کپڑے سے بنے ہوئے لحاف کیلئے مشین سے سیا جانا ضروری ہے۔ لیکن ایک معمولی لحاف میں آسانی سے روئی یا اون بھری جا سکتی ہے۔

ایک کفایت شعار درزی

یہ امر بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ کہ کوئی درزی اپنے زائد روپیہ کی معمولی رقمیں بنک میں جمع کراتا ہو۔ لیکن ان درزیوں میں سے کئی ایک ایسا کرتے تھے۔ اور چند آنے جمع کرا کر روپیہ بنا لیتے تھے۔ اس صورت میں جب آمدنی بجائے فصل بہ فصل آنے کے روز بروز پیسہ پیسہ کر کے آئے۔ ایسا کرنا زیادہ آسان ہے۔ اور ایک ایسے شخص کے لئے جو مشین سے کام کرتا ہو۔ اگر وہ قرض سے بچنا چاہے تو یہ ضروری بھی ہے۔ ایک درزی نے ہمیں بتایا کہ بنک کھلنے سے پہلے جب میری مشین گھس رہی تھی۔ تو میں نے ایک نقدی رکھنے کا ڈبہ خریدا۔ اور اسے قفل لگا کر کنجی ایک کنوئیں میں پھینک دی۔ تاکہ میرے دل میں اس کے کھولنے کی رغبت نہ پیدا ہو۔ ہر روز ایک یا دو آنے اس میں کھسکا دیتا تھا۔ اور فراغت کے دنوں میں روپیہ بھی۔ دو سال گذرے اور میں نے حساب کیا۔ کہ اب میرے پاس ضرور ۹۰ روپے یعنی اتنی رقم جو نئی مشین خریدنے کے لئے درکار تھی۔ جمع ہو گئے ہونگے۔ میں نے صندوق کھولا اور دیکھا کہ ۹۳ روپے ہیں۔ اس سادہ طریق سے اس نے اپنے آپ کو مبلغ یکصد روپیہ کے قرض سے بچا لیا۔ (جن میں سے ۶½ فیصدی کمیشن کاٹ لیا جاتا ہے) اور ۲۵ فیصدی سود لیا جاتا۔ جب تک قیمتیں نہیں گری تھیں۔ ایک مسلمان رنگریز (جو کہیں اور ملا تھا) ہر روز ایک آنہ اپنے لڑکے اور ایک آنہ اپنی لڑکی کی شادی کے لئے جمع کرتا رہا۔ جب اس نے نقدی کے صندوق کھولے تو ایک میں سے اسی روپے نکلے اور دوسرے میں سے ایک سو پچیس۔ ایک ایسی رقم جو ۲½ سال کی مستقل بچت سے جمع ہوئی تھی۔ دو ہزار سال گذرے۔ اشوکا نے ہندوستان کی ایک چٹان پر یہ لکھا۔ کہ تھوڑا خرچ اور تھوڑی بچت قابل قدر ہے۔ اور اگر انسان صرف اسی طریقے سے ثواب حاصل کرلے۔ اور بجائے اُدھار لینے کے بچاتا رہے۔ تو ہندوستانی دیہات کی کایا جلد پلٹ سکتی ہے۔

کپڑوں میں کفایت شعاری

گاؤں میں کپڑے سینے کی مشینیں صرف چند ہیں ۔ لیکن بھیرہ میں سو سے زیادہ ہیں ۔ وہ ہندو بیواؤں کا سہارا بنتی جاتی ہیں ۔ ان میں سے بہت سی درزی کو نقصان پہنچا کر ان سے اپنے گذارے کیلئے کماتی ہیں ۔ لڑکیوں کا مقامی سکول بھی ان کا حریف ہے ۔ کیونکہ اس نے شہر کی لڑکیوں سے کروشیا ۔ کشیدہ کاری اور سینے کے کام کو ترقی دینے کیلئے بہت کچھ کیا ہے ۔ انہوں نے تعریف میں بخل کئے بغیر مجھے نمونے دکھلائے ۔ لیکن شکایتاً یہ کہا ۔ کہ اس مقابلے نے ہماری آمدنی چار یا پانچ آنے فی روپیہ گھٹا دی ہے ۔ میں نے پوچھا تم اس گھاٹے کو کیسے پورا کر رہے ہو ۔ انہوں نے کہا کہ دو ڈھائی مہینے گذرے ۔ ہم نے اپنے حلقے کی برادری کا جلسہ کیا ۔ (ہر ایک حلقے میں اپنی اپنی برادری ہے) اور پانچ بھلے آدمیوں کی ایک پنچایت مقرر کی ۔ تاکہ وہ یہ مقرر کریں ۔ کہ ایک کنبہ کو اپنی شادی و غمی کے موقعوں پر کیا خرچ کرنا چاہیئے ؟ چونکہ حالات اختلاف رکھتے ہیں ۔ اس لئے کوئی مقررہ قانون نہ بنایا جا سکا ۔ اس وقت سے اب تک تین شادیاں ہوئی ہیں ۔ اور ایک صورت میں جیسا کہ ایک ممبر نے بتایا ۔ اس نے ایک ہزار روپیہ صرف کرنے کی بجائے اپنے بیٹے کی شادی پر تین سو روپیہ صرف کیا ۔ ایک اور شادی اب ہونے والی ہے ۔ اور یہ انتظام کیا گیا ہے ۔ کہ صرف اُن لوگوں کی دعوت کی جائیگی ۔ جو برات میں شامل ہونگے ۔ نہ کہ تمام برادری کی ۔ گاؤں میں ویسی پنچایت اپنی تھوڑی بہت طاقت کے ساتھ صرف جنوب مشرقی حصے میں قائم ہے ۔ لیکن قصبے کی غریب ذاتوں میں یہ بھی اب زوروں پر ہے ۔ درزیوں کی ایک پنچایت کئی سال سے قائم ہے ۔ اور اتنی کامیاب رہی ہے کہ کوئی عدالت میں نہیں جاتا ۔

جب ہم بھیرہ سے چلے تو سورج آسمان پر اونچا تھا ۔ اور جب ہم نے اپنا راستہ گہری ریت میں سے اختیار کیا تو گرم تھا ۔ گہری ریت اس امر کی نشانی تھی ۔ کہ ہم دریائے جہلم کے قریب پہنچ رہے ہیں ۔ ہمارے سامنے سلسلہ نمک کا لمبا مستطیل ڈھیر بلند تھا ۔ اور اس پر اب سایہ نہ تھا ۔ یہ انسانی پنجر کی طرح اور نعش کی طرح سخت تھا ۔ اس کی بیرونی سطح پر سرخی جھلک رہی تھی ۔ اور یہ ظاہر کر رہی تھی ۔ کہ خون کی جو اس کی مرتفع سطح پر

رہنے والے لوگوں میں نہایت آزادی سے بہایا جاتا ہے۔ یہ نمک کی سُرخی تھی۔ جس کی وجہ سے
ان پہاڑیوں کو یہ نام دیا گیا ہے۔ دریائے جہلم پنجاب کے تمام دریاؤں کی طرح (سوائے لگام سندھ
کے) سردی کے موسم میں ایک زخم کی مانند تھا۔ جو گرمی میں بہنے والے دریا کے جسم پر لگا ہوا
تھا۔ خوبصورت تھا۔ جیسے کہ تمام بہتے پانی جوان خشک میدانوں میں نظر آتے ہیں۔ اور جب
ہم اس کے کم گہرے شفاف بہتے پانی میں سے چھینٹے اُڑاتے ہوئے گذرے۔ تو سورج کی
روشنی اسکی جھلملاتی سطح پر پریوں کے خانوں کی سی ہزاروں محرابیں اور دائرے بنا رہی تھی۔
ہم پرلے کنارے کی سفید ریت پر پہنچے ہی تھے۔ کہ جہلم کے لوگ ہمارے استقبال کے لئے
قدم بہ قدم آ پہنچے۔ اور نوروز و کرسمس دونو کے لئے بہت سی مبارک بادیں دینے کے بعد
میں نے شاہ پور کے لوگوں کو الوداع کہی اور میں جہلم و شمالی پنجاب میں داخل ہو گیا ؛

باب سوم

کوہستانِ نمک

اصلاحِ دیہات۔ جھگڑے اور فسادات۔ اپنے گھر میں ہی سپاہی کی حالت

دریائے جہلم جس کے کنارے سکندر نے پورس پر فتح حاصل کی تھی۔ پنجاب کے اُن تمام دریاؤں میں سے جن کی وجہ سے یہ پنجاب کہلاتا ہے۔ سب سے شمالی ہے۔ اور قدرتی حد کا کام دیتا ہے۔ یہ اس بڑے میدان کے انجام کو ظاہر کرتا ہے۔ جو دہلی کے کہیں جنوب سے شروع ہوتا ہے۔ اور اس سے پرے مسلمانوں کی وہ قومیں آباد ہیں۔ جو ہندوستان کی کثیر الاولاد نسلوں کی بجائے وسط ایشیا کے لوگوں سے زیادہ علاقہ رکھتی ہیں۔ سرد ہوا کے غلاف میں لپٹے ہوئے ہونے اور اس وجہ سے کہ خشک چٹانیں ان کی پرورش بخل سے کرتی ہے۔ وہ ہندوستان کے نہائت ہی جوانمرد جنگجو کسان ہیں۔ دریائے جہلم کے جنوب میں لوگوں کا ذریعہ معاش مویشی چرانا اور یہاں دشمنوں کا قتل کرنا ہے۔ ایک تجربہ کار مجسٹریٹ نے مجھے ایک بار ان دونوں علاقوں کے متعلق یہ بتایا۔ کہ یہاں قاتل ہمیشہ ایک اچھا شخص ہوتا ہے۔ اور چور عام طور پر بُرا۔ چور ایک ڈرپوک کچائی ہوتا ہے۔ وہ مکر و فریب کا پتلا ہوتا ہے۔ لیکن قاتل چور کی نسبت زیادہ تندمزاج ہونے کی وجہ سے بہادر زیادہ صاف دل اور سادہ ہوتا ہے۔ اور جب فوجی ملازمت سے اسکی تربیت ہو جاتی ہے۔ تو وہ اوّل درجے کا سپاہی ثابت ہوتا ہے۔

مسٹر برین کا لائحہ عمل

لیلا سات ہزار کی آبادی کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اور کوہستانِ نمک کی جڑ سے چندمیل پرے ایک کھلے میدان میں واقع ہے۔ میں اپنے تین اونٹوں سے آگے تھا۔ اس شاندار مگر سست ذریعہ سفر کے ساتھ آج ہمارا پہلا دن تھا۔ ان نے دو جنگ آزمودہ مسلمانوں سے گفتگو

کرنی شروع کردی۔ ان میں سے ایک خوش طبع باتونی کیپٹن تھا۔ جس نے دیر تک عراق اور کردستان میں ملازمت کی تھی۔ اور دوسرا ابن الوقت مگر تیز مزاج رسالدار جس نے مشرقی افریقہ میں خدمات انجام دی تھیں۔ انہوں نے مسٹر الیف ایل برین کے دیہاتی لائحہ عمل کے متعلق بہت کچھ کہا۔ جو ایک سال گذرا۔ اس وقت شروع ہوا تھا۔ جب کہ وہ اس ضلع میں ڈپٹی کمشنر بن کر آئے تھے۔ کیپٹن سو روپے خرچ کر کے کسی دیہات سدھار جماعت کا لائف ممبر بن گیا تھا۔ لیکن دوسرا دس روپے دیکر ستنا ہی چھوٹ گیا تھا۔ اس کے باوجود اس نے درد بھرے دل سے کہا۔ میری پنشن صرف ۴۳ روپے ہے۔ اور کیپٹن صاحب کی ۲۷۰ روپے۔ کیپٹن نے ایک انعامی فنڈ میں بھی چندہ دیا تھا۔ اس کے علاوہ اور چندوں کا بھی ذکر کیا گیا۔ ان تمام باتوں پر وہ نہایت خوش طبعی سے ہنسے۔ لیکن یہ ہنسی غیر متوقع بارش میں شور بور ہوئے ہوئے آدمیوں کی سی تھی۔ انہوں نے اُن بہت سی چیزوں کا ذکر کیا۔ جن کیلئے روپے کی ضرورت تھی اور جب آلہ مکبر الصوت کا ذکر آیا۔ جس پر ۲۰۰ ۳ روپے خرچ آتے ہیں۔ تو رسالدار اپنے سیاہ ہاتھ کو زور سے جھٹک کر بولا ”کم از کم اس کی تو ضرورت نہیں ہے“۔ نہ ہی اسے وہ کھاد کے گڑھے پسند تھے۔ جن میں سے ایک کو میں نے گاؤں میں داخل ہونے پر ایک مستعفی فوجی افسر کی زمین میں خالی پایا۔ اس نے کہا کہ ایک آدمی کو چھ بلکہ اس سے بھی زیادہ دن اسے کھودنے میں لگ جاتے ہیں۔ اور ہمیں ایک آدمی کو اس کام کے لئے آٹھ آنے فی یوم دینے پڑتے ہیں۔ ہمارے مزدور اس کام کو نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ ہمارا کام نہیں ہے۔ اور نہ یہاں ہمیں اپنی زمینوں کیلئے کھاد کی ضرورت ہے۔ یہاں بہت ہی کم بارش ہوتی ہے۔ اور یہ زمین کو گرمی بہم پہنچاتا ہے۔ اور فصل مرجھا جاتی ہے۔ لیکن کیپٹن نے نئی تعلیم میں سے بہت کچھ سمجھا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ بلاشبہ یہ ایک اچھی چیز ہے۔ کہ تمام کوڑا کرکٹ جمع کر کے ایک گڑھے میں ڈال دیا جائے برین صاحب کہتے ہیں۔ کہ ہمیں ان گڑھوں کو پاخانہ کے طور پر استعمال کرنا چاہیئے۔ یہ سچ ہے کہ یہاں بعض لوگ گلیوں ہی میں رفع حاجت کر لیتے ہیں۔ پھر وسیع النظری سے کام لیتے ہوئے اس نے کہا۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ صاحب کے خیالات اچھے ہیں۔ اور جو کچھ وہ کہتے ہیں سچ ہے۔ ہمارے دیہات گندے ہیں۔ اور ہماری صحت خراب ہے۔ اور ہم تعلیم یافتہ نہیں ہیں۔ لیکن لوگ جاہل اور کاہل ہیں۔ وہ اتنے جاہل ہیں کہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتے۔ کہ یہ باتیں مفید ہیں۔ اور اتنے کاہل ہیں کہ گڑھے کھودنے کیلئے رضامند نہیں ہوتے۔ یہاں

زمین بارانی ہے۔ اور جب ہل چلانے اور بیج بونے کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ تو کٹائی کے وقت تک اور کچھ کام نہیں ہوتا۔ وہ تین مہینے کام کرتے ہیں۔ اور نو مہینے بیکار رہتے ہیں۔ بہت ہی سست لوگ ہیں۔

کیپٹن نے داستان پھر شروع کر دی۔ صاحب ہیں پوچھتا ہے۔ کیا لوگ یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ میں پاگل ہوں۔ (اس خیال پر قہقہہ لگایا) ہم اسے بتاتے ہیں۔ کہ لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام کو بھی دیوانہ خیال کیا ہوگا۔ اور جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ بتایا۔ کہ ان کے بت پتھر کے ہیں۔ اور ان کی پوجا نہیں کرنی چاہیئے۔ وہ یقینی طور پر انہیں پاگل کہتے تھے۔ لیکن یورپین لوگوں نے انہیں پیغمبر مانا۔ میں نے پوچھا:۔

"اس کے علاوہ صاحب کیا کرتا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ کہ وہ کہتا ہے کہ لڑکیوں کو بالیاں تک بھی نہ پہنانی چاہئیں۔ لیکن لوگ کہتے ہیں۔ کہ اگر ہماری لڑکیاں بالیاں نہ پہنیں۔ تو ہمیں یہ کیسے معلوم ہوگا۔ کہ وہ لڑکے نہیں لڑکیاں ہیں۔ اس پر رسالدار نے مزہ لیتے ہوئے یہ بیان کیا۔ کہ میں نے مشرقی افریقہ میں ایسے مرد اور عورتیں دیکھے ہیں۔ جو ننگی پھرتی ہیں۔ اور جب اُن سے تکرار کی گئی۔ تو انہوں نے کہا تم کپڑے تو پہنتے ہو۔ لیکن یہ کیسے بتا سکتے ہو۔ کہ آدمی کون ہے؟۔ اور عورت کون؟ کیپٹن نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ کہ صاحب نے یہ بتایا۔ کہ زیورات کی بجائے مچھر دانیاں خریدو۔ زیورات تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچاتے۔ ہزاروں مچھر دانیوں کے لئے آرڈر دے دیا گیا۔ لیکن اگر کوئی شخص ایک بھی خریدتا ہے۔ تو اس کے پڑوسی کہتے ہیں۔ اس نے اپنے آپ کو نواب بنا لیا ہے۔ اور ہر ایک اس پر ہنستا ہے۔ لوگ بہت جاہل ہیں۔ رسالدار کو پختہ یقین تھا۔ کہ جب مسٹر برین کا تبادلہ ہو جائے گا۔ تو یہ سب باتیں ختم ہو جائیں گی۔ اور یہ ہمیشہ یونہی ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک صاحب "ف" تھے۔ وہ سڑکیں بنوانے کے مشتاق تھے۔ سڑکیں اور صرف سڑکیں۔ ہم سب نے سڑکیں بنوائیں۔ ایک بڑی سڑک بنانے کے لئے پتھر جمع کرنے پر بہت روپیہ خرچ کیا گیا تھا۔ لیکن اس کا تبادلہ ہو گیا۔ اور پتھروں کو بلا وجہ نیلام کر دیا گیا۔ اور کسی نے آئندہ سڑکوں کے متعلق یہ نہ سوچا۔ جب کوئی ڈپٹی کمشنر یہ کہتا ہے۔ کہ یہ دروازہ کھولا جائے۔ تو ہم سب اس کے لئے اپنی جانیں لڑا دیتے ہیں۔ کیونکہ ہم اسے خوش کرنا چاہتے ہیں نہ اس لئے کہ اس کے کرنے کا خیال ہمارے دلوں میں ہوتا ہے۔ یہ صرف اسی صورت میں قائم رہ سکتا

ہے۔ جبکہ اس کا خیال لوگوں کے دلوں میں ہو۔ اور ان کے دلوں میں نہیں ہے۔
لیکن سوال یہ ہے۔ کہ یہ خیال ان کے دلوں میں پیدا کیسے کیا جائے؟۔
اب شام ہو چلی تھی اور ہمارے چاروں طرف میدان میں منتشر حالت میں گھر جاتے ہوئے مویشیوں کی اٹھائی ہوئی گرد سے لہریں پیدا ہو رہی تھیں۔ ان سے پرے سورج بادلوں میں غروب ہو رہا تھا۔ تابناک سورج جس کی تیز دھوپ سے پہاڑیاں خون میں ڈوبی ہوئی نظر آ رہی تھیں لیکن میرے اونٹ منزل پر پہنچ گئے تھے۔ اور میں آگ کے پاس دیر سے طیار شدہ کھانے کے نزدیک بھوک سے بیتاب بیٹھا تھا۔

۲۳۔ دسمبر لیلا سے سار دھی (۱۰ میل)

انسانی و حیوانی مشقتیں

اب سردی اتنی تھی۔ کہ میں دھوپ میں ناشتہ کر رہا تھا۔ اور کانپ رہا تھا۔ مویشی اپنی دبلی بے رنگ کھوکھیں لئے چراگاہ کی تلاش میں جا رہے تھے۔ یہاں وہ سردیوں کے دنوں میں نو آبادی کے مویشیوں کی طرح گھر پر نہیں رہتے۔ کیونکہ اس علاقے میں جہاں کوئی نہر سیراب نہیں کرتی۔ بنجر زمین بہت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت ان میں سوائے پتھروں اور نمک کے جو پہاڑیوں پر سے بہہ کر آ گیا ہے۔ اور کچھ نہیں ہے۔ مویشیوں کے لئے یہ مشقت کی زندگی ہے۔ لیکن چھوٹے اور دبلے ہونے کے ساتھ ہی وہ ایسی سختیاں برداشت کرنیکے عادی ہیں۔ جو زیادہ نمائشی جانوروں کیلئے مہلک ہیں۔ یہاں آدمی کے لئے بھی محنتی ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ فصلیں اتنی غیر یقینی ہیں۔ جتنی کہ خدائی امداد۔ فصل کا دو تہائی حصہ بارش کے نہ ہونے سے ضائع ہو جاتا ہے۔ گرمیوں میں دھوپ خوفناک شدت سے پڑتی ہے۔ اور پانی اتنا ہی کمیاب ہوتا ہے۔ جتنا کہ خراب ہے۔ ایک افسر کا بیان ہے۔ کہ اس جگہ کے نزدیک ایک چھوٹے گاؤں میں میں نے سو سے زیادہ آدمیوں کو ایک چھوٹے سے کنوئیں میں سے پانی کھینچنے کے لئے کشمکش کرتے دیکھا۔ اور گاؤں کو پانی مہیا کرنے والا صرف یہی ایک کنوآں تھا۔ اور پانی کیا تھا۔ کیچڑ اور نمک میں گھلی ہوئی ایک غلیظ مائع تھی۔ اس پر بھی یہ گاؤں خوش قسمت تھا۔ کہ اس کے پاس اپنا ایک کنوآں تھا۔ بہت سے گاؤں میں کوئی کنوآں نہیں ہے۔ اور لوگوں کو میلوں اسکی تلاش میں جانا پڑتا ہے۔

نظامِ حکومت

لیلا میں دو انجمنیں ہیں۔ ان کے ۵۰ امیروں میں سے ۷ میرے معائنے کے وقت حاضر تھے۔ ان میں چھ سپاہی تھے۔ اس تاریکی میں صرف وہ ہی روشن چراغ تھے۔ اور کوئی بھی خواندہ نہ تھا۔ اور گاؤں میں اگر کوئی ترقی یافتہ ذریعہ کاشت تھا۔ تو وہ مسٹن ہل تھا۔ جو تین سال ہوئے ان میں سے ایک انجمن نے آزمائش کے لئے خریدا تھا۔ اگرچہ چند آدمیوں نے اسے دیکھا ہوا تھا۔ لیکن ایسا کوئی نہ معلوم ہوا۔ جس نے اسے استعمال کیا ہو۔ اس سال پہلی مرتبہ (غالباً مسٹر برین کے لائحہ عمل کا نتیجہ ہے) منتخب کردہ گیہوں کا بیج (پنجاب ۸ الف) منگوایا گیا تھا۔ اور صرف چند آدمیوں نے اسے استعمال کیا تھا۔ ایک ممبر جو ۱۰۰ ایکڑ زمین کا مالک تھا۔ اگرچہ بادشاہ کا نام نہیں جانتا تھا۔ لیکن سرکاری سیڑھی کے مختلف تدریجوں سے واقف تھا۔ لیکن جب عدالت کے متعلق گفتگو ہوئی تو اس سے پہلے کہ کسی کو (سوائے مستعفی افسروں کے) یہ یاد آئے کہ سشن جج سے اوپر کون ہوتا ہے؟ دیر تک سکوت طاری رہا۔ اور نہ کسی کو یہ معلوم تھا۔ کہ وزراء کی تعداد کتنی ہے؟ کسی نے اس وزیر کا ذکر کیا جو جہلم پار رہتا ہے لیکن جب اس سے یہ دریافت کیا۔ کہ اس کا کیا کام ہے؟ تو اس نے صرف اتنا کہا۔ کہ "وہ دوسروں کی طرح پنجاب کا دورہ کرتا ہے"۔ دوسرے وزیروں کے متعلق کوئی کچھ نہ جانتا تھا۔

کوہستانِ نمک پر چڑھائی

سار دھی تک پہاڑیوں پر چڑھنے کے لئے ہم تین بجے روانہ ہو گئے۔ یہ گاؤں سلسلہ نمک کے بیرونی کنارے پر واقع ہے۔ کپتان نے کہا اگر آپ جلد روانہ نہ ہو گے تو آپ کو دیر ہو جائیگی۔ یہ ایسی سڑک نہیں ہے۔ کہ اس پر اندھیرے میں چلا جائے۔ اس کی بات ٹھیک تھی۔ اس سے زیادہ خراب سڑک پر میں سالہا سال سے نہیں چلا۔ تقسیم کرنے والے میدان کے ساتھ ساتھ چند میل تک سڑک خاصی اچھی تھی۔ لیکن جب ہم اس تنگ گھاٹی میں داخل ہوئے۔ جہاں سے چڑھائی شروع ہوتی تھی۔ تو تمام سڑک پر پتھر ہی پتھر

اور گھسی ہوئی چٹانیں تھیں۔ ہمارے گھوڑوں کے نعلوں کے پھسلنے اور رگڑ کھانے سے پتھروں میں گونج پیدا ہو رہی تھی۔ گھاٹی کے دروازے پرے یہاں ایسی ویرانی تھی۔ کہ یہ جگہ سوائے خدا کی عبادت کے اور کسی کام کے لئے موزوں نہ تھی) ایک خانقاہ تھی۔ اور اس کے ساتھ پتھر کے گھروں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ جس میں ایک پیر اور اس کے مرید رہتے تھے۔ لوگ یہاں خاص طور پر پتھری سے شفا حاصل کرنے کیلئے آتے ہیں۔ جس کے علاج کے لئے یہ خانقاہ بہت مشہور ہو گئی ہے۔ میرا خیال تھا کہ یہ نمک کی سرخ چٹانوں کی کسی خاصیت کی وجہ سے ہوگا۔ لیکن میرے انسپکٹر نے بتایا۔ کہ لوگ یہاں کچھ پینے نہیں آتے۔ بلکہ سلام کرنے آتے ہیں۔ ہمارے ارد گرد کی پہاڑیاں اتنی ننگی نہ تھیں۔ جتنی کہ وہ لیلا سے نظر آرہی تھیں۔ بلکہ اس سے کہیں زیادہ دوزخ کا نمونہ تھیں۔ اور ان پر چڑھنے والی سڑک بدترین (دوزخی نمونے کی) ڈھلوان تھی۔ میں گھوڑے کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے اس پر سے اتر پڑا اور تھوڑا سا اوپر چڑھنے کے بعد یہ دیکھنے کیلئے کہ میرے ساتھی (ایک ہندوستانی ہم مشرب) کا کیا حال تھا۔ میں نے ایک دزدیدہ نظر ڈالی۔ وہ کافی دور پیچھے گرا پڑا تھا۔ اور اپنے گھوڑے پر پھر سوار ہو گیا تھا۔ مجھ سے نظر ملاتے ہی وہ فوراً اتر پڑا۔ (مشرق میں اپنے سے بڑے کی موجودگی میں یہی خوش اخلاقی دکھائی جاتی ہے) لیکن پہاڑ کی پستی کی طرف منہ کر کے ایک ہی آواز دینے سے وہ پھر گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ میرے قریب آکر اس نے عذر خواہی کے انداز میں کہا" میرا وزن آپ سے زیادہ ہے۔ اور بلاشبہ وہ تھا بھی تقریباً اس سے زیادہ تھا۔ جب ہم زیادہ اونچے چڑھے۔ تو پہاڑیوں کی برہنگی میں کوئی کمی نہ آئی۔ لیکن ان کی ہیبت ناک شگاف دار سطحیں اور بھی صاف نظر آنے لگیں۔ شام کے ارغوانی سائے ان کی ڈھلوانوں کے ساتھ ساتھ اوپر ہی اوپر جاتی ہوئی دھوپ کا تعارف کرا رہے تھے۔ اور جوں جوں وہ آگے آگے جاتے تھے۔ روشنی زیادہ منور ہوتی جاتی تھی۔ اور اونچے ٹیلے اس طرح چمک رہے تھے۔ گویا وہ غرب سے بھی پرے دیکھ رہے ہیں۔ ان کے بیرونی کنارے پر ساردھی کا گاؤں بعینہٖ اسی طرح واقع تھا۔ جیسے کسی قلعے کی دیوار میں گولہ باری کے لئے سوراخ بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ گاؤں بہت دور سے باہر معلوم ہوتا تھا۔ اور اس تک پہنچنے کے لئے سڑک زندہ چٹانوں میں سے گذرتی

تھی۔ مین چوٹی پر پہنچ کر ہم نے ۱۵۰۰ فیٹ نیچے میدان پر نظر ڈالنے کے لئے کچھ توقف کیا۔ لیکن سوائے اُس کے کہ دریائے جہلم دھند لکے میں ہلکا ہلکا نظر پڑ رہا تھا۔ ہم اور کچھ نہ دیکھ سکے۔ اس چوٹی سے پرے دلدلوں اور کھیتوں والا سراسر نیا علاقہ تھا۔ جو دور ایک پہاڑی سلسلے تک پھیلا ہوا تھا۔ اور دلدلی علاقوں کے کناروں پر ایک تنہا پیپل کے درخت کے قریب ایک پرانی قیامگاہ تھی۔ جس نے ہمیں آج کی رات آرام دیا۔

۲۴- دسمبر۔ سار دھی سے کلر کاہر (۱۰ میل)

وطنی تعاون

آج کرسمس کی تعطیلات کیلئے فرصت کا احساس پیدا ہونا شروع ہوگیا ہے اور اب دس دن تک فائلوں کی روزانہ ڈاک کا کوئی تھیلا نہیں آئیگا۔ میں نے چبوترے پر ناشتہ شروع کیا۔ لیکن دھوپ شمالی ہوا کی تاب نہ لا سکتی تھی۔ اور مجھے اندر جانا پڑا۔ ناشتہ کرنے کے بعد ہم گاؤں کی حالت کا اندازہ کرنے کے لئے ٹہلتے ٹہلتے وہاں پہنچے نمبر دار اور ایک سفید ریش اور ایک دانت والا سپاہی نمودار ہوا۔ انہوں نے ہمیں اپنی مسجد دکھائی۔ جس کو گاؤں والوں نے حال ہی میں ۵۰۰ روپے صرف کر کے زیادہ وسیع بنایا تھا۔ اور ہر گھر نے اپنی بساط کے مطابق چندہ دیا تھا۔ مزدور بھی مفت کے تھے۔ صرف تین کاریگروں کو مزدوری دینی پڑی تھی۔ گاؤں میں کوئی انجمن امداد باہمی نہیں ہے۔ لیکن وطنی تعاون کا جذبہ بہت ہے۔ شادی کے موقع پر ہر ایک امداد دیتا ہے۔ پہاڑی کے دامن سے ایندھن جمع کیا جاتا ہے۔ مہمان خانے تک بستر لیجائے جاتے ہیں۔ اور کھانا پکانے کے لئے دھوبی اور نائی کے پاس پانی پہنچایا جاتا ہے۔ جب کوئی مر جاتا ہے تو ماتم پرسی کے لئے آنے والوں کی گاؤں کی طرف سے مہمان نوازی کی جاتی ہے۔ تاکہ متوفی کے وارثوں کو ماتم میں مشغول رہنے کا موقع مل سکے۔ قبر کھودنے والے بھی پڑوسی ہی ہوتے ہیں۔ ہلائی اور کٹائی کے وقت بھی اگر کسی کے پاس اتنا کام ہے۔ کہ وہ سنبھال نہیں سکتا تو اسکی امداد کی جاتی ہے۔ اسی طرح اس وقت بھی اعانت کی جاتی ہے۔ جب کسی کو نئے گھر کے لئے عمارتی

لکڑی لانے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ نمبردار نے بتایا ۔کہ حقیقت یہ ہے ۔کہ اگر کسی شخص کے پاس کوئی کام ایسا ہے جو وہ نہیں کر سکتا ۔ تو ہم اُسے مدد دیتے ہیں ۔یہاں تک کہ دشمنی کی صورت میں بھی ۔ وہ لوگ جن کے آپس میں جھگڑے ہوتے ہیں ۔ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں ۔ اسی کا ذکر کرتے ہوئے پرانے سپاہی نے کہا ۔ اگر میرا دشمن مجھ سے امداد طلب کرے تو میں بخوشی ایسا کروں گا ۔ میرے ساتھی نے جو اس کے متعلق ذرا منکر تھا ۔ بعد میں ایک تعلیم یافتہ زمیندار سے اس کی تصدیق کرالی ۔

فسادات

اس ضلع کی لعنت فساد باہمی ہے ۔ یہاں کے جوانمرد لوگ ایک ایسے جھگڑے سے جس میں ایک فرقہ دوسرے فرقہ سے بڑھنے کی خواہش کرے ۔ اور خون بہ بہ کر جانیں چلی جائیں ۔ محبت کرتے ہیں ۔ میرا ساتھی جو اس ضلع سے خوب واقف ہے ۔ یہ کہتا ہے ۔کہ اس گاؤں میں ۲۵ فیصدی سے زیادہ لوگ اس سے مبرا ہیں ۔ اور اس لئے کہ ان کی تعداد حریفانہ جماعت قائم کرنے کے لئے کم ہے ۔ باقی لوگوں میں یہ آگ سلگتی رہی ہے ۔ اور تقریباً ایک تہائی ٹولوں میں کبھی کبھی بھڑک اُٹھتی ہے ۔ اور لڑائی یا خون کا منظر پیش کرتی ہے ۔ میں نے پُرانے سپاہی سے دریافت کیا ۔ کہ تمہاری جوانی میں حالات کیسے تھے ؟

اس نے جواب دیا ۔ جب میں جوان تھا ۔ تو فسادات کم تھے ۔ پھر زیادہ ہوئے اور اب پھر کم ہیں ۔ جب میں جوان تھا تو جھوٹ بھی کم تھا ۔ اب دیتو کا پارہ بہت ہے ۔ لیکن یہ اللہ کی حکمت ہے ۔کہ جھگڑے کم ہیں ۔ یہ بات اس نے تعلیم اور سزا کی سختی کی طرف منسوب کی ۔ یہ ترقی جنگ عظیم کے بعد سے شروع ہوئی ۔ اس نے لوگوں پر ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے رہنے کی نوبت واضح کردی ۔ اس لئے کہا ۔کہ ہم آدمی کو اس لئے بھی قتل کر دیتے ہیں ۔کہ وہ اپنے آپ کو سردار سمجھتا ہے ۔ اس بات سے اس کا اشارہ کسی گذشتہ قتل کی طرف تھا ۔ جبکہ شخصی حکومتوں کے قوانین موجودہ زمانے کی نسبت زیادہ تشدد سے قائم رکھے جاتے تھے ۔ اس متواتر فساد کی نوبت (سبب نہیں) لوگوں کی متقابلتہً کاہلی سے آتی ہے ۔ علاقہ محض بارش پر انحصار رکھتا ہے ۔ اور بارش چونکہ صرف ۲۴ انچ ہوتی ہے ۔ ضروری ہے ۔کہ پیداوار ادنےٰ قسم کی ہو ۔ اور کسان نومبر سے اپریل تک یعنی بیج بونے سے لے کر فصل کاٹنے تک خالی رہتے ہیں ۔ مویشیوں کیلئے چارہ لایا جاتا ہے ۔ اور اسے کترا جاتا ہے ۔ اور

جب یہ کام ختم ہو جاتا ہے۔ تو ہم بیٹھ جاتے ہیں۔ حقہ پیتے ہیں اور دوسری لڑائی کی تجویزیں سوچتے ہیں۔ میں نے مسٹر گاندھی کا ذکر کیا۔ اور بیکار کسان کے لئے اس کا نسخہ بتایا۔ اس نے کہا اگر ہم کاتیں اور بنیں تو ہماری عزت جاتی رہتی ہے۔ اگر گاندھی اس کا حکم دیگا تو ہم کبھی نہ کریں گے لیکن (یہاں پرانے سپاہی کے احساس ضبط نے اپنے آپ کو سامنے کر دیا) اگر سرکار حکم دے تو ہم ضرور کریں گے۔

سپاہی اور امداد باہمی کا ممبر

دوپہر کے وقت ہم پیدل چل پڑے۔ ہمارا راستہ کھلے دلدلی علاقہ میں سے جاتا تھا۔ جہاں ننھی ننھی گیہوں چھوٹے چھوٹے چبوترہ نما کھیتوں میں اُگی ہوئی تھی۔ وہ چبوترے جنہیں اکثر کئی کئی فٹ اونچی دیواروں سے سہارا دیا تھا۔ کسانوں کی محنتِ شاقہ کا پتہ دیتے تھے۔ لیکن کاشتکاری معمولی درجے کی تھی۔ یہاں تک کہ ہم بوچھل کلاں پہنچے۔ جس کے چاروں طرف کھیتوں کو احتیاط سے تیار کر کے کاشت کیا گیا تھا۔ بوچھل کلاں ایک بڑا گاؤں ہے۔ اور ۸۰۰ گھروں پر مشتمل ہے اور صفائی کے لحاظ سے پنجاب کے چھوٹے بڑے تمام گاؤں میں سے جو میں نے دیکھے ہیں۔ پہلا گاؤں ہے۔ بیرونی اطراف کی بعض گلیاں گرد اور کوڑے میں سے اپنا حصہ لئے ہوئے تھیں لیکن وہ پیچ در پیچ راستے جن سے ہم نے بکھرے ہوئے گاؤں میں سے اپنا راستہ لیا۔ تقریباً بے داغ تھیں۔ اور دونوں طرف کے گارے سے لپے ہوئے گھروں کی بسکٹ جیسے رنگ والی کھڑکیوں سے محروم دیواریں لیپ کر صاف اور ہموار کی ہوئی تھیں۔ اور بہت سے صحن جنکی ہمیں جھلک پڑتی رہی۔ احتیاط سے جھاڑ دیئے ہوئے تھے۔

دیہاتی زندگی میں جب کوئی چیز خاص طور پر اچھی پائی جاتی ہے۔ تو قریب قریب ہمیشہ کوئی ہستی اسکی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس صورت میں یہ کام ایک مہذب اور با اثر صوبیدار کا ہے۔ وہ ستر اور اس سے کچھ زیادہ سال کو خیرباد کہہ چکا ہے۔ اور اب اسکی سفید داڑھی سرخی مائل بھورے چہرے پر جھالر کی طرح لٹک رہی ہے۔ وہ قریب قریب جڑی ہوئی آنکھوں کو چوکنا کرنے والی ناک موٹے مگر گٹھے ہوئے ہونٹوں۔ مضبوط لمبی انگلیوں اور پتلی کلائیوں کے ساتھ رئیس خاندان کے اُن سرکش بوڑھے آدمیوں سے ایک کی یاد دلاتا تھا۔ اور اس میں شک نہیں۔ کہ رئیس خاندان کے سب سے پہلے شخص کی طرح اس میں سختی مستقل مزاجی اور

فرمانروائی کی عادت پتھریلی زمین اور شدید آب وہوا کی وجہ سے تھیں۔ تیس سال گذرے جب وہ چین میں فوجی ملازمت کرنے کے بعد واپس آیا۔ تو اس نے دیکھا۔ کہ یہاں کی گرد ناقابل برداشت ہے۔ جتنا کوئی شخص چین میں ایک ماہ میں گندہ ہوتا تھا۔ یہاں ایک منٹ میں ہو جاتا تھا۔ اس لئے لوگوں کو صفائی کی تلقین کرنی شروع کی۔ اور کچھ عرصے بعد وہ اپنے گھروں کو ہر روز صاف کرنے اور اپنے گھر کے سامنے گلی میں جھاڑو دینے لگے۔ چونکہ زمین سخت پتھریلی ہے۔ اس لئے ابھی کھاد کے گڑھے نہیں کھودے گئے ہیں۔ لیکن خیال ہے۔ کہ ان کی بجائے پتھر کی دیواروں سے چھوٹے چھوٹے احاطے بنا لئے جائیں گے۔

پودے لگانا

مجھے یہ دیکھ کر رنج ہؤا کہ دو دو اور تین تین اُپلے جوڑی چھتوں والے گھروں کی دیواروں پر اوپر نیچے قطاروں میں لگے ہوئے تھے۔ پرانے زمانے میں ایندھن گورنمنٹ کے احاطۂ جنگلات میں سے لیا جا سکتا تھا۔ لیکن اب اس کی ممانعت ہے۔ اور اسکی بجائے اُپلے جلانے پڑتے ہیں۔ اس کا ظاہری علاج یہ ہے۔ کہ لوگ خود درخت لگائیں۔ چند آدمیوں نے ایسا کیا ہے۔ لیکن معمولی درجے کا سکول ماسٹر گاؤں کی بہبودی میں اس قدر کم حصہ لیتا ہے۔ کہ اُن سات میں سے جو ٹینک کے معائینے کے وقت موجود تھے۔ صرف دو نے کچھ کام کیا تھا بہرکیف ان میں سے ایک نے سکول کے سامنے ۸ا درخت لگائے تھے۔ سوائے ایک لڑکے کے جس نے مسٹر برین کی نصیحت پر عمل پیرا ہو کر انجیر کے کچھ درخت لگائے۔ دوسرے پودے لگانے والے لوگ سپاہی تھے۔ اگرچہ اور کسی جگہ بھی انہیں اسقدر آسانی سے نہ پانی دیا جا سکتا ہے۔ اور نہ دیکھ بھال کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس پر بھی صرف ایک شخص ایسا تھا جس نے اپنے صحن میں پھلدار درخت (بادام وسیب) لگائے ہوئے تھے۔ وہ ایک مستعفی ای۔ سی۔ او تھا۔ جو دبلا اور سخت گیر نظر آتا تھا۔ کاشتکاری کا اس قدر دلدادہ تھا۔ کہ لوگوں میں اس کا لقب "مالی" پڑ گیا تھا۔ صوبیدار نے کہا۔ کہ جب کسی کے ہاں فصل نہیں ہوتی۔ تو وہ اس کے حاصل کرنے کا انتظام کر دیتا ہے۔ ایک مرتبہ اس خیال سے کہ جوتائی کا قیمتی وقت ضائع نہ ہو۔ جب وہ دوپہر کا کھانا کھانے لگا۔ تو اپنی بیوی کو ہل چلانے پر لگا دیا۔ لیکن اس کے پڑوسی اس پر ہنسے۔ اور اس نے یہ تجربہ پھر نہ دوہرایا۔ اس کے صحن میں بیناسنے پہلی مرتبہ

دیکھا۔ کہ پنجاب کے کسی گاؤں میں مرغی خانے کے لئے کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ یہ محض کھمبوں اور اُن کے گرد محض تاروں کی جالی لپیٹنے سے بنا ہوا تھا۔ لیکن اس میں وہ جراثیم تھے۔ جن سے ایک بڑے مرغی خانے کے وجود میں آنے کا امکان تھا۔

کاشتکاری

آج کے اجلاس میں فوجی نمایندے کافی تھے۔ اُن پچاس ممبروں میں سے جو سکول میں (جہاں ہم اکٹھے ہوئے تھے) ایک کپڑے کے فرش پر بیٹھے تھے۔ تقریباً چالیس نے فوجی خدمات انجام دی تھیں۔ تیرہ خواندہ تھے۔ اور یہ نسبت معمول سے زیادہ تھے۔ اور فوج کی وجہ سے تھی۔ اور وہ اس بات پر پورا زور دیتے تھے۔ کہ تعلیم کاشتکاری کے لئے مفید ہے۔ اسکے باوجود گاؤں میں ایک ترقی یافتہ نہیں ہے۔ اور بیج کی بہترین اقسام میں سے ایک قسم (پنجاب نمبر ۸۔ الف) صرف اسی سال بطور آزمائش بوئی گئی ہے۔ ولیسی ہل کو یہ کہکر جائز ٹھیرا لیا گیا تھا۔ کہ زمین اسقدر خشک ہے۔ کہ میسٹن ہل نہیں چل سکتا۔ اور مقامی بیل اتنے کمزور ہیں۔ کہ اسے کھینچ نہیں سکتے۔ لیکن انہوں نے کبھی اسکی آزمائش نہ کی تھی۔ میں نے صوبیدار سے دریافت کیا "جب سے آپ چین سے واپس آئے ہیں۔ کیا کاشتکاری میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے"؟ اس نے کہا کہ فصلوں کا دور اسی طرح ہے۔ ایک اپریل میں کاٹی جاتی ہے۔ اور پھر سال بھر تک خالی۔ لیکن گذشتہ دنوں میں کسان اپنی زمین صرف دو یا تین بار جوتتا تھا۔ اور اب آٹھ یا نو مرتبہ۔ ان دنوں میں کھاد بھی کم استعمال کیا جاتا تھا اب اسکی بہت قدر کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ کوڑا کرکٹ بھی جمع کیا جاتا ہے۔ اور کھیتوں میں ڈالا جاتا ہے۔ یہ اثر زراعتی تعلیم کا نہیں ہے۔ بلکہ بڑھتی ہوئی آبادی کے سبب سے ہے جس کے لئے زیادہ خوراک درکار ہے۔ جائیدادیں اسقدر قلیل ہوگئی ہیں۔ (انجمن کے ۸۷ ممبروں کے پاس ۶۰۰۔ ایکڑ زمین ہے) کہ لوگ مجبور ہوگئے ہیں۔ کہ زمین میں سے مختلف طریق سے روپیہ حاصل کرکے اپنی آمدنی میں اضافہ کریں۔ یہ خصوصیت تمام پہاڑی سلسلے کے لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ اور ممبروں کی متفرق آمدنی ۲۰٫۰۰۰ روپیہ کی ہے۔ اس کا بڑا ذریعہ فوجی ملازمت ہے۔ لیکن مویشیوں کا بیوپار بھی ایک اہم ذریعہ ہے۔ مویشی عمدہ نسل بڑھانے والے دھنی کے میدانوں سے لائے جاتے ہیں۔ اور جنوب کی طرف نو آبادیوں میں

فروخت کئے جاتے ہیں۔ نوآبادیوں میں سے بھوسہ خریدا جاتا ہے۔ اور تبادلہ کیلئے پہاڑیوں میں روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ اسکی وجہ سے کسی اور جگہ کی عام حالت کے خلاف یہ دیہات کی رقوم ادا کر رہے ہیں۔

خونریز لڑائیاں

بوچھل کلاں میں اگر ایک بات نہ ہو۔ تو یہ نمونہ کا گاؤں کہا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ فسادات کی پھیلتی ہوئی بیماری اسے بھی لگ گئی ہے۔ چند ماہ گذرے یہاں ایک قصہ ہوا۔ اور ایک آدمی جان سے مارا گیا۔ اب بیس آدمیوں کی پیشی لگ رہی ہے۔ اور گاؤں دو گروہوں میں منقسم ہے۔ لیکن اجلاس میں دونو گروہ حاضر تھے۔ خطرہ یہ ہے کہ یہ معاملہ بڑھکر خونریز لڑائی کی صورت نہ اختیار کرے۔ شاہ پور میں فسادات زیادہ تر بڑے جاگیرداروں کی رقابت کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں (زمینداروں کا کوئی کنبہ مشکل سے ایسا ہوگا جوان میں سے کسی نہ کسی کے ساتھ لگا ہوا نہ ہو) لیکن کوہستان نمک میں یہ جھگڑے قدیم خاندانی قضیوں کی جو نسلاً بعد نسل چلے آئے ہیں۔ پوری پوری تلخی اور تشنگیٔ خون لئے ہوئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسکی پہاڑیوں کی پتھریلی زمین سے دشمنوں کے لئے مخالفت کے ایسے چشمے پھوٹتے ہیں۔ جو خشک نہیں ہونے پاتے۔ فلسطین میں پہاڑیوں کی پتھریلی زمین کا بھی یہی حال ہے۔ وہاں ایک عربی جھگڑے کے دوران میں پھل دار درختوں تک کو کاٹ دیتا ہے۔ یہاں دشمن کے درخت تو چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ لیکن اسکی جان ضرور بہر وحشیانہ و ظالمانہ طریق سے لے لی جاتی ہے۔ ایک دیہاتی پر یہ شبہ ہو گیا۔ کہ اس کی ایک عورت سے آشنائی ہے۔ اس عورت کے عزیزوں نے اُسے چائے کی دعوت دی۔ وہ گیا۔ اور گیارہ آدمیوں نے اُسے پکڑ لیا۔ اُنھوں نے تیز پتھر لئے اور گھٹنوں سے نیچے کے جوڑ یہاں تک توڑے کہ وہ اس کی ٹانگوں کو اس کے بازوؤں سے باندھ سکے۔ دو دن بعد وہ ہسپتال میں مرگیا۔ انتقام کا جذبہ کسی قانون حدبندی کو تسلیم نہیں کرتا۔ ایک مرتبہ ایک لڑکی کو اغوا کر لیا گیا۔ شادی کردی گئی۔ لیکن خاندانی عزت پر بٹہ اسی طرح لگا رہا۔ بہر کیف اس وقت کچھ نہ کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اس کا باپ مرگیا تھا۔ اس کے بھائی نابالغ تھے۔ پچیس برس گذر گئے۔ اور آخر کار وہ جھگڑا مٹا دیا گیا۔ ایک اور معاملے میں

ایک شخص تین آدمیوں کے قتل میں اُلجھا لیا گیا۔ جن میں ہر ایک ایک علیحدہ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ تینوں خاندانوں کے سات ممبر جمع ہوئے۔ اور اسے قتل کر دیا یہ فعل امداد باہمی کی ایک ہیبت ناک صورت ہے (پہلے قتل کو بائیس برس گذر چکے تھے) واقعہ کا بہت پرانا ہونا بھی بچاؤ کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ الف نے ب کو زخمی کیا اور ب زخم کی وجہ سے مرگیا۔ پھر ب نے الف کے بیٹے کو دن دہاڑے قتل کر دیا۔ ایک لڑکے کے والدین نے اُسے کہا۔ کہ تم اپنے دوست کے ساتھ مت کھاؤ پیو۔ کچھ عرصہ بعد آخر الذکر قتل کر دیا گیا۔ یہ تمام کے تمام مقابلتہً حال ہی کے واقعات ہیں۔ اگر مائیں بُرا سلوک کریں۔ تو وہ بھی محفوظ نہیں ہیں۔ شاہ پور کے ایک جاگیر دار نے مجھے ایک ایسا واقعہ سُنایا۔ جو اسکی اپنی قوم میں رونما ہوا تھا۔ میں نے دریافت کیا۔ کہ تم نے اس قاتل کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ جو کبھی نہ کسی طرح سے پھانسی سے بچ نکلا۔ اُس نے جواب دیا۔ جب وہ جیلخانہ سے واپس آیا۔ تو پہلے پہل ہم نے اسے اپنی صحبت میں نہ بیٹھنے دیا۔ لیکن اس نے ہم سے درخواست کی۔ اور عاجزی دکھائی۔ تو کچھ لوگ اسکی طرف ہو گئے۔ پس ہم نے پھر اُس کا حقہ پانی کھول دیا۔

اعوان جھگڑا کرنے میں سب سے بڑے ہیں۔ آج ہم انہیں میں بیٹھے تھے۔ یہ لوگ یہاں سے لے کر سکیسر کی چوٹی تک آباد ہیں۔ جو سلسلۂ نمک کے مغربی سرے پر دریائے سندھ کی وادی جھانکتی ہے۔ وہ بہادر سے بہادر سپاہی کڑے سے کڑے کاشتکار اور لاثانی خیمہ لگانے والے ہیں۔ لیکن ان میں نقص یہ ہے۔ کہ انتقام کے جذبے کی اونٹ کی طرح دل ہی دل میں پرورش کرتے ہیں۔ ایک بار جب ایک اعوان نے مجھے بتایا۔ کہ حال ہی میں چار آدمی میرے بھائی کو قتل کرنے کے جرم میں پھانسی دیئے گئے ہیں۔ میں نے اس سے پُوچھا تم اس طرح کیوں لڑتے ہو؟ اور کیوں قتل کرتے ہو؟ اس نے جواب دیا۔ کہ یہ انسانی فطرت ہے۔ یہ بات کسی کے اختیار کی نہیں ہے۔ خدا نے جیسا ہمیں پیدا کیا ہے۔ ہماری فطرت ویسی ہی ہے۔ یہ ہوا اور پانی کا بھی اثر ہے۔ (دوسرے لفظوں میں آب و ہوا کا) فلسطین کی طرح ان پہاڑیوں کی آب ہوا خشک ہے۔ اور اس کا اثر مزاج میں گرمی پیدا کرتا ہے۔ اور اعصاب پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ ایک تعلیمیافتہ اعوان جو اب میدانی علاقہ میں رہتا ہے۔ بیان کرتا ہے۔ کہ جب میں اپنے پہاڑی گھر کی طرف لوٹتا ہوں۔ تو یہی احساس پیدا ہوتا ہے۔ یہی بات جہلم کے شمال اور مغربی خشک علاقے پر صادق آتی ہے۔

لیکن کسی قدر کم ۔ اور موت اکثر محض اس وجہ سے وقوع میں آتی ہے ۔ کہ کوئی آتشیں دماغ تیز ہو جاتا ہے اور بھڑک اٹھتا ہے ۔ مثال کے طور پر وہ واقع کہ جب چند پہاڑی حجلا ہے اس مٹھائی پر جھگڑ پڑے ۔ جو ان کو اپنے پیر کی خدمت میں پیش کرنی تھی ۔ اس خطے میں زندگی کا معیار بھی پست ہے ۔ اور اسی نسبت سے زندگی کی قیمت بھی کم ہے ۔ اس کا علاج یہ ہے ۔ کہ معیار کو بلند کیا جائے ۔ لیکن جہاں مٹی کی تہ پتلی اور پتھریلی ہے ۔ اور کاشتکاری کم اور خیالی بارش پر منحصر ہے ۔ زمین کی حالت سے ایسا کرنا آسان نہیں ہے ۔ خوش قسمتی سے فوج ایک ایسا ذریعہ ہے ۔ اور اسی میں لوگوں کی نجات ان کے مزاجوں کا ضبط میں لایا جانا وسعت خیالات اور معیار کی بلندی ہے ۔ خونریز لڑائی کے جذبہ کو قابو میں لانا مشکل ہے ۔ جس طرح زیادہ مہذب لوگوں میں ممکن ہے ۔ کہ حب الوطنی کا جذبہ انہیں اس امر پر مجبور کرے کہ وہ اجتماعی حیثیت سے ایک دوسرے کو مار دیں ۔ اسی طرح تہذیب سے مبرا لوگوں میں یہ ممکن ہے ۔ کہ خاندانی وفاداری انہیں اس پر مجبور کرے کہ وہ ایک دوسرے کو فرداً فرداً ہلاک کر دیں ۔ ایک وفاداری اتنی ہی خالی از رحم ہے ۔ جتنی کہ دوسری ۔ اور اس کے نتائج وہی ہیں ۔ جو آج ۲۴۰۰ پہلے اس وقت تھے ۔ جب ایک بہت بڑے یونانی شاعر نے قدیم دنیا کے عظیم ترین خونریز فساد کو نظم کرتے ہوئے تحریر کیا کہ دختران انتقام یوں نعرہ زن ہیں ۔ کہ بربادی ہمارا حصہ ہے ۔ تباہی ہمارا شیوہ ہے ۔ خون ریزی ہمارا وتیرہ ہے ۔ ہم امن و امان کا خاتمہ کر دیتی ہیں ۔ ہم خون ریزی کا ساتھ دیتی ہیں ۔ اور گناہ کی پیروی کرتی ہیں ۔

"جب ہم شروع ہو جاتی ہیں تو اخیر تک قدم جمائے رکھتی ہیں" ۔ ساری داستان غم اسی میں ہے ۔ اور والدین کے جذبات بچوں کے ہاتھوں کو رنگین کر دیتے ہیں ۔ اور دلوں پر لگتا ہے ۔ اور دل قتل اور ظالمانہ خونریزی سے پیدا شدہ ضمیر اپنی اور اپنے ساتھیوں کی ہستی اور نقصان سے متکبرانہ بے اعتنائی کی وجہ سے سخت ہو جاتے ہیں ۔ بھلائی عجیب طور پر برائی سے خلط ملط ہے ۔ لیکن اس میں دلیر انسان کی خوبی (رحم) کیلئے کوئی جگہ نہیں ہے ۔

علاج

اس کا واحد علاج تعلیم اور بیرونی دنیا سے ملاپ ہے ۔ قید خانے اور جلاد اسی سال

بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصے سے آزمائے جارہے ہیں۔ (ایک دن جب میں شہر جہلم میں تھا
تو صرف ایک ہی مقدمے میں نو آدمیوں کو پھانسی دی گئی تھی) لیکن پھر بھی سونت جھگڑے جاری
ہیں۔ اور عدالتیں اتنی مصروف ہیں جتنی کہ ہوسکتی ہیں۔ اگر کوئی تبدیلی ہوئی ہے۔ اور
بہترین مصنف اس امر پر متفق ہیں۔ کہ کچھ ہوئی ہے۔ لیکن وہ زیادہ نمایاں نہیں ہے۔ تو وہ
اپنی وجوہ کی بنا پر ہوئی ہے۔ جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ وہ نظریہ جو ایک مستعفی ہندوستانی
افسر نے پیش کیا۔ جس سے میں ایک ایسے چھوٹے قصبے میں ملا۔ جہاں ایک ہائی سکول بھی
تھا۔ اس مضمون پر بہترین رائے کی ایک تمثیل ہے۔ ہائی سکول نے بڑا فرق ڈال دیا
ہے۔ وہ بچے جن کو اب تعلیم دی جارہی ہے۔ جب جوان ہونگے۔ تو ان کے خیالات
اُن کے والدین جیسے نہ ہونگے۔ خیالات پہلے سے بھی بدلے ہوئے ہیں۔ لوگ میدانی
علاقوں میں جاتے ہیں۔ اور نہری آبادیوں کو دیکھتے ہیں۔ (اس کا اشارہ اس نئی سڑک کی
طرف تھا۔ جو پہاڑ اور میدانی علاقے کو ملاتی ہے) وہ دیکھتے ہیں کہ وہاں کے لوگ
اپنے کام کاج اور خیالات کے لحاظ سے اُن سے مختلف ہیں۔ اور یہ کہ کام کرنے کے اور طریقے
بھی ہیں۔ اس علاقے میں گورنمنٹ کا پہلا فرض یہ ہے۔ کہ اس طول و عرض میں تعلیم پھیلائے
رہی یہ بات کہ تعلیم نے ابھی تک بہت کم اثر دکھایا ہے۔ اس کی وجہ تعلیم کی محدود گنجائش ہے
اس قدر محدود کہ اب بھی اس ضلع میں صرف ۱۴ فیصدی مرد اور ۵ فیصدی عورتیں ہیں۔
اور وہ بھی دس سال سے زیادہ عمر کی خواندہ ہیں۔ مؤخر الذکر اعداد و شمار خاص معنی رکھتے ہیں
کیونکہ ہو نہ ہو عورتیں ہی تمام فسادات کی جڑ ہوتی ہیں۔ وہ تصور ہی تصور میں اپنے دشمنوں کے
خون کو اپنی چھاتیوں کے دودھ میں ملاتی ہیں۔ ابتدائی زمانہ سے وہ اپنے بچوں کو سکھاتی
چلی آئی ہیں۔ کہ انہیں کس سے نفرت کرنی چاہیئے۔ اور کس کو قتل کرنا چاہیئے۔ اور اگر پورا
آدمی بن جانے پر وہ اپنا ہاتھ روکیں۔ تو وہ انہیں بزدلی کے طعنے دیتی ہیں۔ اس جگہ کے
نزدیک ہی ایک عورت نے جس کا بھائی قتل کردیا گیا تھا۔ قرآن مجید اٹھا کر یہ قسم کھائی
کہ جب تک اس کے خون کا بدلہ نہ لے لونگی۔ دائیں ہاتھ سے کھانا نہ کھاؤں گی۔ اور قاتل
کے خون کے گھونٹ بھرونگی۔ وہ وقت آیا۔ عورت کو ملا یا گیا۔ اور اسکی قسم پوری کی گئی۔
زنانہ سکول جاری کرنے کیلئے کیا کوئی اس سے زیادہ قوی دلیل ہوسکتی ہے۔ اس
پر بھی ہر سات لڑکوں کے بدلے ایک لڑکی پڑھتی ہے +

جب ہم ایک پہاڑی کی چوٹی پر پہنچے۔ اور نیچے وادی میں کلر کاہر گاؤں اور اسکی وسیع جھیل دیکھی تو شام کا اندھیرا چھا گیا تھا۔ اور سردی سخت تھی چونکہ یہ جھیل مرغابیوں کیلئے بہت مشہور ہے۔ اس لئے یہاں کی قیام گاہ مسافروں کیلئے قابل تعریف طور پر سامان سے آراستہ کی ہوئی ہے۔ لیکن نوکروں کیلئے ایسی نہیں۔ کیونکہ میرے سائیس اور گھسیارے کے لئے کمرے نہیں ہیں۔ چوکیدار نے معذرت کے طور پر کہا" آپ صاحب گھوڑوں پر نہیں آئے"۔

کرسمس کا دن۔ کلر کاہر سے پوائسیدن شاہ (۱۸ امیل)

کلر کا ایک دلکش جگہ اور یوم کرسمس کے شایان شان ہے۔ قیام گاہ پہاڑی کے دامن میں واقع ہے۔ جہاں سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ اور ان پر پھلدار درخت اُگے ہوئے ہیں۔ انار۔ کیلا۔ سیب اور آڑو۔ اور نیچے نرسل والی جھیل ہے۔ جو مرغابیوں اور شکاریوں کی جان ہے۔ آج وہ دن ہے کہ بندوق خوب آرام لے سکتی ہے۔ اور پرندے پُر سکون حالت میں استراحت کر سکتے ہیں۔ لیکن کسی اور موقع پر پہلے تماشا نے پر ہی دیر وقت تڑکے اور طلوع آفتاب کا درمیانی وقت تھا) وہ ہزاروں کی تعداد میں بلند پرواز ہوئے۔ انہوں نے اپنے پروں کی پھڑپھڑاہٹ اور شاں شاں کی آواز سے ہوائیں گونج پیدا کر دی۔ اوران کے وسط میں سُرخ ہوتے ہوئے آسمان کے مقابل ابابیلوں کی ایک اُڑان آگے پیچھے اور اوپر نیچے چکر کاٹ رہی تھی۔ تمام طرف قمچیاں، قمچیاں اور پرہی پر نظر آرہے تھے۔ میرا ساتھی اور میں دوپہر کے وقت چل پڑے۔ ہم ایک کم گہری چوڑی وادی کے ساتھ ساتھ چلے۔ جو نئی پھوٹی ہوئی گیہوں سے سر سبز تھی۔ پہاڑیاں دونوں طرف ننگی اور بنجر تھیں۔ اور کہیں کہیں سیاہ مستطیل سوراخوں نے شگاف پیدا کئے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا پیچھے کی دنیا کے دروازے ہیں۔ اور دراصل وہ پہاتی گھروں کے دروازے تھے۔ کوئی آبادی اس سے بہتر طور پر انسان و قدرت کے درمیانی رشتہ ارتباط کو ظاہر نہیں کر سکتی۔ ان گاؤں میں سے ایک میں حالی ہی میں ایک۔ خاص قسم کا جرم وقوع میں آیا۔ .. سال گذرا کہ ایک شخص کو اس کے بھتیجوں نے قتل کر دیا تھا۔ ان کی پیشی لگی اور چھوڑ دیئے گئے۔ گنبہ کے سب سے بڑے آدمی نے یہ

محسوس کر کے کہ میں اس کام کو نہیں کر سکوں گا۔ ایک خونی کو اجرت پر لے لیا۔ (کوہستانِ
نمک میں ایسے لوگ چند سو روپے پر بلائے جا سکتے ہیں) ایک گاؤں میں جہاں قاتل کبھی
کبھی جایا کرتا تھا۔ خونی کا ایک رشتہ دار بھی رہتا تھا۔ تھوڑے عرصے میں اتفاق سے
دونوں ایک ہی دن وہاں پہنچے۔ اگلی صبح جب قاتل اپنے گاؤں کو واپس آ رہا تھا۔ اتفاق
سے پھر خونی سے آ ملا۔ اور اس کا ساتھی بن گیا۔ دونوں میں دوستانہ ہو گیا۔ اور خونی نے
اس کلہاڑے کی جو قاتل لئے جا رہا تھا۔ طاقت اور خوبصورتی پر دلکش الفاظ میں تبصرہ
کرنا شروع کر دیا۔ اور اس سے دیکھنے کے لئے مانگا۔ جونہی یہ اس کے ہاتھ آیا۔ اس نے
قاتل کو ضرب لگائی۔ اور قاتل مقتول بن گیا۔ یہ داستان اس لئے بیان کی گئی۔ کہ آج
جس شخص سے ہم پہلے پہل سڑک پر ملے۔ اس قدر دلفریب وضع کا کلہاڑا لیے ہوئے تھا
(جس کا دستہ سرخ اور پھل پر کھدائی کا کام کیا ہوا تھا) کہ میں نے ارادۃً وہ کلہاڑا
اس سے لیا۔ اور اسکی تعریف کی۔

سبزیاں اور کنوئیں

"ہم نے ایک کھیت میں ایک آدمی اور اسکی بیوی کو ایندھن کی ٹوکری جنگلی اپلوں
سے بھرتے ہوئے دیکھا۔ وہ زمین کو اس طاقت دینے والی شئے سے بھی محروم کر رہے
تھے۔ اور اس سے زیادہ جہالت کی بات یہ تھی۔ کہ ان کا بچہ بیمار تھا۔ اور انہوں نے
ابھی ابھی ایک فقیر کی خانقاہ پر ایک بکری ذبح کی تھی۔ تاکہ وہ اچھا ہو جائے۔ ایک اور
کسان جو برہما کی فوجی پولیس میں رہ آیا تھا۔ زیادہ سمجھدار تھا۔ اس کے پاس ایک کنواں
تھا۔ اور وہ اس کے گرد گاجریں اور پیاز اگاتا تھا۔ لیکن اس میں بھی خامیاں موجود تھیں۔
اعوان ہونے کی وجہ سے وہ اپنی سبزیوں کو ٹوکرے میں ڈال کر ایک معمولی سبزی بیچنے
والے ملیار کی طرح نہیں پھیریگا۔ اس سے اس کی عزت پر حرف آ جائے گا۔ اور وہ دوسرے
اعوانوں کی نگاہوں میں گر جائے گا۔ ذرا آگے ایک اور شخص اپنی خوبصورت نوجوان بیوی
کے ساتھ پیاز اور گاجروں میں کام کر رہا تھا۔ اس کی بیوی نے بغیر کسی حجاب کے ہماری
گفتگو میں حصہ لیا۔ [illegible] بیچنے میں کوئی عار نہ تھی۔ اس پر کہ وہ اپنے آپ کو
اعوان کہتا تھا۔ بہرکیف اس نے یہ بھی تسلیم کیا۔ کہ دوسرے اسے ملیار کہتے تھے۔ ملیار کا

مفہوم سبزی کاشت کرنے والے سے ہے۔ وہ اوّل درجے کا کاشتکار ہوتا ہے۔ پہاڑیوں میں بہترین زمین کا اکثر حصہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ ہر ایک جگہ وہ زمین جو موقع اور طاقت کے لحاظ سے بہترین ہوتی ہے۔ خود بخود بہترین کاشتکاروں کے زیر کاشت آ جاتی ہے کیونکہ صرف وہی لوگ سب سے زیادہ لگان ادا کر سکتے ہیں۔ لیکن ایسی زمین میں پانی یقینی طور پر بہم پہنچانا ضروری ہے۔ اور اس پتھریلی زمین میں سخت چٹانوں میں کوئی حوض بنانا یا سنگ خارا میں اُبلتے پانی کا کنواں کھودنا روپے کا کام ہے۔ ہم ایک کنوئیں کے پاس سے گذرے جس کا نصف تعمیر ہو چکی تھی۔ اور جس کا قطر ۱۲ فیٹ اور نیچے پانی تک کی ۵۴ فیٹ تھی۔ اس کی بیرونی طرف پتھر لگیں گے۔ اور قیمتیں گر جانے کے باوجود اس پر ایک ہزار روپیہ لاگت آ جائیگی۔ اور آگے مغرب کی طرف وادئ سون میں جہاں پانی ۲۰ یا ۲۵ فٹ تک نکل آتا ہے۔ کنواں لگوانے پر ۵۰۰ روپے سے کچھ زیادہ لاگت نہیں آتی۔ لیکن دونوں علاقوں میں مشکل یہ ہے۔ کہ ایک کنوئیں سے صرف ½ ۲ ایکڑ گرمیوں میں اس سے بھی کم زمین سیراب کی جا سکتی ہے۔ جہاں اس کے مقابلے میں جہلم کے دریائی علاقے میں ایک کنوئیں سے ۱۵ سے ۲۰ ایکڑ تک زمین سیراب کی جاتی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ پانی کی سطح ایک ہی بار کنواں چلانے سے بہت جلد نیچے چلی جاتی ہے۔ اور چند گھنٹوں کے بعد پانی کی سطح اوپر اٹھانے کے لئے کنواں بند کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے باوجود کنوئیں سے زیادہ اچھی اور ایسی کاشتکاری کی جا سکتی ہے جس میں خرچ اور آمدنی کا توازن قائم رہتا ہے۔ اور یہ کاہلی کا بہترین علاج ہے۔ کنوئیں کے بغیر صرف گیہوں۔ جو۔ باجرہ اور چنے پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ چونکہ جائیدادیں تھوڑی ہیں۔ ہر سال کئی کئی ماہ بیکار رہنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر کنواں ہو تو ان فصلوں میں مرچ پیاز اور مکئی کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اور گھر کے لئے کچھ کپاس بھی بوئی جا سکتی ہے۔ اگر کوئی شخص ملیار ہے۔ یا کوئی اعوان۔ اپنی بے عزتی کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ تو وہ سبزیاں بھی اُگا سکتا ہے۔

عزّت

فخر یا عزت کا احساس پنجابی کے گہرے احساسات میں سے ہے۔ اور اس لئے

اس کا بہت احترام کرنا چاہیئے۔ یہ اسے جان سے بھی زیادہ عزیز ہونے کی وجہ سے اچھا سپاہی رہنے کو وہ ہے بننے میں امداد دیتا ہے۔ لیکن یہی احساس اسے خونریز لڑائیوں کے لئے مخصوص کر لیتا ہے۔ اور اکثر اسے ایک معمولی درجے کا کسان بنا دیتا ہے۔ بیلا کے مقام پر ایک سپاہی جو ہانگ کانگ سے واپس آیا تھا چینی کسانوں کی کاشتکاری کا پورا نقشہ پیش کرتا تھا۔ میں نے اس سے دریافت کیا۔ کہ تم پنجابی کسان کی نسبت کیوں زیادہ اچھا کام کرتے ہو۔ اس نے مشرح جواب دیا وہ اپنی عزت کا کچھ خیال نہیں کرتے"۔ میرے ساتھی کا بیان ہے کہ اس ضلع کا دگجرات ٹرائے جاٹ اپنے آپ کو ہر مصیبت میں ڈال لیگا۔ لیکن اپنے حقے کی چلم نہیں بھرے گا۔ اسی قوم کے لوگوں نے جن سے ہم گذشتہ ہفتہ ملے۔ یہ کہا کہ ہم ہرگز انڈے فروخت نہیں کرینگے۔ (اگرچہ ان کے گاؤں کے ملازمین فروخت کرتے ہیں) خوش قسمتی سے انقلاب کے آثار نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ بیلا میں اب زمیندار دودھ بیچتے ہیں۔ اور وہ ایک ایسی بات ہے۔ جو وہ بیس برس پہلے کبھی نہ کرتے۔

جنجوعہ اور اعوان

چند میل آگے ہم نے ۵۰ زمینداروں کو ایک گاؤں کے نشیب میں سڑک کے کنارے اکٹھا دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا یہ واقعہ اٹلی میں کسی ڈھلوان پہاڑی کے اوپر ہو رہا ہے۔ وہ (اعوان اور جنجوعے) دو دیہاتی بنکوں کے ممبر تھے۔ تمام علاقہ جنجوعہ لوگوں کے پاس تھا۔ لیکن انہیں عزت کا اس قدر خمار چڑھا ہوا تھا۔ کہ وہ جان و دل سے اپنے کھیتوں کی طرف متوجہ نہیں ہو سکے تھے۔ اعوان لوگوں نے جو اس لحاظ سے کچھ زیادہ بڑے نہیں ہیں۔ ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اپنی حالت زیادہ اچھی بنالی ہے۔ اور اب وہ ایک دوسرے کے سخت حریف ہیں۔ اور یہ بات کل کے اجلاس میں ظاہر ہو گئی۔ جب کہ ایک پرانے اعوان سپاہی نے ایک ز ٹیل قافیہ نظم پڑھی۔ جس کا کچھ ترجمہ ذیل میں دیا جاتا ہے:۔

"ہم اعوان ہیں۔ ہم جنگ میں گئے۔ اور کسی معاوضہ پر یا بغیر اس کے لڑے۔
ہم نے جرمنی کی توپوں کے سامنے اپنے سینے کھول دیئے۔ اور وہ قید ہونگی

طرح بھاگ گئے۔ لیکن جنجوعہ قوم کے لوگو! تم اس وقت رات اور دن گھروں میں چھپتے پھرتے تھے۔"

یہ ایک مضحکہ خیز بہتان ہے۔ کیونکہ جنجوعہ قوم کے لوگوں نے جنگ عظیم میں اتنا ہی اچھا کام کیا ہے۔ جتنا کہ کسی اور نے۔ اگر اعوان یہ سمجھتے ہیں۔ کہ انہوں نے زیادہ بہتر کارنامے دکھائے ہیں۔ تو وہ اس وجہ سے ہے۔ کہ ان کے گاؤں ڈلمیال نے جو یہاں سے نزدیک ہی ہے۔ ہندوستان کے تمام گاؤں سے زیادہ رنگروٹ بھرتی کرائے۔ ۱۹۲۱ء میں مردوں کی ۸۷۵ کی آبادی میں سے ۴۶۰ نے جنگی خدمات انجام دیں۔

فوج اور کسان

دونوں بنکوں کے ممبروں نے کہا۔ کہ ہمارے گھرانوں میں سے ۹۰ فیصدی لوگ فوج سے علاقہ رکھتے ہیں۔ اس لئے دیہاتی زندگی پر فوجی اثرات کا اندازہ لگانے کا یہ ایک اچھا موقع تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ دونو بنک اچھی حالت میں تھے۔ خاص طور پر وہ جو زیادہ دیر سے قائم تھا۔ ۱۲ برس کے بعد اس کے ۴۳ ممبروں میں سے صرف ایک شخص ایسا ہے جس نے بنک سے باہر کسی کو قرضہ دینا ہے۔ اور وہ قرض سے بالکل بری ہیں۔ مبلغ ۲۰۰۰ روپیہ جمع ہے۔ اس میں زیادہ تر بیواؤں کا ہے۔ بنک کا روپیہ نہایت آزادی اور عقلمندی سے استعمال کیا جاتا ہے۔ جائیدادیں تھوڑی ہیں۔ (تمام ملاکر ۳۵۔ ایکڑ) لیکن متفرق آمدنی (زیادہ تر سپاہگری سے) ۱۲۰۰۰ روپیہ بن جاتی ہے۔ فوج نے نہ صرف ان لوگوں کو غربت سے بچایا ہے۔ بلکہ انہیں خوشحال بھی بنا دیا ہے۔ یہ صورت بہت کچھ ویسی ہی تھی۔ جیسی کہ بوچھل کلاں میں۔

میدان تعلیم میں بھی ان کے نتائج واجبی طور پر اچھے تھے۔ ایسے لڑکوں کی تعداد جو عمر کے لحاظ سے سکول جانے کے قابل تھے۔ ۱۵۰ بتائی گئی۔ اور ان میں سے ۵۶ سکول جاتے تھے۔ اور ۱۲ مقامی ہائی سکول میں پڑھتے تھے۔ تاہم یہ تعداد اتنی نہیں ہے جتنی کہ ہونی چاہیئے۔ لیکن یہ حقیقت کہ یہ تعداد بھی اوسط تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ ظاہر کرتی ہے کہ دیہات تعلیمی لحاظ سے کس قدر پیچھے ہیں؟ تین اخبار منگوائے جاتے ہیں۔ دو رسالہ جو فوجی نگرانی میں شائع ہوتا ہے۔ "مشیر دیہات" اور پنجاب کوآپریٹو یونین لاہور کا رسالہ کوآپریشن

ہم نے ایک ممبر سے جس نے کوئٹہ پولیس میں اکیس [۲۱] برس ملازمت کی تھی۔ یہ دریافت کیا کہ تم انتظام سلطنت کے متعلق کیا جانتے ہو؟ اس نے تحصیلدار تک بتایا۔ پھر بہت وقفے اور سوچ کے بعد اس نے کہا کہ جہلم میں ڈپٹی کمشنر بھی رہتا ہے۔ اس پر ایک عام قہقہہ لگا۔ اس کے بعد صرف لاٹ صاحب کا جو کلکتے میں رہتا ہے۔ اور بادشاہ کا نام اس کی سمجھ میں آیا۔ میں نے پوچھا کہ بادشاہ کا کیا نام ہے؟ "بادشاہ"۔ اس نے جواب دیا۔ ایک نوجوان نے جس نے صرف نو برس ملازمت کی تھی۔ اس سے زیادہ اچھی طرح بتایا۔ اور وائسرائے تک سب گنوا دیئے۔ میں نے پوچھا۔ اس سے اوپر کون ہے؟ اس نے بتایا کہ کمانڈر انچیف۔ شاید سپاہی کو ایسا ہی نظر آنا چاہیئے۔ وہ بھی بادشاہ کو صرف بادشاہی کے نام سے جانتا تھا یہ دو نو اشخاص ناخواندہ تھے۔ تعلیم یافتہ لوگ بلا شبہ زیادہ واقف تھے۔ مثلاً وہ یہ جانتے تھے کہ ڈ. بورڈ بھی ہوتے ہیں۔ اور انہوں نے ان میں سے دو کے نام بھی بتائے۔ انہوں نے کہا کہ ایک زراعت کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ یہ درست ہے۔ لیکن دوسرے کے متعلق وہ صرف یہ بتا سکے کہ وہ میلوں میں تقریریں کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے اس لئے کہا۔ کہ اس نے گذشتہ سال ایک مقامی میلے کے موقعہ پر تقریر کی تھی۔

پھر میں نے اُن سے کاشتکاری کے متعلق دریافت کیا۔ کیا وہ شخص جو سپاہی رہ چکا ہو۔ اتنا ہی اچھا کاشتکار ہے۔ جتنا کہ زمیندار رہے؟۔ ایک سپاہی کی رائے تھی کہ وہ ہے۔ لیکن ایک زمیندار نے بتایا کہ جہاں کہیں وہ جاتا ہے گھوڑے پر رہتا ہے۔ اس نے پتے کی بات کہی۔ ہر شخص کم از کم یہ ضرور توقع کرے گا۔ کہ سپاہی کو نئے نمونے کے آلات کشاورزی اور بیج استعمال کرتا ہوا دیکھے۔ لیکن لیلا اور لوچھل کلاں میں کوئی چیز ایسی نہ تھی۔ جس سے یہ بات ظاہر ہو۔ اس سے زیادہ کوئی بات نہ تھی۔ کہ ایک نمبردار نے جواب مر گیا ہے۔ ایک میسٹن ہل خریدا تھا۔ یہ بات بالکل غیر معمولی معلوم ہوئی ہے۔ کہ ان تینوں جگہوں میں جن میں سے ایک چھوٹا قصبہ اور دوسرا ایک بڑا گاؤں ہے۔ آجتک کوئی منتخب شدہ بیج کیوں استعمال نہیں کیا گیا۔ اور یہ کہ جدید زراعت کی نمائندگی صرف دو میسٹن ہل کرتے ہیں۔

تھوک سے شفایابی

معائینے کے بعد ہم نترال گاؤں کو دیکھنے کے لئے پہاڑی پر چڑھ گئے۔ رواج کے

اُن لاینحل اختلافات میں سے جو ہندوستانی دیہات میں اس قدر تضاد اور رقت پیدا کرتے ہیں۔ کہ ان کے متعلق کوئی عام بات نہیں کہی جا سکتی۔ ایک کی بنا پر وانہر کا علاقہ جس میں سے ہم اب گذرے ہیں۔ صفائی کے اعلیٰ معیار کے لئے" ہورہے۔ جبکہ ناہن کا علاقہ جس میں ہم ابھی ابھی داخل ہوئے ہیں۔ کوئی ایسی عمدہ روایت نہیں رکھتا ہم نے ایک سپاہی کا گھر دیکھا جو اس نے حال ہی میں ۳۰۰ روپیہ لگا کر بنایا تھا۔ ایک گھر اور بھی دیکھا جو رجمنٹ کے کسی سابق بیطار کا تھا۔ اس کا اگلا کمرہ دوائیوں سے بھرا تھا۔ اور اب وہ آدمی۔ مویشی دونوں کا علاج کرتا تھا۔ اس لئے کہ دونوں کے لئے نزدیک سے نزدیک ہسپتال ۱۸ میل کے فاصلے پر تھے۔ میں نے دریافت کیا۔ آیا والدین اب بھی لوگوں کو مسجد سے باہر نکلتے وقت بیمار بچوں پر دم کرنے کیلئے کہتے ہیں۔ تحصیلدار نے کہا۔ کہ وہ تو میرا فرض ہے۔ وہ ایک پیشامت ہوا۔ مستعفی ہونے پر وہ سپاہ گری کی نسبت پیری کی طرف زیادہ مائل تھا۔ اس کا دعویٰ تھا۔ کہ وہ خدا کی بھیجی ہوئی تمام بیماریوں کو محض دم کرنے سے شفا دے سکتا تھا۔ اگر کسی شخص کو کوئی سانپ۔ دیوانہ کتا۔ یا کیدڑ کاٹ کھائے۔ تو وہ ایک پیالے میں تھوکتا ہے۔ اور اسے مریض کو پینے کے لئے دیدیتا ہے۔ اسہال اور قے جو اس کے بعد شروع ہوتے ہیں۔ مریض کو شفا بخشتے ہیں۔ اس نے دعویٰ سے کہا۔ کہ میرا علاج کبھی خطا نہیں گیا۔ نئی تہذیب نے میرے کام کاج پر بہت اثر ڈالا ہے۔ لیکن تمام کا تمام گاؤں اب بھی مجھے اپنا پیر سمجھتا ہے۔ اور ہر ایک گھر ہر سال مجھے کچھ نہ کچھ دیتا ہے۔ پہلے یہ ایک روپیہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن نرخ گرجانے کے وقت سے کچھ کم ہوتا ہے۔

بعد میں اسی کا ذکر کرتے ہوئے میرے ساتھی نے کہا۔ کہ میں ایک مرتبہ آتشبازی سے کھیل رہا تھا۔ کہ کوئی چیز ایک دم جل اُٹھی۔ اور میرا چہرہ بُری طرح سے جلا دیا۔ مجھے تکلیف میں مبتلا دیکھ کر ایک پیر نے کہا۔ کہ میں اسے اچھا کر دوں گا۔ اس نے کئی بار میرے چہرے پر تھوکا۔ اور میرا درد جاتا رہا۔ نہ اس سے پہلے کچھ ملا گیا۔ اور نہ اس کے بعد۔ اور نہ ہی یہ صورت اعتقاد سے اچھا ہونے کی تھی۔ کیونکہ میرا ساتھی پیروں پر بالکل اعتقاد نہ رکھتا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض اوقات تھوک میں شفا بخشنے والی خصوصیات ہوتی ہیں۔ اور بلاشبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی طرح شفا دیتے تھے۔

روپیہ سود پر چلانا

مسلمانوں کے اسی گاؤں میں ایک ہندو کو دہلیز پر کھڑے ہوئے دیکھ کر میں ایک سرسری سی بات کرنے کے لئے ٹھہر گیا۔ وہ ایک کھتری ساہوکار تھا۔ اس نے کہا کہ ساہوکاروں کے لئے بُرا زمانہ ہے۔ پہلے ہمیں روپیہ ملتا تھا۔ تو اب چار آنے ہی حاصل ہوتے ہیں۔ چالیس فیصدی کسان روپیہ مار بیٹھتے ہیں۔ اور باقی ادا نہیں کر سکتے۔ اب وہ صرف زیورات کے عوض روپیہ ادھار دیتا تھا۔ اور اس روپے پر وہ پہلے کی طرح ۱۲ فیصدی سود لیتا ہے۔ صبح ہی صبح ہم ایک اور ساہوکار سے ملے تھے۔ جو دو کسانوں کو ساتھ لئے سوار جا رہا تھا۔ پرانے رواج کے مطابق جو اس وقت بہت عام تھا۔ جبکہ میں ہندوستان میں آیا۔ (چھبیس برس گذرے) لیکن اب کم ہے۔ ہمیں راہ دینے کیلئے وہ سب کے سب اُتر پڑے۔ اگرچہ وہ ہندو تھا۔ لیکن اسکی داڑھی پر خضاب کیا ہوا تھا اور وہ مسلمانوں کی وضع پر تراشی ہوئی تھی۔ دیہہ سے ماحول کا اثر، اور اس کے جھریوں والے چہرہ پر بھاری بھرکم لٹکی ہوئی تھی۔ اپنی قسم کے دوسرے لوگوں کی طرح وہ ڈرپوک بھی تھا۔ جب میرے ساتھی کے گھوڑے نے اس کی طرف پیٹھ پھیری تو وہ جلد جلد چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھا کر ایک طرف ہو گیا۔ وہ زمانے کا تاریک پہلو لیتا تھا۔ لیکن اس نے فخریہ طور پر کہا۔ کہ میں نے ان لوگوں کے خلاف جو مجھ سے لین دین کرتے ہیں۔ کبھی مقدمہ نہیں چلایا۔ دونوں کسانوں نے اس کی دلی تصدیق کی۔ ایک نے کہا کہ ہمارے دن اچھے گذرے ہیں۔ اگر ہم مقررہ تاریخ کے ۶ ماہ بعد بھی ادا کر دیں۔ تو وہ ہم پر مقدمہ نہیں چلاتا۔ اس کی عام شرح سود (غیر محفوظ سود کیلئے) ۲۵ فیصدی ہے۔ لیکن اب اس کے پاس سود پر چلانے کے لئے روپیہ نہیں ہے۔ میری تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس علاقے میں سود کی عام شرح ۱۸¾ یا ۲۵ فیصدی ہے۔ عام طور پر مؤخر الذکر۔ اگرچہ روپیہ سود پر بہت کم دیا جاتا ہے۔ لیکن شرح سود نرخ گر جانے سے ابھی تک کوئی ایسا اثر نہیں پڑا ہے۔ جیسا کہ نیچے میدانوں میں۔ غالباً اسکی دو وجوہات ہیں۔ ایک یہ کہ دور افتادہ جگہ میں رواج زیادہ سخت ہوتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ فوجی ملازمت کے ذریعے بہت زیادہ روپیہ برسا ہے۔ ممکن ہے اس کا تیسرا سبب یہ بھی ہو کہ یہاں ساہوکار غیر معمولی طور پر چوکنا ہے۔

مسلمانوں کے علاقے میں جہاں گرم مزاج اور وعدے کے کچے ہوتے ہیں

اس بات کی بڑی احتیاط رکھتے ہیں۔ کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ قومی تعلقات اب بھی اس قدر قوی ہیں کہ وہ ساہوکار کو یاد دلا سکتے ہیں۔ کہ عرصہ نہیں گذرا کہ اسکی ہستی گاؤں کے ملازم سے کچھ زیادہ نہ تھی۔ اور آگے مغرب کی طرف سون کی وادی میں ایک اور ساہوکار سے ملا۔ جس نے مجھے بتایا کہ اگرچہ میرے تین چار سو مؤکل ہیں۔ لیکن میں نے پچاس برس میں کبھی کسی پر مقدمہ دائر نہیں کیا۔ موجودہ زمانے کی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے اس نے بہت کچھ سچ کہا۔ کہ اگر زمیندار ادا نہیں کر سکتے۔ تو اس کی وجہ غربت ہے۔ اور جب وہ ادا نہ کریں۔ تو ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؟ ہم ان کی زمین نہیں لے سکتے۔ ان کے بیل اور ہل نہیں لے سکتے۔ اور نہ ہی ان کی خوراک چھین سکتے ہیں۔ کوئی چیز ایسی نہیں ہے۔ جس سے ہم اپنا روپیہ وصول کر سکیں۔ ان کے زیورات تک سکے ہو نے ہوتے ہیں۔ جب میں نے یہ پوچھا کیا زمیندار اور ساہوکار کے تعلقات اچھے رہتے ہیں تو اسکی زبان میں تیزی آگئی۔ اس نے کہا۔ اگر ہم اُن سے تعلق نہ رکھیں۔ اگر ہم ان سے محبت نہ دکھائیں۔ اگر ہم اور وہ ایک نہ ہوں۔ اگر ہم انہیں ناخوش رکھیں۔ تو ہم رہ کیسے سکتے ہیں؟ وہ بہت جلد تیز ہو جاتے ہیں۔ چھرے اپنے چھرے نکال لیتے ہیں۔ اور ہمارے حلقوم پر پھیر لیتے ہیں۔ (اس پر اس نے اپنے حلق کے وار پار نمایاں اشارہ کیا) اگر ہم انہیں ناراض کر کے جنگل میں چلے جائیں۔ تو ہمیں کیسے یقین ہو سکتا ہے۔ کہ ہم واپس بھی آجائینگے۔ اور اگر ہم واپس نہ آئیں۔ تو کیسے پتہ چلیگا۔ کہ ہم کہاں ہیں۔ وہ بہت سے ہیں اور ہم تھوڑے۔ وہ جاہل ہیں اور ہم سمجھدار۔ ہمیں ضرور ان کا دوست بنکر رہنا چاہیئے۔ ہر وہ شخص جو اس سال قتل شدہ ۴۳ ساہوکاروں کے متعلق سوچتا ہے۔ اس بات کو جلد سمجھ جاتا ہے۔

جب ہم پھر اپنے سفر پر چلے تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ اور شام پڑ جانے کی وجہ سے میری بڑی ہڈی شق ہو رہی تھی۔ ہم اتنے سُن ہو رہے ہے۔ کہ سوائے کٹاس کے مت مندروں پر نظر ڈالنے کے اور کچھ نہ کر سکتے تھے۔ یہ مندر اس سرزمین پر بنے ہوئے تھے۔ جو پانڈوؤں کے زمانے میں بھی اُس شفاف ندی کی وجہ سے مقدس خیال کئے جاتے تھے۔ جو پتھریلی زمین میں سے پھوٹ نکلتی ہیں۔ اور ایک چھپڑی کی صورت اختیار کر لیتی ہے کے متعلق زمیندار لوگوں نے یہ مشہور کر رکھا ہے۔ کہ وہ اتھاہ ہے۔ لیکن درحقیقت ... فٹ گہری ہے۔

۲۶- دسمبر قیام

یہاں کا آرام گھر اپنے جائے وقوع کے لحاظ سے موسم سرما میں بھی دلفریب ہوتی ہے۔ آرام گھر اور پھلدار درختوں کا باغ دونوں ایک ایسی چٹان پر واقع ہیں۔ جو ایک پیالہ نما وادی کی طرف جھانکتی ہے۔ جہاں کٹاس ندی کا متقدس پانی چمک دار راستہ بناتا ہُوا ننھی ننھی گیہوں کے کھیتوں کو سیراب کرتا ہے۔ وادی کے پار پہاڑ کی پتھریلی سطح سے چمٹا ہُوا اور پتھروں سے تعمیر کیا ہُوا گاؤں چو آ ہے۔ جب سُورج طلوع ہوتا ہے۔ تو اس کے چولھوں سے دھوُاں اُٹھتا ہے۔ اور ساکن ہوا میں نیلگوں آسمان کے نیچے اوری اودی پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ اوپر ہی اوپر پھیلتا چلا جاتا ہے۔ ناشتہ کرنے سے پہلے میں باہر گیا۔ تاکہ اس پر ایک نظر ڈالوں۔ دیکھا کہ گھر کے سامنے کا چبوترہ ردّی کاغذوں۔ ٹین کے خالی ڈبّوں اور ادھر اُدھر کی چیزوں سے پٹا پڑا ہے۔ میں نے بھنگی کو بلوایا۔ ایک معمر مصلّی آیا۔ اتنا بوڑھا جتنے کہ صرف مصلّی ہی ہوچکے ہیں۔ ساٹھ برس کے مصائب اور خاکروبی نے اسکی کمر خمیدہ کردی تھی۔ نہایت مستعدی سے اس نے کوڑے کا ایک گولا بنا اور اس ڈھلان کے سرے کی طرف بڑھ کر جس پر ہم کھڑے تھے۔ آہستہ سے آگے پھینک دیا۔ تاکہ وہ نیئے سرے سے خود بخود ذرا اور پرے بکھر جائے۔ اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ کہ وہ سب اُسے پھر اکٹھے کرنے پڑے۔ اور اس مرتبہ بالکل جلانے پڑے۔

پھلوں کی کاشت

شام کو سیر کرتا کرتا میں ایک سرسبز وادی میں نیچے پہنچ گیا۔ جہاں شفاف پانی کی ایک تیز ندی یا تو پتھروں اور چٹانوں پر سے لڑھکتے وقت ترنم خیز نغمے پیدا کرتی تھی۔ یا پھولدار گھاس و سرکنڈوں میں کہیں کہیں نظروں سے اوجھل ہو جاتی تھی۔ یہ جگہ ایسی تھی۔ کہ یہاں باغیچہ بن سکتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہاں جھاڑیاں اچھی بڑی تھیں۔ اور چھوٹے پیڑوں کا جنگل ہی جنگل نظر آتا تھا۔ اگر آب و ہوا کے لحاظ سے دیکھا جائے۔ تو کوئی وجہ نہیں ہے۔ کہ ان پہاڑیوں کی زیادہ سایہ دار ڈھلوانوں میں جہاں پانی میسر ہے۔ پھلوں کے درخت اس کثرت سے لگے ہوئے نہ ہوں۔ جیسے کہ وہ

فلسطین (Judaea) میں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ ہیبرن (Hebron) کی یاد دلاتا ہے
یہاں کے لوگ اگر کیلیفورنیا سے سبق لینا چاہیں۔ تو وہ بھی کچھ دور نہیں ہے۔ کیونکہ آب وہوا بھی
بہت کچھ ایسی ہی ہے۔ اس امر کا احساس کرتے ہوئے شاہ پور کے ڈسٹرکٹ انجینئر نے وہاں سے
سنگترے کے پچاس درخت منگوائے ہیں۔ (واشنگٹن نیولز اور ویلنشیا کی قسم کے)
تاکہ سکیسر کے نزدیک ڈسٹرکٹ بورڈ کے باغات میں لگائے جائیں۔ وہ آڑو، شفتالو
اور لوکاٹ کی اعلیٰ قسموں کے بھی تجربے کر رہا ہے۔ اور پہلے ہی سے حاصل شدہ نتائج
بڑی بڑی توقعات کو جائز قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس میں ایک شبہ ہے۔ وہ اس کام
میں مستعد ہے۔ اور پودوں کی ایسی حفاظت کرتا ہے۔ جیسی کہ ماں بچوں کی کرتی ہے۔ تمام پودوں کو
احتیاط سے اور باقاعدگی کے ساتھ پانی دیا جاتا ہے (ہندوستانی باغبان کی خواہش کے مطابق
ان کو مقررہ اوقات پانی میں ڈبویا نہیں جاتا) جونہی کہ بھوری چیونٹیاں نمودار ہوتی ہیں۔ ان پر
حملہ کیا جاتا ہے۔ اور چھلکوں پر رہنے والے کیڑے فلٹ (ستمنلکC) یا چونا چھڑک کر ہلاک
کئے جاتے ہیں۔ اور اگر تیز ہوا کسی ٹہنی کو آدھا توڑ دیتی ہے۔ تو جائے شکست پر لگانے کا
شفا بخش لوبہ لیپ کر پٹی باندھ دی جاتی ہے۔ کیا ایک ایسے زندہ دل کسان سے جو اس بات
کا عادی ہو کہ اپنی فصل کے لئے ہل چلائے۔ بونے اور کاٹنے کے سوا اور کچھ نہ کرے۔ ایسی
نازک اور لگاتار احتیاط کی توقع کی جا سکتی ہے۔ یہی مشکل کم و بیش حد تک اس ملک میں زراعتی
ترقی کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے ہے۔ امید افزا پہلو یہ ہے۔ کہ پھلدار درختوں کے لئے دلچسپی
پیدا ہو رہی ہے۔ ناظرین کو بوچھل کلاں کے مالی کا گھر یاد ہوگا۔ اور اس جگہ کے نزدیک ہی ڈلوال
نامی گاؤں میں پہلے سے بیس باغات ہیں۔ اگر پھلدار درختوں کی کاشت میں توسیع ہو
جائے۔ (اس میں بادام اور انگور کے لئے بھی گنجائش ہے) تو اس سے دیہاتی کی اقتصادی
حالت کو تقویت بہم پہنچے گی۔ جو اس وقت فوجی ملازمت پر اس قدر انحصار رکھتی ہے۔ کہ
اسکے بغیر وہ محفوظ نہیں رہ سکتی جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ ان پہاڑیوں میں جائیدادیں بہت تھوڑی ہیں اور بڑھتی
ہوئی آبادی سے لازمی طور پر اور بھی تھوڑی ہو جائینگی۔ اسلئے آسودہ رہنے کیلئے زمین کا پورا پورا ممکن استعمال نہایت
ضروری ہے۔

بلجیئم کے طرز کا ایک ہائی سکول

ڈلوال کا گاؤں جس کا ابھی ذکر کیا گیا تھا۔ نہ صرف اپنے باغات کے لئے مشہور ہے۔

بلکہ ہائی سکول کے لئے بھی چونتیس برس گذرے۔ بلجیم سے آئے ہوئے کیپوچن پادریوں نے
جاری کیا تھا۔ اب اس میں ۴۰۰ لڑکے پڑھتے ہیں۔ اور پہاڑی سلسلے کے مشرقی نصف حصے
میں اسکی بڑی شہرت ہے۔ یہ سب کچھ ان پادریوں کی شخصیت سرگرمی کا نتیجہ ہے۔ جو روایاتی
شان تک پہنچ چلی ہے۔ یہاں کے ۵۰۰ فارغ التحصیل طالبعلموں نے جنگِ عظیم میں خدمات
انجام دیں۔ جب میں پادریوں سے ملا۔ (کسی اور موقع پر) تو اُنہوں نے فوج کی حد سے زیادہ
تعریف کی۔ اور کہا کہ فوجی خدمت کسان میں انسانیت بھی پیدا کرتی ہے۔ اور ان کی تربیت
بھی کرتی ہے۔ ان کا خیال یہ بھی تھا۔ کہ یہ سکول فوج کے لئے اچھا ہے۔ کیونکہ یہ لوگوں کو
بھرتی ہونے کے خلاف نہیں اُکساتا۔ اور ایسے لوگوں کو تیار کرتا ہے۔ جو ترقی حاصل کرنے
کے لئے بھرتی ہوتے ہیں۔ لیکن شاہ پور کے سکول ماسٹروں کی طرح اُنہوں نے بھی اس
بات پر رضامندی ظاہر کی۔ کہ ہائی سکول سے زمین کا کوئی فائدہ پہنچنا مشتبہ ہے۔ کیونکہ یہ لڑکوں
کی طبیعت کو کاشتکاری سے اُچاٹ کرتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ یہی حال بلجیم میں بھی ہے
اور سیب وہاں بھی یہی ہے۔ (کاشتکاری کوئی شاندار مستقبل نہیں پیش کرتی) اس میں
عزت کا بھی سوال ہے۔ کیونکہ تعلیم یافتہ لڑکا ہل جوتنے کو حقارت سے دیکھتا ہے۔ پادریوں
نے دعوے سے کہا۔ کہ عام طور پر سکول کا اچھا اثر پڑا ہے۔ گذشتہ تیس سال سے فسادات
کم ہو رہے ہیں۔ اور قتل کی وارداتیں کم ہو گئی ہیں۔ ذیلدار نے جو کہ فوج میں رہ چکا تھا۔ اس
پر شبہ ظاہر کیا۔ لیکن یہ تسلیم کیا۔ کہ تعلیم یافتہ شخص فساد میں عملی حصہ نہیں لے سکتا۔ اور
کھلم کھلا ایسا کرنے سے ہچکچاتا ہے۔ اس نے یہ بھی تسلیم کیا۔ کہ خاوندوں کا اپنی بیویوں
کے ساتھ پہلے سے زیادہ اچھا سلوک کرنا بھی کسی حد تک سکول ہی کی وجہ سے ہے۔ اب وہ
انہیں منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد کی بجائے اپنا ساتھی سمجھتے ہیں۔ جب میں نے یہ کہا کہ وہ اب
یقیناً انہیں کم مارتے ہیں۔ تو سب سے زیادہ جسیم اور لمبی داڑھی والے پادری نے
اپنی پیٹھ کرسی سے لگالی۔ اور قہقہہ مار کر بولا "سچ ہے سچ ہے"۔ دوسرے نے بتایا کہ میں نے
حقیقتاً ایک شخص کو اپنی بیوی کو جوتیوں سے مارتے ہوئے دیکھا ہے۔ سلسلہ کلام جاری
رکھتے ہوئے ذیلدار نے کہا۔ کہ پرانی روشنی کے لوگ اب بھی لڑکیوں کی تعلیم کے
خلاف ہیں۔ اور حال ہی میں جب میں نے اس کے حق میں تقریر کی۔ تو کسی نے کھڑے
ہو کر کہا۔ "اگر لڑکیوں کو تعلیم دی گئی۔ تو وہ اپنے دوستوں کو خط لکھیں گی"۔ میں نے اسے

یہ کہہ کر خاموش کر دیا۔ کہ کیا تم ایک مثال بھی ایسی پیش کر سکتے ہو۔ جس میں کسی تعلیم یافتہ عورت کا ہاتھ نہ ہو۔ ڈلوال میں لوگ زنانہ سکولوں کے بہت زیادہ حق میں ہیں۔ جب وہاں ایک سکول کھولا گیا تھا۔ تو قریب قریب ایک ہی مرتبہ ۵۰ لڑکیاں داخل ہو گئی تھیں

انتظام سلطنت اور انگریز

انتظامِ سلطنت کا ذکر کرتے ہوئے سب سے بوڑھے پادری نے کہا۔ کہ لوگوں کو کسی قسم کی شکایت نہیں۔ سوائے اس کے کہ وہ انگریزوں کے چلے جانے سے ڈرتے ہیں۔ اس پر مجھے وہ بات یاد آئی۔ جو کل ایک ایسے غیر ملکی شخص نے بتائی تھی۔ جو دیر سے پنجاب میں آباد تھا۔ اس نے کہا کہ لوگ مجھے بار بار کہتے ہیں۔ کاش کمشنر۔ ڈپٹی کمشنر اسسٹنٹ کمشنر اور یہاں تک انسپکٹر پولیس بھی انگریز ہی ہوتے۔ انگریز سے وہ ہمیشہ انصاف کی امید رکھتے ہیں۔ لیکن وہ کہتے ہیں۔ کہ کسی مسلمان کو ہندو سے یہ امید نہیں ہو سکتی اور نہ ہی ہندو کو مسلمان سے۔ میں یہ بات اُن لوگوں پر چھوڑتا ہوں۔ جو انگریز نہیں ہیں۔ اور پنجاب سے خوب واقف ہیں۔ تاکہ وہ یہ بتائیں۔ کہ یہ کہاں تک درست ہے؟ لیکن ہندوستانی افسروں اور اپنے اُن ہندوستانی ہم مشرب لوگوں کے متعلق جن کے ساتھ مجھے کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ صاف دلی سے کام لیتے ہوئے میں یہ ضرور کہوں گا کہ بلا شبہ پنجاب میں بہت سے ہندوستانی افسر ایسے ہیں۔ جن میں انصاف کا زیادہ سے زیادہ مادہ موجود ہے۔ لیکن جہاں انگریز افسر کو عام طور پر منصف خیال کیا جاتا ہے تاوقتیکہ وہ اپنے آپ کو اس کے برعکس ثابت نہ کرے۔ ہر معاملے میں ایک سے زیادہ مذہبی فرقوں کے متعلقہ لوگ ہندوستانی افسر پر خواہ وہ کتنا ہی منصف مزاج کیوں نہ ہو۔ عام طور پر یہ شبہ کرتے ہیں۔ کہ وہ اپنے فرقے کے فریق کا ساتھ دیتا ہے۔ یہ وہ خامی ہے۔ جس سے انگریز افسر مبرا ہیں۔ اور جس کے باعث افسوس ہے۔ کہ ہندوستانی افسر بلا لحاظ ذاتی خوبیوں کے تکلیف اُٹھاتے ہیں۔ اور وجہ محض وہی ہے کہ ایک انگریز ہے اور دوسرا ہندوستانی۔ دراصل یہ بات اُس گہری بداعتقادی سے پیدا ہوتی ہے۔ جو صدیوں کی بدامنی نے نہایت ذکی الحس لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دی تھی۔ اور پنجاب میں فرقہ وارانہ فضا نے جس کا بیج خود غرض یا کوتاہ اندیش

لوگوں نے مسلمان ہندوؤں اور سکھوں میں بو یا ہے ۔ اس میں اور بھی مبالغہ کر دیا ہے
اس کا علاج ظاہر ہے ۔ اور وہ یہ کہ ہر ایک اچھا شہری اور ہر اچھا کوا پریٹر یقیناً
بلا لحاظ مذہب یا قومیت کے اپنی بہترین قابلیت کے مطابق کام کرے ۔

باب (۴) چہارم

کوہستانِ نمک (یعنی سلسلہ مائنی) اور دریائے جہلم کا میدان

مذہب دیہاتی عادات پنجابی بول اور مویشی

۲۷ دسمبر پواسے بشارت (۸ میل)

اسلام

گذشتہ دوسفروں میں ہم کچھ زیادہ اونچ نیچ کے بغیر چوڑی میدانی وادیوں میں سے گذرے ہیں۔ آج ہم پتھریلے شکستہ راستوں پر سے چل رہے تھے۔ اور ایک وادی سے دوسری وادی میں نہایت دقت سے چڑھتے تھے۔ یہاں تک کہ ہم ایک وسیع میدان میں باہر نکل آئے۔ جس کے کنارے پر گوارہ تالی گاؤں ایک پہاڑی پر آباد تھا۔ اور یہی ہماری قریب ترین منزل مقصود تھی۔ اسی خیال سے کہ یہ علاقہ مسلمانوں کا ہے۔ ہم نے راستے میں اس امر پر گفتگو کی۔ کہ دیہاتی زندگی پر اسلام کا کیا اثر پڑا ہے؟ مقامی اخبار نویس کا بیان ہے۔ (صفحہ ۱۲۹) کہ مذہب نے اخلاق کو سنوارنے میں کوئی عملی اثر نہیں ڈالا ہے۔ میرے ساتھی نے جس سے میں نے اس کا ذکر کیا۔ اس سے اتفاق نہ کیا۔ اور یہ بتایا کہ کوئی مسلمان سور یا ایسے جانور کا گوشت نہ کھائے گا۔ جسے خاص طریق سے ذبح نہ کیا گیا ہو۔ اور کوئی شخص الکحل نہ پئے گا۔ صرف چند لوگ جوا کھیلتے ہیں۔ اور بہت سے قرض پر سود نہیں لیتے۔ درحقیقت یہ ہے۔ کہ اس قرضے پر جو دوست کو دیا جائے۔ سود بالکل نہیں لیا جاتا۔ رمضان کے مہینے میں ہر سال روزے رکھے جاتے ہیں۔ (جو اکثر لوگ رکھتے ہیں) اور ایک یا دو گھنٹے روز پنجگانہ نماز پر صرف کئے جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آدمیوں میں سے ۲۰ فیصدی اب بھی نماز ادا کرتے ہیں۔ اور اگر عورتوں میں اس کا تناسب کم ہے۔ تو یہ اس لئے کہ ان کے پاس کام بہت ہے۔ اور اپنے بچوں کے ساتھ جو ہر وقت انہیں لپٹے رہتے

ہیں۔ ان کے لئے یہ بہت مشکل ہے کہ وہ اپنے ہاتھ منہ اور کپڑوں کو اس قدر صاف رکھیں کہ وضو کر سکیں۔ جس کا نماز سے پہلے کرنا لازم ہے۔ یہ کہ آیا مذہبی فرائض کی انجام دہی کے ساتھ اخلاق پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ ایک ایسا بحث طلب مسئلہ ہے۔ جس کے خلاف بہت کچھ رائے ظاہر کی جا چکی ہے۔ میرے ساتھی کا خیال یہ ہے۔ کہ یہ ضروری نہیں ہے۔ کہ گاؤں میں بہترین اخلاق والے اشخاص مذہبی فرائض کو بھی پابندی سے انجام دیتے ہیں۔ لیکن عب معمول وہ ان کے فرائض کے متعلق نہایت محتاط رہتے ہیں۔ اس کا خیال ہے۔ کہ اب ظاہری طریقوں مثلاً روایتی لمبی داڑھی رکھنے اور مونچھ ترشوانے پر بہت کم زور دیا جاتا ہے۔

قرأت قرآن شریف

جب ہم گوارہ کے قریب پہنچے۔ تو یہ بحث ہوتے ہوتے یہاں تک جا پہنچی۔ کہ قرآن شریف کو عربی عبارت میں دیعنی ایک ایسی زبان میں جس کو گاؤں میں بہت کم لوگ اور یہاں تک کہ ملاؤں میں سے بھی بہت کم سمجھتے ہیں) پڑھنے کے متعلق سوالات شروع ہو گئے۔ ضرب المثل یہ ہے۔ کہ "لکھے موسیٰ پڑھے خدا"۔ شمال مغربی ہندوستان میں بیشمار لڑکے اور لڑکیاں ایسی ہیں۔ جو بغیر سمجھے بوجھے ایک ایک یا دو دو سال قرآن شریف پڑھتی ہیں۔ اس بات کا خیال آتے ہی میں نے حاضرین سے جو تعلیم یافتہ تھے۔ پوچھا کہ یہ فعل کہاں تک امید افزا ہے۔ ایک رسالدار نے جواب دیا کہ قرآن شریف میں یہ لکھا ہے کہ اگر کوئی نہ بھی سمجھے تو بھی اسے پڑھنا اچھا ہے۔ دراصل یہ اس میں لکھا ہوا نہیں ہے۔ لیکن یہ بات کہ اسے اسی طرح پڑھنا اچھا ہے۔ ایک ایسا خیال ہے۔ جو عام لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ اور اسکی بنیاد اس اعتقاد پر رکھی جاتی ہے۔ کہ قرآن شریف کا لفظ بلفظ خدا کی کلام ہے۔ اس لئے اسے بار بار دوہرانا ضرور مفید ثابت ہوگا۔ بہرکیف رسالدار اور ایک اور افسر کے اس اظہار خیال پر کہ اسے ترجمے کے بغیر پڑھنا بے فائدہ ہے۔ سب نے اتفاق نہ کیا۔ اس کے برعکس وہ ذیلدار جس نے لفظ تک سمجھے بغیر تمام کا تمام حفظ کیا ہوا تھا۔ یقین رکھتا تھا کہ وہ پندرہ سال ہوا اسے حفظ کرنے میں لگے تھے۔ خوب گذرے تھے۔ اس نے کہا کہ اس کے پڑھنے سے خدا کی یاد آتی ہے۔ اور یہ ثواب ہے۔ یہ وہ ثواب کا کام ہے۔ جس کا خدا بدلہ دیگا۔ ایک نوجوان بی۔ اے نے اپنی شہادت پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس سے روح اور قلب کی صفائی ہوتی

ہے سینٹ پال نے یہ لکھ کر اس صورت کو اچھی طرح نبھایا ہے ۔ "کہ جب میں غیر زبان میں عبادت کرتا ہوں تو میری روح عبادت کرتی ہے ۔ لیکن میری سمجھ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا :۔

مشترکہ تعلیم

پچیس حاضرین میں سے پندرہ خواندہ تھے ۔ اور بہ نسبت صوبے کے ہر دوسرے حصے سے بہت زیادہ تھی ۔ اس صورت میں یہ فوج کی مہربانی سے تھی ۔ جس کے فیاضانہ اثر کی مجھے دیہات میں زیادہ سے زیادہ علامتیں دکھائی دے رہی ہیں ۔ اگرچہ اتنے لوگ تعلیم یافتہ تھے لیکن تمام کے تمام اس مشترکہ تعلیم کے سراسر مخالف تھے ۔ جس کا کچھ کچھ رواج اس ضلع میں ہو چلا ہے ۔ میں نے دریافت کیا کیا تم ان کے لئے بھی پسند نہیں کرتے ۔ جو نابالغ ہوں ؟ ۔ انہوں نے کہا کہ ہاں ان کے لئے بھی نہیں ۔ کیونکہ چھوٹے لڑکے بھی اکثر شریر ہوتے ہیں ۔ ایک چپٹی ناک والے بوڑھے نے میری طرف اپنی انگلی ہلائی ۔ اور کہا لڑکوں لڑکوں کو کھیلنے دو ۔ اور لڑکیوں لڑکیوں کو ۔ میرے ساتھی کا بیان ہے ۔ کہ اس ضلع کے ۷۵ فیصدی کسان اس پر مہر تصدیق ثبت کرینگے ۔ لیکن اس کا خیال ہے کہ وقت آنے پر ممکن ہے کہ ۵۰ فیصدی لوگوں کو پرائمری کے درجے تک مشترکہ تعلیم کے حامی بنانے کے لئے ترغیب دی جا سکے ۔ مشترکہ تعلیم کے خلاف ہونے کے باوجود یہ سپاہی تعلیم کی قدر و قیمت کے متعلق ایک لمحہ کے لئے بھی شبہ نہ رکھتے تھے ۔ اور یوں کہتے تھے ۔ کہ ہمارے تمام بچے جن کی عمر سکول جانے کے قابل ہے ۔ سکول جاتے ہیں ۔ اس پر بھی لیلا ۔ بوچھل کلاں اور تنزال کی طرح جدید طرز کاشتکاری کی یہاں بھی کوئی علامات نہ تھیں ۔ گاؤں میں صرف ایک شخص کے پاس مسٹن ہل تھا ۔ اور اس سال تک جبکہ دو بھائیوں نے محکمہ زراعت سے درخواست کی ہے ۔ کسی نے کبھی بھی کسی ترقی یافتہ بیج کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کی تھی ۔ ایک سپاہی نے اپنے طرز عمل کے جواز میں کہا " میری زمین پتھریلی ہے ۔ اور مسٹن ہل پتھریلی زمین میں ٹوٹ جاتے ہیں ۔ اگرچہ جدید ذرائع عمل میں نہیں لائے جاتے ۔ لیکن پھر بھی کاشتکاری اچھی قسم کی ہے ۔ کھیتوں کی مینڈھیں از بس پسندیدہ طریق پر بنی ہوئی ہیں ۔ اور اس سے پہلے دن میں دیکھی ہوئی بہت سی مینڈھوں کے برعکس پتھروں سے بہت کچھ

صاف ہیں اُن کھیتوں سے جو گاؤں کے نزدیک ہیں۔ دو دو فصلیں لی جاتی ہیں۔ اور مئی میں گیہوں کاٹنے اور جولائی میں مکی بونے کے وقت تک ان میں چار یا پانچ دفعہ ہل چلایا جاتا ہے۔ اور اچھی طرح کھاد دیا جاتا ہے۔ انہوں نے پُر زور الفاظ میں کہا۔ کہ تعلیم نے ہمیں کھاد کا بہت شائق بنا دیا ہے۔ اور ہم نے چالیس پچاس گڑھے کھودے ہیں۔ میں نے پوچھا "حکماً یا اپنی مرضی سے"۔ انہوں نے صاف صاف کہا کہ تین چوتھائی حکماً۔ اور ایک چوتھائی اپنی مرضی سے"۔ لیکن انہیں ان کے مفید ہونے میں شبہ نہ تھا۔ ایک کھتری زمیندار نے جو کہ بنک کا ممبر بھی تھا۔ یہ کہا کہ اس طرح ہمیں زیادہ کھاد حاصل ہوگا۔ اور ہمارا گاؤں زیادہ صاف ہوگا۔ اور ہماری صحت زیادہ اچھی۔ میں نے کہا "تم سب کے سب گڑھے کیوں نہیں کھودتے"؟ اس نے جواب دیا۔ یہ ہماری سستی ہے۔ لیکن ہمارے ڈپٹی کمشنر صاحب ہمیں جگانے اور ہوشیار کرنے کیلئے آگئے ہیں۔ اس گاؤں کو ایک فوقیت یہ حاصل ہے۔ کہ یہاں جلانے کی لکڑی بہت ہے۔ اور اُپلے صرف دودھ کو مکھن بنانے سے پہلے آہستہ آہستہ کھولانے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔

مسٹر برین کے لائحہ عمل کی موٹی موٹی باتیں لوگ خوب سمجھے ہوئے تھے۔ کھتری نے اُن سب کو اس طرح بیان کیا "گڑھے کھودو اور گاؤں کو صاف رکھو۔ بچوں کو تعلیم دو۔ فضول خرچی چھوڑ دو۔ زیورات نہ خریدو نہ پہنو۔ مقدمہ بازی سے کنارہ کشی اختیار کرو" میں نے دریافت کیا۔ کہ ان میں سے سب سے زیادہ سخت حکم کونسا ہے؟ اسکے لئے کچھ سوچنے کی ضرورت نہ تھی۔ چنانچہ بحث کے بعد وہ اس بات پر متفق ہوگئے۔ کہ مقدمہ بازی چھوڑنے کا حکم سب سے کٹھن ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ہماری زندگیاں جھگڑوں سے بھرپور ہیں۔ اور جب ہم اسکے دور کرنے کے ممکن طریقوں پر غور کر رہے تھے۔ تو انہوں نے کہا کہ جھگڑا صرف شادی کرنے سے ہی مٹ سکتا ہے۔ بلاشبہ یہی صورت قوموں میں اس وقت تھی۔ جب کہ خاندانی عہد و پیمان ہوا کرتے تھے۔ وہ فریق جس سے انتقام لینا ہے۔ ضرور لڑکی دے۔ اور اگر طرفین نے انتقام لے لیا ہو۔ تو دو طرفہ شادی ہونی ضروری ہے۔ ان پہاڑیوں کے ایک ذیلدار کا واقعہ پیش نظر ہے۔ بہت سے سال گذرے۔ اس کے کسی رشتہ دار نے اس کے مزارعوں میں سے کسی کو جو اپنے آپ کو اعوان بتاتا تھا۔ یہ کہا کہ تو حرامی ہے۔ اس کی عزت پر حرف آیا۔ اور اس نے اسے قتل کر ڈالا۔ ذیلدار پر یہ شبہ کیا گیا۔ کہ اپنی مطلب براری کے لئے

اس کا ہاتھ بھی اس میں تھا۔ اور اس وقت سے اسے حراست میں رکھا گیا (خاص طور پر رات کو) اگرچہ ظاہری تعلقات دوستانہ ہیں۔ اور کنبے کے دونو گھر اکٹھے بیٹھکر کھاپی بھی لیتے ہیں۔ لیکن دو یا تین سال گذرے جبکہ ہر وقت خوف لگے رہنے سے تنگ آکر اس نے یہ تجویز کی کہ صلح کر لی جائے۔ اور ہماری طرف کی ایک لڑکی ان کی طرف کے لڑکے سے شادی کر لے۔ لیکن عزت کا احساس اسقدر قوی ہے۔ کہ اس کے گھرانے نے سوچا کہ وہ اسے ڈر کی علامت سے تعبیر کریں گے۔ پس پہرے دار کی آواز برابر جاری ہے۔ مقدمہ بازی چھوڑنے کی نسبت زیورات کا چھوڑنا بھی کچھ آسان نہیں ہے۔ کیونکہ جیسے پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ اس کا تعلق عورتوں سے ہے۔ جن کے پاس ان کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ کھتری زیورات خریدنے کی جہالت کے متعلق لسانی دکھانے لگا۔ اس نے کہا کہ ہم اپنا سونا سنار کے پاس لے جاتے ہیں۔ اور وہ اس میں کھوٹ ملا کر ہمیں واپس دیتا ہے۔ اس طرح ہمیں دھوکا دیا جاتا ہے۔ اور ہمیں اپنی لاگت کا نصف ملتا ہے۔

میں نے کہا "پھر تم اپنے کانوں کی بالیاں کیوں نہیں بیچ دیتے؟ (اس کے دونو کانوں میں ایک ایک تھی) ہنسکر اور کچھ شرما کر اس نے کہا۔ جب میں بچہ تھا۔ تو ہمارے فقیر نے انہیں میرے کانوں میں ڈال کر کہا تھا "جب تک تم انہیں پہنے رہوگے۔ امن سے رہوگے"۔ اور اب میرے گھر کے لوگ مجھے ان کے نکالنے کی اجازت نہیں دیتے۔ ہندوستان میں سنار بہت بدنام ہے۔ ضرب المثل یہ ہے۔ کہ وہ اپنی ماں کے کڑوں میں بھی کھوٹ ڈال دیتا ہے لیکن وہ اتنا برا نہیں ہے جتنا کہ اُسے کہا جاتا ہے۔ میری تحقیقات یہ ظاہر کرتی ہے کہ نہایت شاندار زیورات کی صورت میں جن میں بددیانت سنار کے لئے زیادہ سے زیادہ موقع بددیانتی کا ہے۔ فروخت کے وقت قیمت خرید پر ۱۵ یا ۲۰ فیصدی نقصان ہوتا ہے۔ اور زیادہ ٹھوس چیزوں میں ۱۰ یا ۱۵ فیصدی ٭

گھروں کی تعمیر پر فوجی اثر

سارے کے سارے سالٹ رینج (کوہستان نمک) میں ملکیتیں اس قدر چھوٹی ہیں کہ (گوارہ ننک کے ۳۹ ممبروں کے پاس ۳۱۹ ۔ ایکڑ بارانی زمین ہے) تقریباً ہر زمیندار گھرانے کے ایک یا دو آدمی فوج میں ہیں۔ اس کا اثر بہت کچھ ویسا ہی پڑا ہے

جیسا کہ جالندھر میں نقل کرنے کا۔ گاؤں میں بیشمار نئے گھر ہیں۔ گوارہ میں اگرچہ ۱۲۰ کنبے رہتے ہیں۔ لیکن جنگِ عظیم سے لیکر اب تک تین چالیس گھر تعمیر کئے جا چکے ہیں۔ ایک جو میں نے دیکھا ۱۸۰۰ روپے کے خرچ سے بنا تھا۔ یہ لاگت سب سے زیادہ تھی۔ سب سے کم ۴۰۰ روپے تھی۔ ایک ہزار روپیہ فی گھر کے حساب سے بھی (ایک چونکا دینے والا اندازہ) گاؤں نے اس زوال کے زمانے میں چالیس ہزار روپیہ صرف کیا ہوگا۔ اور اس کا اکثر حصہ فوجی تنخواہ سے حاصل کیا ہوا ہے۔ جس طرح فلسطین میں گھر پتھروں سے تعمیر کئے جاتے ہیں۔ اور بعض صورتوں میں اچھے تراشے ہوئے صفائی سے لگائے ہوئے اور گارے سے خوب جمائے پتھروں سے کہ فنِ معماری کا اس سے بہتر کام کہیں اور مشکل سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ بھی پتھروں کے ہیں۔ تمام کام مقامی معماروں نے کیا ہے۔ مزید براں یہ کہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے مہیا کئے ہوئے سکولوں سے ان کا مقابلہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اُن سے کہیں زیادہ خوبصورتی سے تناسب قائم رکھا گیا ہے۔ اور ان کے ہموار پلستر کئے ہوئے دروازے پھولدار منولوں سے اس طرح سجائے ہوئے ہیں۔ جیسے کہ آسٹریا میں۔ اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ کہ گاؤں والوں میں خوبصورتی کی حس تھی۔ اور گرد و نواح کے کاریگروں میں خواہ وہ معمار تھے۔ یا بڑھئی کے کام کی صفائی تھی۔ ایسی چھتوں میں جہاں نئی کڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ دیوار کے شہتیر اچھی طرح صاف کئے ہوئے تھے۔ اور ٹھیک ٹھیک رکھے گئے تھے۔ اور سیمنٹ کے فرش جنہیں درحقیقت عورتوں نے بنایا تھا دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ (اور دل میں تھا) کہ کوہستانِ نمک کے اس دور افتادہ گاؤں کے ان فرشوں سے بہتر فرش پنجاب کی عام کوٹھیوں میں نہیں دیکھے جاتے۔ اور اندر کے اندھیر کمروں میں بھی وہ اتنے بے داغ تھے۔ کہ ان پر جوتے لیکر چلنا جرم معلوم ہوتا تھا۔

جادو

ہم غروبِ آفتاب کے وقت بشارت پہنچے۔ میں نے دیکھا کہ میرے ۷۸ کرسمس کارڈ کارڈ آئے پڑے تھے۔ یہ کل کے چالیس کارڈوں کے علاوہ تھے۔ ان دنوں اس محبت بھرے ملک میں معمولی واقفیت والے کے پاس بھی مبارک باد کا خط بھیجا جاتا ہے۔ اور افسروں کے پاس تو وہ مینہ آندھی کی طرح آتے ہیں۔ اگر پہاڑی علاقے کی بارش کا خیال کیا جائے تو

زیادہ بلند حصّوں میں زیادہ بارش ہوتی ہے۔ لیکن اس لحاظ سے ۱۲۷ اکارڈ محض ایک چھوٹا ثابت ہوئے ہیں۔ ہم سے ۸۰۰ فٹ اوپر سلسلۂ نمک کے مشرقی نصف حصے کی سب سے اونچی چوٹی ہے۔ جو تمام کی تمام ۳۷۰۰ فٹ بلند ہے۔ لیکن روحانیت کے خاص جذبے سے سرشار کی کشش کے لئے یہ کافی اونچی ہے۔ وہ لوگ جنہیں خداوند تعالیٰ کے فضل سے خاص حصہ ملا ہے۔ اسکی چوٹی پر چڑھ جاتے ہیں۔ اور بکرے کی قربانی کر کے اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اور اسے پہاڑ گرا اپنی بھوک کا نقش بٹھاتے ہیں۔ لیکن ایمان یا شکرگذاری کی قوت کمزور پڑتی جا رہی ہے۔ اور بیٹے کی نسبت اب ایسا کم کیا جاتا ہے۔ یہی حال ایک دوسری رسم کا ہے۔ جب غلّے کے گٹھے کھلیان میں ایک دوسرے کے اوپر ڈھیر کئے جاتے ہیں۔ تو ہر ایک میں ایک تعویذ رکھ دیا جاتا ہے۔ اور کھلیان کے گرد ایک دائرہ کھینچ دیا جاتا ہے۔ جس کو کوئی جوتوں والا شخص نہیں کاٹ سکتا۔ اور عورتیں تو بالکل اندر آ ہی نہیں سکتیں۔ کیونکہ بقول بعضے وہ ناپاک اور بہ قول دیگراں (طنّاز) ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ جِن ان کی دلکشی کی تاب نہیں لا سکتے۔ ایک لوہے کا اوزار بھی پاس رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ لوہے میں یہ خوبی خیال کی جاتی ہے۔ کہ یہ بُری روحوں کو دور رکھتا ہے۔ یہ خیال عام ہے۔ کیونکہ حال ہی میں وسط ہند میں میں نے دیکھا۔ کہ جس ڈھیر کا بھی میں نے جائزہ لیا۔ اس میں ایک درانتی چھپی ہوئی تھی۔ اگرچہ اب یہ ٹوٹنے ٹوٹکے ہر جگہ لازمی طور پر عمل میں نہیں لائے جاتے لیکن پھر بھی صوبے بھر میں عام ہیں +

۲۸-دسمبر۔ بشارت سے وَل (۱۳ میل)

ایک گاؤں جو اپنے لئے آپ کفایت کرتا ہے

آج ہماری قسمت میں اوپر بادل اور نیچے پتھر تھے۔ ہم نے ایسا پتھریلا علاقہ کبھی نہیں دیکھا۔ سڑک اور کھیت ان سے پٹے پڑے تھے۔ بعض کھیتوں میں تو اس کثرت سے تھے۔ کہ یہ دیکھ کر حیرانی ہوتی تھی۔ کہ باجرے یا گیہوں کا ایک تنکا بھی ان میں سے کس طرح باہر نکل سکتا ہے۔ ہم وادی بہ وادی چلے گئے۔ اور ان میں سے ایک میں جہاں کی زمین رنگیلے خوش رنگ پتھروں سے بنی ہوئی تھی۔ ہم ایک گلابی رنگ کے گاؤں کے پاس پہنچے۔ جو پہاڑی کے ساتھ ساتھ اوپر کی طرف پھیلا ہوا تھا۔ ہمارے رہبر نے جو کہ فوج سے واپس آیا

ہوا ایک سپاہی تھا۔ یہ کہا کہ یہاں پرانی تہذیب کے لوگ رہتے ہیں۔ وہ تمام دن جنگل میں رہتے ہیں۔ اور انہیں دنیا کی کچھ خبر نہیں ہے۔ اس نے میرے شوق کو تیز کر دیا۔ اور ہم پتھریلے کھیتوں میں سے ہوتے ہوئے امریلا گاؤں کی طرف چلے۔ وہاں کا نمبردار ہماری ملاقات کیلئے باہر آیا۔ اور ان الفاظ کے ساتھ کہ آپ کا قدم ہمارے لئے باعث برکت ہے۔ حسب دستور گورنمنٹ کے ساتھ وفاداری ظاہر کرنے کے لئے ایک روپیہ پیش کیا۔ رسم کے مطابق ہم نے اُسے چھو دیا۔ اور وہ اس کے لباس کی کسی جھول میں غائب ہو گیا۔ اس کے بیان کردہ پرانے رواج ایسے تھے۔ کہ اکثر جدید گاؤں اس پر رشک کریں گے۔ اُس نے کہا کہ جب سے انگریزی راج ہے۔ (خدا جانے کتنے برس گذرے) صرف ایک شخص عدالت تک پہنچا ہے۔ اور اسے تین سال کی سزا ملی۔ ہم اپنے تمام جھگڑوں کا فیصلہ آپس ہی کر لیتے ہیں۔ ہم اب بھی اس طرح کرتے ہیں۔ اور ہمیشہ سے ایسا کرتے آئے ہیں۔ چونکہ گاؤں میں کوئی بنیا نہ تھا۔ مجھے یہ بات معلوم کرنے کا شوق ہوا۔ کہ گاؤں والے اس کے بغیر کیسے کام چلا رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ہم کھتری کے پاس نہیں جاتے۔ ہم میں سے . . . کسی کا اس سے لین دین نہیں ہے۔ جب ہمیں قرض کی ضرورت پڑتی ہے۔ تو ہم برادری میں سے کسی سے لے لیتے ہیں۔ اور اس پر کوئی سود نہیں لیا جاتا۔

"لیکن شادی کے موقع پر کیا کرتے ہو؟"

اس نے کہا۔ یہ تنبول کی امداد سے کی جاتی ہے۔ اور اگر تنبول کچھ نہ آئے۔ تو نکاح پڑھ دیا جاتا ہے اور بس۔ پھر اس نے وہ تمام طریقے بیان کئے۔ جن سے وہ ایک دوسرے کی امداد کرتے تھے۔ اور وہ وہی طریقے تھے جو سارودھی میں بتائے گئے تھے۔ اس نے کہا کہ جب ہمیں کوئی ایسا کام کرنا پڑتا ہے۔ جسے کوئی شخص اکیلا نہیں کر سکتا۔ تو ہم اُسے مل کر انجام دیتے ہیں۔ ایک بندھ کے معاملے میں جس پر ان کے کھیتوں کی نمی کا انحصار ہے۔ یہی صورت تھی۔ اس میں سے پانی رستا تھا۔ اور وہ سب مل کر اسکی مرمت کر رہے تھے۔ یہ گاؤں جو مع بنیس گھروں کے چیونٹیوں کی بستی نظر آتا تھا۔ درحقیقت ایک انجمن امداد باہمی تھی۔ جو گاؤں کی ضروریات نے خود بخود قائم کر دی تھی۔ کاشتکاری کے سوا دوسرے امور کے متعلق یہ معلوم کرنا مشکل تھا۔ کہ ہم انہیں کیا دے سکتے تھے۔ یہ بہت کچھ قدیم طرز کی تھی۔ میں نے ان کے کھیتوں کے پتھروں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ تم انہیں نکال کیوں نہیں دیتے۔ نمبردار نے جواب دیا۔ ہم سست لوگ ہیں۔

لیکن جب سے صاحب آیا ہے۔ اس نے ہم میں اپنے طریقے بدلنے کی روح پھونک دی ہے پس ہم بند کی مرمت کر رہے ہیں۔ اور پھر ہم انہیں بھی دور کر دینگے۔

عورتوں کا کام

آٹھ لڑکے ایک سکول میں جاتے ہیں۔ جو ایک میل کے فاصلے پر ہے۔ میں نے نمبردار سے پوچھا کہ تعلیم کا کیا فائدہ ہے۔ اس نے بتایا کہ ایک لڑکا نارمل سکول گیا ہے۔ وہ استاد بن جائیگا۔ ایک فائدہ تو یہ ہے۔ گفتگو کرنے وقت تعلیم یافتہ شخص کے الفاظ بہ نسبت ایک ان پڑھ کے زیادہ اثر لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ دوسرا فائدہ ہے۔ ایک اور ہے۔ اگر کوئی تعلیم یافتہ شخص جھگڑا کرتا ہے۔ تو عقل سے جھگڑتا ہے۔ دیہاتی کے خیالات میں سے کوئی بات دقیانوسی خیالی نہیں ہے۔ وہ ہر چیز کا اندازہ اپنے مشاہدے سے کرتا ہے۔ آج گھر اتنے صاف ستھرے نہ تھے۔ جتنے کہ کل۔ لیکن فرش نہایت اُجلے تھے۔ اور مویشیوں کے کمرے بہت سے اُن مویشی خانوں سے زیادہ صاف تھے۔ جو میں نے گذشتہ سال یورپ کے مختلف ملکوں میں دیکھے تھے۔ ایک صحن میں تین گائیں چپڑ چپڑ چارہ کھا رہی تھیں۔ اور ان کے نزدیک ایک لولی کتا کوڑے کرکٹ پر بیٹھا تھا۔ یہاں بازاری کتے نہیں ہیں۔ کوہستانِ نمک ہر ایک کتا کسی نہ کسی مالک کا ہوتا ہے۔ اور اس کے لئے بطور چوکیدار کام کرتا ہے۔ اندرونی کمرے کے دروازے میں ایک لمبے دانتوں والی عورت جس کی آنکھوں سے چمک اور صورت سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ دبکی کھڑی تھی۔ بات سمجھنے میں وہ نمبردار سے زیادہ تیز تھی۔ اور اس نے کئی بار اُسے لقمہ دیا۔ یہاں کی عورتیں (اور یہ یہیں کی عورتوں کی خصوصیت ہے) پیستی ہیں۔ کاتتی ہیں۔ اناج کی کوٹھیاں بناتی ہیں۔ (یہ عمدہ سفید مٹی اور بھوس سے بنی ہوتی ہیں) پکاتی ہیں۔ بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ پانی لاتی ہیں۔ گھروں میں جھاڑو دیتی ہیں۔ اور انہیں صاف کرتی ہیں۔ دیواروں پر گارا لگاتی ہیں۔ اور کھیتوں میں کام کرنے والوں کا کھانا بناتی ہیں۔ میں نے دریافت کیا "آدمی پہلے اُٹھتے ہیں۔ یا عورتیں"؟

"عورتیں"۔

"سب سے آخر کون سوتا ہے"؟

"عورتیں"۔

میں نے کہا یہ گاؤں خوب ہے ۔ لیکن اس میں ایک خرابی ہے ۔ وہ یہ کہ عورتیں آدمیوں سے زیادہ کام کرتی ہیں ۔ ایک عام کھکھلاہٹ نے اسکی حقیقت افشا کردی ۔ اور اس کے بعد ہی ہم آگے چل پڑے ؛

ڈھلوان ٹیلے کی چوٹی کے نچلے حصہ سے ۱۵۰۰ فٹ نیچے وہ بڑا میدان تھا ۔ جو سمندر کی طرح وسیع اور راونٹ کی مانند بھورا تھا ۔ ہم پتھروں کے لامختتم سلسلے میں سے نیچے ہی نیچے چلتے رہے ۔ اور ہمارے گھوڑے ٹھہکتے پھسلتے اور کھرچتے ہوئے ہمارے پیچھے آتے رہے ۔ آخرکار جب سورج کو گہرے طوفانی بادلوں کی آڑ میں چھپے ہوئے دیر ہو چکی ۔ تو ہم نے میدانی زمین پر قدم رکھا ۔ اور نصف میل اور چلنے کے بعد قیام گاہ تک پہنچ گئے ۔ جہاں مسٹر برین اور ان کی زوجہ صاحبہ نے میزبان کی حیثیت سے میرا استقبال کیا ۔

مسٹر برین کے لایحہ عمل کے متعلق خوب گفتگو ہوئی ۔ انہوں نے بتایا کہ لوڑ گاؤں کی نسبت یہاں کے حالات بہت موافق ہیں ۔ نہ یہاں پیس دینے والی غربت ہے ۔ اور نہ ایسی غلاظت کہ چپ ہی بھلی ۔ یہاں کے لوگوں کی ذہنیت کہیں اعلیٰ اور دل صاف ہیں ۔ اگر لوگ کسی بات پر اعتراض کرتے ہیں ۔ تو فوراً ہی کر دیتے ہیں ۔ اور مذاق کی دولتیاں جھاڑتے بھی ہیں ۔ اور سہتے بھی ہیں ۔ تعلیم ہو تو بہتر تبدیلیاں بھی ہو سکتی ہیں ۔ لوگوں کو یہ ضرور سکھانا چاہیئے کہ وہ بُری رسمیں چھوڑ دیں ۔ مثلاً زیورات پہننا ۔ اور گاؤں کے گرد کتوں کی طرح آزاد پھرنا ۔ ان کو یہ بھی ضرور سکھانا چاہیئے ۔ کہ وہ اپنے بے اندازہ فرصت کے وقت کو کاشتکاری اور دیہات کی حالت بہتر بنانے میں صرف کریں ۔ اور لڑنا جھگڑنا اور خون کرنا چھوڑ دیں ۔ تقریباً چالیس خون ہر سال ہوتے ہیں ۔ اور ایک ہی گاؤں میں ستائیس بیوائیں ہیں ۔ سنتے ہیں کہ سب یا تو قتل کی وجہ سے بیوہ ہوئی ہیں ۔ یا جلا دگی رستی سے ۔ مسٹر برین نے سب سے زیادہ زور کھاد کے گڑھے پر دیا ۔ کیونکہ اس سے نہ صرف کاشتکاری کو ترقی ہوتی ہے ۔ بلکہ گاؤں کو بھی صاف رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے ۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان سے اخلاق کا رواج ہو جائے ۔ جو اب بالکل نابود ہیں ۔ ذرائع کے متعلق انہوں نے یہ کہا ۔ کہ میرا خیال ہے ۔ کہ ضلع کا ایک مقامی رسالہ جیسا کہ میں نے جاری کیا ہے ۔ دینی زندگی، تعلیم یافتہ طبقہ تک پہنچنے کا اور غیر ان پڑھ لوگوں تک رسائی کرنے کا بہترین ذریعہ ہے ۔ آخرالذکر کے لیئے اس ۔ ۔ بھی بہتر ڈراما ہے ۔ یہ بات بابت خوب ۔ اگر صفحے

مذاقِ ڈراما کو حرکت دی جائے۔ اور اسے "دیہات سدھار" کے کام میں لایا جا سکے۔

۲۹ دسمبر۔ راول سے جلال پور (۵ میل)

سیلاب

آج سڑک اتنی ہی چوڑی تھی۔ جتنی کہ کل ڈھلوان تھی۔ اور ننگی سُرخ پہاڑیاں ہمارے سروں سے اوپر دیوار کی طرح کھڑی تھیں۔ ہم پھر جہلم کے قریب تھے۔ اگرچہ یہ بچے کیطرح خاموش اور بھولا بھالا پڑا تھا۔ لیکن جیسا کہ ہم نے سُنا تھا۔ یہ کوئی بچہ نہ تھا۔ گذشتہ سال ایک شام اس نے اپنے طاس میں سے سر اُٹھایا۔ اور صبح سے پہلے ہی پہلے بیسیوں گاؤں کو بہا کر لے گیا۔ بہت سے ماچھیوں نے مل کر مجھے ایک عرضی دی جس میں لکھا تھا کہ ہمارا گاؤں تقریبًا تمام تباہ ہو گیا ہے۔ اور گرد و نواح کے علاقے میں ہماری ایسی بُری حالت ہے۔ جیسی کہ اس شخص کی ہوتی ہے۔ جس کا آقا کوئی نہ ہو۔ اور وہ سراسر برباد ہو گیا ہو۔ ایک تباہ کُن سیلاب کی لائی ہوئی بے سرو سامانی اور مایوسی کا نقشہ اس سے بہتر الفاظ میں نہیں کھینچا جا سکتا۔ بنک کے ستّر ممبر جو سڑک کے کنارے ہمارا انتظار کر رہے تھے مصیبت زدگان میں سے تھے۔ ان کے گھر سامان غلہ اور چارہ سب کچھ جاتا رہا تھا۔ لیکن امداد باہمی نے، فیصدی سود (عام شرح ۱۲½ فیصدی ہے) پر انہیں خاص قرضے دیکر اس مصیبت سے ان کی جان چھڑائی۔ گھر تعمیر کیے گئے۔ اور اناج کی کمی پوری کی گئی۔ چند لوگوں نے گورنمنٹ سے قرضہ لیا۔ لیکن بنک کے قرضے کو ترجیح دی گئی تھی۔ اور اسکی وجہ وہی تھی۔ جو ہر شخص صوبے کے گوشے گوشے میں سُن سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ بقول شخصے ان میں نرمی ہے جبکہ دوسروں کی سختی۔ جب گورنمنٹ کا قرضہ واپس لیا جاتا ہے۔ تو تحصیل کے لوگ موٹا لٹھ لیکر آتے ہیں اقساط مقررہ تاریخ پر ادا کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن بنک کا قرضہ بن آئے پر دیا جا سکتا ہے۔ ایک بنک نے اُدھار لئے ہوئے روپیہ کا دو تہائی ادا کر دیا ہے۔ لیکن دوسرے نے صرف ⅓ حصہ ہی واپس دیا ہے۔ بادلوں سے ڈھکا ہُوا انگلستان یوں گویا ہے۔ کہ ہر ایک بادل کے ساتھ رو پہلی جدول ہے۔ ہندوستان میں اس کا مترادف یہ ہو سکتا ہے۔ کہ ہر ایک سیلاب کے ساتھ کیچڑ تازہ مٹی جو دریا بہا کر لاتا ہے طوفانی دریا نے یہ مٹی یہاں کھیتوں میں اسقدر

زیادہ بچھائی ہے۔ کہ فصلیں مینہ آندھی کی طرح اترتی ہیں۔ لیکن ہندوستانی دستور کے مطابق پھر خشکی آگئی۔ اور غزاں میں مرجھائی ہوئی فصلیں ہوئیں۔
دیہاتیوں نے لکڑی کے کام کیلئے ایک بڑھئی اور گارے کے لئے ایک پٹھان اور مصلی کی امداد لیکر اپنے گھر خود بنائے تھے۔ ان پر ابھی تک پلستر نہ ہوا تھا۔
اور ان کی بیرونی صورت بوڑھے آدمیوں کے چہرے کی طرح جھریاں اور بل لئے ہوئے تھی۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ اندھوں کے چہروں جیسی تھیں۔ کیونکہ کسی نے ان میں کھڑکیاں رکھنے کے متعلق نہ سوچا تھا۔ گلی کے وار پار ایک رسی کے وسط میں جو پہنچ سے باہر تھی۔ ایک تعویذ باندھا ہوا تھا۔ مویشی بیمار تھے۔ اور یہ ان کا علاج تھا یہ دعویٰ سے کہا گیا۔ کہ جو لوگ اس پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ ان کے لئے یہ علاج کارگر ثابت ہوتا ہے۔

تعلیم کی موافقت و مخالفت

ستر حاضرین میں سے صرف پانچ خواندہ تھے۔ ان میں سے تین فوجی تھے۔ چونکہ لوگ صنعتی کاموں کے عادی ہیں۔ اس لئے یہاں فوج کو کوئی خاص شہرت حاصل نہیں ہے ایک ممبر نے کہا۔ کہ سپاہی ہمارا کام نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی وہ کچھ اور کر سکتا ہے۔ فوج میں صرف چند گھنٹے کام کرتا ہے۔ اور پھر آرام لیتا ہے۔ ہم تمام دن کام کرتے ہیں وہ چائے پیتا ہے اور ڈبل روٹی کھاتا ہے۔ ہم لسی پر ہی قناعت کر لیتے ہیں۔ وہ عمدہ کپڑے اور بوٹ پہنتا ہے۔ ہمارے کپڑے میلے۔ جوتیاں ادھڑی ہوئی۔ اور پگڑیاں پھٹی ہوئی ہیں۔ اس میں رشک اور ساتھ ہی مبالغے کا چٹخارہ تھا۔ لیکن اس دورے میں مشاہدہ کئے ہوئے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ سپاہی بننا کاشتکاری کے لئے کوئی اچھی تیاری نہیں ہے اگرچہ ایسا کرنا تعلیم یافتہ ہونے کی نسبت کاشتکاری کے لئے کہیں بہتر ہے۔ دو نمبروں میں سے ایک کا صدر آخری بات کے متعلق کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا کہ میرے دو بیٹے ہیں۔ بڑا اسکول جاتا ہے۔ اور آٹھویں جماعت میں پڑھتا ہے۔ چھوٹے نے صرف مسجد میں پڑھا ہے۔ وہ ہر ایک کام کر سکتا ہے۔ لیکن بڑا یہ بھی نہیں جانتا کہ کنوئیں کی رسی کے ساتھ ٹنڈیں باندھی جاتی ہیں۔ کس طرح بانٹی جاتی ہے۔ اور اسکے ساتھ چھوٹی سیڑھی نما

چھٹیاں کیونکر باندھی جاتی ہیں۔ چھوٹا ہر طرح کا بوجھ اٹھا لیتا ہے۔ اور بڑا اتنا کمزور ہے۔ وہ بچے جو بچپن میں کام کرتے ہیں۔ ہر قسم کا کام کر سکتے ہیں۔

میں نے کہا۔ لیکن تعلیم کے فائدے بھی ضرور ہیں۔

اس نے جواب دیا۔ حضور کا ارشاد بجا ہے۔ تعلیم یافتہ بیٹا برادری کے معاملات میں زیادہ اچھا ہے۔ مثلاً جب ماتم پرسی کے لئے جانا ہو۔ نیز وہ ایسی کہانیاں بھی سُنا سکتا ہے جن سے دل خوش ہو جاتا ہے۔ یہ آخری بات تعلیم کے حق میں ایک نئی دلیل ہے۔ اور شاید زیادہ مؤثر ہے۔ کیونکہ اگر ایسی کہانیاں جن سے لوگوں کے دل خوش ہوتے ہیں۔ نہ ہوں تو زندگی کیسی پھیکی معلوم ہو۔ عوام میں تعلیم کے خلاف کوئی احساس نہ تھا۔ بلکہ اس کے برعکس وہ اُسے اچھا خیال کرتے تھے۔ اور اس کی وجوہات حسب معمول تھیں۔ "تعلیم یافتہ شخص دھوکا نہیں کھاتا۔ اسے ملازمت مل سکتی ہے۔ اور ایک ایسا شخص جو پڑھا لکھا نہ ہو۔ جانتا ہی کیا ہے؟

جلال پور روضہ کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس کا گنبد میلوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔۔۔۔ موجودہ سجادہ نشین کا پڑدادا سو سال گذرے۔ بخارا سے یہاں آیا تھا۔ لیکن اس جگہ کے تقدس اور خاندان کی ثروت کا سبب اس کے بیٹے کی بزرگی تھی۔ گنبد اس کے مقبرے کا نشان ظاہر کرنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ اور اب سال میں ایک بار اس کا عرس منانے کیلئے ہزاروں زائرین اس کے روضے کی زیارت کو آتے ہیں +

۳۰ دسمبر۔ جلال پور سے دارا پور (۱۱ میل)

چونکہ راستے میں کسی انجمن امداد باہمی کا معائینہ کرنا تھا۔ اس لئے ہم بارہ بجے تک روانہ ہوئے۔ سڑک کے ایک پہلو میں پہاڑ کا دامن تھا۔ اور دوسرے میں دریائے جہلم کا فراخ مگر قریب قریب بنجر نما سا پھیلا ہوا تھا۔ اور ایک دو جگہوں میں سڑک دریا ہی سے جا چھوتی تھی۔ دریا سست کم گہرے پانی کی ایک دھار تھی۔ جسکی تمام قوت اُن دو بڑی نہروں نے جن کو یہ پانی دیتا ہے۔ غصب کر لی تھی۔

سکاؤٹ

جب ہم اُن سے باتیں کر رہے تھے۔ تو ایک خوش پوش لڑکا نیلی پگڑی اور گلابی کوٹ

پہنے گھوڑی پر سوار نظر آیا۔ چونکہ وہ بھی وارا پور جا رہا تھا۔ اسلئے ہم ساتھ ساتھ ہو لئے۔ پندرہ برس کی عمر تھی اور ایک ہائی سکول کی نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سکاؤٹ بھی تھا۔ جب میں نے سکاؤٹنگ کے قوانین کے متعلق دریافت کیا۔ تو اس نے کہا کہ میرا فرض یہ ہے۔ کہ میں عام لوگوں کے ساتھ بھلائی سے پیش آؤں۔ اپنے ماں باپ کی عزت کروں۔ اور بادشاہ کی سلامتی چاہوں۔ میں نے پوچھا۔ تم نے عام لوگوں کے ساتھ کیا بھلائی کی ہے۔ وہ اپنے جواب میں شرمیلے پن سے مسکرایا۔ وہ ایک بات بھی نہ بتا سکا۔ پھر میں نے پوچھا سکاؤٹ کرتے کیا ہیں؟ اس نے جواب دیا۔ ہم ڈرل کرتے ہیں۔ جب ہمارے افسر سکول آتے ہیں۔ تو ہم انہیں سلام کرتے ہیں۔ چند روز ہوئے میں نے یہی سوالات ایک ایسے لڑکے سے پوچھے تھے۔ جو تقریباً ایک سال سے سکاؤٹ تھا۔ اور اس نے محض یہ جواب دیا تھا۔ کہ مجھے کچھ نہیں سکھایا گیا۔ سکاؤٹوں کے ساتھ ملاقاتیں کرتے ہیں میں ابھی تک اپنے آپ کو خوش قسمت نہیں خیال کرتا۔ جب میں نے اس کا ذکر انسپکٹر آف سکولز سے کیا۔ تو اس نے کہا کہ سکول ماسٹر اکثر صرف معائنے کے وقت لڑکوں کو سکاؤٹ بنا لیتے ہیں۔ دھوکا دینے والی پالیسی ملک کی مفید دلچسپیوں میں سے نصف کو تباہ کر دیتی ہیں۔

گھر کا کام

گھر کے جلسے میں جب ہم اس بات پر بحث کر رہے تھے۔ کہ دیہاتی لڑکے جب سکول جاتے ہیں۔ تو کھیتوں میں اپنے والدین کا کیوں اس قدر ہاتھ بٹاتے ہیں۔ مندرجہ ذیل وجوہات بیان کئے گئے تھے۔ ان کے والدین انہیں نامرد بنا دیتے ہیں۔ (یہی بات جھلوال کے پاس کہی گئی تھی) وہ اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتے ہیں۔ اور انہیں گھر کے لئے اتنا کام دیا جاتا ہے کہ وہ کر نہیں سکتے۔ میں نے اپنے نو عمر ساتھی سے پوچھا۔ اس معاملے میں تمہارا کیا حال ہے۔ اس نے جواب دیا۔ کہ کرسمس کی دس دن کی تعطیلات میں سے مجبوراً مجھے پانچ دن گھر کے کام کو دینے پڑے ہیں۔ ہر روز میں صبح تین بجے اٹھتا تھا۔ اور ۹ بجے تک کام کرتا تھا۔ اور پھر ۹ بجے سے شام کے تین بجے تک۔ یعنی دن کے بہترین دس گھنٹوں میں۔ رات کو آٹھ بجے سونے میں وہ نہایت عقلمندی سے کام لیتا تھا۔ گرمی کی تعطیلات میں جو تقریباً سات ہفتے تک رہتی ہیں۔ اس گھر کے کام میں ایک مہینہ صرف ہوتا ہے۔

اس نے ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ سکول کے دو تہائی لڑکے اسی طرح کام کرتے ہیں۔ میرے ساتھی نے کہا۔ اس میں کوئی بات قابل استثنیٰ نہیں ہے۔ اور اپنے دو بیٹوں کی مثالیں پیش کیں۔ اس نے بتایا کہ جتنی کتابیں وہ سکول سے گھر کے کام کیلئے واپس لاتے ہیں۔ ان کی تعداد میری تمام لائبریری کی کتابوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن اس نے ساتھ ہی ہنسکر کہا۔ کہ وہ انہیں پڑھتے نہیں۔ وہ اس بات کو بہتر سمجھتے ہیں کہ بیکار رہیں اور ان پر جرمانہ ہو۔ میں نے سوچا۔ عقلمند لڑکے ہیں جو حد سے زیادہ کام پر جرمانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن ہر شخص اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ ان لڑکوں کے پاس جو اتنا کام کرتے ہیں۔ جتنا ان کو دیا جاتا ہے۔ کھیت میں کام کرنے کیلئے نہ وقت بچتا ہے نہ طاقت۔ اور رفتہ رفتہ انہیں کھیتوں سے دور کی نسبت بھی نہیں رہتی۔

اس سے بھی زیادہ بڑی خرابی وہ طریقہ ہے جس سے ہائی سکولوں میں انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا جاتا ہے۔ میرے ساتھی اور لڑکے دونوں نے اس بات پر اتفاق کیا۔ کہ اس سے دل و دماغ پر بھاری بوجھ پڑتا ہے۔ اور جو کچھ پڑھایا جاتا ہے۔ اس میں سے بہت بہت کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ انہوں نے اس بات پر بھی رضامندی ظاہر کی۔ کہ چھوٹی جماعتوں میں چونکہ اساتذہ خود امتحان لیتے ہیں۔ اور جتنے چاہیں پاس کر سکتے ہیں۔ وہ تعلیم دینے کے لئے کوئی تکلیف نہیں اٹھاتے۔ نتیجہ یہ ہے۔ کہ جب لڑکے اوپر کی جماعتوں میں پہنچتے ہیں۔ تو انہیں کچھ نہیں آتا۔ اور جماعت کے ساتھ چلنے میں بہت دقت محسوس کرتے ہیں۔

روشنی اور صفائی

دیہاتی صحت خانوں کے متعلق مسٹر برین کی بات یاد کر کے میں نے لڑکے سے دریافت کیا۔ کہ انہیں رواج دینے کے لئے سکولوں میں کیا کیا جاتا ہے۔ اس نے کہا۔ صحت خانہ بنا ہوا ہے۔ لیکن چونکہ بھنگی دن میں صرف ایک بار آتا ہے۔ اسکی حالت کچھ اچھی نہیں رہتی۔ میرے ساتھی نے بتایا۔ کہ جب میں دیہاتی زندگی اور اس کے سادہ ماحول میں رہتے رہتے پہلی مرتبہ شہر کے ایک ہندوستانی ہوٹل میں ٹھہرا۔ تو میں وہاں کے انتظامات دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا۔ اس نے ساتھ ہی کہا۔ کہ ہوٹلوں کے غسلخانے اب بھی بری طرح سے گندے ہوتے ہیں۔ میں نے پوچھا کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ایک ایسے ملک میں جہاں آرام طلب

اور کاہل لوگ رہتے ہیں۔ پاخانوں کے گڑھوں کا رواج ہو جائیگا۔ اس نے جواب دیا۔ کہ یہی تو وہ سوال تھا۔ جو اس مسئلہ پر بحث کرتے والے لوگ آپس میں پوچھ رہے تھے۔

تعلیم اطفال

اس سلسلے میں حیران کن بات یہ ہے کہ دیہاتی بچے کو کبھی یہ تعلیم دی جاتی۔ کہ وہ کسی طرح بھی اپنے آپ پر قابو رکھے۔ یہاں تک کہ اسکی عمر اتنی ہو جاتی ہے۔ کہ وہ اپنے بزرگوں کے اطوار کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ غیر تربیت یافتہ کتے کی طرح برتاؤ کرتا ہے۔ جب میں نے اپنے ساتھی سے عورتوں کو پنجگانہ نماز پڑھنے کے لئے مناسب صفائی رکھنے میں دقت پیش آنے کی تشریح طلب کی۔ تو ایک اور نکتہ پیدا ہوا۔ اس نے کہا کہ ماں ہر وقت بچے کو ساتھ رکھتی ہے۔ اور ہر وقت گود میں۔ چونکہ دیہات میں ابھی رومال رکھنے کا رواج نہیں ہوا ہے۔ حادثات رونما ہو جاتے ہیں۔ تعلیم یافتہ زمینداروں کے گھروں میں بھی کوئی تربیت نہیں دی جاتی۔ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے بچوں میں بڑا فرق یہ ہے کہ مؤخر الذکر اپنے گھروں پر بہت کم سیکھتے ہیں کل اس کے سوالات دریافت کرنے پر مسٹر برین کے چار سالہ لڑکے نے جس علمیت کا ثبوت دیا۔ وہ میرے ساتھی کیلئے نہایت حیرانی کا باعث تھا۔ اس نے ایسے ایسے سوالات کا جواب دیا۔ جو اس سے دو چند عمر کے ہندوستانی بچے کے لئے اتنے مشکل تھے۔ کہ وہ جواب نہ دے سکتا۔

ایک نہر کی خرابیاں

اب تک ہم اُلجھے ہوئے نالوں میں چکر کاٹتے رہے تھے۔ اور اب کھلے دریائی علاقے میں نکل آئے تھے۔ اس میں خوبصورت سرکنڈا گھاس اور گیہوں کے ننھے ننھے پودے پودے اُگے ہوئے تھے۔ ہماری بائیں طرف ٹلہ کی مقدس پہاڑی کھڑی تھی۔ بلند و تنہا اور ہمارے دائیں طرف دریا کے وار پار دریائے جہلم کے ہیڈ ورکس چم چم کر رہے تھے۔ دار پور میں ہیں خلاف امید ایک گاؤں کی طرف ہو لیا۔ سوت کی چارپائیاں لائی گئیں۔ اور دیہاتی بنک کے بیس ممبر جلد اکٹھے ہو گئے۔ اس کے صدر نے جو سابق صوبیدار اور جنجوعہ قوم سے ہے۔ ہیڈ ورکس کے بُرے اثرات کی شکایت کی۔ اس نے بتایا کہ یہاں پانی کی بڑی

مقدار جمع رہتی ہے۔ بتیس سال گذرے ہیں کوئی مچھر نہیں ستاتا تھا۔ لیکن اب جب دریا کی طرف سے ہوا آتی ہے۔ تو ہم سو نہیں سکتے۔ اور بخار ہم پر اور مصیبت لاتا ہے۔ پہلے یہاں تین سو گھر تھے۔ اب صرف ۱۵۰ ہیں۔ اس سال ۱۶ پیدا ہوئے ہیں۔ اور ۳۳ مرے ہیں۔ میں نے گاؤں کے چوکیدار کی کتاب منگوائی۔ اور دیکھا کہ یہ اعداد ٹھیک تھے۔ اور ان میں سے سوائے ایک کے باقی سب بخار میں مرے تھے۔ میں نے سوچا کہ نہر سے حاصل کی ہوئی بڑی دولت میں سے تھوڑا سا حصہ ان لوگوں کے لئے بچایا جا سکتا ہے۔ جنہیں اس سے سوائے بخار کے اور کچھ حاصل نہیں ہوا۔ بہرکیف صرف پانچ میل کے فاصلہ پر ایک شفاخانہ موجود ہے۔

ایک پیشرو سپاہی

صوبیدار ایک کامل ترقی پسند سپاہی ہے۔ اور اس ضلع میں اپنی قسم کا دوسرا شخص ہے بہت سے سال گذرے۔ اس نے فوج چھوڑ کر اپنی چار سو ایکڑ زمین کاشت کرنی شروع کر دی تھی۔ اس کے دو سال بعد اس نے اپنے تمام زیورات فروخت کر ڈالے۔ اور اب بچا ہوا روپیہ اپنی بیوی اور بچیوں کی طرف سے ایک امداد باہمی کے بنک میں جمع کراتا ہے۔ دو سال ہوئے اس نے پوسا سے بیج لا کر رجینیا کا تمبا کو بویا تھا۔ اور اس سال محکمہ زراعت کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے لیوسرن۔ برسیم اور سرکنڈا گھاس اُگائی ہے۔ اس ضلع کی دوسری معائنہ کی ہوئی جگہوں کے برعکس اس گاؤں میں بہت سے جدید آلات ہیں۔ مثلاً دو راجہ ہل ۲ رسٹن ہل۔ ۳۔ ڈھیلے توڑ (سہراویں) ۲ کدال اور ایک چارہ کاٹنے کی مشین۔ یہاں پندرہ مینڈھے ہیں۔ جن کا تین چوتھائی میری نو نسل سے ہے۔ ان کے برف سے سفید فربہ ٹیلے انکی قیمت کا پتہ دیتے ہیں۔

صوبیدار اس بات کو اچھی طرح ظاہر کرتا ہے۔ کہ ایک سچا دیہاتی رہنما گاؤں کے لئے کیا کر سکتا ہے؟۔ اس وقت صوبے کو کسی اور قسم کے راہنماؤں کی نسبت ایسے پیشروؤں کی ضرورت ہے۔

تعلیم اور اسکی مشکلات

گاؤں دوسری باتوں میں آگے اُگے ہے۔ ۱۵۰ گھروں میں سے ۹۵ لڑکے اور ۳۰ لڑکیاں

سکول جاتی ہیں۔ تمام حاضرین نسوانی تعلیم کے حامی تھے۔ لیکن بہت سے انہی وجوہات کی بنا پر جو تین دن ہوئے پیش گئے تھے۔ یہ سمجھے تھے۔ کہ لڑکیوں کو لڑکوں کے ساتھ تعلیم دینا کوئی عقلمندی نہیں ہے۔ صوبیدار کو پرائمری جماعتوں تک اس میں کوئی اعتراض نہ تھا۔ اور یہ حقیقت تھی۔ کہ بیس لڑکیاں اور لڑکے مسجد میں اکٹھے پڑھائے جا رہے تھے۔ اور جب میں یہ صاف بات منہ پر لایا۔ تو انہوں نے کہا۔ کہ سکول اس سے مختلف ہے۔ کیونکہ وہاں کئی استاد نوجوان ہیں۔ گاؤں میں تیرہ ہندو دکاندار ہیں۔ اگرچہ وہ اپنی لڑکیوں کو ہندی یا سنسکرت میں پڑھانا پسند کریں گے۔ لیکن مسلمانوں کی بنائی ہوئی اردو پڑھانے پر اعتراض کرتے ہیں۔ ایک ایسے ملک میں جہاں لڑکے اور لڑکیوں کو اکٹھی تعلیم نہ دی جاتی ہو۔ جہاں ہر ایک مذہب اپنی تعلیم ایک ایسی مختلف زبان میں دیتا ہو۔ جو یا تو غیر ملکی ہو۔ یا قدیم ہو۔ یا مردہ ہو چکی ہو۔ اور جہاں لوگوں کی زبان چپے چپے پر اس قدر جلد بدلتی ہو۔ کہ انہیں ان کی مادری زبان میں تعلیم نہ دی جا سکتی ہو۔ لوگوں کی بڑی تعداد کو تعلیم دینا کس قدر مشکل ہے؟

جب میں کھیتوں میں سے ہوتا ہوا قیام گاہ کی طرف چلا۔ تو سنہری سرکنڈہ گھاس پر شام کی روشنی اپنی پوری آب و تاب دکھا رہی تھی۔ اور سورج غروب ہوتے ہی یہ روشنی اوپر آسمان کی طرف اٹھ گئی۔ اور ارغوانی پہاڑیوں کے پیچھے عنبریں رنگ میں تبدیل ہو گئی۔

نوروز کی شام۔ دارا پور سے جہلم (۲۳ میل)

آج صبح سردی شدت سے تھی۔ اتنی شدید کہ دیہاتی اپنی سفید سوتی چادروں کو سر اور کندھوں پر لپیٹ رہے تھے۔ ہندوستانی جب کانپتا ہے۔ تو بھی اپنی پیدائشی شان قائم رکھتا ہے۔ ہم کھلی جگہ میں چلے گئے۔ ایک ایسے میدان میں جہاں گیہوں اگی ہوئی تھی۔ اور ہمارے سامنے ہمالیہ پہاڑ معہ اپنی برفانی عظمت کے کھڑے تھے۔ یہ ایک ایسا نظارہ تھا جو دم بخود کئے دیتا تھا۔ اور ہر شخص کو ٹھیرنے کیلئے مجبور کرتا تھا۔

ترقی نسل مویشیان

ہم ایک گاؤں میں انجمن ترقی نسل مویشیان دیکھنے کے لئے ٹھیرے اور ہمارے

چاروں طرف مویشیوں اور مشتاق انسانوں کی بھیڑ لگ گئی۔ مویشی شمالی دھنی نسل کے تھے۔ ایسی دکھائی دیتی ہے گویا سفید برفانی پہلوؤں میں سیاہی کے چھینٹے دیئے ہوئے ہیں۔ ڈسٹرکٹ بورڈ نے گاؤں کو ایک سانڈ دیا ہوا ہے۔ جسکی دیکھ بھال تیرہ روپے ماہوار پر ایک گاؤں کے ذمے ہے۔ لیکن چونکہ سو سے زیادہ گائیوں کی خدمت بجا لانی ہے۔ اس لئے ایک کافی نہیں ہے۔ میں نے ایک اور سانڈ کی خرید پر بہت زور دیا لیکن اس کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ دیہاتیوں کو خود کچھ روپیہ لگانا پڑے گا۔ اُن کا جواب صرف یہ تھا۔ کہ وہ مؤدبانہ طریق پر رضامند ہو گئے۔ ہندوؤں کے علاقے کی نسبت جہاں گائے کی پوجا کی جاتی ہے۔ اور مویشیوں کو ذبح نہیں کیا جاتا مسلمانوں کا علاقہ مویشیوں کی افزائش نسل کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ اس لئے دریائے جہلم کے شمال میں جہاں مسلمانوں کی آبادی کا نوے فیصدی حصہ ہے۔ مویشیوں کی نسل بڑھانا اتنا ہی آسان ہے۔ جتنا کہ اور کہیں مشکل ہے۔ کیونکہ ڈبلے یا بوڑھے مویشیوں کو قصاب کے پاس فروخت کرنے کے خلاف سوائے ہندوؤں میں چند آدمیوں کے کسی میں ذرا بھی تعصب نہیں ہے اور یہ بات اور بھی کم دیکھنے میں آتی ہے۔ کہ کسی بیل یا گائے کو ناکارہ ہونے پر بیکار سے رکھا جاتا ہو۔ نہ کوئی مذہبی بنا پر اخنہ کرنے پر اعتراض کرتا ہے۔ اور نہ ٹیکہ لگوانے پر۔ جہلم کے بالکل پار بھی مویشیوں کی نسل بڑھانی مشکل ہے۔ اسکی وجہ وہ اختلاف ہے۔ جو جہلم کو حقیقی معنوں میں حدفاصل قرار دیتا ہے۔ اس کے شمال میں بیل تقریباً ہمیشہ بندھے رہتے ہیں۔ اور جنوب میں ہندوانہ رواج کے مطابق وہ جہاں چاہیں پھر سکتے ہیں۔ ایک صورت میں نسل پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اور دوسری میں بیل جہاں چاہتے ہیں۔ جفتی کرتے ہیں۔ اور ایک ایسے ملک میں جہاں ہر ایک قسم کی گائیں ہوں۔ اور اچھے بیل نہایت ہی کم ہوں۔ یہ اختلاف نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ مزید براں یہ کہ اگر بیل بندھے ہوئے ہوں۔ تو ان کے استعمال کے عوض فیس لی جا سکتی ہے۔ اور ان کی تعداد آئندہ نسل سے اور بڑھائی جا سکتی ہے۔ موجودہ کمی کا ظاہری علاج یہی معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر ڈسٹرکٹ بورڈ اس پر عمل پیرا ہوتے تو وہ زیادہ بیل خرید سکتے۔ بدقسمتی سے قانون اور دستور عمل اسکی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ اور بہت سے لوگ اس تجویز کو ناقابل عمل سمجھ کر ترک کر دیتے ہیں۔ تاہم جو لوگ بھینسے رکھتے ہیں۔ اکثر ان کی خدمات کا

معاوضہ لیتے ہیں۔ لیکن ایک ہندو کیلئے بیل سے ایسا کام لینے میں اس کا دھرم بھرشٹ ہوتا ہے۔ اور سکھ بھی اس میں پس وپیش کرتا ہے۔ لیکن شمالی علاقے کا مسلمان اس سے نہیں کتراتا۔ ہندوؤں کی نسبت مسلمانوں کے علاقے میں جدید طریقوں کے مطابق مویشیوں کی نسل بڑھانا اس قدر قابل عمل ہے۔ کہ یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ کہ اسکے لئے دریائے جہلم کے شمالی حصے کی نسبت ستلج کے جنوب میں کیوں اسقدر زیادہ کوشش کی گئی ہے۔

ابھی تک حصاری بیلوں کی خاطر دھنی نسل سے قریب قریب غفلت برتی جاتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اگرچہ حصاری بیل نہروں اور کنوؤں سے سیراب شدہ سخت زمین کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ ان علاقوں میں کوئی کاشتکار ایسا نہیں ہے جو پھرتیلے چالاک دھنی بیلوں کی بارانی زمین کیلئے (جہاں ہل کو گہرا جانے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ ضروری ہے۔ کہ ہلائی جلد ہو جائے تاکہ نمی ضائع نہ ہو جائے) ان پر ترجیح نہ دیتا ہو۔

ایک بھی یہاں تک کہ محکمہ بیطاری کا مستعفی افسر بھی جو وہاں موجود تھا۔ اس بات کی تشریح نہ کر سکا۔ کہ بیلوں کو جہلم کے ایک طرف کیوں باندھا جائے۔ اور دوسری طرف کیوں نہیں باندھا جاتا۔ ایک کا قیاس یہ تھا۔ کہ جانب جنوب جو قبائل آباد ہیں۔ وہ ہندوؤں کی نسل سے ہیں۔ اور غالباً یہی وجہ ہے۔ کہ دریا کے پار مسلمان راجپوت اور گوجر کیوں وقتاً فوقتاً کسی دودھ دیتی گائے کے جوان بچھڑے کو ثواب سمجھ کر آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ سراسر ہندوانہ رسم ہے۔ اور راجپوت اور گوجر دونوں کسی زمانے میں ہندو تھے۔

کیا دودھ کو گرم کرنیکی ضرورت ہے؟

دریائے جہلم کے شمالی وجنوبی حصوں میں نہایت ہی حیران کن وہ اختلاف ہے جو دودھ گرم کرنے کے طریقے میں نظر آتا ہے۔ اس کے جنوب میں گجرات سے لیکر دہلی تک اور جنوب مغرب میں سندھ کے کناروں تک دودھ آنچ پر تمام دن آہستہ آہستہ اُبلنے دیا جاتا ہے۔ اور بے شمار اُپلے (جنہیں زمین کو طاقتور بنانا چاہیئے) بطور ایندھن استعمال کئے جاتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس عمل کے بغیر چارہ نہیں ہے

مگر شمال میں ایک بار دریائی علاقے کو عبور کر لو تو چند لوگ ایسے ملیں گے۔ جو دن میں دودھ کو ایک گھنٹہ سے زیادہ گرم کرتے ہیں۔ اور بہت سے ایسے ہیں جو اسے قطعاً گرم ہی نہیں کرتے۔ اسے گرم کرنے کے اسباب یہ ہیں:۔

اوّل یا یہ اُسے خراب ہونے سے بچاتا ہے۔ ثانیاً یہ کہ اس سے لسی زیادہ بنتی ہے اور گھی بہت آتا ہے۔ ثالثاً یہ کہ اس سے اس میں ایک لذیذ ذائقہ پیدا ہو جاتا ہے۔ آخری دونوں باتیں خاص طور پر بھینسوں کے متعلق ہیں۔ جو شمالی پتھریلے علاقے میں کمیاب ہیں۔ لیکن اور جگہوں میں اثر طرح پائی جاتی ہیں۔ عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ شمال میں دودھ کی بہتات نہ ہونے کی وجہ سے یہ جنوب کی نسبت زیادہ جلد خرچ ہو جاتا ہے۔ وہاں گائیں محض افزائش نسل کے لئے رکھی جاتی ہیں۔ اور یہ کہ گرمی کا موسم جنوب کی نسبت تھوڑے عرصے تک رہتا ہے۔ لیکن اس کے خلاف بھکر تحصیل میں جو دریائے سندھ کی وادی میں ڈیرہ اسمٰعیل خان کے مقابل میں واقع ہے۔ دودھ گرم بہت کم کیا جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی شمال کی طرف میانوالی کی تحصیل میں دودھ گرمیوں میں گرم نہیں کیا جاتا بلکہ سردیوں میں کیا جاتا ہے۔ اور شمال کی طرف پنڈی گھیب تحصیل میں (سوائے کچھ علاقے کے) دودھ بالکل گرم نہیں کیا جاتا۔ دونوں تحصیلوں کی حدود پر اس کے لئے جو وجوہات مجھے بتائی گئیں۔ وہ ہندوستان ہی کا حصہ ہیں۔ ایک پیر نے دیہاتیوں کو کہا کہ اگرچہ اس میں عقلمندی تھی۔ لیکن شاید آئندہ بچھڑوں کی نسبت سائنس پر زیادہ مبنی نہ تھا۔ دودھ گرم کرنا تمہاری گائیوں کے حق میں بُرا ہوگا۔

دوسرے دلائل کے متعلق یہ ہے۔ کہ ایک انسپکٹر جو ایک وسطی ضلع میں رہتا ہے۔ کہتا ہے۔ کہ میں نے دودھ گرم کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اور مجھے اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اٹک کے ایک جاگیردار کا بیان ہے۔ کہ جب میں شاہ پور میں اپنی نہری زمین کو دیکھنے جاتا ہوں۔ تو میرے لئے گرم کئے ہوئے دودھ سے لسی بنائی جاتی ہے۔ اور گھی نکالا جاتا ہے۔ اور مجھے اس میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ پاس ہی ایک گاؤں کے باشندے جو گائیں اور بھینسیں دونوں رکھتے ہیں۔ بتاتے ہیں کہ ہم اپنا دودھ صرف ایک گھنٹہ کیلئے گرم کرتے ہیں۔ اور دونوں صورتوں میں نتائج نہایت ہی اچھے ہیں۔ تب یقیناً کسانوں کو وہ چیز واپس زمین میں ڈالنی دینی چاہیئے۔ جو وہ اس میں سے لیتے ہیں۔ اور اگر

ایساکر دیا گیا ہو۔ تو نئی نہر کھودنے کی نسبت یہ چیز انکی دولت میں اضافہ کرے گی۔

قیمتیں

اس ضلع میں اس بات کا کوئی موقع نہیں ملا۔ کہ نرخ گر جانے کا کوئی ذکر کیا جائے۔ کیونکہ نہری علاقوں کی نسبت یہاں اس کا بہت کم احساس ہے۔ اس کی تین وجوہات ہیں۔ (۱) فوجی ملازمت سے کافی سے زیادہ روپیہ آجاتا ہے۔ نیز ہ لاکھ سے زیادہ روپیہ (تقریباً ۰۰۰،۰۰ اپونڈ) صرف پنشن سے آتا ہے۔ اور ان کے ذریعے وہ پہلے کی نسبت زیادہ چیزیں خرید سکتے ہیں نہر نہ ہونے کی وجہ سے کوئی آبیانہ نہیں دینا پڑتا۔ اور زمین کا لگان آخری بار ۱۹۰۰ء (جبکہ قیمتیں اتنی ہی کم تھیں جتنی کہ اب ہیں) لگائے جانیکی وجہ سے کم ہے۔ ضلع میں پانی کی کمی ہے۔ لیکن نقدی کی نہیں۔ اور فی زمانہ اکثر لوگوں کیلئے دونوں میں سے نقدی کمیاب ہے۔

اب ہم وسیع سیلابی طاس میں سے ڈگمگاتے چل رہے تھے۔ اور جوں جوں ہم دریائے جہلم کے قریب پہنچے۔ ہمالیہ پہاڑ زیادہ ہی زیادہ صاف نظر آنے لگا۔ اور اس پر افتادہ برفانی نظارہ پیر پنچال کا تاج سر پر لئے نیلے آسمان کے ساتھ ساتھ شمال اور مشرق کی طرف پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دریا جس میں سے سکندر اعظم نے ماہ مئی کی گرمی اور طوفانی ایام میں زبردستی اپنا راستہ بنایا۔ ساہنی کے درمیان سے بہنا شروع ہوتا ہے۔ لوگوں کو اب بھی یاد ہے۔ کہ اس نے پورس پر فتح پائی۔ اور بعض لوگ دریائیں کنارے پر، اُسے پیغمبر یا خدا کا رسولؐ کہتے ہیں۔ چند گھنٹے کلکتہ میل سفر کرنے کے بعد ہم ایک بار پھر لاہور آپہنچے۔
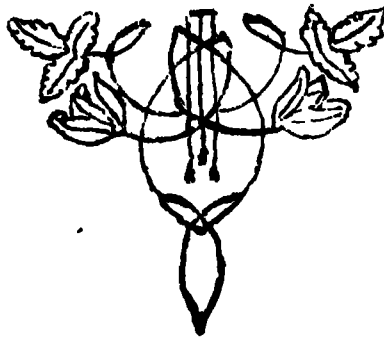
دوسرا حصہ۔ جنوب کی طرف

باب پنجم

دریائے راوی سے ستلج تک

اس مرتبہ جنوب کی طرف ہمارے سفر کی انتہا دہلی تھی۔ پہلے بیس میل سڑک اعظم کے ساتھ ساتھ جو کلکتہ سے کابل تک بنی ہوئی ہے۔ ایک موٹر کار میں طے ہوئے شالامار اور یہاں کا قدیم محلوں کا باغ جس میں سراسر آموں کی قطاریں فوارے اور پھول تھے۔ گذر جانے کے بعد ہم امرتسر اور لاہور کے درمیان آمدورفت کرنے والی لاریوں کی ہمیشہ بہنے والی ندی کی لپیٹ میں آ گئے۔ مسٹر ([illegible]) کے زمانے میں یہ سڑک دلکش تھی۔ اگرچہ اس وقت اس پر تارکول نہ بچھا ہوا تھا۔ لیکن اس پر کسی طرح اسقدر گرد نہ اُٹھ سکتی تھی۔ لیکن اب جب ایک لاری دوسری سے ملتی تھی۔ تو اپنی اپنی طرف دو نو غبار آلود راستے پر چلنے کیلئے مجبور ہوتی تھیں۔ اور ہوا لندن کے دھند کی طرح کثیف ہو جاتی تھی۔ دیہات سدہار کے متعلق بینگ مین کرسچین ایسوسی ایشن کے جاری کردہ ایک تجربہ کے ابتدائی حالات دیکھنے کیلئے میں ونیکی جا رہا تھا۔ ظاہری شکل و صورت سے یہ گاؤں وسطی پنجاب کے نمونے کا ہے۔ جس کا یہ مطلب ہے۔ کہ اس قسم کے ہزاروں گاؤں ہیں۔ گوبر کے ڈھیر اس کا محاصرہ کئے ہوئے ہیں۔ اور بانس کمپنی کے بڑے بیندوں رڈبل روٹی کی قسم، جیسے اُپلے چوڑی مسطح چھتوں پر کپھڑے بناتے ہیں گھر چکنی مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ اور بہت سے چورہ چورہ ہو کر گر رہے ہیں۔ کہیں کہیں کوئی سُرخ اینٹوں کی عمارت پڑوس کے مکانوں سے اوپر سر نکالے نہایت گھمنڈ سے کھڑی ہے۔ ان میں سے

ایک ذیلدار کی ہے۔ اور دوسری سنار کی۔ لیکن کیا عمارت۔ کیا مکان اور کیا جھونپڑی؟ سب کے سب کسی دورہ کرنے والے افسر کے ایک دن کی تھمہ زنی کیلئے تیار کئے ہوئے نقشے اور بناوٹ سے بھی ادنی معیار کے ہیں اور عجب بے ڈھنگے طریق پر بکھرے پڑے ہیں۔ اور کوئی شخص ان مٹی کے تودوں کو دیکھ کر یہ نہیں فرض کر سکتا۔ کہ انسان یہاں کئی نسلوں سے متواتر رہتے آئے ہیں۔

وائی ایم سی اے کا ایک تجربہ

لیکن گاؤں میں ایک بات غیر معمولی ہے۔ اور وہ ایک دروازہ پہلو گنبد ہے۔ نوے برس گذرے۔ یہ ایک ایسے شخص کے بیٹے کیلئے بنایا گیا تھا۔ جس نے رنجیت سنگھ کے ساتھ پرورش پانے میں حصہ لیا تھا۔ لیکن تخت میں نہیں۔ اس میں نیچے ایک تاریک قید خانے جیسا کمرہ ہے۔ جس میں محراب دار تہ خانے بنے ہوئے ہیں۔ اور دیواروں کے آثار چھ فٹ ہیں۔ اور اوپر ہوادار کمرے ہیں۔ جہاں سے فصیل اور ویران میدان پر نگاہ دوڑائی جا سکتی ہے۔ اب اسے وائی ایم سی اے کا مرکز بنایا گیا ہے۔ اور اس سے قوت و اعتقاد کی شعاعیں اسی طرح خارج ہوتی ہیں۔ جیسے کہ اندھیرے میں کسی روشنی کے مینار سے۔ اور انہی سے یہ امید کی جاتی ہے۔ کہ یہ دیہاتی زندگی کی سطح کو بلند و ہموار کر دیگی۔ یہ کوئی آسان کام نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ گاؤں مانجھا (سڑک اعظم و ستلج و بیاس کا درمیانی علاقہ) کی وجہ سے بھی جس کے سرے پر یہ واقع ہے بہت بدنام ہے۔ گاؤں میں چار مخالف فریق ہیں۔ اور وہ ایک دوسرے کے اسقدر خلاف ہیں۔ کہ وہ ایک دوسرے کی شادی میں بھی شریک نہیں ہوتے۔ اور ہر سال اس موقع پر کوئی نہ کوئی قتل ہو جاتا ہے۔ یہاں تک اس وقت بھی جب ہم شہر پناہ پر سے دیکھ رہے تھے۔ نیچے ایک ٹوٹہ حال ہی میں چیخیں مار کر بال بال بچا تھا۔ جب وہ سو رہا تھا۔ تو اس کے کسی دشمن نے اس پر تلوار سے وار کیا۔ لیکن اندھیرا ہونیکی وجہ سے ضرب اس کے پہلو میں دیوار پر پڑی۔ اور اسکی کھوپڑی پر صرف تھوڑی سی رگڑ لگی۔ اگرچہ وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کو زیادہ کام کرنے کے لئے وقت نہیں ملا ہے۔ لیکن پھر بھی کھیل کا ایک چھوٹا میدان تیار کیا گیا ہے۔ اور گاؤں کے جوان لڑکے والی بال کھیلنا سیکھ رہے ہیں۔ امن قائم ہو جانیکے بعد ہندوستان کیلئے انگلستان کی سب سے بڑی نعمت کھیل ہے

اور یہ توقع کی جاتی ہے۔ کہ وقت آنے پر بھی چیز دیہات کا رُخ اُسکے فسادات کی طرف سے موڑ دے گی۔ اسی سلسلے میں یہ ایک مسرت بخش شگون ہے۔ کہ گاؤں کا بہشتی بغیر اجرت کے ہر روز پانی کی ایک مشک کھیل کے میدان پر چھڑکتا ہے۔

ایک مخلص تبلیغی جماعت

وینیج سے ہم ایک مشہور تبلیغی بستی دیکھنے کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ جماعت کئی سال سے آسہ اپور کے نواح میں دیہاتی عورتوں کی حالت کو بہتر بنانے کی سعی کر رہی ہے۔ عیسائی مشن کے سخت سے سخت نقاد بھی اس امر میں کوئی شبہ نہیں کر سکتے کہ تبلیغی ڈاکٹر اس ملک میں جہاں ڈاکٹر نہیں ہیں۔ ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اور جب ڈاکٹر کوئی عورت ہوتی ہے تو ہمیشہ خدائی انعام اور بعض اوقات پارسا ثابت ہوتی ہے۔ یہ صورت آسہ اپور میں ہے۔ جہاں ایک قد کی چھوٹی مگر دل کی بڑی ہندوستانی عورت نے ایک زنانہ ہسپتال اور ساتھ ہی لڑکیوں اور چھوٹے لڑکوں کے لئے ایک سکول چلا رکھا ہے۔ اس بات کو چالیس برس گذر چکے ہیں۔ کہ مس بھوس اپنی صحت بحال کرنے کیلئے یہاں آئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا۔ کہ جب میں یہاں پندرہ دن رہی۔ تو مجھے ایسا محسوس ہوا۔ کہ میں یہاں زیادہ عرصہ نہیں ٹھیر سکتی۔ یہ عرصہ مجھ پر اس قدر بھاری ہو کر گذرا تھا تاہم پندرہ دن کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا۔ کہ میں گاؤں کو ذرا ذرا پہچاننے لگ گئی تھی۔ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ وہ ہندوستانی دیہاتیوں سے واقف ہیں۔ انہیں سنجیدہ الفاظ پر غور کرنا ہوگا۔ مس بھوس کی بہترین خدمات میں سے ایک یہ ہے۔ کہ اس نے عورتوں کو معمولی دیہاتی دایہ بننے کی تربیت دی ہے۔ ان میں جلاہوں۔ چماروں۔ بہشتیوں اور بھنگیوں جیسی غریب ذاتوں کی عورتیں شامل ہیں۔ بیس سے زیادہ گاؤں ان سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ ان گاؤں میں گذشتہ سال ۶۰۰ بچوں میں سے جو اس دنیا میں لائے گئے۔ صرف تین جانوں کا نقصان ہوا۔ جب کہ ایک مردم شماری کی اوسط تعداد اموات آٹھ تھی۔ یہ نتیجہ تربیت یافتہ دائیوں کیلئے پُر زور مطالبہ کرتا ہے۔

عورت اور بچے کیلئے کفایت شعاری

اس نے دوسرا دلیرانہ قدم امداد باہمی کی دو انجمنیں قائم کرنے کی طرف بڑھایا ہے۔

ایک عورتوں کیلئے اور دوسری سکول کے بچوں کیلئے۔ انجمنیں دکھانے کیلئے مجھے سکول لے گئے۔ اور اس میں داخل ہوتے ہی مجھے بیاہ نہ روی اور اس کی خوبیوں کی موجودگی کا احساس ہوا اور اس کے ساتھ ہی شرارت کا بھی کیونکہ پہلی پہلی قطاروں کے لڑکوں کی آنکھوں سے شرارت ٹپکتی تھی۔ عورتوں کی انجمن کے افراد ہسپتال کی دایہ اور ملازم۔ استاد اور اسکی بیوی سب کے سب ہندوستانی لباس میں پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ مشرق یا مغرب میں کوئی اور لباس اس سے زیادہ خوبصورت نہیں ہے۔ اور جب جیسا کہ آج ایک صورت میں دیکھا گیا۔ کسی ذہین سادہ و خوبصورت شخص نے زیب تن کیا ہوا ہوتا ہے تو اس کا اثر سارے خوشی کے بچوں دیتا ہے۔ بیس یا تئیس ممبروں نے پہلے ہی سے دو ہزار روپیہ بچایا ہوا ہے۔ اور دونوں نے حال ہی میں زمین کا لگان دینے کے لئے اپنے گھر والوں کی امداد کی ہے۔ ایک نے ۲۰۰ روپے دیئے۔ اور اس کا خاوند اس قدر خوش ہوا۔ کہ اس نے انجمن کا ماہواری چندہ بڑھا کر ۵ سے دس روپے کر دیا۔ دیہاتی عورت اپنی ذاتی آمدن نہ ہونے کی وجہ سے اپنے چندوں کی اکثر رقوم کے لئے مجبوراً اپنے خاوند پر انحصار رکھتی ہے لیکن وہ ذرائع آمدنی سے سراسر عاری نہیں ہے۔ دودھ اور گھی سے وصول کردہ رقم اس کی بالائی آمدنی ہے۔ اور اس میں بھی شک نہیں۔ کہ وہ وقتاً فوقتاً گھر کے غلے کے گودام میں سے بھی جو عام طور پر اسی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ آمدنی کی صورت پیدا کر لیتی ہے۔ خواہ کچھ بھی ہو۔ کفایت شعاری کا خیال اس کے دماغ میں ڈالا جاتا ہے۔ اور یہی وہ خیال ہے۔ جس کی اسے سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ یہی بات بچوں کی صورت میں ہے۔ ان کی انجمن بالکل نئی اور کام معمولی درجے کا ہے۔ لیکن روپیہ کے استعمال سکھانے کا یہ پہلا سبق ہے۔ ممبروں میں سے بعض ایک ایک روپیہ جمع کراتے ہیں۔ لیکن اکثر صرف چند آنے دیتے ہیں اس کا صدر ایک دس سال کا لڑکا ہے۔ اور خزانچی اسی عمر کی ایک لڑکی ہے۔ خزانچی کا کام برائے نام ہے۔ لیکن صدر پاس بک کے تمام اندراجات پر دستخط کرتا ہے سکول میں جتنے لڑکے ہیں۔ اتنی ہی لڑکیاں ہیں۔ اگرچہ بعض لڑکے گیارہ یا بارہ سال کے ہیں لیکن کوہستان نمک والوں کے یہ کہنے کے باوجود کہ چھوٹے لڑکے بھی اکثر شیطان ہوتے ہیں۔ کوئی دقت نہیں پیش آئی۔ زنانہ انجمن کی کامیابی مس بھوس کے ساتھ وابستہ ہے جب وہ تعطیلات بسر کرنے یورپ چلی گئی تھی۔ نو عورتوں نے اپنا روپیہ واپس لینا

شروع کر دیا تھا۔ اس ملک میں جیسا کہ پہلے بھی دیکھا گیا ہے۔ ہر شاندار کامیابی کی پشت پر ہمیشہ کسی نہ کسی کا ہاتھ ہوتا ہے۔

مانجھا کا علاقہ اپنے باشندوں کی جن میں سے اکثر سکھ جاٹ ہیں۔ وحشت و بربریت کی وجہ سے بدنام ہے۔ ایک افسر بندوبست کا بیان ہے۔ کہ مجھے شبہ ہے کہ صوبے بھر میں شاید ہی کوئی علاقہ ایسا ہو۔ جہاں اس سے زیادہ شدید جرائم ہوتے ہوں۔ امن اور قانون کو حقارت سے دیکھا جاتا ہو۔ اور لوگ اس قدر شراب کے عادی ہوں۔ اس بات کی مختلف طریق سے تشریح کی گئی ہے۔ ایک زمیندار کہتا ہے۔ کہ لوگ ہمیشہ سے بے ضابطگی کرتے آئے ہیں۔ اور جھگڑالو ہیں۔ دوسرا کہتا ہے۔ کہ مانجھا کی گیہوں میں خاص طاقت ہے۔ اور تیسرے کا بیان ہے۔ کہ یہ خوشحالی اور کلر کا اثر ہے۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے۔ جس میں شبہ کی گنجائش نہیں۔ تمام اس بات پر متفق ہیں۔ کہ حیوانیت یہاں ضرور ہے۔ ایک زمیندار نے کہا۔ کہ لوگ کسی آدمی کا سر کاٹ دینے کو گاجر تراشنے سے زیادہ نہیں سمجھتے۔ یہ بات اس امر کی تشریح کرتی ہے کہ گذشتہ سال اس ضلع میں چالیس قتل اور روبیلی سنار جیسے قصے واقعات کیوں رونما ہوئے۔ اور مس بھوس کی بیان کردہ مندرجہ ذیل داستان کیوں سننے میں آئی؟۔ دو نمبرداروں میں جھگڑا اٹھا۔ ان میں سے ایک نے اپنے حریف کو تقریباً قتل کرا کر حالات کی باگ اس ہوشیاری سے پھیری کہ دس آدمیوں کو عمر قید کی سزا ملی۔ اگرچہ مجرم صرف تین تھے۔ یہ بات سوائے ایک مانجھا جاٹ کے باقی سب کی تسلی کیلئے کافی ہے۔ ایک دن اتفاق سے اس کے حریف کا بھنگی جو بھولا ایک سا تھا۔ اس کے دروازے پر آ گیا۔ اگرچہ لڑائی اس کے مالک کے ساتھ تھی لیکن اس نے اسے پکڑ لیا۔ اس کے پاؤں ایک درخت سے باندھ دیئے۔ اور اپنی بیوی کو چمٹا گرم کرنے کیلئے کہا۔ وہ چوڑی سطح کا تھا۔ اور دوسرے دن جب مس بھوس نے اس کے چوتڑوں پر لگے ہوئے داغ دیکھے۔ تو وہ چھ انچ لمبے اور چار انچ چوڑے تھے۔ نمبردار نے ہر شخص پر ایسا خوف طاری کیا۔ کہ کسی نے اس کے خلاف گواہی نہ دی۔ مقامی تھانے میں اس کا ایک دوست بھی تھا۔ خوش قسمتی سے اس کی اطلاع اعلیٰ افسروں تک پہنچ گئی۔ اور اسے حال ہی میں اٹھارہ ماہ کی قید ہوئی ہے۔

بیویوں کے ساتھ سلوک

سکول کے اندرونی حصے میں معصومیت اور حسن برستا تھا۔ اور یہ سب کرتوتیں اس سے باہر کی تھیں۔ اندر امن و آشتی کا دور دورہ اور ایک مہربان ہستی کا وجود تھا۔ بلکہ باہر بھی اس سے زیادہ خیر خواہی نظر آتی تھی۔ جتنی کہ کوئی شخص (ان حالات میں) فرض کر سکتا ہے۔ مس بھوس نے بتایا۔ کہ یہ دیکھ کر بہت حیرانی ہوتی ہے۔ کہ مانجھا اپنی بیوی کی کس قدر احتیاط رکھتا ہے۔ اُسے صرف ایک واقعہ ایسا یاد آسکا۔ جس میں ایک بیمار بیوی کو اکیلی ہسپتال آنے کیلئے چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ جب کسی کی بیوی بیمار ہوتی ہے۔ تو اس کا خاوند اس کے آرام کے لئے ہر ممکن انتظام کرتا ہے۔ اور خطرناک صورتوں میں آدمی سمجھدار ہونے کی بنا پر تیمارداری کا کام عورتوں کی نسبت زیادہ اچھی طرح انجام دیتا ہے۔ مس بھوس نے کہا۔ ممکن ہے۔ اس بیش قیمت چیز کو جس کیلئے اکثر روپیہ خرچ کیا گیا ہے۔ قائم رکھنے کی خواہش اس احتیاط و توجہ کی تشریح کر سکے۔ لیکن تیمارداری کرتے وقت نمایاں مہربانی کی بنا یہ نہیں ہو سکتی۔ بہر کیف یہ ظاہر ہے۔ کہ بیمار بیوہ کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔

بیویوں کو پیٹنے کی بات یاد آنے پر (جواب بہت کم ہے) میں نے کہا۔ کہ میں نے اکثر یہ بات سُنی ہے۔ کہ باوجود پٹنے کے عورتیں اپنے خاوندوں پر غالب رہتی ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ ہاں۔ وہ مجھے یہ بتاتے ہیں۔ کہ ہر اس ضرب کے بدلے جو ہم انہیں لکڑی سے لگاتے ہیں۔ وہ زبان سے بیس (صلواتیں) سناتی ہیں۔ لیکن گاؤں میں اکثر میاں بیوی بظاہر خوشی خوشی گذر کرتے ہیں۔ اور اس گاؤں میں جس سے میں خوب واقف ہوں۔ جہاں ۸۰ گھر ہیں وہاں صرف ایک گھر ایسا ہوگا۔ جہاں میاں بیوی کی نہیں بنتی۔

ایک دیہاتی گرجا

ہر گاؤں میں اور یقیناً ہر گاؤں میں ایک مذہبی مرکز ضرور ہونا چاہیئے۔ جہاں روحانی قوتوں کے ساتھ تعلق قائم رکھا جاسکے۔ یہاں ایک گرجا گھر ہے۔ اور یہ اپنے ماحول کے مطابق ہے۔ بہت سے سال گذرے۔ اسے ایک فنانشل کمشنر نے تعمیر کرایا تھا۔ جو لیجا میں مبلغ بن گیا تھا۔ ایک ایسے مذہب کے لئے جس نے دیہاتیوں میں جنم لیا ہو۔ یہ نہایت موزوں ہے

اس کی زیبائش کی تمام چیزیں معہ اس صلیب کے جو قربان گاہ پر لٹکائی ہوئی ہے مقامی طور پر بنی ہوئی ہیں۔ کرسی کوئی نہیں ہے۔ درختوں کی شاخوں سے بنی ہوئی صرف چند۔ نیچی تپائیاں ہیں۔ کیونکہ اپنی گھریلو خواہش کے مطابق ان میں سے اکثر فرش پر بیٹھتے ہیں۔ عورتیں ایک طرف اور آدمی دوسری طرف۔ اردگرد کے گاؤں میں ۱۲۰۰ عیسائی بکھرے ہوئے رہتے ہیں۔ اور کرسمس کے دن گرجا کا درمیانی اور پہلوؤں کا حصہ تمام کا تمام لوگوں سے پر ہوتا ہے۔

ایک نیا پیر

اٹاری کے راستے میں ہم ایک نئے پیر کے روضے کے قریب سے گذرے۔ جسے انتقال ہوئے صرف چار ماہ گذرے تھے۔ پیر احمد شاہ کی شہرت اس قدر زیادہ تھی۔ کہ لوگ اپنی تکالیف اور بیماریاں لیکر شفا یابی کے لئے اس کے پاس آتے تھے۔ اس کی عادتیں عام لوگوں سے مختلف تھیں۔ جو کوئی اسے جانتا تھا۔ اسے مست بتاتا تھا اور کہتا تھا۔ کہ وہ لوگوں سے علیحدہ رہتا تھا۔ کسی کی امداد کرتا تھا۔ اور کسی کو جھڑکیاں دیتا تھا۔ ایک نے کہا کہ وہ کوئی سنجیدہ بات نہ کرتا تھا۔ لیکن وہ ولی تھا۔ اس کا انجام اتنا ہی تعجب خیز تھا۔ جتنی کہ اسکی زندگی۔ رانی کی (جہاں وہ رہتا تھا) کا تالاب بھرا جا رہا تھا۔ اور اگرچہ بظاہر اسکی صحت اچھی تھی۔ اس نے اعلان کیا۔ کہ میں اس دن مروں گا۔ جب کام ختم ہو جائیگا۔ جب یہ خبر پھیلی تو ۲۰۰۰ لوگ (ایک شخص نے جو وہاں موجود تھا۔ بتایا) اس واقعہ کو دیکھنے کیلئے آئے اور ساعت مرگ سے ایک ہفتہ پہلے جبکہ ایک عورت نے اس سے التجا کی۔ کہ میرے لئے خدا سے سفارش کرو۔ تاکہ میں نہ مروں۔ اس نے جواب دیا کہ میں تم سے پہلے مروں گا اور وہ دن آگیا ہے۔ پس ایسا ہی ہوا۔ اعلان کے پندرہویں دن وہ مر گیا۔ اور آجتک کوئی بات ایسی نہیں ہے۔ جسے اسکی وجہ قرار دی جاسکے۔ یہ بات نسلوں تک اس کے تقدس کا اثر جمانے کیلئے کافی ہے۔ اور اسکی موت کے دن ہر سال عرس کا ہونا یقینی ہے۔ اور آج سے دس یا بیس برس بعد بلا شبہ ایک عمدہ روضہ جیسا کہ ہم نے جلالپور میں دیکھا۔ اس کے مقبرے کے اوپر بنا دیا جائیگا۔ اس کے اوپر ایک لمپ ابھی سے لٹکتا رہتا ہے۔ اور اس کے گرد پھولوں کے ہار ہوا میں لہراتے رہتے ہیں۔ میرے ساتھیوں

میں سے ایک نے فارسی کی ایک پُرشکوک ضرب المثل بیان کرتے ہوئے کہا "پیراں نے پرند۔ مریداں مے پرنند۔ اس نے ساتھ ہی نہایت متانت سے کہا۔ کہ پارسا شخص کی سب عزت کرتے ہیں۔ خواہ وہ ہندو ہو۔ یا مسلمان یا سکھ۔

مذہبی احساس وہ متقدس دھاگا (جینیو) ہے جسے تمام ہندوستان پہنے ہوئے ہے۔ لیکن بعض اوقات اسے بُری طرح مروڑا جاتا ہے۔

۲۰ جنوری۔ اٹاری سے کسیل (۱۲ میل)

تعلیم اور دیہاتی

آج ہم پھر گھوڑے کی پیٹھ پر تھے۔ اور سفر جنوب کی طرف شروع ہُوا۔ آسمان خاکستری رنگ کا تھا۔ اور جلد ہی اس نے مینہ برسانا شروع کر دیا۔ اور چونکہ دسمبر کے بعد یہ پہلی بارش تھی۔ اس لئے دلی اطمینان محسوس ہُوا۔ ایک شخص نے جو میرے ساتھ سوار تھا۔ اس نے کہا کہ اس کا ہر قطرہ سونے کا دانہ ہے۔ جب ہم بھاکنہ کلاں پہنچے۔ جہاں کا ہم کو معائنہ کرنا تھا۔ تو اچھا چھینٹا پڑا۔ خوشی خوشی ہمارا استقبال کیا گیا۔ اور آرزوؤں بھری بارش کے لانے کیلئے بہت مبارک باد دی گئی۔ یہ بات ہندوستانیوں کی سرشت میں داخل ہے کہ وہ اپنی مبارک باد کا حصہ ان لوگوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ جنہیں حاکم ہونے کا فخر حاصل ہوتا ہے۔ آگے چل کر گاؤں کے سرے پر ہی جہاں لوگ شام کو باتیں کرنے جمع ہو جاتے ہیں۔ ایک بڑی چھتی ہوئی ڈیوڑھی میں جمع ہوئے۔ جیسا کہ ڈاڑھیوں کی قطاروں سے ظاہر ہو رہا تھا۔ تمام کے تمام سکھ تھے۔ جتنی ڈاڑھیاں تھیں اتنا ہی اُن میں تفاوت تھا۔ گچھے دار۔ ملائم بالوں والی۔ اُلجھی ہوئی شاندار۔ لہراتی ہوئی۔ حد سے زیادہ بڑھی ہوئی کنگھی کی ہوئی۔ اور بغیر کنگھی کی ہوئی۔ بل دی ہوئی اور بغیر بل کے۔ کاجل سی سیاہ اور برف سی سفید) ساٹھ حاضرین میں سے بیس خواندہ تھے۔ لیکن سکول میں صرف آٹھ نے تعلیم حاصل کی تھی۔ دوسروں نے مقامی گوردوارے میں گورمکھی پڑھنی لکھنی سیکھی تھی۔ اگرچہ یہاں ایک پرائمری سکول پچاس سال سے زیادہ عرصے سے قائم ہے۔ لیکن سکول جانے کی عمر کے لڑکوں میں ۶۰ فیصدی لڑکے بالکل سکول نہیں جاتے۔ حال ہی میں جب ایک بڑا افسر موقع دیکھنے آیا۔ تو اس نے ان سے لازمی تعلیم کے لئے ایک درخواست

پر دستخط کرائے۔ لیکن ہماری آج کی گفتگو سے مجھے اس امر پر شبہ ہوا۔ کہ آیا عرضی دینے میں اپنے افسر کی خوشنودی حاصل کرنے کے سوا اور کوئی بات بھی تھی۔ ایک زمیندار نے باقی سب زمینداروں کی طرف سے کہا "ہم اتنے غریب ہیں کہ اپنے بچوں کو سکول نہیں بھیج سکتے۔ اور نہ ہی اُن کی مدد کے بغیر کام چل سکتا ہے۔ وہ فصلوں کی رکھوالی کرتے ہیں مویشیوں کو باہر لے جاتے ہیں اور رہٹ پر بیل ہانکنے والے کی جگہ بیٹھتے ہیں۔ لیکن جب وہ سکول جاتے ہیں۔ تو گھر کے لئے اتنا کام لے آتے ہیں۔ تو پھر وہ ہمارے لئے کام نہیں کر سکتے۔ ان کی نظریں ہمارے راستے کی طرف نہیں پھرتیں۔ اور جب وہ کچھ عرصہ سکول میں رہ چکتے ہیں۔ تو وہ کمزور ہو جاتے ہیں۔ اور ہماری طرح کام نہیں کر سکتے۔ اس لئے دو نوجوانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ دیکھئے یہ دو زمیندار ہیں۔ ایک نے پڑھا ہے۔ اور دوسرے نے نہیں۔ لیکن تعلیم حاصل کرنے والے کیلئے یہ ممکن نہیں۔ کہ وہ اتنا کام کرلے جتنا کہ دوسرا کر سکتا ہے۔ ان اعتراضات کے خلاف کسی نے آواز نہ اُٹھائی۔ اور مجھے وہی جذبات یاد آگئے جن کا اظہار جہلم کے دریائی علاقے میں کیا گیا تھا۔ اُن آٹھ آدمیوں میں سے جنہوں نے سکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ صرف تین حقیقتاً کاشتکاری کرتے تھے۔ اور انکی کاشت بھی ایسی ہی تھی۔ جیسی کہ دوسروں کی۔ ایک شخص نے نہایت پُرزور الفاظ میں کہا۔ کہ وہ لوگ جنہوں نے سکول میں تعلیم حاصل نہیں کی بہترین کاشتکاری کرتے ہیں اسلئے کہ وہ سخت محنت کر سکتے ہیں۔ اگرچہ گاؤں میں ۳۰۰ گھر ہیں۔ اور سکول اتنی دیر سے قائم ہے۔ لیکن عمدہ آلات کشاورزی کا نام و نشان بھی نہیں۔ اور کسی نے کبھی انتخاب کردہ بیج حاصل کرنے کی تکلیف نہیں اُٹھائی۔ اس پر یہ کہ امرتسر صرف ۹ میل کے فاصلے پر ہے۔

۲۱ جنوری۔ کیسیل سے ترنتارن (۱۴ میل)

میں نے اپنے بہرے سے دریافت کیا۔ کہ آج ناشتے میں اتنی دیر کیوں کی ہے؟ اس نے جواب دیا "صاحب روزے شروع ہو گئے ہیں۔ اور میں صبح ۴ بجے سحری کھانے اُٹھا تھا۔ اس سے ذرا سستی پیدا ہو گئی ہے"۔ روزے رکھنے کے لئے یہ بہترین مہینہ ہے۔ کیونکہ دن اتنے چھوٹے اور ٹھنڈے ہیں کہ پیاس نہیں لگ سکتی۔

کانگریس اور ایک جلوس عَلَم

ہم اپنی سڑک پر دور نہیں گئے تھے۔ کہ ایک فوج میں گھر گئے۔ تقریباً ۵۰۰ آدمی کچھ انگریز اور کچھ ہندوستانی جھنڈے کے ساتھ اس علاقے میں سے جلوس نکال رہے تھے تاکہ کسی قسم کی سول نافرمانی کرنے والوں کو یاد دلادیں۔ کہ اگر ضرورت پڑی تو ایسے لوگ موجود ہیں۔ جو ان سے دو دو ہاتھ کریں گے۔ اس سبق کی ضرورت ہے۔ کیونکہ گذشتہ موسم گرما میں جبکہ کانگریس گورنمنٹ کے خلاف کھلم کھلی جنگ کر رہی تھی۔ اور دیہاتیوں کو زمین کا لگان نہ دینے کی رغبت دلانے کیلئے ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔ تو اس ضلع کے پانچ پانچ سکھوں کے گاؤں (جنہیں زیادہ تر ہندو تاجروں نے ورغلایا تھا) اور احمقانہ پروپیگنڈے کے اثر سے بگڑ گئے تھے۔ اور کچھ گرفتاریاں عمل میں لانی پڑی تھیں۔ یہی صورت شیخوپورہ اور گوجرانوالہ میں پیش آئی۔ کسی نے بتایا۔ کہ لالہ لوگوں نے (جیسا کہ شہروں کے سمجھدار ہندوؤں کو اکثر کہا جاتا ہے) سکھ دیہاتیوں سے کہا۔ کہ گاندھی جی کا حکم ہے۔ کہ کوئی لگان ادا نہ کیا جائے۔ مسلمان دیہاتیوں نے اس کی طرف کچھ توجہ نہ کی۔ لیکن سکھ جاٹوں (دوبرکس) کے پندرہ گاؤں جو ہندوؤں کے ساتھ نہایت گہرے تعلقات رکھتے ہیں۔ گمراہ ہو گئے تھے۔ اور بہت سے لوگوں کو جیل میں جانا پڑا تھا۔

یہ بات اس امر پر دلالت کرتی ہے۔ کہ ان گاؤں میں سے صرف ایک میں امداد باہمی کی انجمن تھی۔ اور انجمن مسلم حلقے میں تھی۔ جہاں اس کا (سول نافرمانی) اثر نہ پڑا تھا امداد باہمی اقتصادیات کی ابتدائی تربیت (صلح جوئی کی تعلیم کے ساتھ اس قسم کی شورشوں کے لئے بہترین تریاق کا کام دیتی ہے۔ اور اس امر پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ کہ گذشتہ سال صوبے کی ۲۰ ہزار انجمنوں نے دیہات پر سکون خیز اثر ڈالا ہے۔ اور سول نافرمانی کو جس کی وجہ سے بہت سے شہروں کو تکلیف پہنچی ہے۔ روکنے میں امداد دی ہے۔

۲۳ جنوری۔ قیام

ایک شہر میں کفایت شعاری

آج ہمارا کام کفایت شعاری کے متعلق تھا۔ اور ہندوستان کی اقتصادی ضرورت بھی

ہی ہے۔ لیکن اس ملک میں تمام ہی فضول خرچ نہیں ہیں۔ اس پر مجھے بھیرہ کا درزی اور اس کی پڑا سینے کی مشین یاد آتی ہے۔ اور ایسا ہی بنیا یا ہندو تاجر ہے۔ جو اس قدر کفایت شعار ہے۔ لہٰذا دنیا کی اور کوئی قوم نہیں ہے۔ وہ یونہی کچھ نہ کچھ بچانے کے فن میں خوب ماہر ہے۔ یہ بچت عام طور پر بچے کی شادی یا تعلیم کے لئے کی جاتی ہے۔ یہ دیکھنے کیلئے کہ وہ یہ بچت کس طرح کرتا ہے۔ ہم نے ترن تارن کے بازاروں کا چکر لگایا۔ یہ بازار چکر کھاتی ہوئی گلیاں ہیں۔ جہاں چھوٹے چھوٹے دکاندار چوکڑی مارے تمام دن اور کافی رات گئے تک تنگ و تاریک دکانوں میں نہایت ہی سستی چیزوں میں گھرے ہوئے بیٹھے رہتے ہیں۔ پہلا شخص جس سے ہم گفتگو کی ایک پنساری تھا جو اپنے بچوں کیلئے ایک معمولی صندوق رکھتا تھا۔ دوسرا ایک کیمیا گر تھا۔ جس نے اپنی دیوار پر ایک بھدا بنا ہوا لکڑی کا صندوقچہ لٹکا رکھا تھا۔ جس کی لمبائی آٹھ انچ اور چوڑائی ۲-۱ انچ تھی۔ اور اوپر کی طرف سکے ڈالنے کیلئے جھری پڑی ہوئی تھی۔ اس نے ہمیں بتایا۔ کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی کیلئے کس طرح ہر روز کچھ نہ کچھ اس میں ڈالتا رہا تھا۔ پانچ سال کے بعد اس نے ڈھکنے کے پیچ کھولے۔ (یہ اتنا بھدا بنا ہوا تھا کہ قفل نہ لگ سکتا تھا) اور ۹۰۰ روپے کی رقم گن لی۔ یہ ایک بڑی رقم تھی۔ لیکن اس کی اوسط صرف آٹھ آنے فی یوم پڑتی تھی۔ پھر ہم نے ایک لوٹوں کے سوداگر کا گھر دیکھا۔ ایک کوڑا بکھرے ہوئے چھوٹے صحن میں سے جو گاؤں کی تمام بدبوؤں کی جائے ملاقات معلوم ہوتی تھی۔ گذرنے کے بعد ہم ایک واہیات سی پیچ دار سیڑھی پر سے ہوتے ہوئے اوپر کی منزل کے ایک چھوٹے کمرے میں پہنچے۔ جہاں پلستر کی ہوئی دیوار میں ایک جھری دیکھی۔ جو قریب قریب پہنچ سے باہر تھی۔ سوداگر نے کہا۔ کہ میں اپنی لڑکی شادی کے لئے ہر ماہ اس میں دس روپے ڈال دیتا ہوں۔ یہ لڑکی ابھی ٹھیک میرے گھٹنوں تک آئی تھی۔ آج سے دس سال بعد بہترین قدیمی رواج کے مطابق شادی کی جائیگی۔ اور ایک آنہ بھی اُدھار نہ لیا جائے گا۔ مقابل کی دیوار میں ایک اور جھری سوداگر کے بیٹے کیلئے تھی۔ دیواریں اس لئے استعمال کی گئی ہیں۔ کہ فرش سیمنٹ کا بنا ہوا ہے۔ جو کچھ اس میں ڈالا جاتا ہے۔ اس کا حساب رکھا جاتا ہے۔ اور جب تین یا چار سو روپے بچ جاتے ہیں۔ تو رقم باہر نکال لی جاتی ہے اور زیورات کے عوض قرض دے دی جاتی ہے۔ (شخصی ضمانت کے عوض کبھی نہیں) اور

اس طرح حاصل کیا ہوا سود سرمائے میں جمع کیا جاتا ہے۔ سوداگر نے کہا کہ میرے شہر میں دکاندار اسی طرح روپیہ بچاتے ہیں۔ میری تحقیقات اس کی تصدیق کرتی ہیں۔ یہ صورت ترن تارن میں بہت نمایاں ہے۔ جہاں ایک نہایت ہی کامیاب کواپریٹو بینکنگ یونین نے جس کا صدر (بہترین قسم کا سکھ سپاہی) اعتماد کی غیر معمولی روح پھونکتا ہے۔ روپیہ جمع کرنے کو مقبول عام بنانے کے لئے بہت کام کیا ہے۔ اور ۶ لاکھ روپیہ (۴۵۰۰۰ پونڈ) بطور امانات کھینچ لیا ہے۔ اس میں چھوٹی جمع کی ہوئی رقوم کا ۷۰۰۰۰ روپے بھی شامل ہے۔

جیسا کہ ہم نے چند روز پہلے دیکھا امداد باہمی آدمیوں اور اس کے ساتھ ہی عورتوں میں کفایت شعاری کو تحریک دینے کیلئے اپنی پوری پوری سعی کر رہی ہے یہاں دونوں کے لئے کفایت شعاری کی انجمنیں ہیں۔ ایک ہائی سکول کے اساتذہ کے لئے کفایت شعاری کی انجمنیں ہیں۔ ایک ہائی سکول کے اساتذہ کیلئے اور دوسری اور اُن عورتوں کے لئے جو زچہ خانہ کے ملازمین میں سے ہیں۔ اسکی تمام ممبر عیسائی عورتیں ہیں۔ اور کئی ایک کوڑھیوں کی لڑکیاں اور کوڑھیوں کے سکول کی استانیاں ہیں۔ رحمدلی کے اُن تمام کاموں میں سے جو عیسائی مبلغین نے ہندوستان میں اپنے ذمے لئے ہیں۔ کوڑھیوں کی دیکھ بھال کرنا نہایت ہی اہم ہے۔ اور یہ نہایت ہی رحمدلانہ طریقوں میں سے ایک ہے۔ کوڑھیوں کو تین سال تک اپنے بچے پاس رکھنے کی اجازت دیجاتی ہے۔ اور اس کے بعد ہفتہ وار ملنے دیا جاتا ہے۔ اس طرح سے والدین اور بچے میں تعلق قائم رکھا جاتا ہے۔ اور جذام ایک سے دوسرے کو شاذ ہی لگتا ہے۔

۲۳ جنوری۔ ترن تارن سے ہالی (۱۲ میل)

نوشہرہ میں بینکنگ کے حسب معمول معائنے کیلئے سکول کے کمرے میں پچاس ممبروں کا اجتماع تھا۔ چار یا پانچ سنفی افسران کرسیوں پر تھے۔ اور باقی فرش پر چوکڑی مارے گچھ مچھ ہوئے بیٹھے تھے۔ دروازے اور کھلی کھڑکیوں کے پاس داڑھیوں والے لوگ زیادہ تھے۔ سکھوں کی اکثریت آشکارا تھی۔ اور پنجاب کے دیہات میں ان لوگوں سے ملاقات کرنا سب سے زیادہ باعث دلچسپی ہے۔ حاضرین میں سے سولہ تھوڑی بہت اردو

پڑھے ہوئے تھے۔ اور ان کے علاوہ پانچ اشخاص گورمکھی لکھ پڑھ سکتے تھے۔ نو آدمیوں نے فوجی ملازمت کی ہوئی تھی۔ ان کی روح رواں ایک بوڑھا مگر زبردست رسالدار رسالہ کا افسر تھا اور اس کا ہاتھ بٹانے والے دو اور مستعفی افسر تھے۔ (جو دونوں کے دونوں ان کی عزت افزائی کے لئے کہے دیتے ہیں) اپنی زمینوں کی خود کاشت کرتے تھے۔ سیکرٹری بھی ایک غیر معمولی شخصیت کا تھا۔ وہ برہمن ہوتے ہوئے کاشتکاری بھی کرتا تھا۔ اور اناج کا لین دین بھی۔ دونوں بنکوں میں سے ایک لوگوں کی امانتیں (۔۔۔ روپیہ) جمع کرنے میں اسقدر کامیاب رہا۔ کہ دوسرے اکثر دیہاتی بنکوں کے برعکس اسے مرکزی بنک سے روپیہ ادھار لینے کی ضرورت نہ پڑی تھی۔ روپیہ امانت رکھنے والوں میں سے پانچ عورتیں تھیں بعض نے اپنا زیور بیچکر روپیہ جمع کرا دیا تھا۔ دو عورتیں بنک کی ممبر تھیں۔ ایک رسالدار کی بیوی دوسری ستھنے کی۔ یہ وہ خوبیاں ہیں جو سکھوں کی عملی جمہوری زندگی کا پتہ دیتی ہیں۔ اور عورتوں کے متعلق ان کے آزادانہ رویے کا اظہار کرتی ہیں۔

سمجھ کے لحاظ سے ممبروں میں بہت تفاوت تھا۔ ضبط۔ تحکم اور تجربے نے مستعفی افسروں کو دانا بنا دیا تھا۔ ایک جاٹ بھی جس نے خالصہ کالج میں تعلیم حاصل کی تھی۔ سمجھدار تھا۔ لیکن دوسری طرف بعض پرلے درجے کے دیہاتی احمق تھے۔ ایک شخص نے جس کے پاس ۱۲۔ ایکڑ زمین تھی۔ یہ تسلیم کیا کہ اس نے حال ہی میں ایک ساہوکار سے ۴۰۰ روپے ۳۷½ فیصدی سود پر قرض لیا تھا۔ اور یہ بنک سے قرضہ لئے ہوئے ۲۰۰ روپے کے علاوہ تھا۔ جو اس نے اپنے مرحوم بھائی کی عورت سے اپنی دوسری شادی رچانے کے لئے لیا تھا۔ (یہ ایک ایسی شادی ہے جو کسی رسم کو توڑے بغیر تھوڑی سی رقم سے کی جا سکتی ہے) ہزاروں اور ناکافی تعلیم یافتہ یا آرام طلب لوگوں کی طرح زندگی بسر کرنے کی وجہ سے وہ اپنا بنک کا قرضہ ختم کر کے ساہوکار کے پاس گیا۔ اور اب وہ زندگی بھر کے لئے اُلجھ گیا ہے۔ ایک اور ممبر نے اقرار کیا۔ کہ میں نے ۲۰۰ روپیہ ۳۷½ فیصدی شرح پر قرض لیا ہے۔ اس نے بھی بنک کے ساتھ اپنی ساکھ توڑ دی۔ اور بنک نے اسے اپنے ہاں جگہ دینے سے انکار کر دیا۔ تاوقتیکہ وہ اپنے قرضے کا کچھ حصہ نہ ادا کر دے۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی تعلیم یافتہ نہ تھا۔ تعلیم کا اثر خالصہ کالج کے سند یافتہ شخص میں پایا گیا۔ وہ ۴۰۔ ایکڑ زمین کاشت کرتا تھا۔ اس نے کہا کہ اگر میرے پاس ذاتی روپیہ ہو تو میں زیادہ

جدید طریقہ پر کاشتکاری کر سکتا ہوں۔ لیکن قرض لینے ہوئے دجووہ آسانی سے لے سکتا تھا ہچکچاتا ہوں۔ کیونکہ فصلیں اکثر خراب ہو جاتی ہیں۔ اور پختہ سے پختہ ارادے والے کو ادائیگی سے مانع ہوتی ہیں۔ یہ شخص دراصل غیر معمولی ہندوستانی دیہاتی تھا۔ یعنی ایک ایسا کاشتکار تھا۔ جو ترقی کرنے کیلئے روپیہ چاہتا تھا۔ دسویں جماعت میں ناکام ہو کر سکول چھوڑنے کے بعد وہ ایک کلرک بن گیا۔ لیکن ایک یا دو سال بعد اس نے نہایت عقلمندی سے یہ فیصلہ کر لیا۔ کہ میں کاشتکاری کروں گا۔ اور اس وقت سے اب تک کاشتکاری کر رہا ہے۔ اب اس کے پاس ایک میسٹن ہل ہے۔ اور وہ مولیسو فی کپاس کو ئمبٹور کے نیشکر دنمبر ۲۲۳) اور پنجاب ۸ الف گیہوں کی کاشت کرتا ہے۔

فوجی اثر

فوجی اثر اس بات سے دیکھا گیا۔ کہ لوگ سبزیاں کاشت کرنے والے اور مرغی خانے قائم کرنے کی طرف متوجہ تھے۔ دریائے راوی کے جنوب میں اکثر زمیندار مرغیاں پالنے میں ہتک سمجھتے ہیں۔ لیکن حاضرین میں سے آٹھ نے جن میں رسالدار بھی شامل تھا۔ مرغیاں پالنی شروع کی ہیں۔ جیسا کہ تھوڑی جائیدادوں والے سمجھدار لوگ ہر جگہ کرتے ہیں۔ سبزیاں کاشت کرنے کے متعلق عام بدزنی بھی دور ہوتی جا رہی ہے۔ ایک شخص نے جو فرانس میں جنگ کر کے آیا تھا۔ یہ کہا کہ ہم نے وہاں نہایت اچھے لوگوں کو سبزیاں کاشت کرتے دیکھا ہے۔ ہم نے سوچا۔ کہ پھر یہاں سبزیاں کاشت کرنا کیوں باعث شرم ہو۔ اگر کوئی شرم باقی ہے۔ تو اسے جلد کافور ہو جانا چاہیئے۔ کیونکہ اب مقامی مڈل سکول کے ساتھ ہی ایک کھیت میں لڑکیاں سبزیاں کاشت کرتی ہیں۔

سکول اور زمین

سکول اور کھیت ایک دلچسپ آزمائش ہے۔ جنگ عظیم کے بعد محکمہ تعلیم کو اس امر کا احساس ہؤا۔ کہ جس قسم کی تعلیم دیہاتی کو دی جا رہی ہے۔ وہ اسے زمین سے بے بہرہ کر رہی ہے۔ پس ثانوی مدارس کی ایک خاص تعداد کے لئے چھوٹے چھوٹے کھیت مہیا کئے گئے۔ اور بہت سے سکولوں کے نزدیک باغیچے لگوائے گئے۔ یہاں کا کھیت چار ایکڑ زمین کا

ہے۔ اور اس میں تمام کام سکول کی مڈل جماعتوں کے کرتے ہیں۔ کل ۸۰ لڑکے ہیں۔ اور تمام کو بلا لحاظ قومیت چالیس منٹ روزانہ کھیت میں کام کرنا پڑتا ہے۔ ان کے بزرگوں کا خیال ہے۔ کہ اس طرح سے اُن کا تعلق زمین کے ساتھ قایم رہیگا۔ اور ان کے اعصاب اس قابل ہونگے۔ کہ کاشتکاری کر سکیں۔

ایک نے کہا۔ کہ دکاندار کا لڑکا تمام دن چوکڑی مارے بیٹھا رہتا ہے۔ اور اس لئے کمزور ہو جاتا ہے۔ کسی نے کہا بہرکیف تعلیم کا اثر جسم کو کمزور کرتا ہے۔ خالصہ کالج کے جاٹ نے بھی اس سے انکار نہ کیا۔ جب میں نے یہ دریافت کیا کہ دیہاتی کیلئے سکول بہتر ہے۔ یا فوج۔ تو اس نے کہا۔ کہ فوج لڑکے کو پابند وقت مکمل اور طاقتور انسان بناتی ہے۔ اور سکول اسے پابند وقت مکمل اور کمزور بناتا ہے۔ اس پر سب نے آمنّا کہی۔ اس کے ساتھ ہی اس کا یہ بھی خیال تھا۔ کہ کاشتکاری اور تعلیم ساتھ ساتھ خوب چلتی ہیں۔ اس نے بتایا کہ مجھے ترقی یافتہ آلات اور بیجوں کا استعمال کرانے والا خالصہ کالج کا ہی ایک اور لڑکا تھا۔ یہ لڑکا صرف مڈل پاس تھا۔ اور اس درجے تک تعلیم سراسر فایدہ مند ثابت ہوتی ہے۔ جو لڑکا یہ کوشش کرتا ہے۔ کہ اگر ہو سکے تو گاؤں واپس نہ آؤں۔ وہ وہ لڑکا ہوتا ہے۔ جو ہائی سکول کی تعلیم ختم کرتا ہے۔ اسکی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ ان میں سے جو واپس آتے ہیں۔ گاؤں والے انہیں ناکامیاب سمجھتے ہیں۔ حسب حال ضرب المثل یہ ہے۔ "دیکھو قدرت کے کھیل۔ پڑھیں فارسی بیچیں تیل"۔ میرے ساتھیوں میں سے ایک نے مجھے بتایا۔ کہ جب میں بی اے ہو گیا۔ تو لوگ میرے ہل چلانے پر ہنسا کرتے تھے۔ اس قسم کا رویہ دیہاتی دنیا میں ہر جگہ ہے۔

دیہاتی جاگیردار کی یک طرفہ توجّہ

شمال کی طرف اسلامی علاقے میں دیہاتی جاگیردار روزی کمانے کے قریب قریب یکساں طریق پر ہاتھ ڈالتا ہے۔ جوں جوں ہم جنوب کی طرف جائیں۔ اور ہندوستان کی ہندوانہ آبادی کی طرف بڑھیں۔ قومیت کا اثر نمایاں ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور زمیندار دوسرے پیشہ وروں سے علیحدہ رہنے کی طرف راغب نظر آتے ہیں۔ یہ رجحان اس علاقے میں بہت پایا جاتا ہے۔ اور شاید بڑے گاؤں میں جن میں سے اکثر کی آبادی دو یا تین ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ زیادہ گھر کئے ہوئے ہے۔ کیونکہ جب لوگ بڑی تعداد میں جمع ہوتے ہیں۔ تو وہ حد سے زیادہ علیحدہ علیحدہ ہو کر بیٹھتے ہیں۔ مانجھا جاٹ کسی سڑک یا نہر پر کام نہیں کرے گا۔ نہ ہی کوئی پیشہ یا صنعت اختیار کرے گا۔

اس کا خیال ہے۔ کہ زمیندار کو زمیندار ہی ہونا چاہیئے۔ اگر سوائے کاشتکاری کے وہ اپنے ہاتھ سے کوئی بھی کام کریگا۔ تو اپنی ذات کھو دیگا۔ اگرچہ انقلاب کے آثار نمودار ہیں (خاص طور پر اُن جگہوں میں جہاں نقل مکان کر کے واپس آئے ہوئے لوگ موجود ہیں) لیکن نوّے فیصدی اب بھی اسی خیال کے ہیں۔ رسالدار نے ان لوگوں کو جن کے پاس تھوڑی زمین ہے۔ کسی تجارت یا صنعت پر لگانے کے لیئے بہت تکلیف اُٹھائی۔ لیکن سب فضول۔ ترن تارن میں ایک اور سمجھدار سکھ نے بھی یہی بات کہی تھی۔ اور کل والے ہیڈ ماسٹر نے بتایا۔ کہ جب میں نے اپنے سکول سے تین لڑکوں کو پارچہ بافی کے ایک گورنمنٹ سکول میں وظیفے لوا دیئے تو انہوں نے انہیں لینے سے انکار کر دیا۔

جب ہم چند آخری میل ختم کرنے کیلئے روانہ ہوئے تو سُورج بادلوں سے مستور آسمان کے جنوبی گوشے میں تھا۔ ہم نے ایک داڑھی والے دُبلے بوڑھے کو ہاتھ میں جوتیاں لئے ایک سوار کے پیچھے دوڑتے ہوئے دیکھا۔ ہم نے اُسے پوچھا۔ تم اتنی جلدی کیوں کر رہے ہو؟ اس نے کہا کہ اسے ابھی چار کوس (چھ میل) جانا ہے۔ اور اب جلد اندھیرا ہو جائیگا۔ اندھیرا چھا جانے کے بعد وہ سڑک پر اکیلا رہنے سے ڈرتا تھا۔ سڑک کچی تھی۔ لیکن اس کے دونو طرف درختوں کی قطاریں خوب تھیں۔ اور سڑک اتنی چوڑی تھی۔ کہ پچاس سپاہی پہلو بہ پہلو چل سکتے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف علاقہ اپنی فرسودہ اچاٹ کن یکسانی لئے ہوئے تھا۔ اور بیشمار بکھرے ہوئے درخت جو تمام کے تمام چھانٹے ہوئے یا کہیں کہیں سے قطع کئے ہوئے تھے۔ آرام یا خوبصورتی کی متلاشی آنکھ کا تمسخر اُڑاتے تھے۔ کاشتکاری کی کوئی کمی نہ تھی لیکن معمول کے مطابق کاہلانہ قسم کی تھی (چارہ۔ گیہوں اور توریا) بہرکیف نہایت ہی پژمردہ منظر زمین میں خوبصورتی گھات لگائے ہوئے ہوتی ہے۔ اور یہاں وہ کپاس کے اُن بے برگ گندمی رنگ کے ڈنٹھلوں میں دبکی ہوئی تھی۔ جو درانتی اور جلائے جانے کیلئے مستعد کھڑے تھے۔

۲۴ جنوری۔ قیام

آج بسنت پنچمی اور ہندوؤں کے حساب سے بہار کا پہلا دن ہے۔ لیکن آج صبح ہوا میں بہار کا کوئی رنگ نہ تھا۔ گرج اور موسلادھار بارش کے بعد مکھیوں کے مقابلے کی کوشش کرتے ہوئے اور ان زمینداروں کے ساتھ جن میں سے اکثر سکھ جاٹ تھے۔ بعید الفہم گفتگو کرتے ہوئے ہم نے

وہاں دو گھنٹے میں سے گذارے۔ اس تحصیل سے مانجھا جاٹ کو اسکی بہترین اور بدترین حالت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ کل اسکی حالت بہترین تھی۔ اور آج وہ بدترین صورت میں ہے۔ بمشکل سے کسی سوال کا جواب دے سکا۔ میرے پاس ہی فرش پر ایک خوش شکل آدمی بیٹھا تھا۔ جس کے چہرے سے سپاہی قاتل کی سی ترش روئی حقارت اور بدنصیبی ٹپکتی تھی۔ یہ سوال پر اس نے منہ پھلا کر جواب دیا کہ مجھے اس کے متعلق کچھ پتہ نہیں۔ عزرا جی! اور چند دوسرے لوگ کچھ کچھ جانتے تھے۔ لیکن اکثروں میں بھینسوں سے زیادہ عقل یا زندہ دلی نہ تھی۔ صرف ایک نے یہ سنا ہوا تھا۔ کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جن کو وزیر کہا جاتا ہے۔ اس پر یہ کہ ایک شخص جو دس سال سے وزیر بنتا چلا آیا ہے۔ اُن سے دس میل سے بھی کم فاصلے پر رہتا ہے۔ کسی نے بھی گول میز کانفرنس کے متعلق نہ سنا ہوا تھا۔ اور جب امداد باہمی طریق کار کے متعلق دریافت کیا گیا۔ تو کوئی بول اُٹھا "ساہوکار جانتے ہیں ہمیں کیا خبر ہے"۔ یہ اس امر پر دال ہے۔ کہ ان میں سے صرف تین نے فوج میں خدمت کی تھی۔ اور صرف ۲ خواندہ ہونے کے مدعی تھے۔ مؤخرالذکر بات تعجب خیز تھی۔ کیونکہ یہاں ایک ہائی سکول ہے۔

ان کی کاشتکاری بھی اسی کے ہم پلہ ہے۔ چارہ کاٹنے کی مشین سے واقف ہیں۔ لیکن لوہے کے ہل سے آگاہ نہیں۔ اور سرہالی میں صرف دو کے پاس سرادیں ہیں۔ کسی نے ترقی یافتہ بیج یا فصل کی آزمائش نہیں کی ہے۔ اور حاضرین میں سے صرف ایک مرغیاں پالتا ہے۔ جب میں نے دریافت کیا۔ کیا اس سے تمہاری عزت پر بٹہ لگتا ہے؟ تو کوئی شخص پچھلی قطار میں سے بول اُٹھا "بلیوں کی وجہ سے ایسا نہیں کیا جاتا"۔ کہا جاتا ہے کہ نہر کا پانی ناکافی ہے۔ اس پر بھی باوجود اس کے کہ پانی کی سطح صرف ۲۰ فٹ نیچے ہے۔ کسی نے کئی سال سے کنواں نہیں کھدوایا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ ایک کنوئیں پر مبلغ ایک ہزار روپیہ صرف آتا ہے۔ ہم اتنی رقم کہاں سے لائیں؟ میں نے یہ رائے دی کہ گورنمنٹ سے ادھار لے لو۔ لیکن کسی کو بھی یہ خبر نہ تھی۔ کہ ایسا ہونا بھی ممکن ہے۔ کاہلی ان کے دل و دماغ پر اس طرح جگہ کئے ہوئے تھی۔ جیسے کہ گوبر۔ ان کی بنجر زمینوں میں لیکن ایک بات خوبی کی تھی۔ اور وہ یہ کہ ایک جاٹ نے آلوؤں کی کاشت شروع کی ہوئی تھی۔ یہ اس بات کا نتیجہ تھا کہ اس نے انہیں سکول کے کھیت میں اُگا ہوا دیکھا تھا۔ اور لوگ بھی ایسا ہی کر رہے ہیں +

ایک خالصہ ہائی سکول

شام کو میں نے ہائی سکول دیکھا۔ یہ سکھوں کی درسگاہ تھی۔ اور چاروں طرف سے صاف ستھری اور کشادہ ہونے کی وجہ سے صبح کی گوبر اور کیچڑ سے لتھڑی ہوئی فضا کے مقابلے میں کہیں زیادہ زندگی بخشتی تھی۔ یہاں کا ہیڈ ماسٹر اپنی مدد آپ کرنے کے منصوبے پر پختہ اعتقاد رکھتا ہے۔ اور ایک مشہور اور کامیاب انگریز پرنسپل کے (جس کا وہ خالصہ کالج میں شاگرد تھا) طریقوں پر عمل پیرا ہو کر اس نے ایک اینٹوں کے آوے کو اپنے ۴۵۰ لڑکے لگا کر صاف کرایا ہوا ہے اور اس سے سکول کے کھیت (۱۸) ایکڑ کا منظر اور بھی اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک تالاب کا پانی خشک کر کے اُسے پُر کر لیا ہے۔ اور اسے والی بال کھیلنے کا میدان بنا لیا ہے۔ کھیت میں کام کرنے کے لئے جس قدر محنت درکار ہوتی ہے۔ اس کی چوتھائی وہ کرتے ہیں۔ جہلم کے دریائی علاقے میں ملاقات کرنے والے ہائی سکول کے لڑکے کی کام کے متعلق اندوہ افزا داستان یاد آنے پر میں نے لڑکوں کے انضباط اوقات کے متعلق دریافت کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ بڑی جماعتوں کے ان لڑکوں کا ٹائم ٹیبل جو بورڈنگ ہاؤس میں رہتے ہیں یہ ہے۔ وہ پانچ بجے اُٹھتے ہیں۔ اور ڈیڑھ گھنٹے تک سکول کے کام سے فارغ ہو کر نہاتے اور کپڑے پہنتے ہیں۔ اور پھر آدھ گھنٹے کے لئے گوردوارے میں جاتے ہیں۔ اس کے بعد بیس منٹ ورزش کرنے اور ناشتے میں لگ جاتے ہیں۔ اور پھر آدھ گھنٹے تک آرام کیا جاتا ہے۔ جس میں سے زیادہ سرگرم لڑکے کام کرنے کیلئے زائد وقت نکال لیتے ہیں۔ نو بج کر تین منٹ پر دعا مانگی جاتی ہے۔ اور اس کے بعد سکول کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ یہ کام چار یا ساڑھے چار بجے تک جاری رہتا ہے۔ اور اس میں آدھ گھنٹہ کا وقفہ دیا جاتا ہے۔ پھر کھیلوں کا وقت شروع ہوتا ہے۔ ہاکی فٹ بال۔ وغیرہ وغیرہ جن کو فراخ میدان ہونے کی وجہ سے سب کھیل سکتے ہیں۔ پھر شام کی بندگی جس میں قریب قریب گھنٹہ لگ جاتا ہے اور اس کے بعد شام کا کھانا دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسری بار اور زیادہ دیر تک یعنی ساڑھے سات سے دس بجے تک پھر سکول کا کام کرنے کا وقت دیا جاتا ہے۔ اور آخر کار لڑکے دس گھنٹے کا ایک دوسرا دن شروع کرنے سے پہلے سات گھنٹے کی

مختصر نیند لینے کیلئے بستروں پر لیٹ جاتے ہیں ۔

گھر کا کام

اس میں ایسی کوئی بات نہیں جسے ترک کیا جا سکے ۔ اس ضلع کے ایک ۱۰ ہیڈ ماسٹر کا بیان ہے ۔ کہ سکول کی سب سے اعلیٰ جماعت کے لڑکے (دسویں جماعت میں کامیابی کو یقینی بنانے کے لئے) تمام سال اوسطاً دس گھنٹے روز کام کرتے ہیں ۔ اور انکی اوسط صرف ۱۷ گھنٹے ہیں ۔ ادنیٰ جماعتوں میں بھی سکول کا کام زیادہ ہونے کی وجہ سے حالت کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے ۔ یہ کام لڑکے اور استاد کی دماغی حالت کے لحاظ سے اختلاف رکھتا ہے ۔ اور متذکرہ بالا ہیڈ ماسٹر کا بیان ہے ۔ کہ ان کی اوسط یہ ہوتی ہے ۔

جماعتیں	یومیہ گھنٹے
ہائی سکول	۳ سے ۴
اپر مڈل	۲ سے ۳
لوئر مڈل	$1\frac{1}{2}$ سے ۲

اس ضلع کے دو ہیڈ ماسٹروں نے اس سے بھی زیادہ وقت کا ذکر کیا ۔ یہ تمام کام سکول میں سردی کے موسم میں ۱۰ سے $4\frac{1}{2}$ بجے تک اور گرمی میں ۷ سے ۱۲ تک (ایک مختصر سی تفریح کے) کافی کام کرنے کے علاوہ دیا جاتا ہے ۔ یہ بات کافی بری ہے ۔ اور سب سے زیادہ غصہ دلانے والی بات یہ ہے ۔ کہ سکول کا کام تعطیلات میں بھی دیا جاتا ہے ۔ اس وقت ہائی سکول کے لڑکے کی اوسط گرمی سردی اور بہار میں تین گھنٹے ہوتی ہے ۔ اور یہ کہ اسکا مطلب کیا ہے ۔ پہلے ہی لکھا جا چکا ہے ۔ اپر مڈل کے لڑکے اس سے ایک گھنٹہ کم کام کرتے ہیں ۔ اور لوئر مڈل والے ایک ہی گھنٹہ بعد فراغت پا لیتے ہیں ۔ یہ ان لڑکوں کے لئے جنہوں نے دوران سکول میں بہت محنت کی ہوئی ہوتی ہے ۔ کافی برا ہے ۔ خالصہ کالج کے ایک سابق پرنسپل کا بیان ہے کہ لڑکوں کے والدین نے مجھ سے اکثر یہ شکایت کی کہ ہمارے لڑکے ہمارے کام میں ہمیں امداد نہیں دیتے ۔ اور یہ بات خود بخود ظاہر ہے ۔ کہ اوپر کی جماعتوں کے لڑکوں کے لئے کھیتوں میں کام کرنا بالکل بے معنی ہے ۔ دوسروں کیلئے بھی یہ ضرور مشکل ہوگا ۔ خاص طور پر اس صورت میں (جیسا کہ اکثر واقع ہوتا ہے) جب کہ اندھیرا ہو جانے پہ لیمپ نہ ہونے کی صورت میں

گھر کے کام کو جلدی جلدی دن کی روشنی میں ختم کیا جاتا ہے۔

ضرورت سے کم خوراک بہم پہنچانا

سکول کے کام کا بوجھ ان لڑکوں پر نہایت سختی سے دباؤ ڈالتا ہے۔ جو سکول سے تین یا چار میل کے فاصلے پر رہتے ہیں۔ اور جنہیں ہر جگہ پیدل جانا پڑتا ہے۔ کیونکہ وہ اتنے غریب ہیں۔ کہ نہ بورڈنگ ہاؤس میں رہ سکتے ہیں۔ اور نہ بائیسکل خرید سکتے ہیں۔ ترن تارن کے چاروں طرف پچاس یا ساٹھ لڑکے اسی قسم کے ہیں۔ اور کل شام جب ہم گھوڑوں پر آرہے تھے۔ تو ان کے گروہ کے گروہ گھر جاتے ہوئے ملے۔ اس وقت پانچ بج کر تیس منٹ ہو چکے تھے۔ اور ان کو ابھی ایک یا دو میل اور آگے جانا تھا۔ اور پھر سکول کا کام کرنا تھا۔ ایک ٹولی نے کہا کہ اس میں دو گھنٹے لگینگے۔ اور دوسری نے کہا کہ تین۔ اور ان کی آزمائش محض اسی پر بس نہیں ہو جاتی۔ ان لڑکوں کیلئے جو سکول سے دو دو میل کے اندر رہتے ہیں۔ روز کا آنا جانا سردیوں میں اچھی ورزش اور گرمیوں میں کوئی زیادہ سخت کام نہیں ہے۔ لیکن اگر دونوں طرف اس سے ایک یا دو میل فاصلہ زیادہ طے کرنا پڑے۔ تو گرمی کا اثر جسم کو اس قدر کمزور کر دیتا ہے۔ کہ ان کے دماغ کیلئے سبق یاد کرنا مشکل ہو جاتا ہے اپریل سے لیکر اکتوبر تک ہر لڑکا ساڑھے پانچ بجے اُٹھ بیٹھتا ہے۔ اور محض لسی کا ایک پیالہ پینے کے بعد اس کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ سات بجے سکول پہنچنے کیلئے چھ بجے چل پڑے۔ وہ اپنا صبح کا کھانا ساتھ لیجاتا ہے۔ غالباً وہ کھانا سوائے گھی لگی ہوئی بغیر خمیر والی روٹیوں کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اور اس کے بعد شام کو چنے یا مٹھائی کا ناشتہ ملتا ہے۔ جس پر وہ دن ڈھلے تک جیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ دن میں دوپہر کو اس قدر گرمی ہوتی ہے۔ کہ وہ گھر واپس نہیں جا سکتا۔ سردیوں کے موسم میں بھی جبکہ سکول دس بجے تک شروع نہیں ہوتا۔ حالات صحت بخش نہیں ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ جانے سے پہلے وہ کھانا کھا لیگا۔ لیکن یہ یقینی ہے۔ کہ اسے اس وقت جلدی پڑ رہی ہوگی۔ اور جو کچھ وہ کھائے گا۔ جلدی جلدی نگل جائیگا۔ اور سکول جانے کا خیال غالباً اسکی بھوک کو بھی بڑھائیگا۔ اسے کوئی اہمیت نہ دی جاتی۔ اگر انگلستان کے سکول جانے والے لڑکے کی طرح اسے دوپہر کے وقت اچھا کھانا ملنے کی توقع ہو سکتی۔ لیکن وہ اسکی استطاعت نہیں رکھتا۔ ایک ہیڈ ماسٹر نے مجھے بتایا کہ

ہیں نے اُن لڑکوں کیلئے جو چار آنے کی اوسط رقم دینے کے لئے رضامند تھے ۔ گرم کھانے کا انتظام کیا۔ لیکن اکثر نے یہ رقم بچانے اور ناشتہ سے بچے ہوئے روٹی کے معمولی ٹکڑے پر انحصار رکھنے یا منہ بھر غلیظ مٹھائی لے لینے کو ترجیح دی۔

ایک اور ہیڈ ماسٹر نے ایک حلوائی سے یہ فیصلہ کیا۔ کہ وہ ہر ایک لڑکے کو نصف آنہ قیمت کی خوراک بہم پہنچائے ۔ اور وہ خوراک لڈو جلیبی یا چنے اور گڑ کی قسم سے ہو۔ لیکن جب اس نے وہ جگہ چھوڑی تو انتظام درہم برہم ہوگیا۔ دوسری بات یہ ہے ۔ کہ دیہاتی کی خوراک حالات کے رحم پر ہے۔ جب بھینس سوکھ جاتی ہے تو دودھ نہیں ملتا۔ جب فصلیں نہیں ہوتیں تو ضروری ہے کہ خوراک میں کمی کردی جائے ۔ اور اب قیمتیں گر جانے کی وجہ سے دودھ اور گھی زیادہ تر فروخت کرنا پڑتا ہے۔ ایک تعلیم یافتہ لڑکا اس قدر رکاوٹوں کے ہوتے ہوئے اگر کھیت میں ناخواندہ کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس کا ایک علاج یہ ہے۔ کہ جسمانی ورزش کی تربیت دی جائے ۔ جنگ کے بعد سے کارکنانِ محکمہ تعلیم نے جن بہترین چیزوں کو سکولوں کے عام نصاب میں داخل کیا ہے یہ ان میں سے ایک ہے ۔

گرنتھ صاحب

اب سکول واپس آنے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ یہاں آکر ہم نے گوردوارہ دیکھا۔ یہ ایک بڑا ہال تھا جس میں تمام سکول کے لڑکے آسکتے تھے۔ اس میں سوائے ایک لڑکے کے جو چبوترے پر بیٹھا اونچی آواز سے گرنتھ صاحب پڑھ رہا تھا۔ اور کوئی نہ تھا۔ آکھنڈ پاٹھ کیا جارہا تھا۔ یعنی یہ کہ تمام کی تمام مقدس کتاب شروع سے آخیر تک بغیر دم لئے پڑھی جارہی تھی ۔ اس میں اڑتالیس گھنٹے لگتے ہیں ۔ اور لڑکے باری باری سے پڑھتے ہیں۔ یہ رسم سال میں چھ یا سات بار ادا کی جاتی ہے ۔ اور ہر مرتبہ خاص نیت سے ۔ اس صورت میں سالانہ معائنہ قریب آرہا تھا۔ اور امتحانات سے پہلے ایک بار اسے اور ادا کرنا ہے ۔ گرنتھ صاحب قدیم پنجابی میں لکھا ہوا ہے ۔ اور وہ شخص جس نے اسکی تعلیم نہ حاصل کی ہو۔ اسے آسانی سے نہیں سمجھ سکتا۔ مجھے بتایا گیا ہے۔ کہ تعلیم یافتہ شخص بھی سوائے کہیں کہیں کوئی لفظ سمجھنے کے اور کچھ نہیں سمجھتا ۔ تاہم اگر وہ سمجھدار اور متوجہ ہو۔ تو سادہ بھجنوں کا لبِّ لباب اخذ کرسکتا ہے ۔ اس بات میں وہ اپنے مسلمان بھائی پر فوقیت رکھتا ہے ۔ جو عربی کے قرآن شریف میں سے شاذ ہی کچھ سمجھتا ہے ۔

مزید برآں یہ کہ گرنتھ صاحب اس کوشش کی نسبت جو قرآن شریف کی صورت میں درکار ہوتی ہے۔بہت کم محنت سے سمجھا جا سکتا ہے۔اور بہت سے سکھ (شاید تعلیم یافتہ طبقہ میں سے پچاس فیصدی) اسے روزانہ پڑھتے ہیں۔البتہ سکھ دیہاتی کی وہی چال ہے۔جو اس کے مسلمان بھائی کی ہے۔اور جب میں نے گذشتہ دورے میں دیکھا ہے۔وہ مذہبی رسوم کے رسمی ارکان بجا نہیں لاتا۔اس کیلئے کام ہی عبادت ہے۔اس کا مقولہ یہ ہے کہ دست بہ کار دل بہ یار (خدا) اس پر بھی اگر کبھی کوئی گوردوارہ مرمت طلب ہوتا ہے یا نئے سر سے تعمیر کرنا ہوتا ہے۔تو (جیسا کہ مسلمان اپنی مسجد کی صورت میں کرتا ہے) وہ ہمیشہ خدمت کرنے اور روپیہ دینے دونو کیلئے تیار ہوتا ہے۔اور یہ جذبہ اس قدر عام ہے۔کہ حال ہی میں جب امرتسر کے شہری مندر (دربار صاحب) کا تالاب صاف کیا گیا تھا۔تو اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ اس بات کو فخر سمجھتے تھے۔کہ وہ مٹی یا اینٹوں کی ایک ایک ٹوکری سر پر اٹھا کر لے جائیں۔اور کام میں سبقت لے جانے کی عزت کے لئے ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے تھے ٭

۲۵ جنوری سرہالی سے ماکھو۔(۱۲ میل)

سرہالی کی قیامگاہ چھوڑتے وقت مجھے ذرا افسوس نہ ہوا۔یہ ایک بڑی سرائے کے کونے میں بنی ہوئی ہے۔اور اس کے ساتھ اسی سرائے میں ڈاک خانہ۔شفاخانہ۔اور سب آنے جانے والے لوگ شامل ہیں۔اس میں ایک بڑا کمرہ ہے۔(۲۷ فٹ) جس میں سیاہی کے دھبوں والی ایک دری اور ایک ٹپکنے والا برتن ہے۔اور چھت ایسی ہے۔کہ اس میں سے بار بار گرد جھڑتی ہے۔دن نہایت شاندار تھا۔اور افق و آسمان بارش کے بعد آنے والی چمکدار روشنی سے مجلا تھے۔ہم پھر اونچی چوڑی سڑک پر چل رہے تھے۔جو اب برساتی چھپڑیوں کی وجہ سے شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔اور جگہ جگہ کیچڑ کی نالیاں بنی ہوئی تھیں۔ہمارے چاروں طرف کا میدان سمندر کی طرح وسیع اور نباتات سے عاری تھا۔اور سمندر ہی کی طرح اسمیں انسانی زندگی کا عنصر کم سے کم نظر آتا تھا۔یہاں تک کہ ایک بلندی پر چڑھ کر ہم نے اپنے سامنے بیاس اور ستلج کا دریائی علاقہ دیکھا۔جو دور درختوں کی ایک پتلی نیلی لکیر تک پھیلا ہوا تھا تصور اور نئی معلومات کرنے کے جذبات پھر بیدار ہو گئے۔اور ایک بار پھر سوار اور گھوڑا دونو ذوق شوق سے آگے بڑھے ٭

شادیوں کے بلاوے

چونکہ آج اتوار کا دن تھا۔ ہم نے بہت سے ملاقاتیوں سے گفتگو کی۔ اور گھاٹ تک چھ
میل کا فاصلہ طے کرنے میں ہمیں گھنٹے لگا دیئے۔ ہماری پہلی ملاقات ایک معمر مگر خوش طبع فقیر سے
ہوئی جو سرمالی کے قریب پڑا۔ لوگوں سے روٹی کی بھیک مانگتے جا رہا تھا۔ وہ قریب کے
ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ اور اپنی تمام زندگی میں ہر روز یہی کام کرتا رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔
جب تم جوان تھے کیا اس وقت تم نے کوئی اور کام نہیں کیا؟ اس نے تسلی بخش طریق سے
اپنے سامنے کے تین دانت دکھا کر جواب دیا "نہیں کبھی نہیں"۔ وہ ان خیراتی رقموں کے لئے
شکرگزار تھا۔ جو رمضان شریف میں فیاضانہ طور پر دیئے جاتے ہیں۔ اس کے پیچھے ایک حجام کا
بیٹا شادی کا بلاوا لئے آ رہا تھا۔ یہ کوئی تکلفانہ خط نہ تھا۔ بلکہ جیسا کہ یہاں رواج ہے تحفہ
کے طور پر کچھ گڑ تھا۔ اور یہ اس صورت میں کھدر کی ایک چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ گاؤں کا کمی
زمیندار کا غلام ہوتا ہے۔ اور اسے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں پیغامات لیجانے
پڑتے ہیں۔ اس کے کچھ دیر بعد ایک اور حجام آیا۔ جو اسی کام پر جا رہا تھا۔ لیکن اس کے
پاس گڑ نہ تھا۔ ہم نے پوچھا یہ کیا بات ہے؟ وہ ایک سکھ تھا۔ اس نے کہا کہ اکالی اس بات
سے منع کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ فضول خرچی ہے۔ اور اگر ہم ایسا کرینگے تو ہمارے گلے گھٹنے لگیں گے
میں نے پوچھا ایک سکھ کے لئے نائی بننا کس کام کا ہے؟

اس نے کہا کہ ہمارے حجام سکھ بن گئے۔ اور انہوں نے کہا کہ تم بھی اپنے بالوں کو بڑھنے
دو اور سر پر پگڑی باندھو۔ ورنہ تم ہمارے نائی نہیں ہو سکتے۔ ہم نے اسی طرح کر لیا۔ اور اب
ہم اپنے بھائیوں کی حجامت نہیں بناتے۔ بلکہ ان کے ناخن کاٹتے ہیں۔ اور پیغامات لے جاتے
ہیں۔ یہ کہتے ہی اس نے اپنے لباس کی سلوٹوں میں سے ایک نہایت صاف ستھرا ناخن
تراش نکالا۔

چونکہ اس تحصیل کا اسی فیصدی سے زیادہ حصہ کاشت کیا جاتا ہے۔ اس لئے مویشیوں
کے لئے چارہ بہت کم ہے۔ اور سال کے اکثر حصے میں انہیں نقصان پر ہی چارہ دیا جاتا ہے۔
اس لئے بہت سے لوگ چارے کیلئے توریئے کے گوپے بھر رہے تھے۔ ان میں سے دو
سکھ تھے۔ گفتگو کرنے کے بعد انہیں چھوڑ کر جب ہم تیس یا چالیس قدم پرے چلے گئے

تو میرے ساتھی نے ایک کو دوسرے سے یہ کہتے سُنا: "انگریز لوگ دھرم مال کم کردے نے۔ ہندوستانی بُرا کام کرتے ہیں۔ اس سے آگے دو سکھ جاٹوں کو ایک عمدہ گوڈائی کئے ہوئے کھیت کے پاس کھڑے دیکھ کر (توجہ جذب کرنے کیلئے یہ بات بہت کم دیکھنے میں آتی ہے) میں نے دریافت کیا۔ آیا ان کی عورتوں نے گوڈائی کرنے میں انہیں کوئی مدد دی تھی۔ انہوں نے کہا۔ یہ عورتوں کا کام نہیں ہے۔ لیکن میں نے دو آبہ دریاس اور ستلج کی درمیانی زمین) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "اس علاقے میں عورتیں یہ کام کرتی ہیں۔ یہاں پھر کیوں نہیں کرتیں؟ پچاس گز کے فاصلے پر کھیت میں کام کرتے ہوئے ایک مضبوط جاٹ کی یہ آواز کھیتوں پر سے گونجتی ہوئی آئی "کچھ عرصے میں یہاں بھی انہیں کام کرنا پڑے گا۔ اس کا اشارہ نازک وقت کی طرف تھا۔ جب ہم آگے چلے۔ اور تقریباً اتنی دور ہو گئے۔ کہ آواز نہ پہنچتی تھی۔ میرے ساتھی نے اور خوشامدانہ الفاظ سُنے۔ دیکھ صاحب ہمارے ساتھ کیسی اچھی باتیں کرتا ہے۔ اگر ہمارے آدمی بھی ہمارے ساتھ اسی طرح باتیں کرے تو ہماری جلد بہتری ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ ہماری روٹیاں کھاتے ہیں۔ اور خوشی سے پھولے نہیں سماتے"۔ جو کچھ کہا گیا اور سُنا گیا۔ میں نے تمام کا تمام لکھ لیا۔

میں نے بھورے رنگ کی ایک چھوٹی گھوڑی پر ایک عورت کو بیٹھے ہوئے دیکھ کر دریافت کیا: "اماں کہاں جا رہی ہو؟"

اس نے کہا اپنی بیٹی کے لئے کپڑے خریدنے بازار جا رہی ہوں۔ وہ اپنے خاوند کے ہاں جائیگی۔ کوئی بیٹی اپنے والدین کے گھر سے خاوند کے گھر خالی ہاتھ نہیں لوٹتی۔ اور ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ لڑکے کی نسبت لڑکی پر کیوں زیادہ خرچ ہوتا ہے؟

اچھے گھرانوں میں اُسے دوپٹہ قمیص اور پاجامہ دیا جاتا ہے۔ اور دوسروں میں محض قمیص اور اوڑھنی۔ اس صورت میں کپڑوں کے تین جوڑے دینے تھے۔ اس لئے کہ نمبردار کی بیوی (بلکہ بیوہ) کو یہی زیب دیتا تھا۔ سات برس گذرے اس کا خاوند پولیس میں یہ خبر دینے پر قتل کر دیا گیا تھا۔ کہ اس کا ایک رشتہ دار ڈاکہ ڈالنے کی تجاویز کر رہا تھا۔ وہ ایک مقدمے میں گواہی دینے جا رہا تھا۔ کہ اس کا دشمن اس پر آ گرا۔ اور اُسے تہ تیغ کر دیا (اپنی جان دے کر، کیونکہ بعد میں اُسے پھانسی دے دی گئی تھی۔ ایک ذیلدار نے جسے ہم بعد میں ملے یہ کہا کہ مانجھا کے ایک گاؤں میں اتنی خون خرابیاں ہوتی ہیں۔ جتنی کہ دریا پار تمام ضلع فیروزپور میں۔ اسمیں

حسبِ معمول مبالغہ ہے۔ لیکن اس میں کافی حقیقت بھی ہے۔ میرے ہمراہیوں میں سے ایک تعلیم یافتہ سردار نے کہا۔ کہ ایک بار مجھے رات کو گھر پہنچنے پر جھڑکیاں ملی تھیں۔ میرے چچا نے کہا۔ کہ ممکن تھا تم قتل کر دیئے جاتے۔ اس کی ایک مسلمان نمبردار نے یہ کہہ کر تشریح کی۔ کہ اس ضلع میں کوئی شخص اندھیرا ہو جانے پر مسجد تک میں جانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔" آج ہی کے اخبار میں لکھا ہے۔ کہ قریب ایک گاؤں پر جو لاہور سے تیس میل کے اندر اندر ہے ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا ہے۔ ایک آدمی اور ایک عورت گولی سے ہلاک کر دیئے گئے ہیں۔ اور تین اور عورتیں زندہ جلا دی گئی ہیں۔ یہاں فساد کی حالت گوجرانوالہ کی نسبت بھی زیادہ بُری ہے۔ سردار نے کہا۔ کہ ایک گاؤں بھی اس سے خالی نہیں ہے۔ اور ان میں سے ۵۰ فیصدی ایسے ہیں۔ یہاں فریقین کی بول چال تک نہیں ہے۔ دریا کے پار ایسی حالت صرف دس فیصدی بتائی جاتی ہے۔

ایک دیہاتی جھگڑا

مانجھا جاٹ جب نو آبادیوں میں نقل سکانی کر جاتا ہے۔ تو ویسے کا ویسے ہی رہتا ہے۔ ایک سردار نے جس کے پاس نو آبادی میں زمین ہے۔ اسکی کئی مثالیں دیں۔ اس نے پہلا واقعہ یہ بتایا۔ میرے گاؤں کا نمبردار ایک سکھ جاٹ تھا۔ جو ساہوکار بھی تھا۔ ایسا ساہوکار جو گلے سے پکڑتا تھا۔ اور دھکا دیکر پیچھے پھینکتا تھا۔ کوئی پیشہ ور ساہوکار اتنا کوتاہ اندیش نہیں ہو سکتا۔ ایک غیر منصفانہ دعوے کی حمایت میں اس نے تین بار قرارنامے میں جعل سازی سے کام لیا۔ اس کے موکلوں میں سے ایک جاٹ شراب پیتا تھا۔ یہ نہیّہ کرکے کہ آخرکار اسکی زمین لے لونگا۔ وہ اسے قرضے پر قرضہ دیتا رہا۔ شرابی کے بیٹے نے یہ دیکھ کر کہ میری موروثی جائیداد خطرے میں ہے۔ اسے قتل کرنے کی ٹھان لی۔ اور اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اسے اپنے گھر حسابات کا فیصلہ کرنے اور جائیداد بانٹنے کی دعوت دی۔ چونکہ معاملہ خاندانی اہمیت لئے ہوئے تھا۔ نمبردار اپنے بیٹے کو ساتھ لے گیا۔ اور جب اس پر حملہ کیا گیا تو وہ ایک زخم کھا کر بھاگ گیا۔ لیکن اس کا بیٹا جو صرف ۱۶ برس کا تھا۔ قتل ہو گیا۔ اس کے بدلے شرابی کے لڑکے کو پھانسی کی سزا ملی۔ یہ واقعہ چھ برس کا ہے۔ دوسرا واقعہ حال ہی کا ہے اور

پہلے واقعہ کی طرح ایک شرابی کو قرض دینے سے ہی شروع ہُوا ۔ اس دفعہ قرض کا خاتمہ ایک ڈگری اور نیلام پر ہُوا نمبردار کو کسی طرح مقروض کے کنبے کی کسی عورت کا پاجامہ ہاتھ آ گیا ۔ اور نیلام کے وقت اس نے اُسے گاؤں میں پھرایا ۔ (بقول سردار) یہانتک کہا ۔ کہ اب اسے ننگا کیا جائیگا ۔ شرابی کے لڑکے نے چل کر کہا ۔ کہ میں اب نمبردار کو قتل کر دوں گا ۔ اس کھیل کے قوانین کے مطابق اس قسم کے ارادے کا اعلان کرنا ضروری ہے ۔ پرندے کو بیٹھے ہوئے نہ مارا جائے دشمن کو بے خبری میں نہ قتل کیا جائے میں اس وقت باہر گیا ہُوا تھا ۔ لیکن واپسی پر مجھے اس کے ارادے کے متعلق اطلاع ملی ۔ تاہم فوری عمل کی کوئی علامت نہ تھی ۔ ایک یا دو ہفتے گذر گئے ۔ ایک دن بعد از دوپہر جبکہ نمبردار اپنے رہٹ کے پاس چبوترے پر سویا پڑا تھا ۔ وہی لڑکا اور اس کا ایک ساتھی بے پاؤں اس پر آ پڑے ۔ اور اسے گنڈاسوں سے ہلاک کر دیا ۔ وہ لڑھک کر زمین پر جا پڑا ۔ اور جب سردار نے اسے وہاں پڑا ہُوا دیکھا ۔ تو اس کے جسم پر بیس سے زیادہ زخم اور گھاؤ پڑے ہوئے تھے ۔ اس نظارے نے اس کے دل میں گاؤں کی زندگی سے ہمیشہ کے لئے نفرت پیدا کر دی ۔

ایک بار پھر ایک دیہاتی پھانسی پر لٹک گیا ۔ مگر اس دفعہ لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا ۔ اور کہا ۔ اب جبکہ نمبردار کا خاتمہ ہو چکا ہے ۔ امن ہو جائیگا ۔ امن ہو رہا ہے ۔ لیکن ایسا ہی جیسا کہ سوئے ہوئے آتش فشاں پہاڑ کے کنارے پر رہنے سے حاصل ہو سکتا ہے ۔ سردار کو اس معاملے میں خاص دلچسپی ہے یہ اس کا بھتیجا تھا ۔ جس نے نمبردار کو قتل کیا تھا ۔ اگرچہ وہ اس کے عوض پھانسی چڑھ چکا ہے ۔ لیکن نمبردار کے کنبے والے اب بھی انتقام کا جذبہ لئے ہوئے ہیں ۔ بہرکیف یہ بات فریقین کو گاؤں کے مشترکہ معاملات میں بخوشی حصہ لینے سے مانع نہیں ہے ۔ جب تک بات دبی ہوئی ہے ۔ ڈر کی کوئی وجہ نہیں ہے ۔ لیکن ہر لمحہ ایک ہی چنگاری دبات (جذبات) کے شعلے بلند کر سکتی ہے ۔ صرف ۲ مہینے گذرے یہی بات ہو گئی تھی ۔ نمبردار کا بھائی (ظاہر ہے کہ اسی ترازو کا بٹہ تھا) گذشتہ مقتول کے ایک رشتہ دار سے جھگڑ پڑا ۔ اور گاؤں والوں کی موجودگی میں اسکی نہایت ہی قریبی رشتہ دار عورتوں کو اس قدر کھلی زبان سے گالیاں دیں ۔ کہ اس نے یہ برملا کہہ دیا ۔ کہ میں تمہیں جان سے مار ڈالونگا

میں ٹھیک وقت پر گاؤں پہنچ گیا۔ اور خبر ملی کہ قتل ہونے والا ہے۔ اس مرتبہ میں اپنے رشتہ دار کے پاس گیا۔ اور منت سماجت سے اُسے (قتل سے) باز رکھا۔ میں نے کہا تمہیں وہ دوبا نہیں۔ جنہیں پھانسی ملی تھی؟ اس نے جواب دیا۔ "لیکن پھر ہم جاٹ نہیں کہلائیں گے۔"
اس میں عزت کا سوال تھا، جاٹ کو اس بات کے راضی کرنے میں کہ وہ اپنی شان نیچی کر لے مجھ کو پورا ہفتہ لگ گیا۔ یہ واقعہ اس معاملے کی یاد دلاتا ہے۔ جس کے متعلق ہم نے کوہستان نمک میں سُنا تھا۔ لیکن وہاں عزت کا ہر شخص کو خیال تھا۔ موجودہ حالات سے یہ نہیں ٹپکتا کہ قدیم وحشیانہ عادات کو کسی نئی طاقت کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

تعلیم

یہ طاقت تعلیم کی ہے۔ اور سردار کو یہ بڑی امید ہے۔ کہ انجام کار سہرہ اسی کے سر رہیگا۔ اس کا بیان ہے۔ کہ گاؤں میں تعلیم یافتہ شخص عام طور پر ظلم و ستم کے خلاف ہوتا ہے اور صاف عمدہ برتاؤ والے کا ساتھ دیتا ہے۔ اس کے اپنے گاؤں میں جو صرف تیس گھروں کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ آٹھ یا دس آدمی کچھ نہ کچھ پڑھے لکھے ہیں۔ اور وہ ایک ایسی نئی جماعت جماعت کا مغز ہیں۔ جو ناخواندہ لوگوں کے قدیم جذبات کو کچلنے کیلئے اپنے اثر سے کام لے رہی ہے لیکن جہاں جورو جفا کا تعلق ہوتا ہے۔ اور لاٹھی اور بھینس کا سوال ہوتا ہے۔ تو نئی روشنی والے ہمیشہ گھاٹے میں رہتے ہیں۔ انہیں بادل ناخواستہ لڑنا پڑتا ہے۔ اس خاص میں فسادات کی صورت میں ہر کس و ناکس انصاف کا خون کرنے کی کوشش میں فسادی لوگوں کے ساتھ ساتھ ہو لیتا ہے۔

دریائے ستلج کے قریب پہنچکر ہم اسے عبور کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ کہ ایک نئے دیہاتی بنک کے ممبروں نے ہمارے گرد گھیرا ڈال دیا۔ ان میں ایک سکھ سیاہ پگڑی پہنے ہوئے تھا۔ سیاہ اس لئے کہ مہینے میں صرف ایک بار دُھلتی تھی۔ اور یہ کام صرف ایک پیسے میں ہو سکتا تھا۔ اُنہوں نے اس سب انسپکٹر کا جس نے بنک جاری کیا تھا۔ خود بخود ہی اچھے الفاظ میں ذکر کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ اس نے ہم سے کچھ نہیں لیا۔ (کوئی مرغی نہیں لی۔ یہاں تک کہ روٹی بھی نہیں کھائی) اس نے کہا کہ حکم ہے۔ اس ملک میں سختی کرنے کی نہایت ہی مشکل صورت جس کا سدباب ہونا ضروری ہے۔ یہ ہے کہ چھوٹے

چھوٹے افسر گاؤں کو کھا کھا کے کپتے ہو جاتے ہیں ۔حکومت کا ڈر ۔ ادنیٰ افسروں کی قلیل تنخواہ ۔ جہاں داری کے دعاوی (جن پر مشرق میں ہمیشہ عمل کیا جاتا ہے) اور بیرونی ازیاد رسومات سب کی سب اسکی حمایت میں ہیں ۔یہاں تک کہ یہ بھی مشکل ہے ۔کہ کوئی شخص اپنے کیمپ کے ساتھ چلنے والوں کو ایسا کرنے سے روکے ۔خواہ کوئی کتنی بھی کوشش کرے یا قیمت دے ۔ اس بات کو قطعی یقینی بنانا کہ ان بیشمار لوگوں تک جو دراصل انڈے ۔ دودھ ایندھن اور خشک گھاس (جن کی دورے میں ضرورت پڑتی) مہیا کرتے ہیں ۔وہ قیمت جو نمبرداروں اور ذیلداروں کو دی جاتی ہے پہنچتی ہے یا نہیں ۔قریب قریب ناممکن ہے اس کا تدارک کرنے کیلئے پنجاب گورنمنٹ نے ضروریات بہم پہنچانے کے لئے ٹھیکیداروں کو ماہوار تنخواہ پر رکھ لیا ہے ۔اور انہیں ایسی قیام گاہوں سے منسوب کر دیا ہے جہاں لوگ اکثر ٹھہرتے ہیں ۔یہ پرانے طریقے کی اصلاح یافتہ صورت ہے ۔اور اس قابل ہے کہ اس پر اتنا خرچ کیا جائے ۔لیکن جیسا کہ ایک اور ضلع کا مندرجہ ذیل واقع ظاہر کرتا ہے ۔یہ علاج ہمیشہ کارگر ثابت نہیں ہوتا ۔میری موجودگی میں ٹھیکیدار کو ان تمام چیزوں کی قیمت دی گئی ۔جو اس نے میرے ہمراہیوں کو لا کر دی تھیں ۔لیکن ایک یا دو دن بعد مجھے اتفاقیہ یہ معلوم ہوا ۔کہ مقامی ذیلدار اپنے حلقے کے گاؤں میں گھومنے گیا ۔اور بیشمار مرغیاں اور انڈے جمع کرلیں ۔اور لوگوں کو یہ بتایا کہ یہ میرے کیمپ کیلئے درکار تھیں ۔اور بغیر ایک پیسہ قیمت ادا کئے انہیں لے آیا ۔میں نے فوراً ہی ایک معتبر افسر کو لوگوں کے بیانات لینے کیلئے روانہ کیا ۔دوسرے دن اس نے آکر بتایا کہ وہ خبر صحیح تھی لیکن عام لوگوں کے سامنے کوئی بیان نہیں دیتا تھا ۔ (حکومت کتے کے ہاتھ میں ہو تو اسکی بھی اطاعت کی جائیگی) اور ذیلدار کا عہدہ ایسا ہے ۔کہ (کتا بھی کاٹ سکتا ہے) ذلیل سے ذلیل انسان بھی رشوت لے سکتا ہے ۔اس لئے سوائے اس کے کہ ذیلدار کی لاگ ٹیک میں جس کا رکھنا ہر ذیلدار کے لئے ضروری ہے ۔چند سطور لکھ دی جائیں اور کچھ نہ کیا جاسکا ۔

ذیل میں ایک اور داستان ہے ۔جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ سادہ لوح انسان اس قسم کی بات پر کس قدر جلد آمنا کہہ دیتا ہے ۔میں ایک بار کشتی میں بیٹھکر دریائے سندھ کے بہاؤ کی طرف دورہ کر رہا تھا اور مجھے رات ایک ایسے گاؤں کے نزدیک بسر کرنی پڑی ۔

بجے میرے آنے کی توقع نہ تھی۔ میں کشتی سے اتر کر اسے دیکھنے کیلئے گیا۔ اس کے کچھ دیر بعد کشتی بان آیا۔ اور اندھیرے میں میری موجودگی سے بے خبر ہوتے ہوئے ہمارے آرام اور کھانے پینے کی بہت سی چیزوں مثلاً دودھ۔ انڈے اور مرغیوں وغیرہ کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا۔ مطالبہ بلا چون وچرا تسلیم کر لیا گیا۔ اور میں نے ایک عورت کا سیاہ ہاتھ اس طرح انڈے پر جاتا ہوا دیکھا۔ جس طرح کوئی شخص چندے پر اس وقت ہاتھ ڈالتا ہے۔ جب کوئی شخص دروازے پر چندے کیلئے زور دے۔ بالآخر میں نے فوراً بتا دیا۔ کہ ہر چیز کی قیمت دی جائیگی۔ یہ ان کیلئے ایک نئی بات تھی۔ اور کچھ دیر تک وہ اس بات کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ اور ایک نسل پہلے صوبے بھر میں مشکل سے کوئی دیہاتی ایسا ہوگا۔ جو اسے سمجھ سکتا۔ لیکن زمانہ بدل رہا ہے۔ اور کم از کم وسطی پنجاب میں دیہاتی یہ محسوس کر رہا ہے کہ اب اسے ان چیلوں کا گدھوں کا جو اس کے گاؤں کے گرد منڈلاتے ہیں۔ شکار بننے کی ضرورت نہیں ہے ۔

فیروز پور

گاؤں کی مالی حالت قیمتوں کا گرنا اور سکھ خادمہ اور ماما

۲۶ جنوری پاکھو سے کوٹ عیسیٰ خاں (۱۴ میل)

فیروز پور اور اس کے ۴۰۰۴ مربع میل رقبے کا حال میں نے کہیں اور لکھا ہے۔ یہ پنجاب کا سب سے زیادہ متفرد ضلع ہے۔ اور سب سے زیادہ خوشحال اضلاع میں سے بھی ہے۔ (بشرطیکہ اب بھی کوئی ایسا لفظ صوبے کے کسی حصے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہو) سکھ جاٹ کا عنصر یہاں اب بھی غالب ہے۔ اور وہ ضلع کے کاشت شدہ نصف رقبے پر قابض ہے۔ لیکن دریائی علاقے میں جیسا کہ پنجاب میں اکثر دیکھا جاتا ہے مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ آج ہم کسی سے نہیں ملے۔

مویشیوں کی تجارت اور مالی حالت

شام کا وقت ہم نے اراعیوں میں کاٹا۔ جو دریائی علاقے میں سب سے زیادہ آباد قوم ہے۔ ہم میں سے ساٹھ اشخاص ایک کھیت میں بیٹھے۔ ان میں سے اکثر بوریوں کے ٹکڑوں پر تھے۔ چھ کے علاوہ باقی سب ان پڑھ تھے۔ لیکن یہ بات بیشمار لوگوں کو مویشیوں کی تجارت کرنے سے مانع نہ تھی۔ تجارت کی صرف یہی ایک ایسی قسم ہے جو زمینداروں کیلئے مخصوص ہے۔

یہ لوگ ایسے بیل خریدنے کیلئے حمار۔ پٹیالہ۔ اور بیکانیر کے میلوں میں دور نکل جاتے ہیں جن کی نسل وسطی پنجاب کا معمولی مالک خود کاشت اپنے لئے شاذ ہی بڑھاتا ہے۔

تمام کام خوردہ فروشی کے طریق پر کیا جاتا ہے ۔ دس یا بیس بیل خریدے جاتے ہیں ۔ (عام طور پر ۲۵ فی صدی شرح پر ادھار دیئے ہوئے روپے سے) اور سڑک ہی سڑک شمال کی طرف لائے جاتے ہیں ۔ اور ضلع کے میلوں میں فروخت کئے جاتے ہیں ۔ وہاں روپیہ نقد مل جاتا ہے ۔ لیکن اگر وہ کسی گاؤں میں فروخت کئے جاتے ہیں ۔ تو قیمت دوسری فصل تک کھڑی رہتی ہے ۔ اور ضمانتیں بھی نہیں لی جاتیں ۔ میں نے کہا فرض کرو ۔ اگر مال کی نقد قیمت ۱۰۰ روپیہ ہو تو تم دوسری فصل پر کیا طلب کرو گے ۔ انہوں نے کہا کہ ۱۲۰ روپے ۔ میں نے کہا ۔ پھر تم بھی ساہوکار ہو ۔ اس پر سب نے قہقہ لگایا ۔ لیکن تاجروں کی اسلامی ضمیر پر چوٹ لگی ۔ اور انہوں نے اسکی پرزور تردید کرتے ہوئے کہا ۔ یہ سود نہیں ہے منافع ہے ۔ ایک پکے مسلمان کے لئے اس میں امتیاز کرنا نہایت ہی اہم ہے ۔ اور اسے جائز ٹھہرانے کے لئے بہت سے ڈھنگ نکالے جاتے ہیں ۔ اس لئے میں نے ان لوگوں کو گنہگار ٹھیرایا ۔ اور یہ ایک ایسا الزام تھا ۔ جو سراسر جائز نہ تھا ۔ کیونکہ اگر دوسری فصل پر قیمت نہ دی جا سکے ۔ تو قرض ۶ ماہ اور مقروض کے سر رہنے دیا جاتا ہے ۔ اور اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا جاتا ۔ ایک شخص نے جس کے پاس تین ایکڑ سے بھی کم زمین تھی ۔ یہ کہا ۔ کہ مجھے ایک بنئے نے ۱۲ فیصدی شرح پر قرض دیا ہے ۔ یہ بات تعجب خیز تھی ۔ کہ اتنی تھوڑی جائداد والے نے کس طرح اس قدر ارزاں شرح پر قرض لے لیا تھا ۔ میں نے دریافت کیا کہ تم نے اس کا کیونکر بندوبست کیا ۔ اس نے فخریہ انداز سے کہا ۔ کہ میں جلد ادا کر دیتا ہوں ۔ میں نے موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا ۔ اور یہ نتیجہ نکال لیا کہ وہ لوگ جو ارزاں شرح پر قرض لینا چاہیں ۔ قابل اعتبار ہونے چاہئیں ۔ اور یہ بالکل مناسب حال تھا ۔ کیونکہ قرضوں کی ایک شرط یہ بھی ہوتی ہے ۔ کہ اگر چار ماہ تک ادا نہ کیا گیا ۔ تو سود ۲۵ فیصدی شرح سے لیا جائے گا ۔"

۲۷ جنوری ۔ کوٹ عیسی خاں سے موگا (۱۰ میل)

ساہوکار کا نظریہ

اس سوال پر کہ آیا ساہوکار کھلیان میں سے غلہ لے جاتا ہے ۔ (جیسا کہ وہ صوبے کے جنوب مغربی حصے میں کرتا ہے) جب مباحثہ کرنے سے گڑبڑ پیدا ہو گئی ۔ تو ایک غصہ ور معمر شخص نے

کہا "خاموش ہو جاؤ۔ جھگڑا مت کرو"۔ چونکہ کوٹ عیسیٰ خان ساہوکاروں کا حصار ہے اور یہ لفظ شاید اسکی دیواروں کی تشریح کرتا ہے) میں نے اس موقع کو غنیمت جان کر ان کے نظریے سے آگاہ ہونا چاہا۔ اور ان میں سے بہت سے آدمیوں کو قیام گاہ میں آنے کی دعوت دی)۔ وہ فوراً چلے آئے۔ اور زمینداروں کی ایک بڑی تعداد کی موجودگی نے کارروائی کو پُر جوش اور سخت بنا دیا۔ سب زمین پر بیٹھ گئے۔ ساہوکار سب سے آگے۔ بعض کی داڑھیاں چھوٹی اور کھچڑی ہوئی تھیں۔ اور دوسرے بغیر مونڈی ہوئی ٹھوڑیاں لئے بیٹھے تھے۔ بعض کے چہروں پر سالہا سال کے حساب کتاب نے جھریاں ڈال دی تھیں۔ اور دوسروں کے رخسار ملائم اور چکنے اور آنکھیں دوراندیشانہ احتیاط لئے ہوئے تھیں۔ لیکن تمام (جو کبھی آفتاب محبت کی سرگرمی سے اثر پذیر تھے) اپنے برتاؤ اور گفتگو کے لحاظ سے خوش اخلاق تھے۔ انہوں نے کہا۔ کہ عیسیٰ خاں میں ہماری تعداد چالیس ہے۔ اکثریت کھتریوں کی ہے۔ اور کوئی کوئی اگروال بنیا یا اروڑا ہے۔ زیادہ تر نقدی کی صورت میں قرض دیتے ہیں۔ لیکن ۵ فی صدی کے علاوہ باقی تمام غلے اور مویشیوں کی شکل میں واپس لئے جاتے ہیں۔ غلہ کھلیان میں سے نہیں اٹھایا جاتا۔ بلکہ دیہاتی کے گھر سے اس قیمت پر جو اسکی مرضی سے مقرر کی جاتی ہے اس پر زمینداروں میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ اور انہوں نے کہا کہ وہ یقیناً ہمارے کھلیان میں سے غلہ لے جاتے ہیں۔ ایک ساہوکار نے پوچھا "ہم کیسے لے جا سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ مقروض کے چار یا پانچ قرضخواہ ہوں۔ اس ٹھنڈے چھینٹے سے جوش سرد پڑ گیا۔ اور ساہوکاروں نے تسلیم کیا۔ کہ اگر ضمانت لی ہوئی ہوتی ہے۔ تو غلہ کھلیان میں تول کر ضامن کے گھر لے جاتے ہیں۔ تاکہ وہ اسے ضائع ہونے سے محفوظ رکھے۔ لیکن ضمانتیں اس وقت لی جاتی ہیں۔ جبکہ کوئی سامی بُری ہوتی ہے۔ اس پر طرفین تھوڑے بہت متفق ہو گئے۔ کہ پیداوار کی قیمت ساہوکار اسی وقت حسب منشا لگاتا ہے۔ جبکہ مقروض کا حال پتلا ہوتا ہے۔

غیر مکفول قرضے کی شرح سود ۲۵ فیصدی ہے۔ اور زیورات کے عوض (فیتیں گر جانے کے وقت سے) ۱۸ فیصدی۔ جو کچھ ہم نے کل سنا تھا۔ اس کی تصدیق کرتے ہوئے ساہوکاروں نے کہا۔ کہ وہ شخص جو لین دین کا کھرا ہو ۱۲ فیصدی شرح پر قرض لے سکتا ہے۔ اس شخص کو جس کے ساتھ مقدمہ بازی نہ کرنی پڑے۔ کسی تکلیف اور نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔ اور ادائیگی مویشیوں کی صورت میں نہ کرتا ہو۔ ہم کم شرح پر قرض دیدیتے

ہیں۔ لیکن جب کوئی شخص قرضے کی بڑی رقم کے بدلے دس روپے کا مویشی آگے کرتا ہو۔ تو اسے کم شرح پر کون قرض دیگا۔ قیمتوں کے گر جانے سے روپیہ کی وصولی بہت مشکل ہو گئی ہے۔ یہی خبر سننے میں آتی ہے۔ کہ روپے میں سے عموماً صرف دو آنے وصول ہوتے ہیں۔ میں جتنے ساہوکاروں سے ملا۔ ان میں سے کسی نے بھی یہ تناسب چار آنے سے زیادہ نہیں بتایا۔ اس لئے نئے قرضوں کا امکان کم ہے۔ میرے نزدیک بیٹھے ہوئے ایک ساہوکار نے دبی زبان سے کہا۔ "اس میں ڈر بھی ہے"۔ مرکب سود جو مقروض دیہاتی کے لئے سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ صرف اس تاریخ سے وصول کیا جاتا ہے جب سے قرضے کا اجرا کرایا جاتا ہے۔ یہ عام طور پر پہلی تحریر لینے کے دو یا تین سال بعد لیا جاتا ہے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں زراعتی ترقی کی اشد ضرورت ہے۔ طویل المیعاد قرضوں سے امداد بہم پہنچانی نہایت ضروری ہے۔ ساہوکاروں نے بتایا۔ کہ ہم وقتاً فوقتاً کنوئیں لگانے کے لئے قرضہ دیتے ہیں۔ لیکن زیادہ دیر تک کبھی نہیں۔ اس لئے کہ (ایک نے سچ کہا) طویل المیعاد قرضے کیلئے رہن رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ایکٹ انتقال اراضی کی رو سے ہم صرف بیس سال کیلئے قبضہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس پر زمیندار پھر تڑپ اُٹھے۔ اور کہا کہ وہ ہم میں سے ایک کو پکڑ لیتے ہیں۔ اور زمین اس کے نام رہن رکھوا لیتے ہیں۔ یہ ایکٹ میں کاٹ چھانٹ کرنے کا طریقہ ہے۔ اس الزام کو کسی نے صاف طور پر نہ دھویا۔ جب اُنہوں نے یہ کہا۔ کہ مسلمان اور ان کے ساتھ ہی سکھ جاٹ بھی روپیہ کا لین دین کرتے ہیں تو جوش کی انتہا نہ رہی۔ یہ بات دینداروں کو سر سے پاؤں تک کاٹ گئی۔ اور وہ اس وقت ٹھنڈے پڑے۔ جب ساہوکاروں نے یہ تسلیم کیا۔ کہ یہ لین دین غلے کا ہوتا ہے۔ نہ کہ نقدی کا۔ ان امتیازات میں سے جو لکشمی اور الشنور دونوں کے پجاریوں کو عزیز ہے۔ ایک یہ ہے۔ تمام ساہوکاروں کے گوام میں زیادہ تر تین روپے من یا اس سے کچھ زیادہ قیمت پر خریدا ہوا غلہ موجود ہے۔ اور اب وہ بمشکل دو روپے من ہے۔ ایک ساہوکار اتنا معمر تھا کہ گذشتہ و موجودہ زمانوں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ میں نے پوچھا "کیا دونوں زمانوں میں کچھ زیادہ فرق ہے"؟ اس نے کہا "بہت فرق" پرانے زمانے میں مقدمہ بازی نہ تھی۔ نہ حساب کتاب تھے نہ ضمانتیں۔ اور سب لوگ امن سے رہتے تھے۔ اب متواتر جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ تاوقتیکہ کوئی شخص بھلا مانس ہو۔ لوگ اکٹھے ہو کر ہمیں مجبور کرتے ہیں۔ کہ ہم اپنے مطالبات چھوڑ دیں۔ اور دوسرے قرضداروں کو اکساتے ہیں۔

کہ وہ قرضہ ادا نہ کریں۔ بعض اوقات ہیں اپنے بچاؤ کے لئے پچاس روپے دیکر اقرار نامے میں ستر لکھنے پڑتے ہیں۔ کیتلی میں پھر ابال آنا شروع ہوا۔ لیکن جب میں نے زمینداروں سے دریافت کیا کیا تم آپس میں بھی پرانے زمانے کی نسبت لین دین کے کھرے نہیں ہو۔ تو انہوں نے فوراً اس بات کو تسلیم کر لیا۔ جو موجودہ زمانے کے متعلق سب جگہ شکایت کے طور پر کہی جاتی ہے۔ پھر ساہوکاروں کی طرف مخاطب ہو کر میں نے یہ رائے دی کہ تم ایسا کاروبار چھوڑ دو۔ جو تمہیں اس قدر مصیبت میں پھنساتا ہے۔ اور اس قدر کم منافع دیتا ہے۔ (ایک نے کہا کہ دس فیصدی) اور اپنا روپیہ انجمن امداد باہمی میں جمع کراؤ۔ جو تمہیں ۶ یا سات فی صدی سود دے گی۔ اور کوئی تکلیف نہ اُٹھانی پڑے گی۔ اور کیوں نہ تم انجمن ہی میں شامل ہو جاؤ۔

"لیکن یہ تو صرف زمیندار ہی کر سکتے ہیں"۔

"ہرگز نہیں۔ بلکہ ہر دیانتدار شخص ایسا کر سکتا ہے"۔

"ہمیں اس کی پہلے خبر نہ تھی"۔

ایک حقیقت شناس زمیندار نے بے اعتباری کا ذکر کرتے ہوئے جو تمام مشکلات کی جڑ ہے۔ یہ کہا کہ شیر اور بکری ایک جگہ کیسے پانی پی سکتے ہیں؟

میں نے جواب دیا کہ یہ مشکل ہے۔ لیکن بہت سی انجمنوں میں وہ ایسا کر رہا ہے۔ اور کسی میں اسکی حالت بُری نہیں ہے۔

پچھلے دنوں تک کسی ہندو ساہوکار کو اس بات کا احساس نہ تھا۔ کہ وہ انجمن امداد باہمی قرضہ کا ممبر بن سکتا ہے۔ درحقیقت دیہاتیوں کی انجمن کیلئے ایک ہندو ساہوکار کی دانائی روپیہ اور تجربہ سے فائدہ اُٹھانا نہایت ہی نفع بخش ہے۔ اور یہ اکثر دیکھا جاتا ہے۔ کہ جب ایک تاجر جو ساہوکار بھی ہوتا ہے۔ دیہاتی بینک میں حصہ لے لیتا ہے۔ تو وہ روپیہ قرض دینا بند کر دیتا ہے۔

اس بات پر ایک دیہاتی جسے احتیاج نے دبلا اور بے بس کر دیا تھا۔ دست بستہ نمودار ہوا۔ اور ایک ساہوکار کے خلاف مجھ سے مدد طلب کی۔ جو اس پر ایک ایسی رقم کے لئے مقدمہ کرنے کو تھا۔ جو اس نے کبھی نہ لی تھی۔ (اس نے یہی کہا) خوش قسمتی سے ساہوکار کا مزاج ایسا اچھا تھا۔ کہ اُنہوں نے معاملے پر غور کرنے (اور اگر وہ کر سکیں) اور مصالحت کی صورت پیدا کرنے کا وعدہ کر لیا۔ میرے عملے کے ایک ممبر کا بیان ہے۔ کہ پرانے زمانے میں ساہوکار

اور کاشتکار آپس میں اس طرح رہتے تھے۔ جیسے کہ ایک کنبے کے لوگ۔ لیکن اب ان میں پھوٹ ہے۔

مختلف قوانین نے جو ہندو تاجر کی سختی پر قابو پانے اور اسے محدود کرنے کیلئے منظور کئے گئے ہیں۔ اس کے دل میں ناسور پیدا کر دیا ہے۔ اور اس کا یقین ہے۔ کہ امداد باہمی سے بھی اس کے خلاف کام لیا جا رہا ہے۔ ایک وکیل نے جس سے میں جہلم کے نزدیک ملا تھا۔ اس موضوع پر نہایت تلخی سے باتیں کیں۔ اور مجھے یہ حقیقت نظر آگئی ہے کیونکہ وہ ایک بڑی جماعت کا تمثیلی فرد ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی عام بے چینی کی موجودگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ ان مشکلات کے باوجود جو قیمتوں کے گر جانے سے پیدا ہو گئی ہیں۔ ساہوکار اور دیہاتی کے تعلقات (اگرچہ خوشگوار شاذ ہی ہوتے ہیں) بہ ہیئت مجموعی تسلی بخش ہیں۔ بمقام ماکھومیں نے دغابازی کی شکائیتیں سُنی تھیں۔ لیکن وہ لوگ جنہیں پوری پوری معلومات ہیں یہ کہتے ہیں۔ کہ ساہوکار عام طور پر انصاف سے کام لیتا ہے ؛

سیرت اور مالی حالت

تحصیل موگا میں سے جس میں ہم نے آج قدم رکھا ہے۔ ساہوکار درحقیقت بھگا دیئے گئے ہیں۔ دریائی علاقے کے مسلمانوں کی نسبت سکھ جاٹ جن کی یہاں اکثریت ہے۔ زیادہ مضبوط کسان ہیں۔ اور انہوں نے جالندھر و ہوشیار پور کی طرح اور بہت کچھ انہی نتائج کے ساتھ اپنی روزی سمندر پار تلاش کی ہے۔ اور بڑی بڑی رقمیں لیکر واپس آئے ہیں۔ جن کا زیادہ حصہ ساہوکار پر لگایا گیا ہے۔ دولت کی وہ فراوانی ہوئی کہ شرح سود ۱۸ سے گر کر ۱۲ فیصدی رہ گئی۔ اور اکثر قرضے غالباً ۵ء۷ فیصدی نقدی کی صورت میں ادا کئے گئے۔ لیکن قیمتوں کے گرنے اور قرضوں کی ادائیگی سرد پڑ جانے سے ان سب کا تختہ اُلٹ گیا ہے۔ اور آج سکھوں کے ایک گاؤں میں ہمیں یہ بتایا گیا۔ کہ سود کی شرح بڑھ گئی ہے۔ اور زیورات کے عوض قرض لینے پر ۱۸۔ اور بغیر ضمانت کے ادھار لینے پر ۲۵ فیصدی ہو گئی ہے۔ اُن لوگوں کے لئے جو لین دین کے کھرے ہیں۔ شرح سود کہیں کم ہے۔ میں نے پوچھا۔ کھرا ہونے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟

اُنہوں نے کہا۔ کہ وہ لوگ جن کے پاس معقول جائیداد ہے۔ اور جن کا برتاؤ اچھا ہے۔ بات خود بخود ہی بینک قائم کرنے کے اس اصول سے جا ٹکرائی۔ کہ روپیہ اُدھار دیتے وقت پہلی بات، اور اس کے ساتھ ہی محض شخصی ضمانت کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔ ضمانت خواہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو۔ اگر قرض خواہ خود ناقابل اعتبار شخص ہے۔ تو مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے۔ اور ایسی مصیبت میں سے ہر صراف (بینکر) دامن بچانے کی خواہش کرے گا۔

گاؤں میں جب کبھی کم شرح کا ذکر کیا جاتا ہے۔ تو اسکی وجہ تقریباً ہمیشہ یہی بتائی جاتی ہے۔ کہ بر وقت ادائیگی پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ اور جہاں کہیں ایسی صورت ہے شرح سود معقول ہے۔ ایک جاٹ نے جو تیس سال سائڑا رہ آیا تھا۔ یہ کہا۔ وہاں چونکہ لوگ ماہ بماہ قرضے ادا کرتے ہیں۔ اس لئے ۱۲ فیصدی شرح پر قرض لیتے ہیں۔ اور ایک اور نے ہمیں بتایا کہ میں نے اسی شرح سے مبلغ پانچ سو روپے اس شرط پر قرض لئے۔ کہ میں عند الطلب ادا کر دوں گا۔ نرخ گرنے سے پہلے اس تحصیل میں (جالندھر کی طرح) قرضہ ۹ یا ۱۰ فیصدی شرح پر قرض لیا جا سکتا تھا۔ بہترین شہروں میں شرح اب بھی بالکل کم نہیں ہے۔ اس لئے وہ دیہاتی جو دیانتداری اور سمجھ سے روپیہ کا لین دین کرتا ہے۔ اتنی ہی کم شرح پر قرض لے سکتا ہے جتنی کہ شہروں کے معمولی تاجر۔ شہر اور گاؤں دونوں میں جہاں زیادہ تر روپیہ کا لین دین ہوتا ہے۔ رواج کی نسبت خطرے کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ نقدی کی وہ رقم جو بطور قرضہ بہم پہنچ سکتی ہے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ جیسا ہم نے ابھی ابھی دیکھا ہے۔ کسان کے لئے کم سے کم شرح ۱۲ فیصدی تک بڑھ گئی ہے۔ ایسے علاقوں میں جہاں لین دین خدمت یا جنس کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ رواج کا عنصر غالب ہے۔ اور دیہاتی کے لئے ۱۲ فیصدی سے کم شرح پر قرض لینا شاذ ہی ممکن ہوتا ہے۔

رہن اور قیمتوں کا گرنا

نرخ گر جانے کا ایک اثر یہ پڑا ہے کہ رہن پر لئے ہوئے ان موجودہ قرضوں کا معاوضہ جن میں جائیداد پر قبضہ دے دیا گیا ہے۔ کم کر دیا ہے۔ ذیل کا ایک حقیقی واقعہ اسکی

تشریح کردیگا۔ چند سال گذرے کہ ایک سکھ نے ایک مالک زمین کو ۱۲۰۰ روپیہ قرض دیا۔ اور ضمانت اور سود کے بدلے میں اسے شیخوپورہ کے کسی نوآباد زمین پر قبضہ مالکانہ دیدیا۔ اس نے سنہ ۱۹۲۹ء میں زمین ایک ہزار روپیہ کے عوض اور سنہ ۱۹۳۰ء میں ۸۰۰ روپے کے عوض اجارے پر دی۔ اس سال اس نے ۵۰۰ روپے لینے کی کوشش کی۔ لیکن اسے پیداوار کا نصف بطور لگان (ٹھیکہ) لینے پر ہی اکتفا کرنی پڑی۔ اگر وہ ۵۰۰ روپے لے لیتا۔ تو اس کے سرمائے کا حاصل بجائے ۴½ فیصدی کے جو اس نے پہلے دو سال میں حاصل کیا تھا۔ ۶ اور ۴ فیصدی ہوتا۔ درحقیقت اسے تین فیصدی سے زیادہ معاوضے کی توقع نہیں ہے۔ قیمتیں گرنے سے پہلے رہن بغیر قبضہ مالکانہ سے ۹ اور بارہ فی صدی کے درمیان (عام طور پر بارہ) اور رہن معہ قبضہ مالکانہ سے ۸ سے لیکر ۹ فیصدی تک آمدنی ہو جاتی تھی۔ قیمتوں کے گرنے نے پہلی صورت پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ لیکن اس نے خود بخود ہی دوسری صورت میں معاوضہ (موجودہ رہن کردہ جائیدادوں پر) تین یا زیادہ سے زیادہ پانچ فیصدی تک کم کر دیا ہے۔ چونکہ صوبے کے زمینداروں کا نصف قرضہ اسی قسم کا ہے۔ اس لئے اس کا یہ مطلب ہے۔ کہ اگرچہ اس کا ادا کرنا دو چند مشکل ہے۔ لیکن اس وقت قرض کا زیادہ حصہ بہت کم شرح پر ہے یہاں تک تو ساہوکار اور مقروض برابر کی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ اب نقدی کی بجائے جنس کی صورت میں ادا کرنے کا فائدہ دیکھئے۔ مغربی یورپ میں رہن کی عام صورت یہ ہے۔ کہ وہ بغیر قبضہ مالکانہ کے ہوتا ہے۔ اور سود کی شرح سود مقرر ہوتی ہے۔ جو نقدی کی صورت میں ادا کی جاتی ہے۔ لیکن پنجاب میں اکثر زمینیں معہ قبضہ مالکانہ رہن رکھی جاتی ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے۔ (جہاں تک مقروض کا تعلق ہے) کہ سود جنس کی صورت میں ادا کیا جاتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے۔ کہ جب قیمتیں گر جاتی ہیں۔ تو اس کمی کا کچھ حصہ ساہوکار برداشت کرتا ہے۔

۲۸۔ اور ۲۹ جنوری۔ موگا

ایک مکمل مشن سکول

وہ تربیت گاہ جسے امریکن پریسبیٹرین مشن (عیسائیوں کا ایک فرقہ ہے) نے

مسٹر ایس۔ ای۔ ہاربر کی کوشش پیدا کرنے والی ہدایات کے زیر اثر چلا رکھا ہے۔ اتنی ہی دلچسپی رکھتی ہے جتنی کہ ہسپتال۔ اس کا مقصد یہ ہے۔ کہ نوجوانوں کو مشن کے دیہاتی سکولوں میں جدید طریقوں کے مطابق تعلیم دینے کی تربیت دی جائے۔ ان میں سے ایک طریقہ پروجیکٹ میتھڈ ہے۔ ہر ایک جماعت ایک ایسا موضوع منتخب کر لیتی ہے۔ جس کے بذریعہ تصاویر جغرافیہ۔ تاریخ۔ اور سائنس وغیرہ اُن علوم کی توضیح ہو سکتی ہو۔ جو انہیں دورانِ سال میں سکھائے جائیں گے۔ اس مضمون کو پھر ٹھوس شکل دی جاتی ہے پھر جماعت کی عقل پر زور ڈالا جاتا ہے۔ تاکہ وہ اس میں زیادہ سے زیادہ تنوع پیدا کرے۔ اور بیش از بیش معلومات بہم پہنچائے۔ سب سے زیادہ اہم مضامین کا انتخاب ہے۔ اور اس کے لئے کم از کم ایک ہفتہ موقع اور بچار اور بحث میں صرف ہو جاتا ہے۔ اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے طلبا کو اپنے آپ پر انحصار رکھنا پڑتا ہے۔ اور کبھی کبھی دقت پیش آنے پر استاد رہنمائی کرتا ہے۔ ایک جماعت نے اپنا موضوع تجارت انتخاب کیا تھا۔ اور احاطے کے ایک گوشہ میں ہندوستان کا ایک نمونہ بنایا ہوا تھا۔ ایک چھوٹا سا تالاب کھود کر بحر ہند دکھایا گیا تھا۔ کیچڑ کے اٹھارہ انچ اونچے ستون سے نما تودے بڑے بڑے شہروں اور بندرگاہوں کو ظاہر کرتے تھے۔ اور ان پر روئی اور گیہوں جیسی مناسب اشیائے تجارت جو زیادہ تر باہر بھیجی جاتی ہیں۔ رکھی ہوئی تھیں۔ دوسری جماعت نے چمڑا رنگنے کا کام منتخب کیا تھا۔ اور بیل گاڑیوں اور اونٹوں پر چمڑا اور کھالیں لانے سے لیکر کراچی سے برآمد کرنے تک کے تمام خاص مدارج سوگارے سے بنا کر دکھایا ہوا تھا۔ اور کراچی کی بندرگاہ ایک بارہ فٹ لمبی ریلوے لائن کے سرے پر بنائی ہوئی تھی۔ اس طرح سے نئی باتیں معلوم کرنے کا وہ فطرتی مادہ جو بہت سے بچوں میں پایا جاتا ہے۔ سکول سے دب جانے کی بجائے اُبھرتا ہے۔ اور تعلیم مشقت کی بجائے فرحت بن جاتی ہے۔ یہی عملی طریقہ حساب اور پڑھنا سکھانے کے لئے کام میں لایا جاتا ہے۔ حساب سیکھنے کے لئے لڑکے ایک چھوٹی دکان چلاتے ہیں۔ اور جو چیز خریدی یا فروخت کی جاتی ہے۔ اس کا نہایت احتیاط سے حساب رکھا جاتا ہے۔ پڑھنا سکھانے میں حروف سے پہلے الفاظ کی پہچان کرائی جاتی ہے۔ اور الفاظ سے پہلے مرکبات سکھائے جاتے ہیں۔ ایک مشہور کہانی دلچسپی جس سے بچے آشنا ہوتے ہیں) سنائی جاتی ہے۔ اور دہرائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ آسان مرکبات

اس وقت تک بار بار لکھے جاتے ہیں جب تک کہ ان کی تصویر ذہن میں نہیں کھچ جاتی۔ پھر لڑکے سے پوچھا جاتا ہے۔ آیا وہ کسی لفظ کی پہچان کر سکتا ہے۔ اور جب وہ ایسا کر لیتا ہے۔ تو یہ دیکھتے ہیں۔ کہ وہ اسے اور کہیں بھی پہچان سکتا ہے یا نہیں۔ اور یہی طریقہ جاری رہتا ہے۔ یہ بات دعوے سے کہی جاتی ہے۔ کہ اس طرح بچہ بجائے دو سال کے پڑھنا سیکھنے کے ایک سال میں سیکھ لیتا ہے۔ مانا کہ یہ اعلیٰ معیار تعلیم اور تربیت کا نتیجہ ہے۔ لیکن خیال یہ ہے کہ عام حالات میں بھی صرف اٹھارہ ماہ درکار ہوتے ہیں۔ سکول کے طریق کار میں یہ بات خصوصیت رکھتی ہے۔ کہ اس کمرے میں جہاں سب سے ادنیٰ جماعت کام کر رہی تھی۔ ایک سادہ کھدائی کیا ہوا لکڑی کا بستہ تھا۔ جس کو وہاں اس لئے رکھا گیا تھا۔ کہ بچوں میں خوبصورتی کا احساس پیدا ہو۔ اور وہ اسے ایسی چیزوں کیلئے استعمال کرتے تھے۔ جنہیں خود بناتے تھے۔ اور خوبصورت سمجھتے تھے۔ سامنے کی گرد روکنے کیلئے ایک پردے کی ضرورت تھی۔ اس لئے دو سکول کے لڑکے پردے کے تختے پر لگے ہوئے تھے۔ ایک آرے سے کام کر رہا تھا۔ اور اسے وہ اپنے پاؤں کے پنجے سے اس کی جگہ پر تھامے ہوئے تھا۔

ماہرین تعلیم کے لئے یہ امر غور طلب ہے۔ کہ آیا اس قدر عمدہ طریق کار بڑے دیہاتی رقبے کے لئے اختیار کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ سب سے پہلی دقت اساتذہ کی ہے۔ کیونکہ اگر تعلیم کو خوشگوار بنانا ہے۔ تو طریق تعلیم کا ایک فن ہونا ضروری ہے۔ اور ہم میں سے بہت کم لوگ ماہرین فن ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ سکول کی زیادہ تر کامیابی اس کی بنا ڈالنے والوں اور اب راہنمائی کرنے والوں کی شخصیت کی وجہ سے ہے۔ اسے ایک اور فوقیت بھی حاصل ہے۔ اور وہ یہ کہ تمام طلبا عیسائی ہیں۔ جس کا یہ مطلب ہے۔ کہ وہ کاریگروں یا گاؤں کے کمیوں میں سے ہیں۔ اور اپنے ہاتھ ہلانے کے عادی ہیں۔

لڑکیوں کا ایک ہائی سکول

کا ایک اوسط درجے کا اہم تعلیمی مرکز ہے۔ اور اس امر پر روشنی ڈالتا ہے۔ کہ سکھ جاٹ اپنے لڑکے اور لڑکیوں کو تعلیم دینے کا کس قدر شوق رکھتے ہیں۔ البتہ لڑکوں کو اس میں سے زیادہ حصہ ملتا ہے۔ اور ۷۰۰ لڑکیوں کے مقابلہ میں دو ہزار لڑکے سکولوں میں پڑھتے ہیں۔ مجھے یقین نہیں کہ پنجاب میں کوئی چھوٹا قصبہ اتنی لڑکیوں کو تعلیم دیتا ہو۔ ان میں سے

اکثر لڑکیاں کو ... ٹ گرلز ہائی سکول میں ہیں ۔ اور وہ خوش قسمت ہیں کہ انہیں اتنی اچھی بڑی استانی دمیدڑ مس ... لیس ، مل ہوئی ہے وہ ایک چھوٹی پتلی سی عورت ہے ۔ اور لمبی نازک انگلیاں لئے ہوئے ہے ۔ وہ ایک سکھ جاٹ کی لڑکی ہے ۔ جو فوجی ملازمت کے زمانے میں عیسائی بن گیا تھا ۔ اس کے دس سال بعد اس کی ماں نے جو بالکل ناخواندہ لیکن اچھے خصائل کی عورت ہے ۔ اس کی تقلید کی ۔ مس ایس نے چار سال ہوئے سکول جاری کیا تھا ۔ اور اب اس میں ۰۰ ۱۴ لڑکیاں پڑھتی ہیں ۔ جن میں سے ۰۰ ا بورڈنگ ہاؤس میں رہتی ہیں ۔ اور اکثر زمینداروں کی لڑکیاں ہیں ۔ اس نے کہا کہ اب تک بجائے اس کے کہ سکول گھر پر اثر ڈالے ۔ گھر نے سکول پر اثر ڈالا ہے ۔ لیکن بتدریج (بعض اوقات مخالفت کے تیروں میں) یہ عمل پلٹا کھا رہا ہے ۔ ایک سال وہاں رہنے کے بعد اس نے سوچا کہ اب بیڈمنٹن ، نٹ بال اور رسی کود جیسے کھیل شروع کرنے کا وقت آگیا ہے ۔ چنانچہ اس نے شروع کر دیئے ، اس پر بہت سے متفکر والدین اس کے دروازے پر آئے ۔ اور ان میں سے ایک اکھڑ بوڑھا جاٹ تھا ۔ جس نے یہ شکایت کی کہ میری لڑکی تمام دن گاؤں میں رسی پر کودتی پھرتی رہتی ہے ۔ اور اپنے بزرگوں کا نام رسوا کرتی ہے ۔ دیر تک جرح ہوتی رہی آخر کار اس نے کہا کہ یہاں وہ صرف سکول کی چار دیواری کے اندر کودتی ہیں ۔ جہاں انہیں کوئی نہیں دیکھ سکتا اور اگر میں ۰۰ ۱۴ لڑکیوں کو قابو میں رکھ سکتی ہوں ۔ تو تم ایک کو کیوں نہیں رکھ سکتے ؟ یہ صورت حالات ایسی تھی کہ گویا ایک جاٹ دوسرے جاٹ سے ملاقی ہوا تھا ۔ اور بوڑھا آدمی شکست کھا کر لیکن ہنستا ہوا واپس چلا گیا ۔ چند ماہ گذرے اس نے لڑکیوں کو قواعد کرانی شروع کی تھی ۔ لیکن اب کے کسی نے اس کے خلاف آواز بلند نہ کی تھی ۔ قدامت پر پڑی ہوئی گرد آہستہ آہستہ صاف کی جا رہی ہے (قدیم رواج آہستہ آہستہ مٹ رہے ہیں) اس نے اس سے بھی ایک نئی بات پیدا کی ہے ۔ پہلے پہل لڑکیاں اسقدر کم تھیں ۔ کہ گھر کا کام کاج نوکروں کے سر پر چھوڑا ہوا تھا ۔ لیکن اب جبکہ سکول بڑھ گیا ہے ۔ لڑکیاں کھانے کے بعد میز صاف کرنے ۔ برتن اور رکابیاں دھونے اور کمروں کی گرد جھاڑنے کے لئے مجبور کی جاتی ہیں ۔ اور اب وہ اسے اپنا معمول سمجھ کر کرتی ہیں ۔ یہ بات دیکھنے کی ہے کہ وہ لڑکیاں جو تعلیمیافتہ گھروں سے آتی ہیں ۔ اسے دوسروں کی نسبت زیادہ توجہ سے کرنے لگ جاتی ہیں ۔ کچھ اسلئے بھی کہ وہ اس کے فوائد کو جلد سمجھ جاتی ہیں ۔ وہ کاڑھنے اور کشیدے کے کام کو بھی دوسروں کی

نسبت زیادہ شوق سے کرتی ہیں۔ اور یہ کام ایک ایسے ملک میں جہاں خوش قسمتی سے کپڑے ابھی تک گھر بیٹھے جاتے ہیں۔ دو چند اہمیت رکھتا ہے۔ گورنمنٹ کے سالانہ معائنہ کے وقت ہر ایک لڑکی کو گھر کا سلا ہوا کپڑا دکھانا ہوتا ہے۔ اور یہ دکھانے کیلئے کہ یہ سکول میں بنایا گیا ہے۔ اس کا بنا ہونا ضروری ہے۔ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ اس میں کافی تمیز ہے۔ لیکن بعض لوگ اتنے غریب ہیں۔ کہ سالانہ معائنہ کے ختم ہونے تک انتظار نہیں کر سکتے۔ اور اپنے بنائے ہوئے کپڑے کو پہن لیتے ہیں۔ اور حال ہی میں میں نے سنا ہے۔ کہ ان میں سے بعض کو ایسے کپڑے لانے کی اجازت نہ دی گئی تھی۔ جو انہوں نے اپنے لئے بنائے تھے۔ کیونکہ وہ انہوں نے پہنے ہوئے تھے۔ مس ایس نے بتایا کہ جو کپڑے تیار کئے جاتے ہیں۔ وہ بہ ہیئت مجموعی ایسے ہوتے ہیں۔ جو دیہاتی ضروریات کے لئے موزوں ہوں۔ اگرچہ جورابیں گاؤں میں شاذ ہی پہنے میں آتی ہیں۔ لیکن پھر بھی لڑکیاں انہیں بننا سیکھتی ہیں۔ اور پھلکاری نہیں بناتیں۔ کیونکہ انہیں دیر بہت لگتی ہے۔ کیا خواندہ دیہاتیوں میں اور کیا ناخواندہ میں سرخ اور عنبریں حاشیہ والی پھلکاری کی قسمت پر مہر لگ چکی ہے۔

ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں۔ کہ سکول کے لڑکے کو گھر پر بہت پیار سے رکھا جاتا ہے۔ یہی صورت لڑکی کی بھی ہے۔ اسے بھی کھیت کے کام اور خانگی امور سے سبکدوش کر دیا جاتا ہے۔ اور اکثر اس کا خمیازہ ناخواندہ بہن کو اٹھانا پڑتا ہے۔ اور وقت آنے پر وہ اپنے آپ کو الگ تھلگ تصور کرنے لگتی ہے۔ اس کے برعکس تعلیم یافتہ لڑکی کے لئے گاؤں میں رہنا وقت طلب ہے۔ کیونکہ اس کیلئے ایک ایسے گھر میں جہاں ناخواندہ بزرگوں کی حکومت ہے نئی تہذیب پھیلانے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ مس ایس نے نئی اور پرانی تہذیب کی ایک ٹکر کے متعلق ایک دل خوش کن واقعہ سنایا۔ ایک بار جب وہ ایک گاؤں کو دیکھ رہی تھی۔ تو وہ اپنے ایک قدیم ہم جماعت سے ملی۔ جو وہاں بطور مدرس کام کر رہا تھا۔ قدرتی طور پر اس نے اس سے ہاتھ ملایا۔ اور دیکھنے والوں نے اس پر سر ہلائے۔

پردہ

سکول کا اثر ایک صورت میں صحیح راستے پر معلوم نہیں ہوتا۔ اگرچہ اس میں بڑی استانی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ چند بارسوخ لوگوں کو اطمینان دلانے کے لئے سکول کو پردے کی شرائط کے

ماتحت چلانا پڑتا ہے۔ لیکن دیہات کی اکثر لڑکیوں کو یہ بھی پتہ نہیں ہوتا۔ کہ پردے کا مطلب کیا ہے۔ اور اس طرح خوف آمیز اور خفیہ پردے کی ذہنیت در حقیقت اُن ذرائع سے پھیل رہی ہے۔ جن کو اسے روکنے کیلئے استعمال کرنا چاہیئے۔ صوبے کے شمال اور مغرب میں اس کا اثر اور بھی تاسف خیز ہے۔ کیونکہ وہاں سیدوں اور سرداروں کے گھروں سے باہر پردہ آدھا بھی مشکل سے قائم ہے۔ اور جہاں کہیں یہ ہے بھی جیسا کہ مشرق اور جنوب میں تو اس سے زیادہ نہیں ہے۔ کہ اپنے سے اعلیٰ مرتبے والے بڑی عمر والے اور اجنبی کی موجودگی میں چہرہ کو چھپا لیا جائے۔

عورتوں کے متعلق سکھوں کا رویہ

وسطی پنجاب میں سکھ عورتیں مرتبے کے لحاظ سے دوسروں سے بڑھ کر ہیں مسلمانوں میں عورتیں مسجد میں نہیں جاتیں۔ لیکن سکھ بیوی اپنے خاوند کے ساتھ گوردوارہ جاتی ہے۔ اور وہاں عورتیں اور مرد پہلو بہ پہلو عبادت کرتے ہیں۔ عام طور پر آسارپور کے عیسائیوں کی طرح وہ علیحدہ بیٹھتی ہیں لیکن وہ اکثر اکٹھے بھی بیٹھتے ہیں۔ اور ایاسنا اور برارتھنا میں عورتیں اکثر راہنمائی کرتی ہیں۔ بعض اوقات ان کو پانچ پیاروں کی جماعت میں جگہ دی جاتی ہے۔ جو رسوم سجاتے وقت گوردوارہ کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ گوردوارہ سے باہر بھی اکثر لوگوں کی نسبت ان میں تفاوت کم دیکھا جاتا ہے۔ اور لڑکی اور لڑکے کے ساتھ سلوک کرنے میں کوئی تمیز نہیں کی جاتی۔ اور اگر ایک بھائی اور بہن میں زمین تقسیم کرنے ہوں تو بہن یقیناً برابر لیگی۔ اور بہت ممکن ہے دو لے لے۔ ایک معمولی نیم تعلیمیافتہ دیہاتی کے گھر میں اگر اُسے ڈبر ڈھ مل جائے۔ تو وہ خوش قسمت ہوگی۔ دلہن کی قیمت جو ہم سکھ جاٹوں میں عام طور پر لی جاتی ہے۔ سکھ دیہاتیوں کے اس رویے پر جو وہ عورتوں کی طرف رکھتے ہیں۔ ایک بڑا داغ ہے۔ لیکن تاجرانہ خیال کے لوگوں میں بھی عمل یہ نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ کہ ہر شخص اپنی لڑکی کا خیال رکھنے کیلئے مجبور ہوتا ہے۔

یہ بات صرف سکھوں میں ہی پائی جاتی ہے۔ کہ وہ اپنی بیٹی کو تعلیم دینے کا بھی اتنا ہی شوق رکھتے ہیں۔ جتنا کہ بیٹے کو۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ گرنتھ صاحب پڑھ سکے۔ اور دوسرے یہ کہ کفایت شعار بیوی بنے۔

ایک بڈھا سکھ سردار جو ستر برس کا ہے۔ بیان کرتا ہے کہ تعلیم نے سکھ عورتوں کو زیادہ آزاد اور سمجھدار بنا دیا ہے۔ اور اب پچاس فی صدی عورتیں قریب قریب اپنے خاوندوں کے بہلو بہ پہلو ہیں۔ اس کے متعلق ایک اور ادھیڑ عمر سکھ یہ کہتا ہے کہ جب میں دفتر سے آتا ہوں۔ تو جہاں میری بیوی میرے پاؤں پڑتی ہے۔ (جیسا کہ میری ماں میرے باپ کے پاؤں پڑتی ہے) وہاں میری بہو میرے بیٹے کے پاؤں نہیں پڑتی۔ میری ماں اپنے خاوند سے پہلے ہرگز کھانا نہ کھائیگی۔ خواہ اسے کتنا ہی انتظار کیوں نہ کھینچنا پڑے۔ اور میری اپنی بیوی بھی سوائے اس صورت کے کہ مجھے بہت زیادہ دیر ہو جائے۔ لیکن میرے بیٹے کی بیوی بعض اوقات اس کا بالکل انتظار نہیں کرتی۔ زیادہ آزادی سے قدرتی طور پر ضبط میں ضعف پہنچا ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہ اس کی ماں گھر کے تمام کام مثلاً دودھ دوہنا۔ روٹی پکانا اور کاتنا وغیرہ کیا کرتی تھی۔ اور اسکی بیوی بھی بھی کچھ کرتی ہے۔ لیکن اس کے بیٹے کی بیوی ایسے ناملائم کاموں سے کنارہ کشی کرتی ہے اور اپنے آپ کو چھوٹے چھوٹے کاموں یا سوئی کے نفیس کام میں مشغول رکھتی ہے۔ بوڑھے سردار کے قول کے مطابق سب سے بڑی تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ زیادہ صفائی پیدا ہو گئی ہے۔ اور اب ۷۵ فیصدی لوگ اپنے آپ کو صاف ستھرا رکھتے ہیں۔ جبکہ اسکی جوانی کے ایام میں ایسے لوگ صرف ۵ فی صدی تھے۔ ان دونوں سرداروں کا خیال ہے۔ (چھوٹا اچھا منصف ہے) کہ گاؤں سکھوں کی دس فیصدی سے زیادہ شادیاں یقینی طور پر غیر موزوں ہوتی ہیں۔ اور نصف سے زیادہ شاید ۶۰ فیصدی کافی حد تک باعث مسرت ہوتی ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال تھا۔ کہ شہر میں بھی حالات تسلی بخش نہیں ہیں اور اب پہلے کی طرح فحش گیت بہت کم گائے جاتے ہیں۔

ساہوکار عورتیں

سکھ جاٹوں میں یہ خصوصیت ہے کہ ان کی عورتیں اکثر روپیہ کا لین دین کرتی ہیں۔ اٹاری میں ایسی عورتیں پچاس سے زیادہ ہیں۔ (ان میں سے چھ یا سات جٹیاں ہیں) اور سیل کے گردونواح میں ایسی عورتیں چھدری چھدری پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے اکثر بالکل معمولی لین دین کرتی ہیں۔ لیکن امداد باہمی کے ایک ممبر نے مجھے بتایا کہ میری والدہ نے

اسی سے نہایت عمدہ جائیداد پیدا کر لی ہے۔ اس نے یہ کام اس وقت شروع کیا جب اسے یہ معلوم ہوا کہ ۱۰۰۰ ... کارہ شرابی سے بیاہ دی گئی ہے۔ بھاگنہ کلاں میں جو دو صورتیں پیش کی گئی تھیں۔ ان میں بھی بہت کچھ یہی وجہ بیان کی گئی تھی۔ کوئی حساب کتاب نہیں رکھا جاتا۔ اور نہ ہی اسکی ضرورت ہے۔ کیونکہ قرضے تقریباً ہمیشہ زیورات کے عوض دیئے جاتے ہیں۔ صرف اتنا کیا جاتا ہے۔ کہ زیورات کے ساتھ ایک پرچہ باندھ دیا جاتا ہے اور قرضہ بے باق کرنے کی تاریخ مقرر کر دی جاتی ہے۔ شرح سود وہی ہے۔ جو آدمی لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۸¾ فیصدی مکفول قرضوں کیلئے اور ۲۵ فیصدی غیر مکفول کیلئے۔

زیورات

جنگ عظیم کے بعد سے سکھ عورت کی زندگی میں ایک نمایاں تغیر رونما ہوا ہے۔ وہ پہلے کی نسبت بہت کم زیورات پہنتی ہے۔ میرے عملے کے ایک ممبر نے ٹھیٹھ مادری زبان میں کہا۔ کہ اب لوگ زیورات کا بائیکاٹ کرتے ہیں۔ دس سال گذرے۔ دھرم دوست اکالیوں نے زیورات اور شراب کے خلاف مورچہ لگایا۔ اور یہ ان کی تحریک کا بہترین پہلو تھا۔ جسے اس ضلع میں خاص قوت حاصل تھی۔ امداد باہمی کی تحریک نے بھی زیورات کو سودی بیمہ میں بدلنے کی طرف حوصلہ افزائی کی اور کینی سکھوں نے اس کے مفاد کو بہت جلد سمجھ لیا۔ اب قیمت کے گر جانے سے ایک متوسط الحال کیلئے نئے زیورات کا مجموعہ بہم پہنچانا حقیقی طور پر ناممکن ہو گیا ہے۔ ایک سکھ جاگیردار نے اسی کے متعلق ذکر کرتے ہوئے تازگی بخش راستی سے یہ سنایا۔ کہ جب میری دادی جان کا انتقال ہوا۔ تو ایک ثالث کو بلایا گیا تاکہ وہ زیورات وارثوں میں بانٹ دے اور زیورات اتنے تھے۔ (نصف لاکھ سے زیادہ قیمت کے) کہ اس میں سے کچھ میں نے خود لئے اور باقی سب کو کچھ نہ کچھ ضرور ملا۔ لیکن اب یہ سب حالات بدل گئے ہیں۔ اپنے آپ کو خشمیں بنانے میں لوگوں نے اپنے آپ کو غریب بنا لیا ہے۔ یہاں تک کہ سرداروں کے پاس بھی بہت کم نقدی ہے۔

شراب خواری

جاگیردار نے شراب خوری کے متعلق بھی اسی راستبازی سے کام لیا۔ اور یہی وجہ

ہے جس نے سکھوں پر - جن کا مذہب تمباکو کے استعمال کی اجازت نہیں دیتا، گہرا اثر ڈال کر انہیں کمزور بنا دیا ہے - اس نے کہا کہ میں شراب پیا کرتا تھا - اور اس قدر پیتا تھا - کہ کوئی مجھ پر کسی قسم کا اعتبار نہ کرتا تھا - میرے مزارع مجھ سے رسیدیں طلب کیا کرتے تھے - اور میں اپنے والد کا روپیہ چپ چاپ لے لیا کرتا تھا - پھر میں ایک کمیٹی کا ممبر بن گیا - (اس نے ایک مشہور نیم مذہبی جماعت کا نام لیا) اور سب یہ معلوم کر سکتے تھے - کہ میں کس قدر شراب پیتا تھا - جب میں نے یہ بات دیکھی تو حضور کی مہربانی سے (اس نے سلام کرتے ہوئے ہاتھ اٹھایا) اور واہگورو کی کرپا سے میں نے اس سے نجات حاصل کر لی - اب مجھ پر سب اعتبار کرتے ہیں اور مجھے رسیدیں نہیں دینی پڑتیں - اور مجھے گاؤں میں لڑکیوں کے سکول کا منیجر منتخب کیا گیا ہے - یہاں اس کے والد نے بات کاٹ دی - اور چال چلن کی تبدیلی کی ایک دوسری اور شاید زیادہ معقول دلیل دی - اس نے کہا کہ میں اس سے بہت ناخوش تھا - اور میں نے اسے کہدیا تھا - کہ اگر تم نے اسے نہ چھوڑا تو میں تمہیں گھر سے باہر نکال دوں گا - اور اپنی تمام زمین دوسرے بیٹے کیلئے چھوڑ جاؤنگا " بیٹے کی دلفریب صاف بیانی مجھے اس بات پر لے آئی - کہ میں نے مذہب سے متعلق گفتگو شروع کر دی - اور اُن پانچ ککوں کے متعلق سوال پوچھا - جن کا پہننا ہر پکے سکھ کے لئے ضروری ہے - اس نے کہا کہ ان سب کا کچھ مطلب ہے - یہ کڑے (اور اس نے اپنی کلائی کے پتلے فولادی کڑے والی کی طرف اشارہ کیا) میرے ہاتھوں کو باندھتے ہیں تاکہ وہ چوری نہ کر سکیں - اور جو کچھ میں نیچے پہنے ہوئے ہوں (اس نے سیاہ کچھیرا کی طرف اشارہ کیا) میرے دل میں کسی قسم کی شرارت پیدا ہونے کی صورت میں قفل کا کام دیتی ہے -

افیون کھانا

اس میں کوئی شک نہیں کہ سکھ اب اتنی قیمت کی شراب نہیں پیتا - جتنی کہ جنگ عظیم سے پہلے پیتا تھا - اس عزت کے مستحق اکالی ہیں - اگرچہ نہایت ہی معمولی وجہ قیمتیں گرنے کے بعد روپیہ کی کمی بھی ہے - یہی بات افیون کے استعمال پر صادق آتی ہے - جیسے ستلج کے جنوب میں سکھ عام طور پر کھاتے ہیں - لیکن یہ عجیب بات ہے - کہ جو لوگ شمال کی طرف رہتے ہیں - وہ نہیں کھاتے - ایک افسر کا جو فیروزپور سے

خوب واقف ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ تیس سال سے زیادہ عمر کے لوگوں میں سے ۲۰ فیصدی اور پچاس سال سے زیادہ عمر والوں میں سے ۷۰ سے ۸۰ فیصدی تک اور ان میں سے نصف عادتاً افیون کھاتے ہیں۔

حصار میں بھی (راجپوتانہ سے متاثر ہو کر) ہندو راجپوت اس کے عادی ہیں۔ بعض اوقات ان کے بچوں کو پہلے پہل اس کا ایک ذرہ ان کی ماں کے دودھ میں گھول کر ان کی چھاتیوں سے دودھ پینا سکھایا جاتا ہے۔ افیون پانی یا چائے کے ساتھ کھائی جاتی ہے۔ اور اگرچہ اسے کبھی حقہ میں رکھ کر نہیں پیا جاتا۔ لیکن یہ ان لوگوں کو بہت نقصان پہنچاتی ہے جو اس کے عادی ہوتے ہیں۔ اور انہیں عام طور پر ان کے پچکے ہوئے چہروں۔ بے نور آنکھوں۔ بے ربط حرکات اور نیند لانے والی آوازوں سے پہچانا جا سکتا ہے۔ گذشتہ دورے میں مجھے انبالہ میں بتایا گیا کہ باوجود اس کے کہ تمباکو ان کے لئے پاپ ہے۔ سکھوں میں نسوار مقبول ہوتی جا رہی ہے۔ یہی بات میں یہاں سنتا ہوں۔ چائے کی عادت بھی جلد جلد پیدا ہو رہی ہے۔ اور اب شہر میں تو لگی ہوئی میدے کی تین یا چار انچ مربع روٹیاں تھوڑی تعداد میں بازاروں میں دیکھی جاتی ہیں۔ وہ ایک ایک پیسے ملتی ہیں۔ اور صبح یا سہ پہر کی چائے کے ساتھ کھائی جاتی ہیں۔ انہیں بغیر خمیر والی چپاتیوں پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ زیادہ آسانی سے ہضم ہو جاتی ہیں۔ اور بنی بنائی مل جاتی ہیں۔

باب ہفتم (۷)

فیروزپور (بہ سلسلۂ سابق)

دیہات سُدھار۔ دیہاتی بینک اور منڈیاں

۳۰ جنوری۔ موگا سے باگاپورانہ (۱۱ میل)

اس تحصیل کا نہایت ہی دلچسپ پہلو یہ ہے۔ کہ سب ڈویژنل افسر صاحب دیہات سدھار کیلئے منظم کوشش کر رہے ہیں۔ وہ ایک ہندوستانی افسر ہیں۔ جنہیں اس آزمائش کی ابتدا پہلے افسر سے میراث میں ملی ہے۔ عام طریق کار اور مقاصد میں یہ لائحہ عمل اس سے ملتا جلتا ہے۔ جو مسٹر برین نے جہلم میں اختیار کر رکھا ہے۔ رفاہِ عام کا کام کرنے والے تمام محکموں کے نمائندوں کو یکجا کرنے اور ان سے اپنے کام میں امداد لینے کے لئے ایک مرکزی انجمن ہے۔ اور اس کے ماتحت چھ آنریری انسپکٹر ہیں۔ جن کے متعلق یہ خیال ہے کہ وہ گوڑگاؤں کے نمونے پر دیہاتی رہناؤں کا کام کرتے ہیں۔ چھ میں سے دو اچھے ہیں ایک بُرا۔ اور تین بین بین ہیں۔ سب ڈویژنل افسر خود بھی ... کچھ پند و نصائح سے کام لیتے ہیں۔ اور جہلم کی طرح یہاں بھی ایک رسالہ ہے۔ جو اس نیت سے جاری کیا ہوا ہے کہ وہ اپنا خرچ آپ اٹھائے۔ لیکن درحقیقت وہ چھ سو روپیہ کے خسارے میں ہے۔ اب جبکہ اس آزمائش کو چار سال ہو چکے ہیں۔ کھاد کے ایک سو ستر گڑھے کھودے جا چکے ہیں۔ اسی ترقی یافتہ ہل اور دو ہزار چارہ کاٹنے کی مشینیں فروخت کی گئی ہیں۔ اور سولہ گاؤں میں ۵۰۰۰ فٹ لمبی نالیاں تعمیر کی گئی ہیں۔ کہیں کہیں لوگوں کو بھی اس بات پر رضامند کیا گیا ہے۔ کہ وہ گاؤں کے اندر اُپلوں کے انبار لگانے چھوڑ دیں۔ لیکن بعض گاؤں میں باہر موزوں جگہ نہ ملنے کی وجہ سے یہ عمل اب بھی جاری ہے۔ اگر مشترکہ زمین نہ ہو۔ یا کسی شخص کی گاؤں کے نزدیک اپنی زمین نہ ہو۔ تو صرف یہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ کرایہ

پر یا اجارے پر دی جائے۔ لیکن ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ جو اس کیلئے تیار ہوں یا ایسا کر سکتے ہوں۔ بیشمار [illegible] انتظامات کئے گئے تھے۔ لیکن جب انہیں عملی جامہ پہنانے کا موقع آیا۔ تو وہ پس پشت ڈال دیئے گئے۔ مسٹر برین کی طرح سب ڈویژنل افسر بھی یہ ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ لوگوں کو آشکارا طور پر یہ بتا دیا جائے۔ کہ گورنمنٹ انہیں غربت و جہالت کی تاریکی سے باہر نکلنے میں امداد دینے کے لئے کچھ نہ کچھ کر رہی ہے۔ اور اس سے اس لائحہ عمل کا یہ پہلو کہ مثلاً موسم گرما کی سیاسی تحریک کے وقت خاص طور پر قابل قدر پایا۔ مسٹر برین کی طرح ان کا بھی یہ دعویٰ ہے۔ کہ اس طرح کے کام کا نتیجہ دیہاتی کو مصروف رکھنے اور اس کی توجہ کو مقدمہ بازی اور لڑائی جھگڑوں سے منعطف کرنے میں مدد دیتے ہیں اس کے طریقے مسٹر برین کے طریقوں سے صرف ایک خاص فرق رکھتے ہیں۔ اس مفید اصول کے مطابق کہ متعلقہ لوگوں کو ہر چیز کی قیمت خود ادا کرنی چاہیئے۔ اور دوسروں کی خیرات پر نگاہ نہ رکھنی چاہیئے۔ عمل کرنے کی وجہ سے کوئی روپیہ نہیں جمع کیا جاتا۔ اگر یہ صورت ممکن ہے۔ تو یہ اس سکیم کی بڑی خوبی ہے۔ کیونکہ جہلم اور گوڑگاؤں کے حالات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ کہ ایسی تجاویز کیلئے جن سے دوسروں کو فائدہ پہنچتا ہے بہت کم لوگ یہ چاہتے ہیں۔ کہ ان کی جیبوں پر ہاتھ ڈالا جائے۔

دیہات کو ترقی دینے کی تجاویز صدر مقامات اور دیہات میں اس قدر مختلف نظر آتی ہیں۔ کہ آج مجھے یہ معلوم کرنے میں کچھ دقت محسوس ہوئی۔ کہ ان پر کس طرح عمل کیا جا رہا تھا۔ جس گاؤں میں حسب معمول بنک کا معائنہ کرنے کے لئے ٹھہرا وہ ان گاؤں میں سے تھا۔ جہاں اس سکیم کا عمل جاری تھا۔ لیکن باوجود اس کے کہ میں نے اسے اچھی طرح سے دیکھا۔ مجھے کوئی چیز ایسی نہ ملی جس سے کسی تبدیلی کے آثار پائے جاتے۔ اور لوگ صاف طور پر یہ کہتے تھے۔ کہ ہم پرانے طریقے پر کام کرتے ہیں۔

دو سال گذرے۔ ایک بار تحصیلدار آیا تھا۔ اور اس نے ہمیں گلیاں صاف کرنے اور گوبر کوڑا گاؤں سے ۱۰۰ گز پرے پھینکنے کا حکم دیا تھا۔ اس وقت ہم رضامند ہو گئے تھے۔ لیکن اس کے بعد کوئی نہ آیا۔ اور ہم نے کچھ نہ کیا۔ اور اب ہم چیزیں جہاں چاہتے ہیں۔ پھینک دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ناکامیابی بلاشبہ آنریری انسپکٹر کی غفلت کی وجہ سے تھی۔ جو دو اچھے انسپکٹروں میں سے نہ تھا۔

ہم سوار چلتے رہے۔ اور سکھوں کے ایک گاؤں میں پہنچے۔ بدقسمتی سے لوگوں کو ہمارے آنے کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ اور ہر چیز ٹھیک ٹھاک اور صاف ستھری تھی ایک جاٹ نے کھاد کا گڑھا کھودا ہوا تھا۔ اس نے تسلیم کیا کہ یہ میں نے حکماً کھودا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ کہا کہ بلاشبہ یہ ایک اچھی چیز ہے۔

پھر میں نے اپنے چاروں طرف بیٹھے ہوئے داڑھی والے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ دوسروں نے بھی کھودے ہیں"۔

انہوں نے کہا "کسی نے نہیں کھودے ہیں۔ ہماری زمین گاؤں سے بہت دور ہے۔ اور گاؤں کے نزدیک زمین نہیں مل سکتی"۔

"لیکن تم میں سے ان لوگوں نے جن کی زمین گاؤں کے نزدیک ہے یقیناً کھودے ہونگے؟"

"نہیں"۔

"پھر کیا تم انہیں برا سمجھتے ہو؟"

"نہیں۔ ہم انہیں اچھا خیال کرتے ہیں"۔

"پھر تم نے انہیں کھودا کیوں نہیں؟"

"یہ ہماری سستی ہے"۔ یہی بات کوہستانِ نمک والوں نے کہی تھی۔ اور اگر کسی کو ایسی دھوپ میں رہنا پڑے۔ جو سال میں سات مہینے سائے میں ۹۰ سے ۱۱۵ تک ٹمپریچر بڑھا دیتی ہے۔ تو وہ اس کے سوا اور کہے گا بھی کیا؟

ایک صاف ستھرا گاؤں

سب سے آخر میں ہم باگا پلانہ آئے۔ اس کی آبادی تینیس ہزار ہے۔ اور پنجاب کے ہر قسم کے ان تمام گاؤں سے جو میں نے پنجاب میں دیکھے ہیں صفائی کے لحاظ سے یہ دوسرا گاؤں ہے۔ اس نے دو بار صفائی کے لئے انعام پایا ہے۔ اور امید کی جاتی ہے کہ اگلے مہینے کے مقابلے میں ضلع بھر میں سب سے زیادہ صاف گاؤں کا انعام تیسری مرتبہ اسے ملیگا۔ اس لئے یہ بہترین حالت میں ہے۔ اگرچہ یہ ہو سکتا ہے۔ کہ گلیاں ہمارے آنے کی وجہ سے صاف کی گئی ہوں۔ لیکن گھروں کی صورت میں ایسا نہیں

ہو سکتا۔ ان کی کیچڑ سے لپٹی ہوئی دیواریں غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی روشنی میں
منعکس نظر آتی تھیں۔ ان میں سے بعض اتنی خوبصورت تھیں۔ کہ جدید عمارتیں اور کوٹھیاں
ان کے سامنے ہیچ نظر آتی تھیں۔ وہ عمارت خاص طور پر خوبصورت تھی۔ جس میں سوفٹ
لمبی ڈیوڑھی تھی۔ اور جس میں محراب دار راستے بنے ہوئے تھے۔ اور اینٹوں کے
ستون مرکزی ستونوں کی طرح کھڑے اونچی چھت کو سہارا دے رہے تھے۔ مالوہ
کے جاٹ گول محرابوں کے دلدادہ ہیں۔ اور ان کے گھر صوبے بھر میں سب سے عمدہ ہیں
تمام گھر جو میں نے دیکھے صاف تھے۔ لیکن اندرونی کمروں میں حسب معمول اندھیرا گھپ
تھا۔ یہاں تک کہ اس گھر میں بھی یہی حال تھا۔ جہاں نادر خوشحالی کا اس قدر زیادہ ثبوت
دیا تھا۔ کہ باورچی خانہ اور انگیٹھی تک بنوائی ہوئی تھی۔ لباس فاخرہ سے گھر کی رانی جب
شام کی خنکی دور کرنے کیلئے آگ پر جھکی۔ تو اس نے کہا "انگیٹھی سے بہت آرام ہے"
اس گاؤں میں ادھر ادھر پھرنے سے راحت محسوس ہوتی تھی۔ اور اسکی صفائی میں قریب
قریب باغ کی سی جھلک تھی۔ اور یہ نہایت سستے داموں خریدی گئی تھی۔ گلیوں کی صفائی
کے لئے تین بھنگیوں کو فی کس ایک روپیہ دیا جاتا ہے۔ اور گھروں کے متعلق یہ ہے۔ کہ
لوگ خود بھی سست نہیں ہیں۔

مذہبی تعلیم

جیسا کہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے۔ لڑکوں کے لئے سکول ہوتا ہے۔ لیکن لڑکیوں کیلئے
نہیں۔ تاہم ۱۴ والدین نے حوصلہ کر کے اپنی لڑکیوں کو لڑکوں کے سکول میں بھیج دیا ہے۔
(سب سے بڑی دس برس کی ہے) ان میں ایک ہیڈ ماسٹر، ایک سب انسپکٹر پولیس
اور ایک برہمن شامل ہے۔ دوسروں نے ان کی تقلید نہیں کی ہے۔ کیونکہ لوگوں کو
انتظام کے متعلق بہت تشویش ہے۔ اگر لڑکیاں مذہبی تعلیم حاصل کر سکیں۔ تو ان کی دنیاوی
تعلیم کی کمی کوئی اہمیت نہ رکھتی۔ لیکن وہ فرقہ جو یہ تعلیم دیتا ہے۔ صرف عیسائیوں کا ایک
گروہ ہے۔ جس میں سے اکثر پنچ نسل سے ہیں۔ ان کے ایک ہندوستانی پادری ہے
جو انجیل کو پڑھ اور سمجھ سکتا ہے۔ مسلمانوں اور سکھوں کی عبادت گاہیں بہت ہیں۔
چار مسجدیں اور تین گوردوارے۔ لیکن ایک ملا یا گرنتھی بھی ایسا نہیں ہے۔ جو اپنی مذہبی

کتاب کی تفسیر کر سکے۔ گر نفیوں میں سے اندھا ہے۔ اور ایک گاؤں میں جو ہم نے آج دیکھا۔ تین ملاؤں میں سے ایک کی یہی حالت تھی۔ روحانی طور پر تینوں کے تینوں اندھے تھے۔ کیونکہ ان میں سے کوئی بھی اردو نہ جانتا تھا۔ اور عربی اس سے بھی کم جانتے تھے۔ وہ چند لڑکوں کو طوطے کی طرح عربی پڑھاتے ہیں۔ اور چند سال گذرے جب ملا ایک معمر شخص تھا۔ چند لڑکیاں بھی پڑھتی تھیں۔ سوائے ان بارہ لڑکیوں کے جو مذکرہ بالا سکول میں جاتی ہیں۔ گاؤں کی باقی لڑکیوں کو کسی قسم کی تعلیم نہیں دی جاتی۔ اور گاؤں اتنا ہی بڑا ہے جتنا کہ باگا پورانہ۔ لڑکوں کیلئے ایک سکول ہے۔ لیکن سوائے ان لڑکوں کے جن کا مسجد یا گوردوارے میں جانا مشتبہ ہے۔ مذہبی تعلیم نہیں بھی نہیں دی جاتی۔ یہی بات میں نے اپنے گذشتہ دورے میں پائی تھی۔ اور یہ بات پنجاب میں خصوصیت سے دیکھی جاتی ہے۔ اور غالباً تمام ہندوستان میں اگر میں اس کا دوبارہ ذکر کر رہا ہوں تو اسکی وجہ یہ ہے۔ کہ مجھے پختہ یقین ہے۔ جیسے یورپ کے تجربے نے اور بھی راسخ کر دیا ہے کہ جب تک کسان پورا تعلیم یافتہ نہ ہو۔ اسکی زندگی کو نئی یا پرانی تہذیب سے محلا کرنے کیلئے رہنمائی اور مذہبی تعلیم کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ تعلیم ایسے لوگوں کو دینی چاہیئے۔ جو مذہب کی حقیقت کو پہچانتے ہوں۔ اور اس کے ساتھ ہی مذہبی کتابوں کو بھی سمجھتے ہوں۔

اس سال آج پہلی مرتبہ میں نے چنڈول کو اس گندے میدان میں وجد آفرین نغمے گاتے ہوئے سنا۔ گھوڑے پر بیٹھے ہوئے ہر کوئی ایسی آوازیں سنتا ہے ؛

۳۱ جنوری۔ باگا پورانہ سے کوٹ کپورا (۱۸ میل)

دیہاتی بینک

میں اکثر دنوں میں ہر روز ایک یا دو بینکوں کا معائنہ کرتا ہوں۔ لیکن ہر روز یہ لکھنے بیٹھنا کہ کوئی بنک کس قسم کا ہے۔ باعث زحمت ہوگا۔ اس لئے میں صرف اسی پر قناعت کرونگا کہ ان لوگوں کیلئے کہ جو پہلی ہی مرتبہ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ کہ زراعتی انجمن ہائے امداد باہمی کفایت شعاری و قرضہ دیہات میں کس طرح کام کرتی ہیں۔ اس کے صرف چند خاص خاص پہلوؤں پر روشنی ڈالوں گا۔ مثلاً کل کے دیکھے ہوئے دیہات میں سے ایک میں کسی وقت چار بینک تھے۔ لیکن اب صرف ایک ہے۔ ایک زمینداروں کی انجمن اور دو

بھنگیوں کی دسکھوں اور عیسائیوں کی) ناکامیاب رہی تھیں - اور دو سال گذرے جو
کو بھی ... رپورٹ میں مایوس کن لکھا گیا تھا - ان کے اس طرح بیٹھ جانے
وجوہات یہ تھیں - کہ ایک تو ابتدا میں اچھے آدمی نہ ملے تھے - اور دوسرے یہ کہ
نے دو سال تک غفلت سے کام لیا تھا - بہت کم دیہاتی انجمنیں ایسی ہیں جو
ابتدا میں ... سرپرستی کی ضرورت نہ ہو - چوتھا بینک اس طرح بچایا گیا - کہ اچھے
لوگوں کو اس میں حصہ لینے کی ترغیب دی گئی - اور ممبروں کو وہ تعلیم دی گئی - جو انہیں
ہی میں دینی چاہیئے تھی - انجمن کا اجرا کرنے وقت ممبروں کے انتخاب میں بہت زیادہ
احتیاط سے کام لینا مشکل ہے - شہد بنانے والی شہد کی مکھیاں ہوتی ہیں - نہ کہ وہ مکھیا
جو اس کی طرف بیکتی ہیں - اور انہی کی ضرورت ہوتی ہے - ہر ایک ممبر کو اس کی انجمن کے
قوانین اور امداد باہمی کے بنیادی اصول خوب ذہن نشین کرانے چاہئیں - یہ بات کتنی
سہل معلوم ہوتی ہے - لیکن اکثر گاؤں میں ہر ایک شہد کی مکھی کے بدلے دس عام مکھیاں
ہیں - اور ہر خواندہ کے مقابلے میں دس ان پڑھ ہیں - تمام تعلیم زبانی دی جاتی ہے - اور
بار دہرا کر ذہن نشین کی جاتی ہے - ۱۹۳۰ء میں ہمارے ۶۰۰۰ دیہاتی بینکوں کے ممبر
میں سے صرف ۱۳ فیصدی ممبر لکھ پڑھ سکتے تھے - اور تحصیل زیرہ میں جس میں سے ہم ا
گذر کر آئے ہیں - ۹۷ فیصدی ان پڑھ ہیں -

ان سے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے - وہ ذیل کی عبارت میں لکھا جاتا ہے - دریائے ست
کے نزدیک ہم اراعیوں کی ایک انجمن کا معائنہ کر رہے تھے - ۱۶ حاضرین میں سے سو
چھ کے باقی سب ان پڑھ تھے - زیادہ سے زیادہ سمجھدار شخص سیکرٹری تھا - لیکن ا
اپنی سمجھ اپنے رشتہ دار کے لئے ۰۰ ۱۰۰ روپیہ قرض حاصل کرنے میں . . . . (جو اس کی
قرضہ سے زیادہ تھا) استعمال کی تھی - اور تمسک پر دو فرضی گواہوں کے انگوٹھوں کے
نشان تھے - ایک مہینہ گذرا - جبکہ انتظامیہ کمیٹی نے انسپکٹر سے یہ وعدہ کیا - کہ قر
وصول کر لیا جائیگا - لیکن کیا کچھ نہیں - صاف ظاہر ہے - کہ یہ ایک ایسا معاملہ تھا - جو
نئے سیکرٹری کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے تھا - لیکن چونکہ پرانا سیکرٹری موجود تھا - اُ
نکال کر کوئی اپنے سر دشمنی نہ لینا چاہتا تھا - کیونکہ وہ اپنی تعلیم اور سمجھ کی وجہ سے نہ
قوی تھا - معاملہ بہت نازک تھا - اور اس سے پہلے کہ کمیٹی کسی کارروائی کے لئے

ہو۔ بہت کچھ دلجمعی سے کام لیا گیا۔ اس کا انجام یہ ہؤا کہ مصالحت ہو گئی۔ اور قرض کی ادائیگی تک اس عہدے پر کام کرنے کیلئے ایک نیا سیکرٹری مقرر کیا گیا۔

دیہاتی بنیک میں ذمہ داری غیر محدود ہوتی ہے۔ اس لئے ممبروں کو اس کے نتایج سے محفوظ رکھنے کیلئے ہر ایک قرضے کیلئے ایک یا دو ضامن ضروری ہیں۔ ایک نام بنیک میں بھلے بُرے ہیں جلد تمیز کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ دیکھا جائے۔ کہ آیا قرضدار یہ جانتا ہے۔ کہ اس کے ضامن کون ہیں اور آیا ضامن اپنے فرائض کا احساس رکھتے ہیں۔ کل ہی ایک بنیک کے ممبروں نے یہ اطلاع دی کہ گذشتہ دنوں تک ہماری انجمن اے کلاس رہی تھی۔ اب حضور کی مہربانی سے پھر ویسی ہی ہو جائیگی۔ یہ خبر پاتے ہی میں نے اسی طریق سے آزمایش کی اور دیکھا کہ ایک ممبر کو جس نے ایک مہینہ ہؤا قرضہ لیا تھا۔ اپنے قرضے کی رقم تک یاد نہ تھی۔ اور نہ ہی یہ پتا تھا۔ کہ ضامن کون تھے؟ کمیٹی کا ایک ممبر اسے نجات دلانے کیلئے آگے بڑھا۔ اور کہا کہ ان میں سے ایک میں تھا۔ لیکن تمسک کسی اور کا پتہ دیتا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ کہ میرا مطلب اس سے پہلے قرضے سے ہے۔ لیکن تمسک نے اسے پھر غلط ثابت کر دیا۔ جس پر تمام لوگ ہنسے اور وہ کھسیانا سا ہو گیا۔

بنیک کی روح رواں اور بے لوث انتظامیہ کمیٹی ہے . . . .

. . . . اس سے بغیر تنخواہ کے خدمت لی جاتی ہے۔ اور یہ امر شہد بنانے والی مکھی کی نسبت شہد سے رغبت رکھنے والی مکھی کیلئے زیادہ باعث کشش ہے۔ شاہ پور میں ہم ایک خزانچی سے ملے۔ جس نے ۴۵۰۰ روپیہ قرض لیا ہؤا تھا۔ اور اس ضلع میں ایک شخص ایسا ہے۔ جس نے ۳۰,۰۰۰ روپیہ لیا ہؤا ہے۔ اس قسم کے بڑے قرضے تباہی لاتے ہیں۔ اور صرف اسی صورت میں وصول کئے جاتے ہیں جبکہ ان کے لئے لا انتہا دقتیں اٹھائی جائیں۔ دوسری عام خرابی یہ ہے کہ اجلاس دیر کے بعد کئے جاتے ہیں۔ اور ان میں حاضری بہت کم ہوتی ہے۔ بھلوال کے ایک رہن رکھنے والے بنیک میں بائیس ڈائرکٹروں میں سے چھ نے گذشتہ ۹ اجلاس میں سے صرف ایک نے شرکت کی تھی لیکن خوش قسمتی سے بنیک کا صدر ایک لائق شخص ہے۔ اور اگرچہ ۵۰,۰۰۰ روپیہ قرضے میں گیا ہؤا ہے۔ لیکن ایک بھی نادہند نہیں ہے۔ اچھے بنیکوں میں کمیٹیاں اکثر اجلاس کرتی ہیں۔ ایک انجمن نے جو ہم نے کوہستان نمک میں دیکھی تھی۔ بارہ مہینے میں ۵۵ اجلاس

کئے تھے ۔

اس دورے میں کوہستان نمک کی انجمنیں ہی صرف ایسی دیکھی ہیں جنہیں قیمتوں کے گر جانے نے قرضوں کی رقمیں کم سے کم کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محکمہ فوج اُن کی پُشت پر رہے۔ اور تنخواہوں اور پنشنوں کی وجہ سے قرض کا لین دین جاری رہتا ہے لیکن ہر وہ چیز جو باقاعدہ طور پر روپیہ کھینچتی ہے یہی کام دے سکتی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ ایک گاؤں میں چھ بینک تھے۔ ان میں سے پانچ میں دھندہ بند ہو گیا تھا۔ لیکن چھٹے میں کاروبار جاری تھا۔ کیونکہ اس کے ممبر جو دراصل کاشتکار تھے۔ اپنا خالی وقت کپڑا بننے میں صرف کرتے تھے۔ مسٹر گاندھی اس بات پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ کہ ہندوستانی دیہاتی کو کسی ایسی صنعت کی اشد ضرورت ہے۔ جس سے اسکی آمدنی اور مصروفیت دونوں میں اضافہ ہو۔ اور اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے وہ کتائی کی سفارش کرتے ہیں جہاں تک بارانی علاقوں کا تعلق ہے (جہاں کاشتکاری لازمی طور پر خطرناک ہے۔ اور فرصت بہت ملتی ہے) اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ وہ درست کہتے ہیں۔ اور پیش نظر معاملے کی یہی صورت ہے۔ یہ گاؤں سراسر بارش پر انحصار رکھتا ہے۔ اور پانچ بینکوں کے ممبر کاشتکاری کے علاوہ اور کوئی کام نہ کرنے کی بنا پر خشک سالی کی وجہ سے بیکار تھے۔ لیکن چھٹے بینک میں انہوں نے پھر کپڑا بننے کا کام اختیار کر لیا تھا۔

آسان قرضے اور اُن کے خطرات

دیہاتی بینک میں خطرہ یہ ہوتا ہے۔ کہ ممبر قرض لینے میں سہولتیں پیدا کرلینے میں جب ہم اس معاملے کے متعلق نو آبادی کی ایک منڈی میں بحث کر رہے تھے۔ تو ایک غلّے کے سوداگر نے کہا۔ کہ بینک سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ ہر کوئی جتنا روپیہ لے سکتا ہے اتنا ہی خرچ کر دیگا۔ وہ دس یا بیس کوئی فرق نہیں دیکھتا۔ اور تمام روپیہ برباد کر دیتا ہے۔ جتنا کہ میں نے اور کہیں بتایا ہے۔ اس الزام کی تہ میں سچائی ہے۔ اور چند سال گذرے۔ جب ایک دوسرے ضلع میں دیہاتی بینکوں کو بغیر امداد باہمی کے عملے کی مزاحمت کے ایک خاص حد تک قرضہ لینے کی اجازت دیکر اس تجربے کی آزمائش کی گئی تھی۔ تو اس کے نتائج تباہ کن تھے۔ اکثر انجمنوں نے فوراً ہی پوری حد تک قرضہ

لے لیا۔ اور جب ادائیگی کا وقت آیا۔ تو ایسا نہ کر سکنے کی وجہ سے جھوٹ موٹ ادائیگی کر دی اس کے اثرات نے اب تک گاؤں پر بوجھ ڈال رکھا ہے۔ اور روپیہ کا لین دین کرنے کی ا۔ب۔ ف نئے سر سے سکھانی پڑتی ہے۔ خوش قسمتی سے ہمارے ممبروں میں سے (خاص طور پر وسطی پنجاب میں) ایسے ہیں۔ جنہوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے۔ کہ کسان کا روپیہ سے ڈرنا اس میں عقل پیدا ہونے کی ابتدا ہے۔ اور قیمتوں کے اچانک گرنے نے (جس نے گذشتہ خوشحالی کو بے بنیاد خیالی عمارت کی طرح نیست و نابود کر دیا ہے) یہ سبق انہیں مجبوراً پڑھا دیا ہے۔ لیکن ۵۰۰۰۰ ممبروں میں سے اب بھی بہت سے ایسے ہیں۔ جو اپنی انجمن کو محض دودھ دینے والی گائے خیال کرتے ہیں۔ اور جب وہ یہ دیکھتے ہیں۔ کہ انجمن میں ان کی ساکھ لوٹ چکی ہے۔ تو وہ ساہوکار کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی آخری حالت پہلی کی نسبت بدترین ہوتی ہے۔ اور فی الحال یہ ناممکن ہے۔ (سوائے اس کے کہ متواتر تعلیم دی جائے) کہ انہیں اُن کے ہاتھوں سے محفوظ رکھا جا سکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کے انسداد کی محض یہ صورت ہے کہ ساہوکار کو ایک ایسے کواپریٹر کے خلاف مقدمہ دائر کرنیکی اجازت نہ دی جائے۔ جس نے بینک میں حصہ لینے کے بعد اس سے قرض لیا ہو۔

دوسرا اور زیادہ دھوکہ دینے والا خطرہ یہ ہے۔ کہ ممکن ہے وہ لوگ جو مقروض نہیں ہیں بینک میں حصہ لیکر قرض لینا شروع کر دیں۔ اگر وہ نفع بخش کاموں کے لئے قرض لیتے ہیں۔ اور ادائیگی کے متعلق محتاط ہیں۔ تو اس میں کوئی نقصان نہیں ہے۔ لیکن فضول خرچ اور ناتجربہ کار کیلئے قرض لینے میں سراسر (خطرناک) پھندے ہیں۔ سکھوں کا وہ بینک جو ہم نے موگا کے نزدیک دیکھا۔ اسی واقعہ کی ایک مثال ہے۔ جب اس انجمن کا اجرا کیا گیا تھا۔ صرف ایک یا دو ممبر مقروض تھے۔ لیکن اب سوائے ایک کے باقی سب نے زمین کا لگان اور آبیانہ ادا کرنے کے لئے قرض لیا ہے۔

بعض اوقات یہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے۔ کہ ایک گاؤں میں بینک ہے۔ اور قریب ہی دوسرے میں کیوں نہیں۔ گذشتہ مہینے میں دو سکھوں کے گاؤں میں پہنچا۔ جو ایک دوسرے سے ایک میل کے فاصلے پر تھے۔ ایک میں پچاس ممبروں کا ایک بہت بڑا کامیاب بینک تھا۔ اور دوسرے میں کوئی نہ تھا۔ آخر الذکر گاؤں والوں نے بتایا۔

کہ ہم ساہوکار سے لین دین کرنے کو بینک پر ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ جب ہمارے پاس اُسے دینے کیلئے کچھ نہیں ہوتا۔ تو وہ ہم پر دباؤ نہیں ڈالتا۔ جب کہ بینک اپنے ممبروں کی قرقی کرا لیتا ہے۔ ص ن ۱۲ فیصدی سادہ سود لینے کی وجہ سے انجمن مجبور ہوتی ہے۔ کہ ایسے لوگوں کے خلاف قدم بڑھائے۔ جو باوجود استطاعت کے قرض ادا نہیں کرتے۔ اور اکثر انجمنوں میں قدم سختی کی طرف نہیں اُٹھایا جاتا۔ بلکہ نرمی برتی جاتی ہے۔ ساہوکار ذرا آرام پسند ہے۔ اور اپنی سامی کو ستانے سے پہلے اکثر دو تین سال تک انتظار کر لیتا ہے یہ بات قدرتی طور پر دیہاتی کے لئے موزوں ہے۔ اور یہ بڑی وجہ ہے۔ کہ وہ قرض ادا کرنے میں کیوں اس قدر سست ہے؟ ان میں جو دانشمند ہیں۔ وہ اس بات کو سمجھتے ہیں۔ سارد ھی میں (کوہستانِ نمک کا ایک گاؤں) جب ہم اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ گاؤں میں بینک ہونا چاہیئے یا نہیں۔ اور میں نے یہ بتایا۔ کہ اس کا یہ مطلب ہوگا۔ کہ قرض بجائے ہر تین سال بعد ادا کرنے کے ہر ششماہی ادا کیا جائے۔ تو ایک بوڑھے سپاہی نے کہا "یہ ہمارے لئے اچھا ہے۔ اس صورت میں جو کچھ ہم کو ادا کرنا ہوتا ہے بڑھتا نہیں ہے"۔ ایسا مناسب اور غیر متوقع جواب سُنکر میں نے پوچھا۔ کہ تم نے پہلے سے کیوں بینک جاری نہیں کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ کسی نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ کس طرح جاری کیا جائے۔ لیکن ہم نے دوسرے گاؤں والوں سے سُنا ہے کہ یہ اچھی چیز ہے۔ اور اس سے بہت فائدہ پہنچتا ہے۔

باوجود بہت سی ناکامیوں اور بیشمار نقائص کے اس کے متعلق کوئی شبہ نہیں کر سکتا اس دورے میں اور گذشتہ دورے میں مجھے یہ بار بار بتایا گیا ہے۔ لیکن یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اس سے کیا مطلب لیا جاتا ہے۔ ایک ہی مثال کافی ہوگی۔ ایک ایسے علاقے میں جہاں امداد باہمی نے دیر سے پاؤں جمائے ہوئے تھے۔ ایک بینکنگ یونین کے اجلاس میں میں نے سو حاضرین سے جن میں بہت سے دیہاتی بینکوں کے صدر شامل تھے یہ دریافت کیا کہ تمہیں امداد باہمی نے کیا فائدہ پہنچایا ہے؟ سب نے مل کر ان آدمیوں میں سے ایک نمایندہ مقرر کیا۔ جو فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اور اس کا جواب جس کی اُنہوں نے تصدیق کی یہ تھا۔ کہ اس نے ہمارے سرمائے میں اضافہ کیا ہے۔ ہمارے قرضے کم کر دیئے ہیں۔ اور ہمارا آپس کا سلوک بڑھا دیا ہے۔ نیز اب روپیہ ضائع نہیں کیا جاتا"۔ بلاشبہ ایسی

ٹھوس فائدہ ہے۔ اور ممکن طور پر تعلیم کو مستثنیٰ کرنے کے بعد یہ چاروں فائدے ایسے ہیں جنکی اس وقت ہندوستانی دیہاتی کو سخت ضرورت ہے۔ کیا گورنمنٹ کو یہ نہیں چاہیئے کہ جہاں تک اس کے ذرائع اجازت دیتے ہوں امداد باہمی کی کامل حد تک مدد کرے اور اگر ضروری ہو تو اس غرض کیلئے قرضہ بھی اٹھائے۔

زمین کا لگان

زمین کا لگان اور آبیانہ ادا کرنے کے لئے قرض لینا جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا، موجودہ زمانے کی نحوست کی نشانی ہے۔ اب موسم سرما کی قسط جمع کی جا رہی ہے۔ اس ضلع میں اور اس سے پہلے ضلع میں تحقیقات کرنے سے یہ ظاہر ہوا ہے۔ کہ اسکی ادائیگی کے لئے عام طور پر قرض لیا جا رہا ہے۔ امرتسر میں ایک تحصیلدار نے بتایا کہ تمام رقم کا صرف دس فی صدی قرض لیکر ادا کیا گیا ہے۔ لیکن میرے انسپکٹروں میں سے ایک جو لوگوں سے اچھی طرح واقف ہے۔ یہ کہتا ہے کہ یہ رقم پچاس فی صدی ہے۔ موگا کے ایک مال افسر کا اندازہ ہے کہ تحصیل کے نصف لوگوں نے قرض اٹھایا ہے۔ اور انجمن امداد باہمی کے مقامی عملے کا بیان بھی یہی ہے امرتسر میں ایک تحصیلدار نے ادائیگی میں سہولت پیدا کرنے کے لئے ساہوکاروں کو یہ ترغیب دی کہ وہ اپنی تھیلیوں کے منہ جو قیمتیں گر جانے کی وجہ سے بند کئے ہوئے تھے۔ کھولدیں۔ اور انہوں نے یہ خیر خواہی کرنے کی وجہ سے بیس فی صدی سود لیا۔ بلاشبہ قرض لینے والے کی ساکھ کے ساتھ ساتھ سود کی شرح میں کافی اختلاف ہے۔ ماکھو میں ایک زمیندار نے مجھے بتایا کہ پانچ روپے کے قرض کے بدلے میں نے جون میں دس روپے دینے کا وعدہ کیا ہے۔ ایک اور نے کہا۔ کہ میں نے بائیس روپے قرض لئے۔ لیکن بیس روپے نقد اس شرط پر ملے۔ کہ اگر میں نے چھ مہینے میں بائیس روپے دیدیئے تو میری طرف کچھ نہ باقی رہیگا۔ ورنہ مجھے قرض لینے کی تاریخ سے ادائیگی کے دن تک ۲۵ فیصدی شرح سے سود دینا پڑے گا۔ یعنی یہ کہ اگر رقم ۶ ماہ میں ادا کی گئی۔ تو سود ۲۰ فیصدی ہوگا۔ (جو پہلے ادا کیا گیا ہے) ورنہ وہ ۲۵ فیصدی ہوگا۔ اور پہلے چھ ماہ کا بیس فی صدی سود اسکے علاوہ ہوگا۔ میں نے امرتسر میں ایک سکھوں کے گاؤں میں دیکھا کہ پچاس حاضرین میں سے موجودہ قسط ادا کرنے کیلئے سولہ آدمیوں نے زیورات گروی رکھے تھے۔ اور تیئیس نے

فروخت کر دیئے تھے۔ میں نے پوچھا کہ سب نے کیوں نہ فروخت کر دیئے؟ ایک افسر نے بتایا کہ "عزت کا معاملہ ہے۔ انہیں امید ہے کہ وہ اگلی فصل پر چھڑا لیں گے۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکیں گے۔ اس گاؤں میں گذشتہ موسم گرما کا لگان دینے سے انکار کرنے کی وجہ سے دس ہزار روپیہ سالانہ کے خرچ پر پولیس کی چوکی بٹھا دینے سے صورت پیچیدہ ہو گئی تھی۔ اس گاؤں میں لگان کی جس تخفیف کا گذشتہ ماہ اعلان کیا گیا ہے۔ اس سے گاؤں کے پچاس ہزار روپے بچ جائیں گے۔ اس گاؤں میں (شاہ پور والوں کے خلاف) لوگ اس بات کیلئے شکر گذار تھے۔ شمالی علاقے کی طرح یہاں بھی ہر دیہاتی کے منہ سے یہ نکلتا ہے کہ یہ تمام اقتصادی خطرے کی صورتیں کانگرسی جوش کا نتیجہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ گاندھی جی نے لوگوں کو انگریزی کپڑا خریدنے سے منع کر دیا ہے۔ اب انگلستان بھی ہماری گیہوں نہ خریدے گا۔ وہ موجودہ حالات سے یہ سادہ مگر مغالطے میں ڈالنے والا نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔

چونکہ کوئی بھی مجبوراً لگان دینا پسند نہیں کرتا۔ اس لئے محکمۂ انجمن امداد باہمی کے ایک کارکن نے اس سے بچاؤ کی ایک صورت نکالی ہے۔ اور یہ اتنی سادہ ہے۔ جتنی کہ ہو سکتی ہے۔ اس لئے صرف اتنا ضروری ہے کہ انجمن امداد باہمی ادائیگی مالگذاری کا ممبر بن جائے اور جب کبھی زمین کا لگان دینا پڑے۔ تو اس کے برابر رقم انجمن کے پاس جمع کرا دے۔ اگر حسب دستور انجمن جمع شدہ رقم پر ۷ فیصدی سود مرکب ادا کرے۔ تو ۱۲ سال میں ممبر کی جمع کردہ رقم اتنی ہو جائیگی۔ کہ اس سے اتنا سود آ جائیگا۔ کہ وہ اپنی زمین کا لگان ادا کر سکے گا۔ اس قسم کی بیشمار انجمنیں بن گئی ہیں۔ اور اُن میں سے ایک ہم نے گذشتہ ہفتہ مانن میں دیکھی تھی۔

اُونٹ

ہمارے سفر کے دوران میں آج ایک وقت ایسا آیا۔ جب کہ سڑک کی حالت یک لخت تبدیل ہونے سے یہ صاف طور پر ظاہر ہو گیا۔ کہ ہم ایک ہندوستانی ریاست میں داخل ہو رہے تھے۔ علاقہ بھی تبدیل ہونے لگا۔ سرسبز کھیتوں میں ریتلی پہاڑیاں نمودار ہونی شروع ہوئیں۔ اور کھیتوں کی مینڈھیں زیادہ شکستہ دکھائی دینے لگیں۔ اور سڑک پر ہمیں اونٹ ہی اونٹ آتے ہوئے ملے۔ ہم اونٹوں والے اُس بڑے علاقے

میں داخل ہو رہے تھے۔ جو مغرب کی طرف بغیر کسی روک ٹوک کے بلوچستان۔ ایران۔
عرب اور شمالی افریقہ کی تمام تر پہنائی میں بحر اوقیانوس تک پھیلا ہؤا ہے۔ اس وسیع علاقے
میں کوئی جانور اونٹ پر سبقت نہیں لے جا سکتا۔ گھوڑے اور بیل کے کاموں میں سے
کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس پر اُسے فائدہ مند طریق سے نہ لگایا جا سکے۔ حصار کے
ایک جاٹ نے بتایا کہ سوائے کھانا پکانے کے وہ ہمارے لئے سب کچھ کر دیگا۔ صحرا میں وہ
سوائے نہایت ہی پختہ گھوڑے سوار کے باقی سب کو پیچھے چھوڑ دیگا۔ اور اس کے متعلق
یہ لکھا گیا ہے۔ کہ اس نے انچاس گھنٹوں میں ۱۵۰ میل طے کئے ہیں۔ اور دس دن تک
بغیر کچھ پئے اور قریب قریب کچھ نہ کھائے کے سفر کیا ہے۔ اور کچھ ایسی حکومت سے جو
بڑے لوگوں کا حصہ ہے۔ وہ کاہلانہ کاموں کو بھی اس طرح بے چون وچرا انجام دیگا جس طرح
کہ نہایت دلیرانہ کاموں کو کل سے ہم جگہ بہ جگہ دیکھتے آئے ہیں۔ کہ رہٹ میں بجائے حسب دستور
بیلوں کی جوڑی سے کام لینے کے اونٹ لگایا ہے۔ اور اسے اس مقصد کیلئے بیلوں پر
ترجیح دیجاتی ہے۔ اس کا قدم زیادہ تیز پڑتا ہے۔ اور آنکھیں بند ہونے کی صورت
میں چھ چھ گھنٹے برابر چکر پر چکر لگاتا رہتا ہے۔ اور بجائے اس کے کہ بیل (اتنی دیر میں)
چار کنال زمین سیراب کریں۔ یہ پانچ یا چھ کنال کر دیگا۔ اور یہ کام کسی ہانکنے والے
کے بغیر ہی پورا کر دیگا۔ اور سوائے کبھی کبھی للکار دینے کے اور کسی طرح اُکسانیکی
ضرورت نہ پڑیگی۔ چار سال کی عمر کا ایسا جانور ۱۸۰ روپے میں خریدا جا سکتا ہے۔ ہل
میں بھی یہ خوب کام دیتا ہے۔ اگرچہ سوائے ریتلی زمینوں کے اور کہیں یہ اتنا اچھا کام
نہیں دیتا۔ جتنا کہ بیلونکی جوڑی۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ہل چلانے والے گھوڑوں کی
طرح وہ چھ یا سات قدم ہل سے آگے رہتا ہے۔ اور اس کیلئے کوئے بنانے ضروری ہیں۔
بڑی جائیدادوں کی صورت میں جو ریتلے علاقوں میں عام ہیں۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔
لیکن تھوڑی جائیداد والا بیلوں کو ترجیح دیتا ہے۔

ایک تمثیلی منڈی

کوٹ کپورہ میں میں نے منڈی کا معائینہ کیا۔ اور چونکہ یہ پانچویں منڈی ہے۔ جو اس دورے
میں دیکھنے میں آئی ہیں۔ اس لئے میں اس کے متعلق تفصیل سے بتاؤں گا۔ سن انیس سو کے

اُن ابتدائی ایام سے لیکر جب کہ فیروز پور کی خوشحالی شروع ہوئی۔ ایسے آدمیوں یا زمانے میں سے
کسی نے بھی پیمائش نہیں دی۔ اور اس کے دو منزلہ سرخ اینٹوں کے مکانات معہ اپنے
حصہ دار دوستوں کے پیا آمدوں کے ایک بڑی اور قریب قریب بغیر درختوں والی منڈی کے
چاروں طرف ایک بدصورت مربع شکل پیدا کرتے ہیں۔ پنجاب کی منڈیوں کا تقریباً ہر جگہ
بغیر درختوں کے ہونا (جبکہ چند ماہ کے لئے یہ دنیا کا سب سے زیادہ گرم علاقہ ہوتا ہے) یہ ظاہر
کرتا ہے۔ کہ انسان جب نفع کی دھن میں لگا ہوا ہوتا ہے۔ تو اپنے آرام کی کس قدر کم پرواہ کرتا
ہے۔ البتہ آج کے دن کسی انسان یا چوپائے کے لئے سائے کی ضرورت نہ تھی۔ اور تاجر
اور اونٹ دونوں دھوپ میں خوش تھے۔ ہم نے ایک کار آزمودہ دلال تلاش کر لیا۔ اور ایک اچھا
بوڑھا بنیا مل گیا۔ جو چیچک رُو مگر بڑی بڑی آنکھوں والا اور گہری نظر کا آدمی تھا۔ جب اس نے
ہمیں منڈی کا حال سنایا۔ تو اونٹ چاروں طرف سے گھر آئے۔ اور خرانٹا شروع کر دیا۔

ابتدائی ایام میں جب منڈیاں بہت کم تھیں۔ پیداوار پچاس پچاس میل سے لائی جاتی
تھی۔ لیکن اب جیسا کہ اکثر منڈیوں میں دیکھا جاتا ہے۔ چاروں طرف سے تقریباً پندرہ پندرہ میل
سے آتی ہیں۔ اور یہ اتنا فاصلہ ہے کہ ہر کوئی بیل گاڑی۔ گدھے یا اونٹ پر ایک دن آجا سکتا
ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پیداوار کا ۹۰ فیصدی حصہ کاشتکار خود منڈی میں لاتے ہیں۔ اور بہت
کچھ یہی صورت موگا میں ہے۔ جہاں ایک منڈی بھی ہے۔

اس کے باوجود منڈی کے پچپن دلالوں میں سے ایک بھی زمیندار یا کسان نہیں ہے
سوائے گیارہ کے باقی سب اگروال ہیں۔ جو جنوبی پنجاب کی بڑی بنیا قوم کا ایک فرقہ ہے۔
چونکہ منڈی میں کوئی بینک نہیں ہے اس لئے دلال کو اپنی آمدنی کے لئے ساہوکار پر اور
آخرالذکر کو فیروز پور کے بینک پر انحصار رکھنا پڑتا ہے۔ اس آمدنی کی بنیاد غلے کا گودام
ہے۔ جس میں عام طور پر ۰۰۰ ۲ من غلہ ہوتا ہے۔ قرض لینے گودام رہن رکھ دیتا ہے اور چابیاں
سپرد کر دینے پر غلہ کی قیمت کا ۷۵ یا ۸۰ فیصدی قرض دے دیا جاتا ہے۔ قیمتوں کے گرنے
سے اس سادہ طریق پر بہت دباؤ پڑتا ہے۔ کیونکہ قیمتوں کے کم ہو جانے کی وجہ سے بہت سے
قرضخواہوں کیلئے یہ ناممکن ہو گیا ہے۔ کہ وہ قرضے کی رقم اور جنس کی قیمت میں کافی گنجائش
رکھ سکیں۔ نہ ہی اکثر لوگ قیمت بڑھ جانے کی امید پر جو انہیں بھاری نقصان سے بچا دیگی
بیچنے کے لئے تیار ہوئے ہیں۔ اور قرض دینے والے اس ڈر سے کہ کہیں پرانی سامی ہاتھ سے

نکل نہ جائیں۔ فروخت کیلئے مجبور کرنے سے ڈرتے ہیں۔ اس طرح سے لگایا ہُوا روپیہ کافی ہے۔ کیونکہ تقریباً ۲,۰۰,۰۰۰ من (۷,۰۰۰ ٹن سے زیادہ) غلّہ زیادہ تر گیہوں دلّالوں کے نام پر گوداموں میں جمع ہیں۔ پاس ہی کھڑے ہوئے ایک کسان نے کہا۔ ہم جمع کرنے کی توفیق نہیں رکھتے۔ اس منڈی میں دس لاکھ من غلّہ جمع رکھنے کی گنجائش ہے۔ جب کہ موگا صرف چار لاکھ من جمع رکھ سکتا ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ مقدار کافی سے زیادہ ہے۔ اس صوبے کے مختلف حصوں میں تحقیقات کرنے سے مجھے یہ معلوم ہُوا ہے۔ کہ پنجاب میں غلّہ جمع کرنے کی سہولتیں خواہ وہ درجے کے لحاظ سے کتنی ہی ناکافی کیوں نہ ہوں۔ مقدار کے لحاظ سے کافی ہیں۔ اپنے طریق کار میں باقاعدگی پیدا کرنے اور تجارتی جھگڑوں کا تصفیہ کرنے کیلئے بعض منڈیوں میں بے ضابطہ پنچائتیں ہیں۔ ایک موگا میں ہے۔ لیکن اس میں کوئی زراعت پیشہ شخص شامل نہیں ہے حالانکہ اس کے بغیر منڈی ہی قائم نہیں رہ سکتی۔ درحقیقت کوٹ کپورہ کی طرح یہاں بھی کوئی زراعت پیشہ دلّال نہیں ہے۔ اور اگر منڈی میں کوآپریٹو کمیشن شاپ نہ ہو تو وہاں دیہاتی کا کوئی ساتھی نہ ہو۔ پنچایت میں اس کا بھی کوئی نمائندہ نہیں ہے۔ جب میں نے اس خرابی کے متعلق بتایا۔ تو بنیوں نے اپنے آپ کو یہ کہکر بچالیا۔ کہ ہم میں سے بعض کے پاس زمین ہے۔ اور اس طرح زمیندار طبقہ کے نمائندے پنچایت میں موجود ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے تمام زمینوں والے کاشتکار نہیں ہیں۔ پھر میں نے کہا کہ امداد باہمی کے مسلّم اصول کے مطابق منڈی کے بھنگیوں۔ تولنے والوں اور دوسرے ملازمین کے نمائندے اس میں شامل ہونے چاہئیں۔ اُنہوں نے اس پر یہ اعتراض کیا۔ کہ اسکی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ ہم سب آپس میں نہایت سلوک سے رہتے ہیں اور ہم میں کوئی جھگڑے کی صورت نہیں ہے۔ میں نے انہیں ان خوشگوار تعلقات کے لئے مبارک باد دی۔ لیکن یہ بھی کہا کہ ممکن ہے۔ یہ ہمیشہ قائم نہ رہیں۔ اور اگر کبھی کوئی سوال اُٹھا تو اس کا دوستانہ طریق سے فیصلہ کرنے میں بہت سہولت ہوگی۔ بشرطیکہ تمام گروہوں کے لوگ مِل جُل کر تبادلہ خیالات کرنے کے عادی ہوئے۔ اس کے بعد نہایت دل خوش کن اور دلچسپ بحث ہوئی۔ اور ایسے غیر معمولی مباحثے کو سننے کے لئے لوگوں نے چاروں طرف سے جمع ہو کر بھیڑ کر دی۔ ایک باتونی دلّال نے یہ کہا۔ کہ میں خود یہ تجویز کروں گا کہ کوآپریٹو کمیشن شاپ کی طرف سے ایک نمائندہ پنچایت کیلئے منتخب کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی ہنسی خوشی سے ہماری بحث کا خاتمہ ہو گیا۔

دکان ہائے آہڑت

اس دورے میں میں نے بہت سی دکان ہائے آہڑت کا معائنہ کیا ہے۔ چونکہ میں نے گذشتہ دورے میں ان کے متعلق کچھ بیان نہیں کیا۔ اس لئے یہ ضروری ہے۔ کہ یہ انہیں یہاں ایک یادداشت صفحات میں لکھا جائے۔ یہ دکانیں پنجاب کے چھوٹے یا درمیانہ درجے کے کاشتکاروں کی اس سعی پر دلالت کرتی ہیں۔ جو انہوں نے ابتک اپنی پیداوار کو مشترکہ طور پر منڈی میں لانے کے لئے کی ہے۔ دکانیں یہ کام ایک معمولی کمیشن ایجنٹ کے طریقوں کے مطابق کرتی ہیں۔ یعنی اپنے ممبروں کی پیداوار میں سے کچھ فروخت کر دیتی ہیں۔ اور کچھ جمع کر لیتی ہیں۔ اور کبھی کبھی انہیں خرید کر بھی دیتی ہیں۔ یہ کام وہ ہر ممبر کے لئے انفرادی طور پر کر لیتی ہیں۔ اور یہ ان کی خامیوں میں سے ایک ہے۔ کسان اس وقت تک اپنی پیداوار اجتماعی طور پر فروخت نہیں کرتا۔ جب تک ضرورت اسے مجبور نہ کرے اور کسان کی وہ پیداوار جس کو ایک جگہ ڈھیر نہ کیا جائے۔ درجوں کے لحاظ سے یہ نہیں لگائی جا سکتی۔ اجناس کی بہت کم مقدار لائی جاتی ہے اور ان کی اقسام (درجے) بہت زیادہ ملی جلی ہوتی ہیں۔ (ان کی اقسام چھانٹنے اور ڈھیر کئے بغیر انہیں برآمد کرنے کی منڈی میں جمع کرنے کا تو ذکر ہی فضول ہے) اس کے علاوہ اور کئی ایک مشکلات ہیں۔ بہت سے ضلعوں میں جائیدادیں کم ہیں۔ اور نہری بستیوں کے باہر کسان کے پاس فروخت کرنے کیلئے اتنا تھوڑا غلہ ہوتا ہے کہ کواپریٹو شاپ اس کے لئے نقدی کی صورت میں کوئی مفید کام نہیں کر سکتی۔ نہری بستیوں کے اندر حالات زیادہ موافق ہیں۔ اور اکثر انجمنیں وہیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن وہاں بھی رکاوٹیں بہت سخت ہیں۔ کسی کواپریٹو شاپ کا قیام عام طور پر کمیشن ایجنٹوں کی طرف سے متفقہ بائیکاٹ کا اعلان کرتی ہے۔ اور چونکہ وہ منڈیوں پر مکمل طور پر چھائے ہوئے ہیں۔ اس لئے کسی دکان کو سخت خطرے میں ڈالنے کیلئے انہیں صرف ایک عام قطع تعلق کا اعلان کرنا پڑتا ہے۔ سانگلہ میں ایک نئی کواپریٹو شاپ کا اس بنا پر دو ماہ کیلئے قطع تعلق کر دیا گیا۔ کہ اس نے روپے میں سے چھ آنے مہاکر کے تقسیم کر دیئے۔ اس بائیکاٹ کا خاتمہ صرف اس وقت ہوا۔ جب کہ افسران نے ضابطہ قوانین فوجداری کے ماتحت ضمانت لے لی۔ جب تک یہ (بائیکاٹ) جاری رہی۔ انجمن اپنے ممبروں کی کپاس نہ فروخت کر سکی۔ اور اس امر کو روکنے کیلئے کہ دوبارہ ایسی متنوع حالات

پیدا نہ ہو۔ اس نے اگلے سال ایک روئی بیلنے کے کارخانے والے سے معاہدہ کیا۔ کہ وہ ایک بڑی رقم کے قرضے کے عوض ان کی تمام کپاس میں سے بنولے علیحدہ کر دے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ بائیکاٹ کی صورت پیدا نہ ہوئی۔ لیکن جیسا کہ میں نے سانگلہ میں دیکھا ۔۔۔۔ ۳۰۰ روپیہ کا قرض نہایت ہی مشتبہ تحریروں کی صورت میں تھا۔ اگر کوئی سوسائٹی بائیکاٹ سے بچ جاتی ہے تو قرضے کی رقمیں ماری جانے کی وجہ سے وہ نیم تباہی کی حالت کو پہنچتی ہے جس کی مثال یہ ہے۔ یا غبن کی وجہ سے یہ صورت پیدا ہوتی ہے اس تنخواہ پر جو اکثر انجمنیں دے سکتی ہیں۔ یاد دینے کیلئے تیار ہیں۔ یہ نہایت ہی مشکل ہے۔ کہ کوئی ایسا منیجر مل جائے۔ جو ایماندار بھی ہو اور لائق بھی۔

بہت سے غبن ہو چکے ہیں۔ اور بعض اوقات ہزاروں روپے غائب ہو جاتے ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ اس میں فرقہ وارانہ فساد کا بھی امکان ہے۔ اور یہ سب سے زیادہ بڑی آفت ہے۔ ایک ایسے گھرانے کے متعلق جس میں آپس ہی تفرقہ پڑا ہوا ہو۔ انجیل کی کہاوت کہیں بھی اسقدر یقینی طور پر صادق نہیں آتی۔ جتنی کہ انجمن امداد باہمی پر۔

منڈی کے مطالبات

اس لئے ہندوستان میں امداد باہمی کی اہرٹ کی دکان اگرچہ اپنی بناوٹ کے اعتبار سے سادہ ہے۔ (اس سے زیادہ سادہ ہونا مشکل ہے) لیکن یہ نظام ایک بیباکانہ اقدام ہے۔ تاہم اگر وہ کوئی ٹھوس فائدہ نہ پہنچاتیں۔ تو اس قسم کی ایسی پچیس انجمنیں قائم نہ ہوتیں۔ جو تقریباً ۲۰ لاکھ (۰۰۰ و ۲۵ و ۲ پونڈ) روپیہ کا لین دین کرتی ہیں۔ ان فوائد میں سب سے نمایاں فائدہ مطالبات کے متعلق ہے۔ پنجاب کی تمام منڈیوں میں پیداوار کی فروخت پر چھوٹی چھوٹی رقوم ادا کرنے کی شرائط لگی ہوئی ہیں۔ اور یہ بات اتفاقیہ طور پر اس امر کی تشریح کرتی ہے ایک متوسط درجے کی سوسائٹی میں محنت کس حد تک تقسیم کی جا سکتی ہے۔ کمیشن ایجنٹ لائل پور میں فروخت شدہ پیداوار کے ہر سینکڑے پر ۱۲ آنے ۶ پائی ہے۔ اور وہ بڑی سی رقم بھی جو دلال کو دی جاتی ہے۔ معقول ہوتی ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ شاگردی (ایجنٹ کے شاگردوں کو کچھ رقم دی جاتی ہے) خواہ شاگرد ہوں یا نہ ہوں۔ پھر تولنے والے سقے۔ بھنگی۔ تلی اور باورچی کو جو تمام کے تمام کچھ معمولی رواجی خدمات انجام دیتے ہیں جنس کی

صورت میں ادائیگی کی جاتی ہے۔ وہ اس طرح خدمات انجام دیتے ہیں۔ کہ دو آدمی غلّے کی بوریاں گاڑی پر سے اتارتے ہیں۔ ایک اور غلّے کو چبوترے پر ڈھیر کرتا ہے۔ چوتھا اسے تولنے والے کی ترازو میں چڑھاتا ہے۔ اور پانچواں اسے تولتا ہے۔ اور باورچی درمیانے درجے کا کھانا پکاتا ہے۔ جیسے تاجر مشرقی خوش اخلاقی کے ساتھ اپنے گاہکوں کو کھلاتا ہے۔ لیکن سب سے عجیب بات یہ بھی ایک ایسے ملک کی خصوصیت ہے۔ جہاں مذہب ساتھ ساتھ ہے۔ یہ ہے کہ ایک پیسہ فی سینکڑہ روپیہ مقامی گئو شالہ کیلئے لیا جاتا ہے۔ اور پانچ پیسے اور مذہبی کاموں کیلئے (دھرماؤ) زیادہ نکتہ رس لوگ اخراجات کو تذ سکولوں، شفاخانوں اور دوسرے ایسے خیراتی کاموں کے لئے دیدیتے ہیں۔ جن میں انہیں دلچسپی ہوتی ہے۔ لیکن باقی لوگ (کہا جاتا ہے کہ ان کی زیادہ تعداد) اسے مذہبی رسوم۔ بھجن منڈلیوں۔ برہمنوں کی دعوتوں۔ بنارس اور ہردوار کی جاترہ اور گنگا کے پوتر جل میں نہانے پر صرف کرتے ہیں۔ اور اس امر کا بھی اقرار کیا گیا ہے۔ کہ بعض اوقات ایسے کاموں کے لئے بھی خرچ کرتے ہیں۔ جن سے دنیاوی فائدہ زیادہ مقصود ہوتا ہے۔

یہ رقوم ہر منڈی میں مختلف ہیں۔ مگر شاذ ہی (اگر کبھی) کم رقم فروخت شدہ پیداوار کی قیمت کے ۲½ یا ۳ فیصدی سے زیادہ ہوتی ہے۔ البتہ تعداد کے لحاظ سے یہ بہت تکلیف دہ ہیں۔ اور بعض اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت دلخراش کن ہیں۔ خیرات اور تجارت کو مربوط کرنے کیلئے خواہ کچھ بھی دلائل کیوں نہ دیئے جائیں۔ اس امر کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ کسان کو (جو اکثر صورتوں میں مسلمان ہوتا ہے) ایسے چندے دینے کیلئے کیوں مجبور کیا جاتا ہے۔ جن کو ہندو تاجر کلی طور پر اپنے قبضے میں رکھتے ہیں۔ کمیشن شاپ دیہاتی کو اس سے بالکل بچا لیتی ہے۔ اور اسکی کلی واجبات غلّہ کی تجارت کرنے والوں کا ⅖ ہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ قابل قدر خدمت یہ ہے۔ کہ وہ ٹھیک ترازو اور وزن بہم پہنچاتے ہیں۔ ۱۹۲۸ء میں تحقیقات کرنے سے یہ معلوم ہوا۔ کہ پانچ ضلعوں میں ۱۴۰۰ ترازوؤں کی آزمائش کرنے پر یہ دیکھا کہ ۶۰ فیصدی درست نہ تھیں۔ اور ۷۰۰۹ باٹوں میں سے ۲۹ فیصدی پورے نہ تھے۔ اس پر ایک فائدہ اور بھی ہے۔ ہر ایک منڈی میں ہندو یا تاجروں کا غلبہ ہے۔ اور اسکی فضا گاؤں سے اس قدر مختلف ہے . . . . کہ پہلی مرتبہ وہاں جانے والا دیہاتی اپنے آپ کو ایسا کھویا ہوا محسوس کرتا ہے جیسا کہ صحرائی عرب

تو کسی شہر میں داخل ہو کر۔ ایسے شخص کے لئے کمیشن شاپ ایک نخلستان ہے۔ زیادہ تر اس وجہ سے بھی کہ وہاں لوگ لوٹنے کی بجائے امداد دینے کیلئے تیار ہونگے۔ یہ فوائد نہیں بڑے فوائد۔ ایک چوتھا بھی ہو سکتا ہے۔ جرمنی میں سمجھدار کسان اپنے پاس صرف اپنی فوری ضروریات کے لئے روپیہ رکھ کر باقی کو بینک میں جمع کرا دیتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں کسان تمام کا تمام گھر لے جاتا ہے۔ حالانکہ اکثر منڈیوں میں یا ان کے نزدیک امداد باہمی کے سنٹرل بینک ہیں۔ جو تھوڑی رقم جمع کرانے پر بھی اچھی شرح سود دیتے ہیں۔ بینک با اثر منیجر اگر کوشش کرے۔ تو اس کے لئے بہت کچھ کر سکتا ہے۔ لیکن میں اب تک کسی ایسے منیجر سے نہیں ملا جس نے کوشش کی ہو۔ کمیشن شاپ کا مستقبل غیر یقینی ہے۔ لیکن جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ اس سے ایک بات ظاہر ہے۔ اور وہ یہ کہ صوبے کی منڈیوں پر قابو رکھنے اور انتظام کرنے میں زراعت پیشہ طبقہ کا زیادہ ہاتھ ہونا چاہیئے۔ جہاں تک حقیقی انتظام کا تعلق ہے۔ اسکی قریب قریب کوئی آواز نہیں ہے۔ یہاں تک کہ مقامی جماعتوں پر بھی جو اس پر حکومت کرتی ہیں۔ اسکی اقلیت بیچارگی کی حد کو پہنچی ہوئی ہے۔
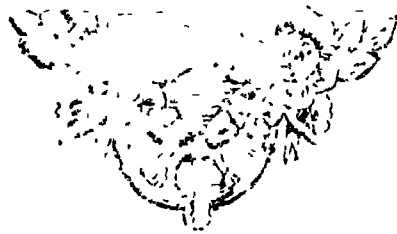
باب ہشتم

حصار

زمیندار اور مزارع - وسیع کاشت - پنچائتیں اور روپیہ کا لین دین

۲ - فروری - سرسہ سے سوچن (۱۰ میل)

اب ہم اونٹوں والے علاقے کے وسط میں اور ہندوستان (ہندوؤں کے علاقے) کے کنارے پر ہیں - پنجاب مع اپنے سکھ و مسلمان دہقانیوں کے ہماری پشت پر واقع ہے - اور پنجابی زبان صرف شمال مشرقی علاقے کے سکھ بولتے ہیں - اب لہراتی ہوئی داڑھیاں ہمارے چاروں طرف نظر نہیں آتیں - اور بہت سے چہرے بغیر داڑھی کے دکھائی دیتے ہیں - انکی صورتیں اچھی طرح دباغت کئے ہوئے چمڑے کا رنگ لئے ہوئی ہیں - عورتوں کی چادریں اور ان کے تمام کے تمام حاشیے بھی سرخ رنگ کے ہیں - باگڑی جاٹوں کی بیویاں ہر کسی کو برابری کی نظر سے دیکھتی ہیں - اور ان کے بچے ہر کسی کو گلی میں سے گذرتا ہوا دیکھنے کیلئے جوش فروش میں جمع ہو جاتے ہیں - یہاں کوئی پردہ نہیں ہے - اور گھونگھٹ اس وقت نکالا جاتا ہے جب کوئی بزرگ یا اور کوئی ممتاز شخص موجود ہوتا ہے - گاؤں کے چاروں طرف (ہندو ماحول کی قطعی عدالت کے طور پر) عظیم الشان مور بغیر ستائے آزادانہ طور پر خراماں خراماں چلتے ہیں جہاں اور تمام چیزیں بد احتیاطی سے بنی ہوئی معلوم ہوتی ہیں - وہاں یہ جانور صانع و خالق کی قدرت یاد دلاتا ہے -

زمیندار اور مزارع

اگرچہ ضلع میں ہندوؤں کا غلبہ ہے - یہاں اہم اسلامی عناصر بھی موجود ہیں - اور سرسہ سے

واپس آتے ہوئے جب میں ایک مزارعوں کا قائم کردہ بینک دیکھنے کے لئے ٹھیرا تو میں نے اپنے آپ کو مسلمانوں میں پایا۔ جاگیردار کی عدم موجودگی میں جیسا کہ عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے یہاں بھی غربت اور انحطاط کا دور دورہ تھا۔ ممبر ہمارے سامنے ایک مردہ دل گروہ کی صورت میں بیٹھے تھے۔ اُن کے چہرے پچکے ہوئے۔ قمیصوں کے رنگ اُڑے ہوئے اور انکی پگڑیاں ان کے تھکے ہوئے سروں پر اس طرح لپٹی ہوئی تھیں۔ کہ وہ پژمردہ نظر آتے تھے۔ جیسا کہ پنجاب میں مزارعین کے متعلق عام طور پر دیکھا جاتا ہے۔ ان کو بھی ایک ہی زمین متواتر کئی سال تک کاشت نہیں کرنے دیجاتی۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ جیسا کہ سرکاری پیادے نے تسلیم کیا۔ (اور جیسا کہ اکثر زمیندار ایسی حالات میں تسلیم کرینگے) کہ وہ حقوق موروثی کیلئے مطالبہ پیش کر دیں۔ لیکن یہ صورتیں ایسی نہیں ہیں۔ جنہیں زمین کے بہترین استعمال کے لئے مفید ٹھہرایا جا سکے۔ اور تمام سمجھدار زمیندار جن سے میں نے ملاقات کی ہے۔ اسی بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ تاہم یہ دیکھ کر کہ ہر سال اُن سب سے بڑی زمیندار (گورنمنٹ بذاتِ خود) ہزاروں ایکڑ زمین ایک یا دو سال کے لئے ٹھیکہ پر دیتی ہے۔ انہیں ملامت کرنا مشکل ہے۔ اگرچہ مزارعین کو مقررہ وقت پر ایک زمین سے دوسری میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ تو وہ کسی اور جگہ جانے کے لئے شاذ ہی گاؤں چھوڑتے ہیں۔ یہ بات بھی صوبے کی خصوصیات میں سے ہے۔ اور یہ کچھ تو اس وجہ سے ہے کہ اوسط درجے کا جاگیردار شاذ ہی مزارع کو بے دخل کرتا ہے۔ اور زیادہ تر اس وجہ سے بھی کہ دیہاتی جس گاؤں میں ایک بار جم چکا ہو۔ اسے قطعی طور پر چھوڑنے کیلئے بالکل ناخوش ہوتا ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ اور کہیں اسے گھر تک ملنا بھی مشکل ہے

فضول خرچی اور آمدنی

کاش یہ لوگ اپنی آمدنی کے متعلق بھی اتنے ہی عقلمند ہوتے۔ یہ ایک ایسی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو اپنے آپ کو راجپوت کہتی ہے۔ لیکن مقامی طور پر یہ لوگ پچادے یا باشندگانِ مغرب کہلاتے ہیں۔ آزادانہ لوٹنے والے نیم چوپانوں کی نسل سے ہونے کی وجہ سے اپنی جائیداد کی نگہبانی کرنے اور دوسروں کا مال اُڑانے میں بُری طرح سے بدنام ہیں۔ گذشتہ پندرہ سال میں گورنمنٹ نے انہیں کنوئیں اتارنے کے لئے ۵۰،۰۰۰ روپیہ قرض دیا ہے۔ اور اب تک ایک کنواں بھی تکمیل نہیں پہنچا ہے۔ ایک جیتہار نے دوسرے کنوئیں کے لئے بھی قرض

لے لیا اور پہلا ابھی تک بھی نہیں بنا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ روپیہ کہاں غائب ہوا ہے۔ اور قرض واپس لینے کی کوششوں کا جواب غربت کی صدائے احتجاج سے دیا جاتا ہے۔ بلاشبہ ایسے لوگ خواہ کسی طرح غریب ہو گئے ہوں۔ اب اس قابل نہیں ہیں۔ کہ ان کی امداد کی جائے۔ پندرہ سال گذرے بڑی بڑی توقعات کے ساتھ ان میں بینک کھولے گئے تھے۔ اور نہیں مالی امداد دینے کے لئے سرسہ میں ایک سنٹرل بینک قائم کیا گیا تھا۔ اور اب سنٹرل بینک کے اپنے قرضوں پر ایک سال سے زیادہ کا سود لینا ہے۔ دن یقیناً گڑھ دہ رہے ہیں۔ کیونکہ قحط سالی اور قرضوں کا آنا ایک ہی ساتھ وقوع میں آتا ہے لیکن جس چیز نے انہیں زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ وہ ان کے استقلال اور مالی حس کی کمی ہے۔ وہ باگڑی جاٹ جو بیکانیر کے کنارے کے ساتھ ساتھ ریتلے بنجر علاقے میں کاشت کرتے ہیں۔ ان سے بہت مختلف ہیں۔ قحط سالی کے تواتر نے انہیں سکھا دیا ہے کہ وہ پیش بینی سے کام لیں۔ اور روپیہ کو احتیاط سے رکھیں۔ لیکن پچادے دریائے گھگھر در حقیقت دریا کی نسبت اسے نالہ کہنا زیادہ موزوں ہے) اور ایک نہر پر انحصار رکھنے کے باوجود نہایت بے شرمی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور ادھر کماتے ہیں۔ ادھر چٹ کر جاتے ہیں۔ اور اتنے فضول خرچ ہیں۔ جتنے جنوب مغربی علاقے کے کسان جاٹ اور پچادے دونوں فصلوں کے محفوظ نہ ہونے سے نقصان اٹھاتے ہیں۔ لیکن جاٹ کی صورت میں یہ حالت افراط کی بجائے قحط سالی سے وابستہ ہے۔ اور اس ردِ عمل کا نتیجہ کفایت شعاری ہے۔ اور پچادہ کی صورت میں اس کا تعلق افراط سے ہے اور جیسا کہ جنوب میں ہے۔ اس کے ردِ عمل کا نتیجہ فضول خرچی ہے۔

غیر محافظت اور کفایت شعاری

قحط اسقدر بار بار پڑتے ہیں۔ کہ باگڑی جاٹ کفایت شعار ہونے کیلئے مجبور ہے۔ بارش کی اوسط ۹ سے بارہ انچ تک ہے۔ لیکن اچھے سالوں میں یہ بیس بھی ہو جاتی ہے اور برے میں صرف تین یا چار ہی ہوتی ہے۔ اچھے سال میں فصل بے حد زیادہ ہوتی ہے۔ اور برے سال میں کچھ نہیں ہوتا۔ اس لئے اچھے سال میں جاٹ کم از کم ایک سال کیلئے غلے کا ذخیرہ جمع کر لیتا ہے۔ اور باجرے اور بھوسے کا جتنا ڈھیر اکٹھا کر سکتا ہے۔ لگا لیتا ہے تاکہ وہ خشک سالی کے ایام میں اپنے آپ کو اور اپنے مویشیوں کو زندہ رکھ سکے۔ یہ ہو سکتا

ہے کہ خشک سال پے در پے آئیں۔ یہاں ۱۹۲۰ء سے اچھی فصل نہیں ہوئی ہے) اور گذشتہ ایام میں جلد یا بدیر فضول خرچ کیلئے یہ صورت موت کا پیغام تھی۔ اور ان کے مویشیوں کے لئے اب بھی موت سے کم نہیں ہے۔ مناسب حال یہ ہے کہ جاٹ کی عادتیں کفایت شعارانہ ہیں۔ اور وہ ہر موقع پر کفایت شعاری سے کام لیتا ہے۔ سفر پر جاتے ہوئے وہ اپنی جوتیاں ہاتھ میں لے کر چلتا ہے۔ رات کو وہ لیمپ سے کام نہیں لیتا اور جب وہ پردیس میں جاتا ہے۔ تو اس کسان کے برعکس جو اس سے پرے شمال کی طرف رہتا ہے۔ وہ گھر کے کپڑے کی پگڑی پہنتا ہے۔ اور اگر اس کے سر پر لپٹی ہوئی پگڑی سے اسکی مایوسی ٹپکتی ہے۔ تو اسکی وجہ یہ ہے۔ کہ یہ باقاعدہ دس یا بارہ گز ہونے کی بجائے صرف پانچ یا چھ گز ہوتی ہے۔ اسکی خوراک بھی حد سے زیادہ سادہ ہوتی ہے۔ گوشت کو کوئی چھوتا ہی نہیں۔ اور انڈے کوئی کھاتا ہی نہیں۔ (انہیں عادت نہیں ہے) اکثر لوگ سراسر اناج۔ مکھن۔ دودھ۔ اور گھی پر گذارہ کرتے ہیں۔ گرمی کے موسم میں گیہوں کی روٹی کھاتے ہیں۔ اور سردی میں باجرے کی۔ بیس سال گذرے۔ جنگلیوں کی طرح یہ بھی بارہ مہینے باجرے کی روٹی کھایا کرتے تھے۔ جو لوگ خوشحال نہیں ہیں۔ وہ اسے چنے کے ساتھ ملا لیتے ہیں۔ جو اس ریتلے علاقے کی بڑی فصل ہے۔ اور اس طرح کھاتے ہیں یہ اشتہا خیز اور تقویت دینے والی ہے۔ کفایت شعار کے لئے باجرے کی روٹی میں یہ فائدہ ہے۔ کہ بغیر گھی لگائے کھائی جا سکتی ہے۔ لیکن خشک روٹی کو خوش ذائقہ بنانے کے لئے اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس صورت میں وہ تمام گھی جو زیادہ سے زیادہ دودھ سے بنایا جاتا ہے۔ فروخت کیا جا سکتا ہے۔ جن جاٹوں نے مجھے یہ معلومات بہم پہنچائیں۔ میں نے اُن سے دریافت کیا۔ "کیا تمہارے پاس کھانے کے لئے کافی ہے؟ ان کے جواب میں دیہاتیوں کی سی خوشی اور سچائی کی جھلک تھی۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس سے کم نہیں کھا سکتے۔ لیکن ہم اپنی طاقت بحال رکھتے ہیں"۔

علاقہ

ہم اس علاقے کے وار پار ہوتے ہوئے سرسہ واپس آئے۔ اور راستے میں ہمارے چاروں طرف پچھلی طرف سے آنے والی ہوا نے گرد کا بادل اُٹھائے رکھا۔ اور وہاں

پہنچنے پر میں گرد سے اسقدر اٹا ہوا تھا کہ اسفنج کو چہرے پر پھرا کر نچوڑنے سے ہی پانی خاکستر رنگ کا ہو گیا۔ چار ماہ سے زیادہ عرصہ ہوا۔ کہ یہاں کوئی بارش نہیں ہوئی ہے۔ اور زمین اسقدر بھُربھُری ہو گئی ہے۔ کہ کوئی شخص بغیر خاک اُڑائے ایک قدم نہیں ہلا سکتا۔ شام کو ہم سوار ہو کر سچان کی طرف چلے۔ اور اس پرانی سڑک پر سے ہوئے۔ جس کا درجہ حال ہی میں دہلی اور ملتان کو ملانے والی سڑک اعظم کے برابر کر دیا گیا ہے۔ ۱۹۳۸ء میں امیر تیمور دہلی کی طرف تباہ کن حملہ کرتا ہوا اسی طرف سے گذرا تھا۔ اور اب یہ کہا جاتا ہے۔ کہ سرسہ کے باہر کے بڑے بڑے ڈھیروں کی ابتدا اُن کھوپریوں سے ہوئی جو اس کی فوج نے کاٹ کاٹ کر پھینکدیں۔ بڑی بڑی فوجوں کو راستہ دینے کیلئے اُن دنوں میں یہ علاقہ ضرور زیادہ سیر حاصل ہوگا۔ پرانے طریقہ کے مطابق اب ایسا کرنا نا ممکن ہوگا۔ کیونکہ تحصیل کا ۹ فیصدی حصہ سراسر بارش پر انحصار رکھتا ہے۔ جو اس قدر تغیر پذیر ہے۔ کہ ممکن ہے کوئی گاؤں اچانک ہی اپنے آپ کو جھیل کے اندر پائے۔ یا کئی سال تک اتنی فصل بھی نہ ہو کہ اس کے چاروں طرف کی گرد بیٹھ جائے۔ مٹی اتنی ہلکی ہے۔ کہ سخت بارش بیج کو اُگنے سے پہلے بہا دیگی اور اگر یہ اس سے بچ گیا۔ تو اندھی اس کا گلا گھونٹ ڈالیگی۔ ساٹھ سے لیکر ۱۰۰ فٹ تک پانی کی تہ نیچی ہوتے کی وجہ سے وہ کنوئیں جو اُتارے جانے کے قابل ہیں۔ صرف چند ہیں اور گاؤں کے تالاب کے نزدیک واقع ہیں۔ تاکہ جب یہ سوکھ جائے۔ تو وہ اسکی جگہ لے لیں نہروں کے متعلق یہ ہے کہ نہر جمن غربی کی ایک شاخ فقط سرسہ تک پہنچتی ہے۔ لیکن اس قدر کم پانی بہم پہنچاتی ہے کہ ملک کے دونوں طرف سرسبزی کی جھلک ہی نظر آتی ہے۔

وسیع کاشتکاری

اسلئے یہاں کاشتکاری وسیع پیمانے پر ہونی چاہیئے۔ یہاں تک کہ ایسی جیسی کہ یورپ کے اُن حصوں میں ہے۔ جہاں بارش کم ہوتی ہے۔ اور گرمی زیادہ پڑتی ہے۔ کیونکہ وسیع کاشتکاری کے لئے باقاعدہ پانی بہم پہنچنے کی اور کھاد کے آزادانہ استعمال کی ضرورت ہے۔ اس ضلع میں مویشی پالے جاتے ہیں۔ اس لئے یہاں کھاد کی افراط ہی لیکن چونکہ نمی اسقدر کم ہے۔ کہ وہ اسے سڑا کر زمین کا جزُ نہیں بناتی۔ اس لئے اس کا ایک

چوتھائی بھی کھیتوں تک نہیں پہنچتا۔ اور چونکہ بہت کم آبپاشی ممکن ہے۔ اسلئے ہل چلانا
اور بیج بونا سراسر بارش پر منحصر ہے۔ اور یہ اسقدر کم ہوتی ہے۔ اور زمینیں اتنی بڑی
ہیں کہ کئی بار قلبہ رانی نہیں ہو سکتی۔ عام طور پر چنے کے لئے زمین میں دو بار اور گیہوں
کے لئے تین بار ہل چلایا جاتا ہے۔ کسان صرف اتنا کر سکتا ہے کہ اچھا بیج استعمال کرے
بارش کے ساتھ ساتھ فصل کو تبدیل کرے۔ احتیاط سے اسکی گوڈی کرے۔ جنگلی جانور
اور آوارہ مویشیوں کو روکنے کے لئے کھیت کے گرد باڑ لگائے۔ اور نمی کو اسطرح
جمع رکھے۔ جس طرح سونے کو۔ ان میں سے بعض باتیں وہ اب کرتا ہے۔ وہ غلّے کا بیج جمع
رکھتا ہے۔ اور اسے ڈرل کے ذریعے بوتا ہے۔ بارش زیادہ یا ہلکی ہونے کے لحاظ سے
وہ چنے یا گیہوں بوتا ہے۔ یا دونوں کو ملا کر اس امید پر بو دیتا ہے۔ کہ ممکن ہے ان میں سے
ایک اچھی ہو جائے۔ لیکن کھیتوں کی مینڈھیں اتنی چھوٹی ہیں کہ زیادہ بارش کے پانی
کو نہیں روک سکتیں۔ اور اتنی ہلکی بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ کہ بعض اوقات بہ جاتی ہیں مقابلتہً
بہت کم لوگ ایسے ہیں جو فصل کے بعد جلد ہی کھیت میں ہل چلاتے ہیں۔ تاکہ وہ دوسری
بارش کے لئے تیار ہو جائے۔ گوڈائی کی طرف بہت غفلت برتی جاتی ہے اور صرف ان
فصلوں کی کی جاتی ہے۔ جو موسمی ہواؤں سے ہوتی ہیں۔ اگرچہ چارے کے ڈھیروں کے
گرد باڑ لگانے کیلئے کانٹے دار جھاڑیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ لیکن یہ کھیتوں کے گرد
شاذ ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ محکمہ زراعت کا ایک افسر جو میرے ساتھ تھا۔ اس کے متعلق
نکتہ چینی کرتا رہا تھا۔ کیونکہ یہاں بہت ہی کم ترقی یافتہ آلات استعمال کئے جاتے تھے۔
لیکن اس پر بھی شبہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ آیا اس علاقے میں نہایت ہی قدیم حالات کی
موجودگی میں یہاں ان کے لئے کوئی خاص گنجائش بھی ہے۔ مجھے یہ باتیں اسلئے معلوم ہو جاتی ہیں۔
کہ (واضح الفاظ میں بیان کرتے ہوئے) یہ تمام ایسے بارانی علاقوں میں پائی جاتی ہیں جہاں
بارش بیس انچ سے کم ہوتی ہے +

۴ فروری۔ سچان سے بھٹو (۱۳ میل)

آج ہم صبح سوار ہو کر چلے تو بڑے بڑے جنگلی مرغوں کی قطاریں ہمارے سروں پر سے
پر مار کر تیز شاں شاں کی آواز پیدا کرتی ہوئی گذریں۔ اور تھوڑی دیر بعد ہم نے اس مسطح بدنما

تحصیل کی زمین کا لشان دیکھا جو اکیلا ہی تھا) یہ جودھکا کے بارہ گوسائیوں کی بلند عمارتیں تھیں۔ ہمارے چاروں طرف ریتلی بنجر زمین تھی۔ جس میں کہیں چنے بوئے ہوئے تھے۔ اور چونکہ ہوا ابھی تک ہماری پشت کی طرف سے آ رہی تھی۔ ہم گرد کے بادل میں سوار چلے جا رہے تھے۔ برف سی سفید پہاڑیوں کے مقابل زمرد میں سرسبزی کا واقع ہونا اس منظر کا ایک خوبصورت پہلو تھا۔ اس کے علاوہ ہر چیز (جیسا کہ خوبصورتی کی عدم موجودگی میں ہوتا ہے) نقلی معلوم ہوتی تھی۔ (وہ جھاڑیاں جو درخت نظر آتی تھیں اور اونٹ جب ہمارے پاس سے گذرتے تھے۔ تو نہایت شاندار معلوم ہوتے تھے۔ حالانکہ افق کے پاس محض ایک داغ سا نظر آتے تھے)۔

پنچائیت

ایسے علاقے میں اگر لوگ مل جل کر نہ رہتے تو تباہ ہو جاتے۔ اس لئے یہاں دیہاتی طبقے میں پنجاب کے اکثر اور حصوں کی نسبت زیادہ بیداری ہے۔ اسکی بہترین علامت یہ ہے کہ یہاں پنچایت زندہ ہے۔ صوبے کے اکثر حصوں میں یہ قدیم اور کسی زمانے کی بہت بڑی جماعت اب مردہ ہو چکی ہے۔ اور گورنمنٹ ایک ایکٹ سے (۱۹۲۲ء میں منظور ہوا) مدد لیکر نہایت عقلمندی سے اسے زندہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن جنوب مغربی پنجاب میں یہ دیسی طریق پر قائم ہے۔ مقام ڈنگ میں جہاں آج ہم نے قیام کیا تھا ایک پنچائیت سو سال سے یعنی اس وقت سے جب کہ گاؤں کی بنیاد ڈالی گئی تھی۔ اب تک چلی آئی ہے۔ پنچایت کی بہت سی مختلف صورتیں ہیں۔ کیونکہ یک رنگی گاؤں کے لئے اتنی ہی خلاف فطرت ہے۔ جتنی کہ گورنمنٹ کے لئے فطرت کے مطابق ہے۔ ہو سکتا ہے۔ کہ یہ ایک ہی ذات تک محدود ہو۔ جیسا بھیرہ کے درزیوں کی صورت میں۔ یا گوڑگاؤں کی طرح اس میں ایک قوم کے بارہ گاؤں شامل ہو سکتے ہیں۔ یا جیسا کہ شمال میں یہ کسی مقدمے میں مصالحت کرانے کیلئے سفید داڑھی والے بزرگوں سے امداد لینے کی نسبت اور زیادہ کام کر سکتی ہے۔ حصار کے باگڑی جاٹوں میں یہ ایسے مقدمات کا تصفیہ کرتی ہے۔ جن کا تعلق ایک ہی گاؤں سے ہوتا ہے۔ لیکن دیوالی جاٹوں میں بعض اوقات ایسے مقدمات لے لیتی ہے۔ جس کے فریق مختلف گاؤں میں رہتے ہیں۔ اور ایسے گاؤں جو اتنے فاصلے

پر ہوں ۔جہاں تک آواز پہنچ سکتی ہے ۔تو وہ بھی ایک پنچایت میں شامل ہو سکتے ہیں ۔اکیلے گاؤں کی صورت میں اگر گاؤں بڑا نہیں ہے ۔تو تمام متعلقہ لوگ ایک الگ جگہ پر جمع ہوتے ہیں ۔اور مقدمات کا فیصلہ جلسۂ عام میں کیا جاتا ہے ۔لیکن اگر گاؤں اتنا بڑا ہو کہ ایسا نہ ہو سکے ۔تو گاؤں کی مختلف ذاتیں یا حلقے اجلاس میں شامل ہونے کیلئے اپنے نمائندے بھیج دیتے ہیں ۔ڈنگ معہ اپنے چار سو گھروں کے اسکی ایک مثال ہے ۔جب کوئی جھگڑا پیدا ہوتا ہے ۔تو ہر ایک فوراً اپنا پنچ مقرر کرتا ہے ۔اور نمائندوں کی پنچایت ایک تیسرے شخص کو مقرر کرتی ہے ۔تاکہ وہ سرپنچ کی حیثیت سے کام کرے ۔اور بوقت ضرورت فیصلہ کن رائے دے ۔تینوں مقدمے کو سنتے ہیں ۔اور خلوت میں اپنے فیصلے پر غور کرنے کے بعد پنچایت کو اسکی اطلاع دیتے ہیں ۔جو یا اسے منظور کرتی ہے ۔یا ترمیم کرتی ہے جھگڑے عام طور پر چھوٹے قرضوں ۔معمولی دخل درازیوں ۔کھیتوں کی حدود ۔باہمی حقوق کی تقسیم اور مشترکہ زمین پر سے درخت کاٹنے کے متعلق ہوتے ہیں ۔کوئی جرمانہ نہیں کیا جاتا ۔بلکہ مصالحت کرا کے مقدمات کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے ۔اور عوام کے سامنے معافی مانگنے کے حکم پر عمل درآمد کرایا جاتا ہے ۔حال ہی کے مقدمات میں سے دو نقدی کے متعلق تھے ۔ایک ساہوکار بنئے نے ایک جاٹ سے ...۳ روپے کا مطالبہ کیا ۔اسے تین بھینسیں دو بیل ۔کچھ چارہ اور چار سو روپے دلوا دیئے ۔جو چار سالانہ اقساط میں ادا کرنے تھے ۔(یہاں ہر شخص نقدی اور جنس کا ملاپ دیکھتا ہے ۔جو دیہاتی زندگی کا ایک عام نمونہ ہے) دوسرے مقدمے میں قرضخواہ اور مقروض دونو جاٹ تھے ۔دو سو روپے کا مطالبہ کیا گیا تھا ۔اور سو دلوا دیئے گئے تھے ۔کبھی کبھی جیسا کہ سوائے بہترین گاؤں کے باقی سب جگہ ہوتا ہے ۔مقدمات عدالت تک پہنچے تھے ۔

اُن جاٹوں میں سے جو کل مجھے ملنے کے لئے آئے ۔بعض سمجھدار لوگوں نے کہا ۔کہ باگریں جاٹوں کے ہر ایک گاؤں میں پنچایت ہے ۔اگرچہ اکثر بے ضابطہ طریق پر ہوتی ہے تمام ذاتوں کے لوگ ایک جگہ اکٹھے ہوتے ہیں ۔اور عوام کی مرضی سے مشترکہ مفاد کے معاملات کا فیصلہ کرتے ہیں ۔کوئی ثالث مقرر نہیں کیا جاتا ۔لیکن بزرگوں کی رائے کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے ۔جو ان جاٹوں میں سے ایک نے جو خطاب یافتہ اور ایک اوّل درجے کے بینک کا صدر ہے ۔یہ کہا کہ اگر میں اپنے سے کسی کم درجے لیکن بڑی عمر کے

آدمی پر اپنی رائے کا دباؤ ڈالنا چاہوں تو وہ میرا حقہ پانی بند کردیں گے۔ یہ انتہائی سزا ہے اور ایسے علاقے میں جہاں پانی کی قلت اور ذاتوں کی حکمرانی ہو۔ اپنے ذات بھائیوں کے کنوئیں کو استعمال کرنے کی اجازت نہ ہونا بہت بڑی بات ہے۔ کیونکہ اس کا بدل محض یہ ہو سکتا ہے۔ کہ کسی ادنیٰ ذات کا کنواں استعمال کیا جائے۔ اور ایسا کرنا ذات کا عارضی نقصان ہے۔ جاٹوں نے بتایا کہ کس طرح دو گھرانوں کو اس قسم کی سزا دی گئی تھی۔ ایک کو برہمن بیوہ سے شادی کرنے کی بنا پر اور دوسری کو اپنی چچی سے شادی کرنے کی وجہ سے۔ اور آخر الذکر کا حقہ پانی تین سال بعد کھولا گیا۔ عام طور پر کسی شخص کو اس وقت بحال کیا جاتا ہے۔ کہ وہ اپنے قصور کا اعتراف کرلے۔ اور کچھ معمولی سا جرمانہ ادا کردے۔ صدر کے گاؤں میں جہاں کوئی کنواں نہیں ہے۔ عام سزا یہ ہے کہ اس تالاب میں سے جس کا پانی پینے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ چند من مٹی کھودی جائے (یہ تعداد ۱۰۰ بھی ہو سکتی ہے اور ۵۰۰ بھی) یا یہ بھی ممکن ہے۔ کہ کسی شخص کو گئوشالہ یا مندر میں تھوڑا سا جرمانہ ادا کرنا پڑے۔ سب سے زیادہ بڑی سزائیں ذات توڑنے والے پر عاید کی جاتی ہیں۔ جس کی دو مثالیں ابھی ابھی دی گئی ہیں۔ یہ بات دیہاتی ہندو دھرم کی خصوصیت میں داخل ہے۔ پندرہ برس گذرے ایک مرتبہ جب میں سرسہ میں ٹھیرا ہوا تھا۔ تو مجھے یاد پڑتا ہے۔ کہ میں نے ایک جاٹ ذیلدار سے دریافت کیا تھا۔ کہ آیا اُن جاٹوں کیلئے جنہوں نے آریہ سماج مذہب اختیار کرلیا تھا۔ یہ تبدیلی زیادہ اچھی تھی یا بُری۔ اس نے جواب دیا "زیادہ اچھے آدمی نہیں ہیں۔ میں نے کسی اخلاقی خرابی کے سُننے کی توقع رکھتے ہوئے پوچھا "اچھے کس طرح نہیں؟" اس نے کہا کہ یہ مردے کی کریا کرم کے تیرھویں دن دعوت نہیں کہلاتے"۔ وسوالی جاٹوں کے ایک بڑے گاؤں میں ہم نے ایک باقاعدہ پنچایت دیکھی۔ اور پہلے گاؤں کی طرح یہ بھی یہاں سو سال سے زیادہ عرصے سے قائم ہے۔ گاؤں میں ۲۵۰ گھر ہیں۔ اور یہ چھ حصوں (ٹھلوں) میں بٹا ہوا ہے۔ ہر حصہ اپنا نمایندہ منتخب کرتا ہے۔ جو منتخب کنندگان کی خوشنودی کے دوران میں حکمت عملی سے پنچایت کا کام کرتا ہے۔ لیکن عام طور پر اپنی زندگی کیلئے کرتا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ اگر کوئی بڑی بات ہو جائے۔ تو اسے تبدیل کردیا جائیگا۔ چونکہ پانچ حصوں میں زیادہ تر جاٹوں کی آبادی اور چھٹے میں برہمنوں کی ہے۔ اس لئے پنچایت پانچ جاٹوں اور ایک برہمن پر مشتمل ہے۔ ادنیٰ ذاتوں کا (۵۰ دھنک (بھنگی) ہیں اور ۱۲ چمار ہیں) کوئی نمایندہ

نہیں ہے۔ میں نے حرف گیری کرتے ہوئے کہا یہ نقص ہے۔ ذیلدار نے زور دار طریق سے
کہا۔ ان میں یہ کام کرنے کی سمجھ نہیں ہے۔ پنچایت کے چھ ممبر اپنے میں سے ایک شخص کو سرپنچ
کی حیثیت سے کام کرنے کیلئے چن لیتے ہیں۔ انہوں نے ذیلدار کو منتخب کیا ہوا تھا۔ جو ایک
ایسا شخص ہے جس کے متین اور کھلے نقوش والے چہرے پر تحکم کی مہر لگی ہوئی ہے
مقدمات ان تمام لوگوں کی موجودگی میں سُنے جاتے ہیں جنہیں حاضر باشی کا خیال ہوتا ہے۔
اور ٹھیک جمہوری طریقے کے مطابق ہر ایک اپنی رائے کا اظہار کر سکتا ہے۔ لیکن اُن چھ
آدمیوں کی رائے سب پر غالب رہتی ہے یہ ہے چھوٹے پیمانے پر بہترین گورنمنٹ کا نمونہ۔
جس کی ابتدا جمہوریت اور انتہا حکومت الامرا پر ہے۔ بہت سے دوسرے گاؤں کی طرح
یہاں بھی جرمانہ نہیں کیا جاتا۔ اور حقہ اور پانی انتہائی حالات میں بند کیا جاتا ہے۔ چند سال
گذرے ایک چمار کو کسی کے گھر میں نقب لگا کر اونٹ یا بیل چرانے پہ گاؤں بدر کر دیا تھا
جب اس نے معاوضے کی مقررہ رقم دے دی۔ تو اُسے گاؤں آنے کی اجازت دیدی گئی
گذشتہ سال چار اور چماروں کو طلب کیا گیا تا کہ وہ اس بات کا جواب دیں۔ کہ انہوں نے
اپنے گھروں کے لئے شاملات دیہہ میں مداخلت بے جا کیوں کی تھی؟ ہندوستان میں اس
قسم کی مداخلت کا فیصلہ کرنا خواہ گاؤں میں ہو یا شہر میں ہمیشہ کٹھن ہوتا ہے۔ چنانچہ پڑوس کے
اُن تمام گاؤں سے جن کے ساتھ اس گاؤں کے تعلقات تھے۔ نمائندے بلائے گئے۔ تاکہ اس
مقدمہ کا فیصلہ کرنے میں مدد دیں۔ یہ ہمیشہ اس صورت میں کیا جاتا ہے۔ جب کہ فریقین اس کی
خواہش کرتے ہیں۔ یا معاملہ اہم ہو۔ پنچایت کو ترقی دینے کا یہ ایک قابل تعریف طریقہ ہے
اگر ایک فریق پنچایت کے فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ اور وہ عدالت میں
جاتا ہے۔ تو پنچایت دوسرے فریق کی مدد کرتی ہے۔ لیکن کم از کم دو سال سے کوئی
عدالت تک نہیں پہنچا ہے۔ گذشتہ موقعہ پر اس سے پہلے کہ پنچایت کوئی مداخلت
کرے۔ فریقین نہایت سرعت سے عدالت میں پہنچ گئے تھے۔ لیکن آخر کار اس کا فیصلہ
دوستانہ طریق پر کر دیا گیا۔ لوگوں نے یہ شکایت کی کہ گذشتہ ایام میں عدالت پنچایت
کے کام میں روڑے اٹکاتی تھی۔ اور یہاں تک کہ اس کے کاموں پہ معترض ہوتی تھی لیکن
۱۹۲۲ء کے پنچایت ایکٹ نے ان میں نئی روح پھونک دی ہے۔ میں نے پوچھا "کیا لوگ
پنچایت کے سامنے سچ بولتے ہیں؟ ذیلدار نے پورا زور دیتے ہوئے کہا "ہمیشہ"۔

"کیا کچہری میں بھی سچ بولتے ہیں"؟

"نہیں۔ وہاں جھوٹ سے کام لیتے ہیں"۔

"اور جب تم کچہری جاتے ہو تو تم بھی جھوٹ بولتے ہو"؟

اس نے اپنا سنجیدہ چہرہ پیچھے پھینکتے ہوئے فخریہ انداز میں کہا۔ کہ جب میں ثالث (اسیسر، (ایک افسر جو جج کی مدد کیلئے بیٹھتا ہے) ہوتا ہوں تو کبھی نہیں۔

"لیکن اگر تمہیں گواہی دینی پڑے تو پھر"؟

مرجھائے ہوئے چہرے پر چمکدار مسکراہٹ نمایاں ہوئی اور اس نے کہا "اور پھر میں اوپر نیچے کر لیتا ہوں"۔ اس پر ایک عام قہقہہ لگا۔ لیکن ایک برہمن نے نہایت متانت سے یہ کہہ کر اُسے پھر سکوت میں بدل دیا۔ کہ پنچایت میں انصاف ہوتا ہے۔ لیکن عدالت میں نہیں۔ یہ ایک ایسا خیال تھا۔ کہ جس پر سب نے مہر تصدیق ثبت کر دی۔

"لیکن کیا وجہ ہے۔ کہ لوگ پنچایت میں جھوٹ بولنے سے ڈرتے ہیں۔ اور عدالت میں نہیں"؟

عدالت میں فریقین کا معاملہ ہوتا ہے۔ لیکن پنچایت میں.................. زمین پر دو لکیریں کھینچ دی جاتی ہیں۔ ایک گنگا کیلئے اور دوسری جمنا کے لئے اور ان مقدس دریاؤں کی موجودگی میں کسی کو جھوٹ بولنے کی جرأت نہیں ہوتی۔

وہ تمام لوگ جن سے میں نے دریافت کیا ہے۔ ایسی بات پر متفق ہیں۔ کہ پنچایت کے سامنے سچ بولنا اتنا ہی یقینی ہے جتنا کہ عدالت کے سامنے جھوٹ بولنا کل والے جاٹوں میں سے ایک نے کہا۔ کہ انسان اپنے بھائیوں کے سامنے کس طرح جھوٹ بول سکتا ہے؟ ایک اور نے کہا۔ کہ ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے۔ کہ جہاں پانچ اکٹھے بیٹھتے ہیں۔ خدا خود بھی وہاں موجود ہوتا ہے۔ اور اس کی موجودگی میں کوئی جھوٹ بولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ میرے ہمراہیوں میں سے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ زمیندار نے کہا کہ ہماری عدالتوں میں سراسر جھوٹی شہادتوں کا ہونا برطانوی حکومت کا نہایت ہی بُرا پہلو ہے۔ اور پنچایتوں کی حوصلہ افزائی کرنے کیلئے ممکن ترین قومی دلیل ہے۔ محض اس سے کم قوی دوسری دلیل یہ ہے کہ پنچایت ہمارے قوانین شہادت کی پابند نہیں ہے۔ جن کے متعلق میکالے نے لکھا ہے کہ ان میں بہت سی ایسی باتیں مفقود ہیں۔ جو ایک معقول شخص کا چلن پوشیدہ زندگی کے

نہایت ہی اہم معاملات میں درست کرنے کے لئے بالکل کافی ہوسکتی ہیں۔

نئی پنچایتیں

پنچایتوں کی حوصلہ افزائی کے لئے حکومت کچھ نہ کچھ کر رہی ہے۔ انہیں زیر ایکٹ سنہ ۱۹۲۲ء قائم کیا جاتا ہے۔ اس ضلع میں ۱۳ پنچایتیں ہیں۔ ان میں سے کہا جاتا ہے۔ کہ دس بہت خوب ہیں۔ پانچ یا چھ نکمی ہیں۔ ہر تین سال کے بعد انتخاب ہوتا ہے۔ اور ہر ایک ہزار باشندوں کے لئے ایک پنچ منتخب کیا جاتا ہے۔ کم سے کم تین اور زیادہ سے زیادہ سات پنچوں کا ہونا ضروری ہے۔ چونکہ کوئی ایک ایسا شخص بھی جو کم سے کم پانچ روپے مالیانہ نہ ادا کرتا ہو منتخب نہیں کیا جاتا۔ اس لئے صرف ایک بنیا پنچ ہے۔ لیکن کمی کوئی بھی پنچ نہیں ہے۔ گاؤں میں ہر کام مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ جیسا کہ منڈی میں ہر کام بنیا کی منشا کے مطابق سرانجام پاتا ہے۔ ان دونوں کا وجود لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور دونوں کا قدم رفتار زمانہ کے مطابق نہیں ہے۔ انجمن امداد باہمی ثالثی کا فائدہ یہ ہے۔ کہ وہ پنچایت کو امداد باہمی کی بنیادوں پر زندہ کرنا چاہتی ہے۔ اس کا بنیادی اصول یہ ہے۔ کہ ہر چھوٹا اور بڑا معاملہ انتظامیہ کمیٹی ثالثی کے روبرو پیش ہونا چاہیئے۔ اور ثالثوں کی خدمات حاصل کرنا مشکل نہیں ہے۔ اس لئے کہ زمیندار کو اگر نمایاں مساوات و انصاف کی امید ہو۔ تو فوراً اس کام پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ انجمن ثالثی کا ایک اور فائدہ یہ ہے۔ کہ دیوانی تنازعات میں مالیت کی کوئی حد نہیں ہے۔ اور اکثر اوقات بڑی بڑی رقوم کے تنازعات کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ پنچایت ایکٹ کے ماتحت ۵۰ روپے سے زیادہ مالیت کا مقدمہ معرض بحث میں نہیں لایا جا سکتا ہے۔ فوجی تنازعات بھی مختصر سی چوریوں۔ خفیف حملوں۔ شرارتوں۔ مویشیوں اور کھیتوں میں آمد و رفت وغیرہ معمولی معمولی امور تک محدود ہیں۔ اس تحریک کے باوجود اس ضلع میں گذشتہ سال ۶۵۰ دیوانی اور ۱۵۰ فوجداری مقدمات کا فیصلہ کیا گیا۔ قید کا حکم نہیں دیا جا سکتا۔ اور خاص حالتوں کے علاوہ عام حالتوں میں ۲۵ روپے سے زیادہ تک جرمانہ نہیں کیا جا سکتا۔ امر واقعہ یہ ہے۔ کہ بہت کم جرمانے عائد کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ بہت سے اُن لوگوں کی طرح جو اس ملک میں برسر اقتدار ہوتے ہیں۔ پنچ بھی اس ڈر سے کہ مجرم دشمن نہ بن جائے۔ سزا دینے سے عجب خوف کھاتے ہیں۔ اور اکثر صورتوں میں وہ (کسی عذر کی بنا پر) اپنے آپ کو معذرتوں اور دوبارہ قصور نہ

کرنے کے عہدوں تک محدود رکھتے ہیں۔ حفظانِ صحت کے سلسلے ہیں جن کے متعلق انہیں اختیار دے دیا گیا ہے۔ کہ ترقی کرنے کی ایک وجہ یہ ہے۔
جنگ عظیم کے بعد سے جس قدر بل پنجاب کونسل نے منظور کئے ہیں۔ پنچایت ایکٹ ان میں سب سے بہتر ہے۔ کیونکہ اس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے۔ کہ دیہاتی حالات کو دیسی طریق پر ترقی دی جائے۔ اس لئے اس کا پورا پورا استعمال کرنا چاہیئے۔ لیکن میری اس دورے اور گذشتہ دورے کی تحقیقات سے پوری طرح یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایسا نہیں کیا جا رہا ہے۔ تحصیل ترنتارن میں صرف چند پنچائیتیں ایسی ہیں۔ جو شاندار ہیں۔ اور ان میں سے بہت کو دھڑے بندی نے یا تو بگاڑ دیا ہے یا بالکل مسخ کر دیا ہے۔ تحصیل موگا میں جہاں ۷۶ پنچائیتیں ہیں۔ ان پر یہ الزام لگایا گیا تھا۔ کہ جانب داری اور مقدمات کو عام اجلاس میں نہ سننے کی وجہ سے ان میں دھڑے بندی روبہ فروغ ہے۔ حصار میں مقدمات ان تمام لوگوں کی موجودگی میں سُنے جاتے ہیں۔ جو وہاں حاضر ہوتے ہیں۔ ممکن ہے اس لئے کہ یہاں پنچایت کی روائیت اب تک قائم چلی آئی ہے۔ یہ ایک نفع بخش طریق ہے۔ اور اسے عام طور پر اختیار کر لینا چاہیئے۔ اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے۔ کہ ہر ضلع میں ایک ایسا تربیت یافتہ افسر ہونا چاہیئے جو خود دیہاتی ہو۔ تاکہ وہ پنچائیتوں کی ترقی کی دیکھ بھال کرے۔ اور اس کیلئے ترغیب دے انجمن ہائے امداد باہمی کبھی ہزاروں کی میں نہ بڑھتیں۔ اگر نہایت ہی احتیاط سے انتخاب کیا ہوا اور تربیت یافتہ عملہ اس کی امداد نہ کرتا اور یہ فرض کر لینا بالکل فضول ہے۔ کہ پنچائیتوں کا (جو اسی طرح کی ایک جماعت ہے) اس کے بغیر بننا ممکن ہے۔ حصار میں ایک ایسا افسر موجود ہے۔ اور اسی لئے اس کی پنچائیتیں اوسطاً اچھا کام کر رہی ہیں۔ لیکن جہلم اور شاہ پور میں نہیں ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ جہلم میں ایک پنچایت ہے۔ اور شاہ پور میں کوئی نہیں ہے۔ حالانکہ اس کے قریب ہی گجرات میں جہاں ایک افسر موجود ہے۔ پچاس سے بھی زیادہ ہیں۔ اور ان میں سے بعض صوبے بھر میں سب سے اعلیٰ ہیں۔ اُن دس ضلعوں میں جہاں میں نے پہلی مرتبہ دورہ کیا تھا۔ بہت کم ایسے ہیں جہاں اس کو ترقی دینے کے لئے باقاعدہ جد و جہد کی گئی ہو۔ اگر ہندوستان کو حقیقی جمہوریت میں ترقی دینے کی تمنا ہے۔ تو یہ کہنا یقیناً حد سے تجاوز نہیں کرتا۔ کہ کچھ روپیہ پنجاب کے لئے ایک لاکھ روپیہ فی سال کافی ہوگا، کو ترقی دینے کیلئے خرچ کرنا چاہیئے۔ جس کی ابتداء اسی ملک سے ہوئی ہو۔

جمہوریت اور دیہاتی

دیہاتی دوسری باتوں کے متعلق جو ہم نے اس دورے میں بار بار دیکھی ہیں۔ کس قدر ناواقف اور بے پرواہ ہے۔ آنے والی سیاسی تبدیلیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اور تکرار سے کچھ خطرے میں پڑ کر میرا خیال ہے۔ کہ میں وہ سب کچھ دیانتداری سے لکھتا جاؤں۔ جو وہ موجودہ انتظام سلطنت کے متعلق بتاتا جائے۔ ڈنگ اور ایک اور ہندو جاٹوں کے گاؤں میں میں نے حسب معمول سوالات دریافت کئے۔ اگرچہ آخرالذکر گاؤں میں ۱۰۲ آدمی جمع تھے۔ ان میں سے پندرہ تعلیم یافتہ تھے۔ کوئی بھی وزرا کے متعلق نہ بتا سکا۔ مجھے اس میں بھی شبہ ہے کہ کسی نے ان کے ہونے کے متعلق سنا بھی ہے یا نہیں؟ ان میں سے تین ڈسٹرکٹ بورڈ میں رائے دینے کا حق رکھتے تھے۔ لیکن گذشتہ انتخاب کے متعلق انہیں صرف اس قدر یاد تھا۔ کہ اس میں سے ایک نے ایک سیاست دان کے لئے رائے دی تھی۔ (جس کا انہوں نے نام بتایا) ان میں سے دو صوبجاتی کونسل میں رائے دینے کے حق رکھتے تھے۔ لیکن انہیں ذرا بھی یہ معلوم نہ تھا۔ کہ کونسل کیا ہوتی ہے؟ اور نہ ہی کسی کو خبر تھی۔ اس پر یہ کہ گاؤں ایک منڈی سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر تھا۔ ڈنگ میں جو بذاتِ خود منڈی ہے۔ جہالت اتنی ہی زیادہ تھی۔ تئیس حاضرین میں سے (چار خواندہ تھے) دو باقاعدہ سرکاری انتظام سے واقف تھے۔ لیکن صرف ایک شخص یہ جانتا تھا۔ کہ وزیر بھی ہوتے ہیں۔ اور اسے بھی یہ مطلق خبر نہ تھی۔ کہ وہ کون ہیں؟ کتنے ہیں؟ اور کیا کرتے ہیں؟ ایک نے کہا ہمارے لئے پٹواری ہی بہت بڑی ہستی ہے۔ ہم بڑے آدمیوں کے متعلق کیسے جان سکتے ہیں؟ اس پر ان علاقوں کی ایک کہاوت یاد آتی ہے۔ کہ آسمان پہ خدا ہے اور زمین پہ پٹواری ہے۔ مطلب یہ کہ دونوں کے درمیان کوئی اہم شخصیت نہیں ہے۔ گول میز کانفرنس کے متعلق صرف یہ کہا گیا۔ کہ ہم نے سنا ہے کہ کوئی تاریخ مقرر کی گئی ہے۔ لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ وہ کس مقصد کے لئے ہے۔ دوسرے نے (صریحاً قریب کے ریلوے سٹیشن کے ٹیلیفون کا خیال) کہا کہ انگلستان بہت دور ہے۔ وہاں سے ہمیں ٹیلیفون پر کون خبریں پہنچاتا ہے؟ حاضرین میں سے دو رائے دہندگی کا حق رکھتے تھے۔ لیکن یہ بات کہ کونسی جماعت کے لئے انہیں اسے استعمال کرنا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ حق ڈسٹرکٹ بورڈ کے لئے تھا۔ لیکن وہ متیقن نہ تھے۔ میں نے دریافت کیا "کیا تم نے لیجسلیٹو کونسل کے متعلق بھی سنا ہے"؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم نے

اس کا نام سنا ہے ۔ اور بس ۔ لیکن اب ہمارے بچے پڑھ رہے ہیں ۔ اور وہ ہمیں بتائینگے
اس کا اشارہ نزدیک کے ایک لوئر مڈل سکول کی طرف تھا ۔ جہاں اس وقت کام ہو رہا تھا۔
بلاشبہ یہ لڑکوں کیلئے تھا ۔ لڑکیوں کا کوئی سکول نہیں ہے ۔ لیکن لوگوں نے کہا ۔ کہ گیارہ
برس کی عمر تک لڑکوں کے ساتھ پڑھنے میں ان کا کوئی حرج نہیں ہوگا ۔ لیکن چونکہ رواج
نہیں ہے ۔ اس لئے ایسا نہیں کیا جاتا ۔

مکانات اور دیہاتی زندگی

جب کبھی میں کسی نئے علاقے میں داخل ہوتا ہوں میں یہ دیکھنے کے لئے کہ لوگ کس طرح
کی زندگی بسر کرتے ہیں ۔ ایک یا دو گھروں کا معائنہ کرتا ہوں ۔ آج ہم اس مقصد کے لئے
باگڑی جاٹوں کے ایک گاؤں میں ٹھہرے ۔ باوجودیکہ یہ گھر ایک ایسے شخص کا تھا ۔ جو ایکسو
ایکڑ زمین کا مالک تھا ۔ لیکن سوائے چند ضروریات کے باقی چیزوں سے بالکل خالی تھا ۔ مگر
تھیں سب چیزیں صاف ۔ رہائشی کمروں میں دن میں دو بار جھاڑ دیا جاتا تھا ۔ اور جیسا کہ
ہم نے پہلے کئی بار دیکھا ہے ۔ مویشی خانے میں جو گھر کا ہی ایک حصہ تھا ۔ ریت بکھیری جاتی
تھی ۔ جیسا کہ اس مالک کے اکثر لوگوں کا یقین ہے ۔ اور جیسا کہ اس کتاب میں جو میں آج
پڑھ رہا تھا درج ہے ۔ پنجاب کے متعلق یہ فرض کر لینا کہ لوگ گندگی اور غلاظت میں رہتے
ہیں ۔ پورا پورا مغالطہ ہے ۔ دیہات کی گلیاں اور اطراف اکثر کافی گندی ہوتی ہیں ۔ لیکن
صوبے کے بڑے حصے میں گھروں کو نہایت احتیاط سے صاف رکھا جاتا ہے ۔ اگرچہ مجھے
ہندوستان کے دوسرے حصوں کے متعلق بہت کم تجربہ ہے ۔ لیکن میں نے کم از کم مالوہ
واقع وسط ہند میں یہی بات دیکھی ہے ۔ پنجاب کے گھروں کی سب سے بڑی خرابی اور وہ جس کی
یہ گھر نظیر پیش کرتا ہے ۔ یہ ہے کہ سونے کے کمروں میں روشندان قطعاً نہیں ہیں ۔ جیسا کہ
ہم پہلے دیکھ چکے ہیں ۔ یہ بات زیادہ تر خطرے کے احساس کی وجہ سے ہے ۔ اور اس کا
بہترین علاج یہ ہے کہ قابل پولیس رکھی جائے ۔

مویشیوں کی بیماری کی عام علامت گلی کے وار پار لٹکی ہوئی تھی ۔ یعنی ایک رسی اور
ایک ٹھیکری جس پر تعویذ لکھا ہوا تھا اور جس کی طاقت دیہاتی کی نظر میں ٹیکہ کرانے سے کہیں
کہیں زیادہ ہے ۔ مگر اسے کبھی نہیں آزمایا گیا ہے ۔ نمبردار نے کہا ۔ کہ قحط سالی کے گذشتہ

تین سالوں میں ہم نے ۲۰۰۰ مویشیوں میں سے ۵۰۰ ضائع کر دیئے تھے۔ اور ایک اور سوال کے جواب میں اس نے کہا کہ اب خوراک کے لئے غلہ خرید کرنے کی وجہ سے انکی تعداد اور بھی کم ہو گئی ہے۔ کچھ دیر کے بعد گاؤں کے صوبیدار سے ملاقات کرتے وقت میں نے پوچھا "صوبیدار صاحب! گذشتہ تین سال میں یہاں کتنے مویشی مرے ہیں؟"

اس نے کہا صاحب دو سو۔

کیا اب بہت سے لوگ خوراک کے لئے غلہ خرید رہے ہیں؟

"نہیں صاحب۔ بہت کم"۔

اس ملک میں ایک عقلمند آدمی کسی ایسی بات کو قبول نہیں کریگا۔ جو وہ ایک آدمی سے سنے گا: تاوقتیکہ وہ کسی دوسرے شخص سے اس کی تصدیق نہ کرا لے۔

ساہوکاروں سے گفتگو

شام کو میں نے اسی آزمائش کا اعادہ کیا۔ جو کوٹ عیسیٰ خاں میں کی گئی تھی۔ اور بھٹو کے کچھ ساہوکاروں سے گفتگو کی۔ یہاں بیس یا اس سے زیادہ ساہوکار رہتے ہیں۔ اکثریت اگروال بنیوں کی ہے۔ لیکن کوئی کوئی اروڑا ہے۔ اور چار یا پانچ جاٹ بھی ہیں۔ باگڑی جاٹوں کے قریباً ہر گاؤں میں ایک یا دو جاٹ ساہوکار رہیں۔ ہم گاؤں کی کھلی چپال (چوک) میں جمع ہوئے۔ یہاں مقامی بنک کے چند ممبر بھی موجود تھے۔ میں نے یہ کہہ کر مہر سکوت توڑی کہ میں پنجاب کا سب سے بڑا ساہوکار ہوں۔ (انجمن ہائے امداد باہمی نے جن کا میں ذمہ دار ہوں۔ ساٹھ لاکھ پونڈ قرض دیا ہوا ہے) اور میں اس بات کیلئے بہت فکرمند ہوں۔ کہ دونوں کے حالات کا موازنہ نہ کروں۔ کیونکہ ان لوگوں کے لئے جو روپیہ اُدھار دیتے ہیں۔ یہ بہت نازک زمانہ ہے۔ انہوں نے یہ کہہ کر تسلیم کیا کہ بہت نازک ہے۔ میں نے دریافت کیا۔ تم نئے قرضوں کے متعلق کیا کر رہے ہو؟

"نہیں وصول کچھ نہیں ہوتا۔ پھر ہم اور روپیہ کیسے اُدھار دے سکتے ہیں؟

لیکن کیا تم میں سے بعض کے پاس روپیہ ہے؟

"ہاں" اور اگر ہم اپنے مؤکلوں کو روپیہ اُدھار نہ دیں۔ تو وہ ہمارے ساتھ لین دین کرنا بند کر دیں گے۔ اور جو کچھ اُن کو ۔ ۔ ۔ ہمیں دینا ہے۔ ہمیں اس میں سے کچھ نہ ملیگا۔

"تمہاری شرح کیا ہے؟
عام شرح پیسہ روپیہ ہے (یعنی ۱۸ فیصدی) لیکن بعض سے ہم ۱۲ فیصدی لیتے ہیں جب روپیہ کافی ہوتا ہے۔ جیسا کہ خشک سالی سے پہلے تھا۔ (یعنی ۱۹۱۸ سے کوئی اچھی فصل نہیں ہوئی ہے) تو زمینداروں کیلئے ہماری کم سے کم شرح بارہ آنے (۹ فیصدی) ہوتی ہے۔ لیکن یہ شرح ہم اس وقت لگاتے ہیں جب ہمیں یہ یقین ہوتا ہے۔ کہ جب ہم اس کا مطالبہ کریں گے۔ تو ہمیں ہمارا روپیہ مل جائے گا۔
ایک معلم اخلاق پکار اُٹھا " زمیندارو! تم سنتے ہو۔ تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہمیں ساہوکار کے جبر و تشدد کی وجہ سے سود کی زیادہ شرح دینی پڑتی ہے۔ لیکن دینی اس لئے پڑتی ہے۔ کہ تم ٹھیک وقت پر ادا نہیں کرتے۔ گذشتہ ایام میں دیہاتی کے لئے اس بات کا کافی ثبوت نہیں بہم پہنچایا گیا ہے۔ کہ اسکی مالی مشکلات پیدا کرنے میں ساہوکار کا لالچ اور اس کی بے ڈھنگی فضول خرچی برابر کی حصہ دار ہیں۔ کفایت شعار اور محنتی لوگ ہندوستان میں بھی اتنے ہی مالدار ہیں جتنے کہ اور کہیں ہیں۔
یہاں کے ساہوکار ضمانتیں نہیں لیتے۔ لیکن فی الحال زیورات کی ضمانت کے بغیر روپیہ دینے سے انکار کر دیتے ہیں ہمیں نے سب سے زیادہ معمر شخص سے دریافت کیا کہ کیا گذشتہ تیس سال میں روپیہ ادھار دینے کے طریقے میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ ہمارے اخراجات بڑھ گئے ہیں۔ اور ان کے اخراجات بھی بڑھ گئے ہیں۔ ہم گھروں اور شادیوں پر پہلے سے زیادہ خرچ کرتے ہیں۔ اور سب کے سب جنٹلمین بننے کی خواہش کرتے ہیں۔ پس اس صورت میں ادھار لیا ہوا روپیہ واپس کرنا بہت مشکل ہے پہلے زمانے میں لوگ ہر چیز اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ لیکن اب یہ بات نہیں ہے۔ یہاں تک کہ کاتنے کا کام بھی کم ہو گیا ہے۔
"پھر تم نے مہاتما گاندھی کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں کیوں نہیں کاتتے؟"
"اس لئے کہ شاستروں میں یہ لکھا ہے۔ کہ عورتیں کاتیں گی۔ اور آدمی کاشتکاری کریں گے"۔
"تو کیا پھر مہاتما گاندھی غلطی پر ہیں؟"
"ہماری عقل وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ جہاں اس کی پہنچتی ہے"۔

"کیا موجودہ اور آج سے تیس سال قبل کے زمانے میں اور بھی کوئی فرق ہے"؟

اس نے بتایا کہ اعتبار کے لحاظ سے بہت فرق ہے۔ کسی زمانے میں انگوٹھے تک نہیں لگوایا جاتا تھا۔ قرض لینے والے کے ہاتھ میں قلم دے دیا جاتا تھا۔ کہ وہ کوئی اپنا نشان بنا دے۔ وہی کافی ہوتا تھا۔ وہ مان لیتا تھا۔ اور پھر کسی نشان کی ضرورت نہ رہتی تھی۔ پھر انگوٹھے کے نشان کا رواج ہوا۔ اور پھر تمسک کا۔ اب بینک ہر چھ ماہ بعد ادائیگی کا مطالبہ کرتا ہے۔ لیکن پرانے زمانے میں حساب دس دس سال تک چلتا رہتا تھا۔

مقامی بینک کے صدر نے کہا "ہاں" اور آخر کار قرضہ اسقدر بڑھ جاتا تھا کہ ادا نہ کیا جا سکتا تھا۔ اور قرض ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جاری رہتا تھا۔ ہمارے لئے یہی اچھا ہے کہ ہم ہر ۶ ماہ بعد ادا کریں۔ اس طرح سے قرضہ تھوڑا رہ جاتا ہے۔ ساہوکار کے خلاف روزمرہ کا الزام پھر سامنے ہے۔

آجکل اگر زمیندار کے سر بہت قرض ہوتا ہے۔ تو وہ ہمارے پاس ایک ایسی گائے لے آتا ہے جس کیلئے ہمیں سو روپیہ بھی نہیں مل سکتا۔ ہمیں اپنے قرضے میں سے صرف آٹھ آنے روپیہ وصول ہوتے ہیں۔ ہم اب اتنا کم قرض دے رہے ہیں جتنا کہ ممکن ہو سکتا ہے۔ اور تین سال تک ہم بالکل بند کر دیں گے۔

میں نے کہا "یہ بہت اچھا ہوگا۔ اس لئے کہ پھر تم اپنا روپیہ بینک میں رکھ سکتے ہو اور بغیر کسی تکلیف کے باقاعدہ طور پر ۶ یا سات فیصدی سود لے سکتے ہو۔ نہ تمہیں موکلوں کے پیچھے ادھر ادھر بھاگنا پڑے گا اور نہ عدالتوں میں ان پر مقدمے دائر کرنے پڑیں گے۔

اس نے کہا ہم عدالتوں میں نہیں جاتے۔ دو سال میں گاؤں میں سے صرف ایک شخص کچہری گیا ہے۔ جھگڑوں کا فیصلہ مصالحت سے کر دیا جاتا ہے۔ ہم زمینداروں کا کام کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اور وہ ہمارا اس اظہار صلح جوئی کے بعد جلسہ برخاست ہو گیا۔ میرا خیال ہے۔ کہ ہم سب پہلے زیادہ عقلمند ہو کر اُٹھے۔

جنوب مشرقی پنجاب میں روپیہ قرض دینے کا طریقہ

مقروض اور قرضخواہ کی دائمی کشمکش کا اندازہ لگانا ہمیشہ مشکل ہے۔ بہت کچھ

دولیکے تعلقات پر مبنی ہے۔ اور یہ بات گاؤں در گاؤں مختلف ہے ۔ بہت سے ساہوکار ایسے ہیں جو اس بات پر فخر کرتے ہیں ۔ کہ وہ اپنے مؤکل کو کبھی عدالت میں نہیں لے گئے ۔ اور دوسرے ایسے ہیں ۔ جو چیلوں کی طرح عدالتوں کے گرد منڈلاتے ہیں ۔ یہ کہا جا سکتا ہے ۔ کہ اس ضلع میں بہ حیثیت مجموعی تعلقات نہ اچھے ہیں ۔ نہ بُرے ۔ دیہاتی طبقے کی پرانی یک جہتی ابھی تک باقی ہے ۔ اور جیسا کہ ہم نے دیکھ لیا ہے یہ انہیں اُن لوگوں سے بچاتی ہے ۔ جو اسکے ممبروں سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں ۔ دھوکہ بازی کثرت سے ہے ۔ ایک افسر جس نے جنوب مشرقی علاقے میں روپیہ اُدھار دینے کا نہایت احتیاط سے مطالعہ کیا ہے ۔ مجھے بتایا ہے کہ میں شاذ ہی کوئی بہی کھاتہ ایسا دیکھتا ہوں ۔ جس میں چند انگوٹھے لگے ہوئے حسابات ایسے نہ ہوتے ہوں ۔ جن میں رقوم . . واجب السلب کی جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہو ۔ ان میں سے بعض صورتیں یقیناً باہمی اعتبار لئے ہوئے ہوتی ہیں لیکن بہت سی صورتوں میں مقروض کی جہالت یا سستی سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے ۔ زیادہ تر اسی وجہ سے بھی کہ لین دین غلے کی صورت میں کیا جاتا ہے ۔ اور ساہوکار عام طور پر غلے کا بیوپاری ہوتا ہے ۔ اس کے لئے آسان ہے ۔ کہ وہ اپنے مطلب کے مطابق پیداوار کی قیمت گھٹا بڑھا کر حساب کی دونوں طرفوں میں ملمع سازی سے کام لے ۔ اس کے برعکس امداد باہمی کے وہ ممبر جن میں سے ملاقات کرتا ہوں ۔ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں ۔ کہ جاٹ بھی کوئی فرشتہ نہیں ہے ۔ ایک کا بیان ہے ۔ کہ صرف دو ماہ گذرے ہمارے گاؤں کے چار بنیوں پر اس وقت حملہ کیا گیا جبکہ وہ انکم ٹیکس افسر کے پاس سے واپس آرہے تھے ۔ اور ایک کو اس بُری طرح ضربیں آئیں ۔ کہ وہ قریب المرگ ہو گیا ۔ ایک اور شخص نے جو ستر سال سے زیادہ کا ہے ۔ بھٹو کے ساہوکاروں اور اپنے ہم عمر اکثر لوگوں کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا ۔ کہ اعتبار دونو طرف کم ہو گیا ہے ۔ اس نے بتایا کہ اسکی وجہ گاؤں میں مذہبی تعلیم کی کمی ہے ۔

حساب کتاب

اگرچہ لین دین زیادہ تر غلے کی صورت میں کیا جاتا ہے ۔ لیکن حساب کتاب تقریباً ہمیشہ نقدی کے اندازے سے رکھے جاتے ہیں ۔ وہ افسر جس کا ابھی ابھی ذکر کیا گیا تھا ۔ یہ کہتا ہے ۔ کہ گذشتہ ۸ سال میں غلے کا لین دین میں نے صرف گوڑگاؤں میں دیکھا ہے ۔ یہ صوبے

تین نہایت ہی غیر ترقی یافتہ اضلاع میں سے ایک ہے، کہیں کہیں رہتک میں ہے۔ اور حصار میں بھی اس میں ذرا جان باقی ہے۔ اس قسم کا لین دین دور دراز کے گاؤں میں صرف چھوٹے ساہوکاروں میں ممکن ہے۔ تمام لوگ اس بات پر متفق ہیں۔ کہ اس وقت ساہوکار کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ ایک تجربہ کار جاٹ کا خیال ہے۔ کہ وہ کسان سے بھی زیادہ بُری حالت میں ہے۔ وہ یہ کہتا ہے۔ کہ ہر چار بنیوں میں سے تین نے اپنی تمام نقدی اُدھار میں دے دی ہے۔ اور اب انہیں واپس کچھ نہیں مل سکتا۔ انہیں اس بات کا احساس ہے۔ کہ مقدمات لاحاصل ہیں۔ اور ان کے لئے صرف ایک ہی صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ اچھے دنوں کا انتظار کریں۔ جو اسی افسر کا بیان ہے، نہایت ہی زوردار پہلی ہی فصل کے ساتھ آجائینگے اس کے ساتھ ہی جو کچھ انہیں ملتا ہے۔ وہ اس بعد سے طور پر اُدھار دے رہے ہیں۔ لیکن صرف اپنے موکلوں کو روک رکھنے کیلئے۔ اور باقی ماندہ کی صورت میں وہ اس ڈر سے کہ قرضہ حد معینہ سے نہ نکل جائے۔ اپنی تمام چالاکی و عقلمندی کو کام میں لا کر دیہاتی کو اس بات کی ترغیب دے رہے ہیں۔ کہ وہ حسابات نئے سر سے جاری کرے۔

جیسا کہ اور کہیں یہ صورت عام ہے۔ یہاں بھی ہر دوسرے یا تیسرے سال حسابات کو نئے سر سے جاری کیا جاتا ہے۔ اور اس طرح حساب تیس سال جاری رکھا جا سکتا ہے Usurious Loans Act کے ہر ممکن اقدام کو زک دینے کے لئے ہر تجدید کو عام طور پر بناقرضہ دکھایا جاتا ہے۔ اور اس کا کھوج لگانا اس وقت تک ممکن نہ ہوگا۔ جبتک کہ روکڑ بہی عام استعمال میں نہ آجائے۔ اس وقت ایک تجدید کو آخری میزان کے قلمزن کرنے اور بظاہر فیصلہ کرنے کے چند دن بعد نئے قرضے کا اندراج کر کے دکھایا گیا۔ - - اگر ایک روکڑ بہی رکھی جائے۔ تو یہ صورت ناممکن ہوگی۔ کیونکہ اس کا اصل مقصد ہی یہی ہے۔ کہ روز کی کارروائی اسی طرح ہر روز لکھی جائے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تاریخیں بھی دی جائیں۔ نہ ہی کسی طرح کی دانستہ فریب دہی قرین قیاس ہے۔ کیونکہ بنیا اپنے بہی کھاتوں کو پوتر سمجھتا ہے۔ اور دیوالی کے موقع پر ان کی پوجا کرتا ہے۔ اور جب وہ اس جگہ کے نزدیک جاتا ہے۔ جہاں وہ رکھی ہوئی ہیں۔ تو اپنے جوتے اُتار دیتا ہے۔

آبائی قرضہ

ہندوستان میں اقتصادیات (بلاشبہ تمام کی تمام زندگی، مذہب کے رنگ میں

ڈوبی ہوئی ہے۔ اور یہ قرضے پر بھی اثر ڈالتی ہے۔ یہ بات کل ہی امرت سر کے گاؤں میں آبائی قرضہ پر بحث کرنے سے مجھے بلا ارادہ طور پر معلوم ہوگئی۔ تمام حاضرین جن میں ہندو مسلم سکھ سب شامل تھے۔ اس بات پر متفق الرائے تھے۔ کہ باپ کو تکلیف سے یا بے شعور لوگوں کے قول کے مطابق دوزخ سے بچانے کیلئے اس کے قرض کی ذمہ داری ضرور اپنے سر لینی چاہیئے۔ استثنٰی کی صرف ایک ہی صورت تھی۔ جس میں قرض صریحاً برے مقصد کے لئے لیا گیا تھا۔ حاضرین میں سے ایک بینک کا صدر بھی تھا۔ جس نے دسویں جماعت پاس کی ہوئی تھی۔ اس نے بھی یہی کہا کہ اس سے انحراف لا مذہبیت کی نشانی ہے۔ اور میرا دوست گمنام سنگھ جو کہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ سکھ ہے۔ یہ کہتا ہے۔ کہ یہ احساس عام ہے۔ بلاشبہ یہ احساس ہر حالتیں آبائی جائیداد پر قبضہ کرنے کی خواہش اور عدم ادائیگی کی صورت میں زمین کے متعلق مقدمہ بن جانے کے ڈر سے قلعہ میں محصور ہے۔ لیکن اس کی پشت پر حقیقت میں مذہب کا ہاتھ ہے۔ بقول گمنام سنگھ قرضے کی ادائیگی مسلمان۔ ہندو۔ سکھ کا مذہبی فریضہ ہے۔ ہر ایک کے لئے ضروری ہے کہ اپنی زندگی دخدا کو سونپ دینے سے پہلے اپنے حسابات صاف کرے۔ کیونکہ ایک ایسی روح جس پر قرض کا بار ہو۔ دوسری دنیا میں آرام نہیں پاتی۔ مرتے ہوئے انسان کے آخری الفاظ میں ہمیشہ قرضہ لینے اور دینے کا ذکر ہوتا ہے۔ اور یہ درخواست ہوتی ہے کہ واجبات کا فیصلہ کر دیا جائے۔ ساتھ ہی یہ کہتا ہے۔ کہ ادھار کا معقول نظام قائم رکھنے کے لئے قرض کی ادائیگی کے لئے رضامندی کا ہونا اشد ضروریات سے ہے۔ اور مذہب ہر شخص کیلئے یہ لازم بنا کر کہ وہ اپنی موت سے پہلے قرض ادا کرے۔ اسے قائم کرنے کے درپے ہوا۔ اگر اسی سادہ اصول کو مد نظر رکھا جائے۔ اور قرض کی مقدار ایسی رکھی جائے۔ جو موت سے پہلے یا اس کے بعد جلد ہی ادا کی جا سکے۔ تو ہندوستان کی اقتصادی ترقی کس قدر آسان ہو جائے گی۔

باب نہم

(حصہ گذشتہ سے پیوستہ)

تدفین زر۔ ترقی نسل مویشیان۔ عمیق کاشت

۵ فروری۔ بھالو سے آدم پور براستہ سدالپور (۱۳ میل)

جب ہم روانہ ہوئے تو شمال مغربی سرد ہوا پھر ہماری پُشت کی طرف سے آ رہی تھی۔ اور مجھے اندیشہ ہے کہ اُن لوگوں نے جو میرے پیچھے پیچھے تنگ راستے پر سے آ رہے تھے بہت زیادہ گرد پھانکی۔ علاقہ ایسا ہی تھا۔ جیسا کہ کل۔ لیکن ہماری روانگی کے اختتام کے قریب عمدہ کاشتکاری کی علامات ہویدا تھیں۔ دخوب گوڈائی کئے ہوئے چینے کے کھیت تھے۔ اور نہایت بیش قیمت کانٹے دار جھاڑی سے اچھی طرح باڑ کی ہوئی تھی۔ یہ جھاڑی خوراک اور اس کے ساتھ ہی حفاظت دونو کے لحاظ سے بیش قیمت ہے۔ کیونکہ اس سے گائیں اور بھینسیں دونوں زیادہ دودھ دیتی ہیں۔ نئے چارے کے ڈھیروں کی بڑی تعداد یہ ظاہر کرتی تھی۔ کہ گذشتہ فصل اچھی ہوئی تھی۔ تمام کے تمام احتیاط سے بنائے ہوئے تھے۔ اور انہیں چار یا پانچ سال یعنی اس عرصے کے لئے جب تک کہ چارے کو قائم رکھنے کی ضرورت تھی۔ محفوظ رکھنے کے لئے چاروں طرف سے دس فٹ اونچی باڑ سے گھیرا ہُوا تھا۔

بشنوئی

ہم سدالپور دایک بڑا گاؤں ہے اور اس کی ۶ پتیوں میں سے ہر ایک میں بینک ہے) کو دیکھنے کے لئے اپنے ریتلے راستے سے ذرا باہر گئے۔ گاؤں کے متعلق نہائیت ہی

دلچسپ بات بنیکوں سے تعلق نہ رکھتی تھی۔ بلکہ مذہب سے مربوط تھی۔ اس کے باشندے ایک عجیب ہندو فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو بشنوئی کہلاتا ہے۔ چونکہ ان کا پروہت دایک برہمن) موجود تھا۔ ہم نے ان کے متعلق سب کچھ سُنا۔ ہر ہندو بشنوئی بن سکتا ہے سیدالپور بیں برہمن۔ جاٹ۔ بنیا۔ اور چمار سب اس میں شامل ہیں۔ لیکن جو ایک مرتبہ بشنوئی بن گیا۔ اسکی ابتدائی ذات کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ عمل کرنے اور اعتقاد رکھنے کے لیئے اُن کے ہاں دھرم کے انتیس نیم (اصول) ہیں۔ ان میں سے نہایت ہی اہم یہ ہیں۔ ہر غسل کھانے والا شخص یعنی ہر وہ آدمی جو پانچ برس سے زیادہ عمر کا ہے۔ ہر روز صبح کو بھوجن چکھنے سے پہلے ضرور اشنان کرے۔ رسمی پوترتا (پاکیزگی) جو تمام ہندوستان کے ہندوؤں میں اہمیت رکھتی ہے۔ بشنوئی کے لیئے دو چند ضروری ہے۔ اور کہاوت یہ ہے کہ بیس اونٹوں کی قطاریں سے اگر بشنوئی کا کھانا پہلے اونٹ پر ہو اور کوئی غیر بشنوئی بیسویں اونٹ کو چھُو دے تو ضروری ہے۔ کہ اس کھانے کو پھینکدیا جائے۔ یہ بھی لازم ہے۔ کہ پینے کے پانی کو کپڑے میں سے چھان لیا جائے۔ تاکہ کوئی جاندار تلف نہ ہو۔ مہینے کی پہلی اور پندرہ تاریخ کو کاٹنے یا ہل چلانے کا کوئی کام نہیں کیا جا سکتا۔ تمباکو۔ بھنگ۔ افیون اور گوشت کا استعمال ممنوع ہے۔ کاسنی رنگ کے کپڑے نہ پہنے جائیں۔ اس آخری آچار (نہی) کی کوئی تشریح نہ کر سکا۔ اور ایک ایسے زمانے میں جبکہ ہر نیا سیاسی مسلک اس امر پر زور دیتا ہو۔ کہ اس کے پیروؤں کو کسی خاص رنگ کے قمیص پہننے چاہئیں۔ سوائے ایک کے باقی سب سرخ کپڑا پہننے پر لعنت بھیجتے ہیں۔ زناکاری۔ چوری اور چغلخوری خاص طور پر ممنوع ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی حکم ہے۔ کہ سبز درختوں کو نہ کاٹا جائے۔ اور یہ ایک نیم صحرائی علاقے میں عقلمندانہ ہدایت ہے۔ بکریاں بھی نہ فروخت کی جائیں۔ بلاشبہ اس لئے کہ وہ معہ اپنے مقوی دودھ اور کم خوراک کے غریبوں کی دوست ہیں۔ ایک ایسی بکری کو خریدنا جو ذبح کی جارہی ہو۔ پُن کا کارن ہے۔ اور ہر اس شخص کو جو ایسا کرے۔ چاہیئے کہ وہ اس کے کان میں ایک بالی ڈال کر اُسے آزاد چھوڑ دے۔ جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اسے خلاص کرا لیا گیا ہے۔ ایک چمار نے کہا کہ میں نے مختلف اوقات میں اپنے گھر پیدا شدہ چار بکرے آزاد چھوڑے ہیں۔ یہ اسی طرح ہے۔ جس طرح کہ دھارک ہندو بیلوں کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں مگر گائیں ہندوؤں کے پاس فروخت کی جا سکتی ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے

پاس نہیں۔ اس لئے کہ ممکن ہے۔ وہ انہیں ذبح کردیں بھینسوں کا کم لحاظ رکھا جاتا ہے اور بہ دو کے پاس فروخت کی جاسکتی ہیں۔ عام ہندوؤں میں بیلوں کے اختہ کرنے کے مذہبی اعتراض پر قابو پالیا گیا ہے۔ لیکن بشنوئی اس کے متعلق دل کڑا کئے ہوئے ہے اور کبھی اس کی اجازت نہیں دیتا۔ بالآخر یہ کہ پورنماشی سے پہلے دن تمام بچوں کو اُپ تین دیا جائے۔ اس فرقے کا بانی ایک سادھو تھا۔ جو جھانبا کہلاتا تھا۔ وہ ۱۴۵۱ء میں بیکانیر میں رہتا تھا۔ اور اب اس کے وشنو کے بہ حیثیت اوتار ہونے کے اسکی پوجا کی جاتی ہے۔ سال میں دو مرتبہ اس کے گاؤں (موکم) کی زیارت کی جاتی ہے۔ اور اگرچہ یہ ۱۵۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ لیکن ۲۰۰ یا اس سے زیادہ لوگ سدا پور سے جاتے ہیں۔ اور اگر وہ اونٹوں پر جائیں تو ۵ دن اور پیدل جائیں۔ تو صرف ایک ہفتہ لگتا ہے۔

بشنوئی کی صفائی زبان زدِ خلائق ہے۔ اور سدا پور اس کی ایک اچھی مثال ہے گھروں کو روزانہ دو بار صاف کیا جاتا ہے۔ اور ان کی دیواروں پر مہینے میں ایک بار لپائی (لیپنا) کی جاتی ہے۔ آخر الذکر کام اس وقت کیا جاتا ہے جب تالاب خشک ہو جاتے ہیں۔ اور صاف چکنی مٹی اُن کے طاس میں سے کھودی جاسکتی ہے۔ اس میں دوچند فائدہ ہے۔ گھر پائیدار بن جاتے ہیں۔ اور تالاب گہرے ہو جاتے ہیں۔ لیکن بشنوئی کی صفائی گھر تک ہی محدود نہیں ہے۔ ورنہ یہ خاص طور پر دیکھنے میں نہ آئے۔ کیونکہ جیسا کہ میں نے کل دیکھا۔ پنجاب میں گھروں کو اکثر شیشے کی طرح صاف رکھا جاتا ہے۔ سدا پور میں گاؤں کی گلیاں اتنی ہی صاف ہیں جتنے کہ گھر۔ یہ بات بہت کم دیکھنے میں آئی ہے۔ اور یہ بھنگیوں کے دو گھرانوں سے روزانہ روٹی اور فصل کے موقع پر غلّہ دینے کے عوض کام کرانے کا نتیجہ ہے۔ یہ طرزِ عمل عام ہے۔ اور اگر مویشیوں کو تھان ہی پر رکھا جاتا ہے۔ تو گلیوں کو صاف رکھنے کا صرف یہی ایک یقینی طریقہ ہے۔ اور یہ یقینی ہے۔ کیونکہ اس کا انحصار عوام الناس کی مرضی پر ہے۔ دوسری صورت یعنی حفظانِ صحت بالجبر میں اس کا انحصار خارجی حکومت پر ہونے کی وجہ سے اغلب ہے۔ کہ زبردست حاکم کی صورت میں اس سے ناراضگی کا اظہار کیا جائے۔ اور کمزور کی صورت میں اس کے خلاف خم ٹھونکا جائے۔ پنچایتوں کی توسیع کرنے کے لئے یہ ایک اور دلیل ہے۔ کیونکہ یہ حفظانِ صحت کو رضامندی سے رواج دینے کا بہترین ذریعہ ہے۔

زمین کی خرید

پشتونئی اپنے کاشتکار ہیں۔ اور اگرچہ کسی کے پاس کسی قسم کا نیا آلہ نہیں ہے یہاں تک کہ انہوں نے لوہے کا ہل دیکھا تک نہیں ہے، لیکن پھر بھی اُنہوں نے محکمہ زراعت سے کپاس کا بیج حاصل کیا ہے۔ اور بہت سے لوگ فصل کے بعد زمین میں ہل چلاتے ہیں۔ تاکہ وہ دوسری بارش کیلئے تیار ہو جائے۔ ان کی اخلاقی شہرت اُنکا کمزور پہلو ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اپنی انتیس دفعات کے باوجود وہ شادی کے رشتوں میں کہتے کچھ ہیں کرتے کچھ ہیں۔ اور متکبر اور لڑاکے ہیں۔ جب میں نے یہ تجویز کی کہ ۶ بینکوں کو ملا جلا کر چار بنا لیا جا سکتا ہے۔ تو مجھے یہ مہمل جواب ملا "آنکھیں سامنے نہیں ہوتیں" تاہم حال ہی میں قابل قدر مشترکہ مالی لین دین ہوتا رہا ہے۔

د مزارعین نے ایک مشہور خاندان سکنز نامی سے جو ضلع کے سب سے بڑے جاگیردار ہیں۔ گاؤں کا ایک چوتھائی حصہ خریدا ہے) خریداروں کی تعداد ۴۸۷ تھی۔ اور اس کی خرید کا کام ایک پنچایت نے کیا۔ جو پانچ ایسے افراد پر مشتمل تھی۔ جو ان کی طرف سے نمائندگی کر رہے تھے۔ ان میں سے صرف ایک شخص (ذیلدار) کاشتکار تھا۔ باقیوں میں سے تین بنئے اور ایک سُنار تھا۔ بلاشبہ یہ سب لوگ اس قسم کے سودے کیلئے اوسط درجہ زمیندار سے زیادہ موزوں تھے۔

روپیہ جمع کرنا

تاہم ایک یا دو دلچسپ نکات واضح کئے گئے۔ خریداروں میں اٹھارہ جُلاہے بھی شامل تھے۔ جنہوں نے اپنے جمع کئے ہوئے مال میں سے ۴۰۰۰ روپیہ دیا۔ ایک جاٹ نے تسلیم کیا۔ کہ میں نے ۷۰۰ روپے یعنی وہ روپیہ جو مجھے ادا کرنا تھا۔ کھود کر نکالا تھا۔ اور ایک اور نے بتایا کہ میرے چچا نے ۵۰۰۰ روپیہ زمین میں سے نکالا تھا۔ اس نے ساتھ ہی کہا کہ ہمارا خاندان تین پشتوں سے اپنی دولت کا کچھ حصہ فوری ضروریات کے لئے زمین میں دفن کرنے کا عادی رہا ہے۔ اس سے میرا شوق اور بڑھ گیا۔ کیونکہ میں دیر سے اس بات کو یقینی طور پر معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ اور روپیہ کس حد تک جوڑ جوڑ کر رکھا جاتا ہے۔ اور اس کی مخصوص مثالیں کبھی کبھی میرے دیکھنے میں آئی ہیں۔

اور میری تحقیقات کا نتیجہ مناسب طور پر یہاں لکھا جا سکتا ہے۔
یہاں سب سے پہلے حصار کے متعلق تمام وہ لوگ جن سے میں دریافت کرتا ہوں
اس بات پر متفق الرائے ہیں۔ کہ زمینداروں میں روپیہ جوڑنے کی عادت عام ہے۔
ایک بوڑھے عقلمند راجپوت نے کہا۔ اگرچہ پہلے کی نسبت بہت کم ہے۔ آج سے
پچاس برس پہلے زمانے کی نسبت ۵۰ فیصدی کم ہے۔ بنیوں میں پرانا رواج یہ تھا۔ کہ
خاندانی روپے کو چار حصوں میں تقسیم کر کے تین حصے زمین پر لگا دیتے تھے پھر کے بعد
دیگرے قرض دیتے اور زیور بنواتے اور چوتھے حصے کو بطور محفوظ روپے کے زمین میں دبا دیتے
تھے۔ اگرچہ اب ایسا نہیں کیا جاتا۔ لیکن زیادہ امیر آدمیوں نے بڑی بڑی رقمیں زمین میں
دبا رکھی ہیں۔ ایک افسر نے مجھے بتایا۔ کہ حال ہی میں جب میں نے ان میں سے ایک سے یہ
دریافت کیا۔ کہ مجھے ½ ۱ لاکھ روپیہ جو زمین خریدنے کے لئے درکار تھا۔ کس طرح بہم پہنچ سکتا
تھا۔ تو اس نے جواب دیا "یہ رقم میرے گھر میں موجود ہے۔"
دوسرے اضلاع کے متعلق جن میں سے ہم گذرے۔ صورت حالات یہ ہے کہ جب
ہم دریائے جہلم کے دریائی علاقے میں تھے۔ تو میں نے ایک انسپکٹر کو روپے بھنانے کیلئے
دس روپے کا نوٹ دیا۔ وہ اسے ایک واقفکار زمیندار کے پاس لے گیا۔ جس نے اسے
اس قدر میلے روپے دیئے کہ اس نے یہ دریافت کیا۔ کہ تمہیں یہ کہاں سے ملے ہیں۔ ثابت
ہوا کہ وہ کھود کر نکالے ہوئے تھے۔ لیکن صوبے کے اس حصے میں روپیہ جوڑنے کا دستور
چناب کے بھٹی راجپوتوں اور ان جنگلیوں تک محدود ہے۔ جو نصف خانہ بدوش ہیں
اور جنہیں حصار کے لوگوں کی طرح موجودہ زندگی کی روش نے چھوا تک نہیں۔ سکھے کی میں
مجھے ایک جنگلی جاگیردار کے متعلق بتایا گیا۔ کہ لوگوں کا یقین ہے کہ اس کے پاس چار لاکھ روپیہ
زمین میں دفن ہے۔ اور ایک اور کے متعلق بتایا گیا۔ کہ وہ دو لاکھ روپیہ زمین میں سے نکالنے
کو ہے۔ تاکہ اسے بینکنگ یونین کے پاس جمع کرا دے۔ جب پیپلز بنک نے دیوالہ دے دیا۔
تو اس سے ایک روپیہ بھی وصول نہ کیا جا سکا۔ ذیلدار نے قریب قریب مؤدبانہ آواز میں اس پر
یہ حاشیہ آرائی کی "اس کے پاس تو پونڈ ہیں"۔ اس وقت کے بعد پیپلز بنک ایک بار پھر جاری
کیا گیا تھا۔ اور پھر دیوالہ دیدیا تھا۔ اور اس سے کہیں زیادہ بڑا بینک الائینس نامی نے
بھی دیوالہ دے دیا ہے۔ زمیندار اگر روپیہ جمع کرانے سے ڈرتا ہے۔ تو یہ کوئی تعجب کی

بات نہیں ہے۔ خوش قسمتی سے امداد باہمی کے بینکوں کا نظام عمل زیادہ اعتماد کی روح پھونکتا ہے۔ اور اب منکانہ میں دو جھنگیلوں میں سے ہر ایک نے ۔۔۔۔۴۰ روپیہ بینکنگ یونین میں جمع کرایا ہے۔

باقی صوبے کے متعلق یہ ہے۔ کہ گذشتہ سال جب میں پنجاب کے بینکونکی تحقیقاتی کمیٹی کا ممبر تھا۔ تو میں نے اس مضمون کے متعلق انکم ٹیکس اور امداد باہمی کے تجربہ کار افسروں سے خاص تحقیقات کیں۔ اور وہ یہ لوگ ہیں جو شہر اور دیہات کے اقتصادی حالات سے صوبے کے دوا فسران کی نسبت زیادہ واقفیت رکھتے ہیں۔ تقریباً تمام کی یہ رائے تھی۔ کہ جنگِ عظیم کے بعد سے روپیہ شاذ ہی جوڑ جوڑ کر رکھا جاتا ہے۔ اور یہ کہ سوائے چند غیر ترقی یافتہ اضلاع کے باقی جگہوں میں اس کا دستور صرف عورتوں۔ گاؤں کے ملازموں اور زیادہ خانہ بدوش لوگوں میں عام ہونے کی حیثیت سے باقی ہے۔ تاہم ایک بات مدنظر رکھنی چاہیئے۔ روپیہ جوڑنا بدامنی کا قدرتی نتیجہ ہے۔ اور کفایت شعار کیلئے بدامنی خواہ سیاسی ہو یا اقتصادی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ مستحکم مستقل حکومت کے قائم ہونے اور نہروں کے انتشار سے بدامنی کی دو نو صورتیں بہت کچھ گھٹ چکی ہیں۔ لیکن حال ہی میں اس دوگونہ طرز عمل کو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اقتصادیت کی صورت میں قیمتوں کے گرنے سے اور سیاست میں سول نافرمانی سے۔ قیمتوں کا گرنا مشترک سرمائے پر تباہی لایا ہے۔ اور اس کی وجہ سے کفائیت شعار لوگوں نے اپنا ہاتھ روپیہ لگانے سے کھینچ لیا ہے سول نافرمانی کے متعلق یہ ہے۔ کہ ہندوستان میں اعتماد کا پودا اتنا نازک ہے۔ کہ گذشتہ موسم گرما کی ہلچل تعلیم یافتہ لوگوں تک کو روپیہ جوڑنے پر لگانے کے لئے کافی تھی۔ ایک ہندوستانی دوست نے جو تجارتی دنیا سے لگاؤ رکھتا ہے۔ یہ بتایا کہ بیشمار افسروں نے مجھے اس کام پر مقرر کیا۔ کہ میں ان کے لئے کم سے کم ممکن قیمت پر اشرفیاں خریدوں۔ سیاست دانوں کو یہ بات خاص طور پر ذہن نشین کر لینی چاہیئے۔ کہ بڑے پیمانے پر روپیہ پھیلائے بغیر ہندوستان میں (ایسے اصولوں پر جن میں فرقہ داری کا دخل نہ ہو) مادی ترقی کا ہونا ناممکن ہوگا۔

زیورات

یہ سب کچھ نقد روپیہ جوڑنے کے متعلق تھا۔ اس سے زیادہ عام صورت زیورات کا

جمع کرنا ہے۔ گذشتہ موسم گرما کی تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ قیمتوں کے گرنے سے پہلے اس چار یا پانچ کروڑ روپے کا سونا جو ہر سال باہر سے پنجاب میں آتا ہے۔ کم از کم ۱/۲ ۳ حصّہ عام طور پر زیورات کے لئے خرچ کیا جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے ہر ایک بات یہ یقین دلا سکتی ہے۔ کہ یہ خرچ اب کم ہو رہا ہے۔ اپنے گذشتہ دورے میں میں نے اس کی علامات دیکھی تھیں۔ خصوصاً ان گاؤں میں جہاں تعلیم نے گھر پیدا کر لیا تھا۔ اور جو کچھ میں نے اس دورے میں سُنا ہے اس سے بھی یہی بات ظاہر ہوتی ہے۔ کہ ان جملہ خیالات کی تصدیق اُن نہایت شاندار تحقیقات سے ہوتی ہے۔ جو گذشتہ موسم گرما میں بنکنگ تحقیقاتی کمیٹی کے موقع پر کی گئی تھیں۔ اسلئے یہ بات نہایت وثوق سے کہی جا سکتی ہے۔ کہ دونوں طریقوں سے روپیہ جوڑنا جنگِ عظیم کے پہلے زمانے کی نسبت اب بہت کم عام ہے۔ جو محض اعتماد کے بڑھ جانے اور روپیہ لگانے کے لیے سہولتیں حاصل ہونے کا نتیجہ ہے۔ اور زیورات کی صورت میں یہ تعلیم کے پھیلنے کا معیار زندگی کے معہ اپنے مطالبہ زر بڑھ جانے اور حال ہی میں سب سے بڑھ کر قیمتوں کے گر جانے کی وجہ سے ہے۔

گھوڑے کی پیٹھ پر سواری

ہم نے دیکھا کہ آدم پور میں گاؤں اور اس کے پیپل کی درمیانی کھلی جگہ میں نہایت خوشگوار طریق سے نصب کی ہوئی خیموں کی ایک بستی ہمارے آنے کی منتظر تھی۔ آجکل خیمے بہت کم استعمال میں آتے ہیں۔ ذیلدار نے کہا کہ اس وقت سے جب مسٹر لطیفی بحیثیت ڈپٹی کمشنر یہاں آئے تھے۔ یہ اور کسی افسر کے لئے نہیں لگائے گئے۔ وہ زمانہ ۱۹۲۰ء کا تھا۔ اس نے یہ بھی ذکر کیا۔ کہ اس طرف سے گذرنے والے آخری صاحب مسٹر سی۔ ایچ ٹاؤن شنڈ تھے۔ جو ۱۲-۱۹۱۱ء میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ بھٹوئیں ذیلدار نے کہا۔ کہ مسٹر سی۔ ایم۔ کنگ کے بعد سے جو ۱۳-۱۹۰۱ء میں افسر بندوبست تھے . . . . کوئی صاحب اس علاقے میں سے نہیں گذرا۔ میں ان بیانات کی تصدیق نہیں کرتا۔ لیکن یہ کھلم کھلا سُننے میں آتا ہے۔ اور قابل افسوس ہے کہ جنگ سے پہلے ایام کی نسبت اب گھوڑے پر بہت کم دورہ کیا جاتا ہے۔ اس کی ذمہ داری موٹر اور سیاست پر عائد ہوتی ہے۔ سیاست پر اس لئے کہ گورنمنٹ بہت سے ایگزیکٹو افسروں کو ٹیلیگراف یا ٹیلیفون کے آخری مقام پر موجود رکھتی ہے۔ اور موٹر کی وجوہات صریح ہیں۔

لیکن یہ اکثر بالکل بری ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ کہ کسان اُن لوگوں سے جو اسے کھیتوں میں پالکاؤں تیہ بتے، یہ سب کچھ کہ دیتا ہے۔

۶ فروری - آدم پور سے حصار (۱۸ میل)

حصاری سانڈ

حصار میں جہاں ۲۷ ہزار کی آبادی ہے۔ ہم نے زیادہ تر مویشیوں کے متعلق گفتگو کی کیونکہ فارم معائنے ۔۔۔ ہم۔ ایکڑ زمین کے مویشیوں کی افزائش نسل کے لئے صوبے کا نہایت ہی اہم مرکز ہے۔ گرم آب وہوا میں مویشی مرطوب جگہ کی بجائے خشک طبقے میں زیادہ اچھے رہتے ہیں۔ اور صوبے کی تمام بہترین نسلیں خشک رقبوں میں پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر دھانی نسل جسے ہم نے دریائے جہلم کے شمالی علاقے میں دیکھا تھا۔ اور ہریانہ جو حصار اور رہتک میں پھلتا پھولتا ہے۔ ہریانہ نسل سے جسے بعض صورتوں میں گجراتی نسل کے ملاپ سے دوغلا کر دیا گیا ہے۔ مشہور حصاری سانڈ پیدا ہوا ہے۔ جو حکومت ہند کی طرح پرشکوہ ہے بعض دیگر لحاظ سے بھی اس کے مشابہ ہے۔ بے حد جسیم اور طاقت ور۔ لیکن چلنے میں سست اور رکھنے میں گراں ہے۔ جہاں چاہتا ہے چرتا ہے۔ تابو میں رکھنے کیلئے مضطرب ہوتا ہے۔ انتہائی درجہ کا ضبط رکھتا ہے۔ (ان خوبیوں کے ہوتے ہوئے) وہ اس تمام علاقے میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ اور اس قدر اندھا دھند خدمات انجام دیتا ہے۔ کہ اس کی نصف طاقت وقعت ضائع کی جاتی ہے۔ نصف صدی سے زیادہ عرصے تک گورنمنٹ کی مسلسل سرپرستی کی وجہ سے اس نے بہ مقابلہ اس شہرت کے جو وہ اس صوبے میں آزادرہ کر اپنی خوبیوں کی بنا پر کرتا۔ لیکن زیادہ شہرت حاصل کر لی ہے۔ باوجود اس کے کہ اس کی نسل بڑھانے اور پرورش کرنے پر ۵۰۰ روپے صرف ہوتے ہیں۔ اسے ڈسٹرکٹ بورڈوں کے پاس ۲۵۰ روپے میں فروخت کر دیا جاتا ہے۔ اور جہاں زیادہ ہل چلانے کی ضرورت ہوتی یا کنوئیں پر مشقت اٹھانی پڑتی ہے۔ تو اس کی نسل اپنی گراں پرورش کو صحیح ثابت کرتی ہے۔ اور بہترین مقامی بیل سے بہت زیادہ قیمت پاتی ہے۔ لیکن شمال اور مغرب کی ریتلی اور بھربھری زمینوں میں جہاں کسان غریب ہے۔ چھوٹے قد کی نسل اچھا کام دیتی ہے۔ اور اسے اس پر بہت ترجیح دی جاتی ہے۔

حصاری اور دھنی نسلوں کا مقابلہ

چھوٹے قد کی نسلوں میں سے بہترین نسل دھنی ہے۔ اور گجرات جیسے ضلع میں جہاں دھنی اور حصاری بیل پہلو بہ پہلو کام کرتے ہیں۔ حصاری بیل کی بندشیں صاف صاف ظاہر ہیں۔ گجرات کے ایک ذیلدار نے جسے میں اگلے دن ملا۔ اس معاملے کو اچھی طرح سے پیش کیا۔ اس نے بتایا کہ دھنی بیلوں کی ہڈیاں موٹی اور سینگ مضبوط اور چلنے میں تیز ہوتے ہیں۔ حصاری نسل کے بیل نہایت جسیم ہوتے ہیں۔ لیکن انہیں کھلائے کون؟ ان کی خوراک بہت ہے۔ وہ حضور کے گھوڑوں جیسے ہیں (امیروں کیلئے اچھے اور غریبوں کے لئے بُرے) پھر یہ محسوس کر کے کہ شاید میں نے حصاری بیل کے متعلق منصفانہ رائے نہیں دی۔ اس نے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ کہ دھنی نسل کے مقابلے میں وہ سست رفتار ہیں۔ لیکن وہ دور دور جاتے ہیں۔ اور تھکتے نہیں۔ دیکھا س میل آگے اور اتنا ہی پھر واپس) ہم نے بھی ایک ایسے بیل کا ذکر سُنا جس نے اتنا فاصلہ طے کیا۔ وہ صبح چار بجے روانہ ہوا۔ اور اگلی صبح کے چار بجے تک چلتا رہا۔ دھنی بیل بھی خوب چلتا ہے۔ مگر اتنا اچھا نہیں چلتا۔ یہ ۲ گھنٹے کام دیتا ہے۔ اگر ضرورت ہو تو بارہ گھنٹے بھی۔ اس کے پیچھے ہاتھ میں ڈنڈے کا ہونا اچھا ہے۔ لیکن حصاری بیل خواہ چھڑی ہاتھ میں ہو۔ خواہ نہ ہمیشہ سست چلتا ہے۔ یہ بیل گاڑی اور کھینچنے کے کام کے لئے بہترین ہے۔ لیکن اگر اسے خوراک نہ ملے تو فوراً لاغر ہو جاتا ہے۔ لیکن دھنی نسل کا بیل خوراک نہ ملنے کی صورت میں بھی مضبوط رہتا ہے۔ اسے پیدا ہوتے ہی تیل دیا جاتا ہے۔ اور یہ بڑھاپے تک قوی رہتا ہے۔ صوبے کے دوسرے سرے پر گوڑگاؤں میں میرے گذشتہ دورے کے موقعہ پر لوگوں نے اس سے کہیں زیادہ سخت الفاظ میں حصاری بیل کی مذمت کی۔ وہاں معاملہ مقابلے کی دو اچھی نسلوں کا نہ تھا۔ بلکہ سراسر غیر موزونیت کا تھا لوگ اتنے غریب ہیں کہ اس کے معیار اور مقابلے کا بیل نہیں رکھ سکتے۔ بلاشبہ اُسے ایک دیوتا کی طرح یورو پا (دیوی) کی تلاش میں پھرتے ہوئے دیکھ کر اور دُبلی پتلی گایوں کو پاکر یہ مثل یاد آتی تھی۔ کہ افضل چیز اچھی شئے کی دشمن ہے۔

درحقیقت ایک ایسی چیز کسان کے سامنے پیش کرنا جسے وہ جہالت یا غربت کی وجہ سے

استعمال نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ بذاتِ خود کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو۔ فضول ہے۔ اس کیلئے
اصلاح خواہ ۔۔ وہ بڑے بیل کی صورت میں ہو خواہ زیادہ طاقت والے ہل کی شکل میں۔ صرف
اسی وقت فائدہ مند ہو سکتی ہے۔ جب کہ یہ اس کے حالات کے موافق ہو۔ اس لئے کسی
تبدیلی کا قصد کرنے سے پہلے ان حالات کا احتیاط سے مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اور یہی وہ بات
ہے جو اس سول روزنامچے کے لئے بطور عذر پیش کی جا سکتی ہے۔ محکمہ علاج مویشیان
کے کارکن چھوٹی نسل کے بیلوں کی پرورش کرنے کی کوشش کر کے اب عقلمندی سے
کام لے رہے ہیں۔ یہ بیل (جو اپنے ہم جنسوں میں نیم دیوتا ہے) کسان کی ضروریات کو
پورا کرے گا۔ یہ ضروریات دودھ اور کھینچنے کے کاموں پر انحصار رکھتی ہیں۔ حصاری نسل
کھینچنے کے کام کے لئے افضل ہے۔ اور ساہی وال اور منٹگمری کی نسل دودھ کے لئے
لیکن دونوں میں سے کوئی بھی دونوں باتوں میں فضیلت نہیں رکھتی۔ اور جیسا کہ کسان کے
ذرائع آمدنی نہایت محدود ہیں۔ ایک ایسی نسل پیدا کرنی مقصود ہے۔ جو سرکاری طور پر
ذو مقصد (دو نو فائدے دینے والی) گائے کہلاتی ہے۔ یعنی یہ کہ ایک ایسی گائے
جس کی نسل دونو مقاصد یعنی دودھ دینے اور کھینچنے کے کام کے لئے مفید ہو۔ کسان کی
ضروریات کے گہرے مطالعہ نے آخر کار اس نتیجہ پر پہنچایا ہے۔ کہ اب وہ حتیٰ نسل کو ترقی
دی جا رہی ہے۔ اور اب یہ نہیں فرض کیا جاتا۔ کہ پنجاب کے تقریباً ہر دیہاتی علاقے میں
حصاری بیل زیادہ اچھا کام دے گا۔

بھینس

ایک بات کے متعلق ابھی کارروائی کرنی باقی ہے۔ ایسے اضلاع میں جہاں چارہ
کافی ہے۔ مویشیوں سے بہت زیادہ آمدنی ہے۔ صرف حصار میں ہی اغلباً ۱۵ لاکھ
(۱۲،۵۰۰ ، ۱ پونڈ) سے کم نہیں ہے۔ اب اس آمدنی کا زیادہ حصہ گھی کی فروخت سے
حاصل کیا جاتا ہے۔ اور گھی کے لئے بھینس گائے سے بہتر ہے۔ اس لئے کہ اس کے
دودھ میں زیادہ غذائیت اور افراط دونوں ہیں۔ شمالی علاقے میں جہاں نہ دریا ہیں۔ نہ نہریں
دونوں میں کوئی رقابت نہیں ہے۔ کیونکہ علاقہ خشک ہے۔ اور اتنا پتھریلا ہے۔ کہ اس
میں ایسے تالاب نہیں بن سکے۔ جن میں بھینسیں کو ہیں۔ لیکن دوسری جگہ میں اگر دونوں کو

رکھا جا سکے۔ (کسان کے پاس ایسا کرنے کے وسائل شاذ ہوتے ہیں) تو بھینس کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اور اس وقت بھی جب کہ دونو رکھی جاتی ہیں۔ گھر کی مالکہ بھینس کا زیادہ خیال رکھتی ہے۔ کیونکہ گائے کو بیل کی ماں سمجھا جاتا ہے۔ اور بھینس کو گھی پیدا کرنے والی اور اہی سے پیدا کرنے والی چیزیں گھر کی مالکہ کی ضروریات ہیں۔ اسی لئے ضرب المثل یہ ہے۔ کہ جب تقدیر ساتھ دیتی ہے۔ تو بھینس بچھیا (کٹی) دیتی ہے۔ اور گائے بچھڑا۔ اس کے ساتھ ہی یہ کہ بھینس اگرچہ سیاہ اور دھندلی آنکھوں والی نظر آتی ہے۔ شفقت کو سمجھتی ہے۔ اور اپنے مالک کی آواز کا جواب دیتی ہے۔ اور بعض اوقات کسی دوسرے کے ہاتھ دودھ دینے سے انکار کر دیتی ہے۔ بہت سے گھروں میں کسان اُسے سب سے زیادہ پیار کرتا ہے اور تقدیس کے زیر اثر نہ ہونے کی وجہ سے اسکی نسل بڑھانے میں گائے کی نسبت بہت کم دقتیں اُٹھانی پڑتی ہیں۔ کم از کم وسطی پنجاب میں اسے مقابلتہً آسان ہونا چاہیئے کیونکہ جیسا کہ میں نے ترن تارن کے نزدیک دیکھا۔ بھینسے کو کام میں لگایا جا سکتا ہے۔ اور اس کی خدمات کا معاوضہ لیا جا سکتا ہے۔ عام طور پر کسان گائے کی نسبت بھینس کا جوڑ ملانے میں نہایت احتیاط سے کام لیتا ہے۔

باوجود اس کے کہ بھینس صوبے کو دودھ بہم پہنچانے کے لئے اہمیت رکھتی ہے اب تک گورنمنٹ نے اس کی نسل کو ترقی دینے کے لئے کوئی اہم کام نہیں کیا ہے۔

ترقی نسل مویشیان

ہندو مذہب اس رویہ کی بنا پر جو یہ (جانوروں کو) ذبح کرنے کے متعلق رکھتا ہے۔ مویشی پالنے کی مجوزہ ترقی کو قریب قریب ناممکن بنا دیتا ہے۔ مقامی ماہرین کا بیان ہے۔ کہ محض اتنا کیا جا سکتا ہے۔ کہ ترقی نسل کے بیلوں کو اختہ کر دیا جائے۔ اور کاشتکار کو کہا جائے۔ کہ وہ اچھی گائیں رکھے۔ اب سوائے بشنوئیوں کے چھوٹے فرقے کے اور کوئی اختہ کرنے پر معترض نہیں ہوتا۔ لیکن ذبح کرنے پر تمام ہندو اعتراض کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ناکارہ گایوں کی فروخت پر بھی معترض ہوتے ہیں۔ اور انہیں غیر محدود عرصے تک رکھتے ہیں۔ اور اگر وہ اتنے غریب ہیں۔ کہ ایسا نہیں کر سکتے۔ تو وہ بجائے اس کے کہ اُسے مویشیوں کے تاجر کے پاس فروخت کریں۔ جو اُنہیں فقط مذبح میں لے جانے کے لئے

خریدنا ہے ۔ گئوشالہ میں بھیج دیتے ہیں ۔ یا مرنے کیلئے کھلا چھوڑ دیتے ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ بعض چُپ چُپ چھپا کر فروخت کر دیتے ہیں ۔ لیکن ایسے علاقے میں جہاں عوام کی پرائے پنچایت کے ذریعے سے نہایت پُر زور طریق پر ظاہر کی جا سکتی ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ مشکلات بھی ہیں ۔ ذبح کرنے کے اس مخالف احساس میں بہت سے سکھ بھی حصہ لیتے ہیں ۔ ضلع امرتسر میں جب میں نے مویشیوں کی نسل بڑھانے والی ایک سکھ انجمن سے یہ دریافت کیا ۔ کہ کیا تم ایک ایسی گائے بیچ دو گے ۔ جو ناکارہ ہو جائے ۔ تو سب نے کہا ۔ "نہیں" ۔ ایک نے ساتھ ہی کہا ۔ ہم نے اس سے بہت فائدے اُٹھائے ہیں ۔ اور اگر ہم اسے فروخت کریں ۔ تو یہ ناشکری ہوگی ۔ ہم اسکی خدمات کو یاد رکھتے ہیں ۔ اب سوائے اسکے کہ کوئی شخص اس نرم دلی سے محبت کرے ۔ اور اسے عزت کی نظر سے دیکھے ۔ اور کچھ نہیں ہو سکتا ۔ یہ جذبہ ہر اس جگہ دیکھا جا سکتا ہے ۔ جہاں ہندو خاندان کے لوگ ہیں ۔ یہاں تک کہ مسلمانوں میں بھی ۔ لیکن جب اسے ایسی گایوں کی طرف منسوب کیا جائے ۔ جنہیں ہرگز نہیں رکھنا چاہیئے تھا تو یہ مویشیوں کی نسل بڑھانے میں ایک کھلی رکاوٹ ہے ۔ حصار اور رہتک میں اکثر گایوں کی یہی صورت ہے ۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں ۔ کہ صرف چند دیکھی پانچ فی آدمی گائیں اوسط میں تو صورتِ حالات اور بھی خراب ہو جاتی ہے ۔ ایک ماہر فن نے یہ سوچا کہ بہترین چارہ کار یہ ہوگا ۔ کہ بدترین گایوں کو محصور کر لیا جائے ۔ اور اس طرح ان کا گابھن ہونا ناممکن بنا دیا جائے ۔ اس کا بیان ہے کہ صوبے کے جنوب مغربی حصے میں ایسا کیا جاتا ہے ۔ اور مجھے یہ بھی خبر ملی ہے ۔ کہ لاہور اور سیالکوٹ میں بھی بعض اوقات جوان گھوڑیوں کو وقت سے پہلے گابھن ہونے سے پہلے روکنے کیلئے ایسا کیا جاتا ہے ۔

اگر سانڈ کو دہقان پر باندھا جا سکے ۔ جیسا کہ بعض اوقات بھینسے کے ساتھ کیا جاتا ہے تو یہ علاج غیر ضروری ثابت ہوگا ۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے ۔ بدقسمتی سے دریائے جہلم کے جنوبی علاقے میں ہر جگہ اُسے کھیتوں میں چرنے اور فصلوں کو روندنے کے لئے آزاد پھرنے دیا جاتا ہے ۔ اس کا فائدہ صرف اتنا ہے کہ وہ ورزش بھی کر لیتا ہے ۔ اور اسے خوراک بھی بہم پہنچ جاتی ہے ۔ اور حصہ رسدی اپنی پرورش کا خرچ تمام گاؤں میں تقسیم کر دیتا ہے ۔

لیکن یہ طریقہ کفایت شعارانہ نہیں ہے ۔ بہاؤالدین میں یہ بات تسلیم کی گئی تھی ۔ کہ

یہاں حصاری بیل اس چارے کی نسبت جو اسے تھان پر کھلانے کے لیے کافی ہوگا۔ کم از کم تین گنا چارہ چٹ کر جاتا ہے۔ یا اتنا ہی نقصان پہنچا دیتا ہے۔ لیکن ایک کسان نے ایک مشہور کہاوت بیان کرتے ہوئے کہا۔ کہ راجہ کی طرح سانڈ کو بھی نہیں باندھا جا سکتا امرت سر کے ایک گاؤں میں جب میں نے دریافت کیا کہ کیا جو بات بھینسے کی صورت میں ممکن ہے۔ وہ سانڈ کی صورت میں ممکن نہیں۔ تو کسی نے کہا۔ کہ بھینسا اس قدر سخت جان ہے۔ کہ اسے اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ لیکن سانڈ اس سے زیادہ نرم طبیعت ہے۔ اور جلد کام کرنے کے نا قابل ہو جائیگا۔ بھینسے کی مثال جاٹ کی سی ہے۔ کوئی چیز اسے کمزور نہیں بناتی۔ اور سانڈ ایسا ہے جیسا کہ برہمن۔ اس کی قوت جلد زائل ہو جاتی ہے۔ تاہم دریائے جہلم کے شمالی حصے میں کسان اس بات پر بھی اتنا ہی زور دیتا ہے کہ سانڈوں کو ضرور باندھ کر رکھا جائے۔

مویشیوں کی بیماریاں اور ٹونے ٹوٹکے

چونکہ سانڈوں کو باندھ کر نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ خوش نصیبی کی بات ہے کہ اب پست قد بیلوں کو اختہ کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح عوام کے تعصب پر قابل فخر فتح حاصل کی گئی ہے اور اسے ناکارہ نر مویشیوں کا تخم زائل کرنے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ کسان اس سے اگلے علاج یعنی ٹیکہ کرانے کی شرائط کا قائل ہو جائے۔ صرف وقت آنے کی بات ہے۔ پہلے ہی وہ اب اس اصول پر اعتراض نہیں کرتا۔ اگرچہ عملی حیثیت سے اس کے متعلق اس کا اعتقاد پختہ نہیں ہے۔ جس کے ثبوت میں فارم کے مہتمم نے ذیل کی مثال پیش کی۔ "گذشتہ ماہ میں نے ایک گاؤں میں مویشیوں کو وبا سے بچانے کے لئے ٹیکہ لگایا۔ اور نتیجہ دیکھنے کے لئے واپس آنے پر مجھے گاؤں میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی گئی۔ کیونکہ گلی کے وار پار لٹکے ہوئے تعویذ کا معروف ٹونا علاج آزمایا جا رہا تھا۔ یہ تعویذ ایک سادھو سے لیا گیا تھا۔ اور ایک ٹھیکری پر لکھا جا رہا تھا۔ مویشیوں کو ہانک کر اس کے نیچے سے گذارا گیا۔ اور جب وہ ڈھنگا سے ہوتے ہوئے اس کے نیچے سے گذرتے تھے۔ تو سڑک کے دونوں طرف رکھے ہوئے بڑے بڑے کڑھاؤں میں سے اُن پر پانی ملا ہوا دودھ چھڑکا جاتا تھا۔ اس رسم کی ادائیگی کے دوران میں کسی کو گاؤں چھوڑنے

یا اس میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی جاتی تھی۔ تمام کام التوا میں ڈال دیا جاتا تھا یہاں تک کہ اس شخص کے لئے کنوئیں سے پانی بھی نہ نکالا جا سکتا تھا۔

موجودہ و گذشتہ دورے کے حاصل کردہ تجربات سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یہ تمام صوبے میں مویشیوں کی بیماریوں کا علاج کرنے کا نہایت ہی مقبول طریقہ ہے۔ اس دورے میں میں نے اسے جہلم میں مسلمانوں۔ فیروز پور میں سکھوں۔ اور حصار میں ہندوؤں میں دیکھا ہے۔ گاؤں در گاؤں دستور العمل میں خفیف سا فرق ہوتا ہے۔ لیکن تعویذ ہمیشہ گلی کے وار پار لٹکایا جاتا ہے۔ گاؤں کے سکھوں نے کہا۔ ہم نے اسے لٹکا دیا۔ اور اس رات ہم نے نہ لیمپ جلایا اور نہ آگ۔ اگلی صبح ہم نے اپنے تمام مویشی ڈور کے نیچے سے گذارے۔ اور ہم خود بھی کھیتوں میں گئے۔ اور وہاں آگ جلائی۔ اور کھانا پکایا۔ اور جب ہم واپس آئے تو بیماری پاؤں اور منہ کی تھی۔ دور ہو گئی تھی۔ اور مویشی تندرست تھے۔ اس سے دس یا بارہ مر گئے تھے۔ لیکن اس کے بعد کوئی نہ مرا۔ ہندوؤں کے گاؤں میں دودھ ملا ہوا پانی گاؤں کے گرد ایک دائرے کی شکل میں بھی چھڑکا گیا تھا۔ اور دونوں گاؤں میں اگرچہ ایک میں صرف مسلمانوں کے صرف تین گھر تھے، تعویذ ایک مسلمان پیر سے لیا گیا تھا۔ ایسا اکثر کیا جاتا ہے۔ اور جب ہندو اور سکھ مسلمانوں کے ساتھ جھگڑتے ہیں۔ جیسا کہ وہ بعض اوقات کرتے ہیں۔ تو انہیں یاد رکھنا چاہئیے۔ کہ مذہب میں بھی ان کی بعض باتیں مشترکہ ہیں۔ مالیر کوٹلہ میں سکھوں نے تعویذ ایک پٹھان سے لیا تھا۔ جو اس کے لئے کچھ نہ لیتا تھا بلاشبہ وہ ایک بزرگ شخص تھا۔

بیماریوں کو شفا دینے کے لئے تعویذوں کا استعمال کرنا پنجاب کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ یہاں تک ہندوستان کے لئے بھی نہیں۔ میں نے اس سے پیشتر بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ کہ اس کا رواج عرب میں عام ہے۔ جو خواہ کیسا بھی ہو۔ ایک ایسا علاقہ ہے۔ جو ہندوستان سے ملتا جلتا ہے۔ روس جیسے عیسائی ملک میں اس کا ہونا اس امر پر اور بھی دلالت کرتا ہے۔ شمال میں اتنی دور تک جہاں آرینجل واقع ہے۔ ملیریا کا علاج یہ ہے کہ بیمار پر دھان اور زم زم کیا ہوا پانی چھڑکا جائے۔ تاکہ ان شیطانی روحوں کو بھگا دیا جائے۔ جو اس میں کپکپی پیدا کر رہی ہیں۔ اور اس کے دانتوں کو بجا رہی ہیں۔ اور جب کوئی شخص چیچک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ تو پہلے دفعہ کوئی افسون پہلے تین بار اس کے

کان میں پھونکا جاتا ہے۔ پھر کاغذ پر لکھ کر اس کے گلے کے گرد باندھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ تندرست ہو جاتا ہے۔ ہندوستان میں اور بلا شبہ روس میں بھی یہ طور طریقے آہستہ اور بہت آہستہ اپنی جگہ سائینس کی نئی روشنی سے بدل رہے ہیں۔ لیکن جہاں کہیں انسان ابھی تک ما ورقدرت کے رحم میں ادھورے بچے کی طرح اندھیرے میں ہے۔ اس کی روشنی محض اعتقاد ہے۔ اور یہ ایک ایسی روشنی ہے۔ جو اکثر فسوں سازی میں ملفوف ہوتی ہے

کیا مویشیوں کی نسل بڑھانا نفع بخش ہے؟

حصار کے سابق افسر بندوبست کا بیان ہے۔ کہ مویشی زمیندار کی دولت ہیں۔ اور وہ اپنی تمام بچت ان پر صرف کر دیتا ہے۔ اس پر بھی غم انگیز حقیقت یہ ہے۔ کہ مویشی پالنے کا صلہ نہیں ملتا۔ حصار کے ماہران فن کا بیان ہے۔ کہ رہتک میں خاص طور پر اندازہ لگانے سے یہ معلوم ہوا ہے۔ کہ وہاں میدان میں ۷۰ فیصدی گائیں اپنے کھلانے پلانے کا صلہ بھی نہیں دیتیں۔ اگر تین سال سے بارش کی قلت نہ ہوتی تو حصار میں صورت حالات اور بھی خراب ہوتی ایک ایسے ملک میں جو مویشیوں کو ذبح کرنے میں مزاحم ہوتا ہے۔ خشک سالی اُن چند امور میں سے ہے۔ جو مویشی پالنے میں معاون ہوتے ہیں۔ کمزور مویشیوں کی صفائی کر کے یہ اچھے مویشیوں کے اوصاف قائم رکھنے میں مدد دیتی ہے۔ جس طرح ایک مرتبہ وبا نے یورپ کے انسانوں کے ساتھ کیا تھا۔ لیکن یہ دستور العمل مویشی پالنے والے کے لئے بہت گراں ہے۔ وسطی پنجاب میں مویشی بہت کم پالے جاتے ہیں۔ اور کھینچنے کا کام کرنے والے بیل اکثر خریدے جاتے ہیں۔ چونکہ جائیدادیں کم ہیں۔ اور پہاڑوں کے متصل اضلاع میں نمی کی وجہ سے وہاں مویشیوں کی بیماری کا ہونا اغلب ہے۔ اس لئے یہ اور یہ روش دانشمندانہ ہے۔ دریائے جہلم کے شمال میں خشک اور بلند میدان اس کے لئے بہت موزوں ہیں۔ اور دھنی نسل اسی کا نتیجہ ہے۔ اس کے باوجود وہاں بھی یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا مویشی پالنے کا صلہ ملتا ہے یا نہیں ایک مستعفی بیطار نے جسے میں جہلم کے نزدیک ملا۔ حساب لگا کر بتایا کہ دودھ چھڑانے کے بعد دھنی نسل کے ایک عام بچھڑے کو رکھنے کا خرچ پانچ یا چھ روپیہ کا ماہوار آتا ہے اور جب یہ ساڑھے تین سال کا ہو جاتا ہے۔ تو اسکی قیمت صرف ۸۰ یا ۱۰۰ روپیہ پڑتی ہے۔ اور اب قیمتیں ۲۵ فیصدی گر گئی ہیں ؏

۸ فروری حصار سے ہانسی (۱۶ میل)

متواتر تین دن سے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے ۔ خشک بادل جنہیں ہوا ادھر اُدھر لے جا رہی تھی ۔ زمین ایک لحاظ سے تبدیل ہو رہی تھی ۔ ہم ایک مرتبہ پھر ایک ایسے علاقے میں سے سوار جا رہے تھے ۔ جہاں گیہوں کے کھیت اور کپاس کے پودے نظر آ رہے تھے ۔ اور ایک جگہ میدان کا سینہ دفعتہً اُبھرا ہوا تھا ۔ گویا وہ نامحدود یک وضعی سے تنگ آ گیا تھا ۔ جنوب کی طرف چند پہاڑیاں بھی تھیں ۔ جو صرف ۴۰۰ فٹ اونچی تھیں ۔ لیکن سرگودھا کے قریب کی پہاڑیوں کی طرح بہت ڈھلوانی نوکدار اور مقدس تھیں ۔ بلاشبہ مقدس اس لئے کہ انکی موجودگی غیر متوقع تھی ۔ ان کی چوٹی پر ایک سادھو اور اس کا چیلہ رہتے تھے ۔ اور وہ عورتیں جو نئی نئی بیوہ ہوتی ہیں ۔ تاکہ وہ اپنے اُن کپڑوں کو پھینک آئیں جنہیں ممکن ہے وہ آئندہ نہ پہنیں ۔

چونکہ آج اتوار کا دن تھا اور کسی کام کا دباؤ نہ تھا ہم راستے میں اپنے ملاقاتیوں سے گفتگو کرتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر چلتے رہے ۔ پہلا شخص ایک برہمن فقیر تھا ۔ وہ پرانی چیلیوں کا ایک جوڑا پٹخارتا جلدی جلدی گھر جا رہا تھا ۔ اور اس کے کپڑوں میں سے جو اور بھی زیادہ بوسیدہ تھے ۔ اس کی ٹانگیں اتنی پتلی نظر آ رہی تھیں ۔ کہ اگر وہ جسم جسے وہ اُٹھائے لئے جا رہی تھیں ۔ زیادہ کمزور ہوتا تو وہ ضرور ٹوٹ جاتیں ۔ ...... دھجیاں اُڑے ہوئے شال کے نیچے ایک بڑا تھیلا چھپائے ہوئے تھا جس میں تین سیر باجرا تھا ۔ اس نے پتلی آواز سے کہا کہ میں در بدر پھرا اور ہر ایک نے مجھے مٹھی بھر دیا ۔ فقیر کے بعد ایک حجام ایک بڑا بورا لئے ہوئے آیا ۔ وہ ایک سو تئیس میل سے ایک غم انگیز پیغام لے کر آیا تھا ۔ اور اسے نزدیک ہی ایک گاؤں میں جانا تھا ۔ اس کے ایک سرپرست کی لڑکی وہاں بیاہی ہوئی تھی ۔ اور جب اس کے حاملہ ہونے کی خبر پہنچی ۔ تو اسکی ماں نے خوشی خوشی اس کے اور اس کے بچوں کے لئے تحفے تیار کئے ۔ بچہ پیدا ہوا ۔ لیکن پانچ دن بعد مر گیا ۔ حجام نے وہ تحفے جو تھیلے میں تھے ہمیں دکھائے ماں کے کپڑے تھے ۔ اور بچے کیلئے سُرخی مائل نیلی واسکٹ اور گلابی کاڑھی ہوئی ٹوپی اور کھیلنے کیلئے ایک گیند تھی ۔ میں نے دریافت کیا اب یہ چیزیں ماں کے لئے کس کام کی ہونگی ۔ داس نے کہا ، وہ انہیں کسی اور بچے کو دیدے گی ۔

لیکن وہ انہیں دیکھنا ہی کب گوارا کرے گی۔ جب کہ حجام اپنے بورے کا سامان دوبارہ سنبھال رہا تھا۔ ایک کھٹیکھلی دو پہیوں والی گاڑی آ پہنچی۔ جسے دو عمدہ بھورے رنگ کے بیل کھینچ رہے تھے۔ اور اس میں ایک ہستی لحاف سے استراحت پذیر تھی۔ اور دو شخص اسکے پہلوؤں پر چار زانو بیٹھے تھے۔ اسے اپنے رشتہ داروں کے گھر مہمان جانے سے نمونیا کی بیماری لگ گئی تھی۔ اور یہ دونوں شخص اسے گھر لئے جا رہے تھے۔ وہ اسے ہسپتال نہیں لے گئے تھے۔ کیونکہ انہوں نے کہا کہ ہمیں اس کے پاس بیٹھنا پڑے گا۔ اور ہم لوگ ہیں زمیندار ہمارے کام کو نقصان پہنچیگا گھر پر بھی کافی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ آگ جلائی جا سکتی ہے اور عورتیں اسکی تیمارداری کر سکتی ہیں۔

دوسرا گروہ شادی سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک لڑکے کی ایک لڑکی سے منگنی کی گئی تھی۔ اور ۶۵ روپے زیورات اور کپڑوں کی صورت میں دیئے گئے تھے۔ لڑکا شادی کئے جانے سے قبل مر گیا۔ اور اس کا باپ کنواری لڑکی کے گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ تاکہ وہ یہ انتظام کرے۔ کہ اس کی بجائے بھتیجے سے شادی کر دی جائے۔ بلاشبہ اس لئے کہ ۶۵ روپے کی معقول رقم لگائی ہوئی ضائع نہ جائے۔

شادی اور تجہیز و تکفین

خدا محبت اور موت۔ ہندوستانی سڑکوں کے پہلوان کی شہرت سے گرم ہیں۔ اور ان تینوں کے خدمت گذار روپیہ کا مطالبہ کرنے میں نہایت سخت دل ہیں۔ ۱۹۰۹ء میں افسر بند و بست نے لکھا۔ کہ اس ضلع میں فروخت ہائے اجناس کا ایک حصّہ شادیوں اور تجہیز و تکفین کی فضول خرچیوں میں کام آتا ہے۔ اور یہ فضول خرچی اب بھی جاری ہے۔ قیمتیں گرنے سے پہلے ایک معمولی کسان اپنے بیٹے کی شادی پر ۔۔۔ سے لیکر سات سو روپیہ تک خرچ کرتا تھا۔ اور شاید دو سو روپے کم لڑکی کی شادی پر۔ یہ خرچ وسطی پنجاب کی نسبت کم ہے۔ لیکن تجہیز و تکفین کے اخراجات بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ اگرچہ یہ بھی اس سے زیادہ نہیں ہیں۔ جتنے کہ مغربی پنجاب کے کچھ حصّے میں ہیں۔ جب ہم اودھم پور میں تھے۔ تو ایک شخص کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اُن لوگوں نے جو میرے ساتھ تھے یہ کہا۔ کہ اس کے لئے ضروری ہے کہ تیسرے دن کی دعوت کے لئے فوراً دو سو روپے کا انتظام کرے۔ خواہ اسے اپنی زمین ہی

کیوں خرچ کرنی پڑتی ہیں رکھنی پڑے۔ اس قسم کی باتوں میں رواج کا حکم ناطق ہے۔ اگرچہ اس قدر بڑی رقم کی ضرورت صرف والدیا والدہ کی صورت میں پڑتی ہے۔ دوسروں کے لئے ۵۰ سے لیکر ۹۰ روپے تک کافی ہوتے ہیں۔ وسطی پنجاب کی طرح یہاں بھی اگر دلہن کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ تو شادی کے مصارف قریب قریب دوچند ہو جاتے ہیں۔ صرف دس دن گذرے میرے علم میں ایک شخص نے دیکھا کہ ایک جاٹ نے اپنی دو لڑکیوں کے لئے ۸۰۰ روپے لیا تھا۔ لیکن اس ضلع میں اگرچہ نئی تہذیب بہت کم ہے۔ لیکن پرانی تہذیب یہاں ابھی تک زوروں پر ہے۔ اور اس قسم کے لین دین مقابلتہً کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ اور جب یہ داستان گاؤں کے مجمع میں سنائی گئی۔ تو اس پر یہ تنقید کی گئی۔ "جو لوگ ایسا کرتے ہیں۔ ہم ان کی عزت نہیں کرتے"۔ اس موقعہ پر عزت کا لفظ پہلی مرتبہ استعمال کیا جا رہا تھا۔ جیسا کہ اسے کرنا چاہیئے۔

اگر ان رسومات پر پہلے کی نسبت کم روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔ تو یہ سراسر قیمتوں کے گر جانے کی وجہ سے ہے جس نے متذکرہ بالا شادی کے اخراجات کو نصف کر دیا ہے۔ لیکن کہیں کہیں کمی کے لئے دانستہ کوشش کی جا رہی ہے۔ کچھ سال گذرے سمبر کے باگڑی جاٹ اس بات پر رضامند ہوگئے۔ کہ وہ شادی کے موقع پر خاطر تواضع میں ۱۰۰ سے زیادہ روپے نہ صرف کریں گے۔ اور دولہا کی برات میں ۱۰۰ سے زیادہ لوگوں کو شامل نہ ہونے دینگے پہلے سینکڑوں شامل ہوتے تھے۔ آج گاؤں میں ہمیں سنایا گیا۔ کہ ہم سب اکٹھے بیٹھے اور اس نتیجہ پر پہنچے۔ کہ ہم نے پہلے بہت ہی زیادہ خرچ کیا تھا۔ اب بہت کم لوگ برات میں جاتے ہیں۔ اور زیورات پر بھی کہیں کم خرچ کیا جاتا ہے۔ تجہیز و تکفین کے اخراجات بھی پانچ یا سات روپے تک کم کر دیئے گئے ہیں۔ ہڈیوں کو گنگا لے جانے اور شادی کا خرچ نصف کر دیا گیا ہے۔ آخر الذکر مسلمہ طور پر روئی کی قیمت گر جانے کی وجہ سے ہے (ہم روئی کے علاقے میں ہیں) لیکن جب میں نے یہ دریافت کیا۔ کہ کیا قیمتوں کے چڑھ جانے سے اخراجات دوبارہ نہیں بڑھ جائینگے تو اس نے ایسا جواب سنا جس میں نئی تہذیب کی جھلک تھی۔ نہیں اب لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بہت زیادہ قرض بُرا ہے۔ جو کچھ ہم نے پہلے کیا ہماری غلطی تھی۔ اگر شادی پر ۲۰۰۰ روپیہ صرف کریں تو یہ تین پشتوں تک قائم رہتا ہے۔ اور ہمارے بچوں کے اور پھر ان کے بچوں کے کام آتا ہے۔ اور ساتھ ہی گورنمنٹ کے ملازموں اور حاکموں کے بھی ؎

گاؤں کی ایک جمہوری سلطنت

یہ ضلع اتنی دور ہے۔ کہ یہاں نئی تہذیب کی روشنی بہت کم پہنچتی ہے۔ لیکن جہاں کہیں پرانی روشنی جلوہ ریز ہوتی ہے وہاں ضروری نہیں ہے کہ یہ غیر مفید ہو۔ کیونکہ جب وہ ملتی ہیں تو نئی اور پرانی روشنیاں ایک دوسرے کو بجھا دیتی ہیں۔ اس گاؤں میں پرانی تہذیب کا دور دورہ ہے۔ تعلقات اتنے اچھے ہیں۔ کہ چند سال سے کوئی عدالت میں نہیں گیا ہے جھگڑے بہت کم ہوتے ہیں۔ اور وہیں فیصل کیئے جاتے ہیں۔ کوئی باقاعدہ پنچایت نہیں ہے۔ اور تمام متعلقہ لوگ اکٹھے بیٹھ جاتے ہیں۔ اور جیسا مناسب سمجھتے ہیں مقدمات کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔ اور برادری کے دباؤ سے فیصلے پر عمل درآمد کرایا جاتا ہے۔ لکھا کچھ نہیں جاتا۔ کیونکہ کوئی تعلیم یافتہ نہیں ہے۔ بلا شبہ بینک کے بیس ممبروں میں سے ایک بھی خواندہ نہیں ہے۔ ناخواندگی اچھے تعلقات کی راہ میں حائل نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اس کے حق میں بھی ہو۔ لیکن یہ یقینی بات ہے کہ نئی تہذیب والوں سے لین دین کرتے ہیں وہ اس کی وجہ سے خسارے میں رہتے ہیں۔ اس لئے یہاں اب ایک پرائمری سکول کا ہونا مفید ہے۔ اور استاد اتنا سرگرم ہے۔ کہ اس نے ایک نائیٹ سکول بھی جاری کر دیا ہے۔ لیکن اسے اکیلے کو تینتیس لڑکوں اور ۲۸ بالغوں کو پڑھانا پڑتا ہے۔ یہ امر ہندوستان میں تعلیمی مشکلات کی ایک تمثیل ہے۔ (پڑھنے کیلئے اس قدر زیادہ منتظر ہیں۔ اور پڑھانے کے لئے اس قدر کم تیار ہیں) اس کے شاگردوں میں سے ایک پندرہ برس کا ملائم چہرے والا لڑکا بینک کا سیکرٹری ہے۔ اس کا دوسرا کام محض یہ ہے۔ کہ وہ اپنے والد کی زمینوں میں ادھر اُدھر کے کام کرتا ہے۔ اس کا رجحان آرام طلبی کی طرف ہے۔ اور وہ سایہ میں نہایت خوشی سے بیٹھتا ہے۔ یہ تھی وہ تنقید جو ایک مضبوط کسان نے اس کے متعلق کی۔ اور اس ملک میں جہاں لوگوں کو اپنی روزی کے لئے مجبور نہیں کیا جاتا یہی تنقید دس میں سے نو پر صادق آتی ہے۔

پانی پینے کے کنوئیں

گاؤں والے رفاہِ عامہ کے تمام انتظامات بہ حیثیت مجموعی کرتے ہیں۔ خواہ یہ کام پینے کے

پانی کے کنوؤں اُتارنے ۔تالاب کو گہرا کرنے کا۔ اس کا گھاٹ بنانے ۔ مندر یا چوپال تعمیر کرنے یا مشترکہ زمین کی دیکھ بھال کرنے کی ہو۔ ان اجتماعی کارروائیوں میں سے اکثر جنوب مشرقی علاقے کے ہر گاؤں میں عام ہیں۔ اور ان سب میں سے زیادہ اہم پینے کا پانی مہیا کرنا ہے ۔ خوش قسمت گاؤں کے تالاب نہر سے بھر دیئے جاتے ہیں۔ لیکن حصار میں اکثر گاؤں کیلئے یہ بات ناممکن ہے ۔ اور ان جگہوں میں (جیسا کہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے) جہاں پانی کی سطح زمین سے ۹۰ فٹ یا اس سے زیادہ نیچے ہے ۔ اور بارش ۱۵-۱ انچ یا اس سے کم ہوتی ہے ۔ جلد یا بدیر حوض خشک ہو جاتے ہیں ۔ اور انسانوں اور جانداروں کو ایسے کنوؤں پر انحصار رکھنا پڑتا ہے جو صرف بہت بڑی لاگت سے اُتارے جا سکتے ہیں ۔ مثلاً یہاں دس سال گذرے ایک کنواں ۳۰۰۰ روپیہ صرف کرکے اُتارا گیا تھا ۔ اور پانی تک کی گہرائی صرف ۶۰ فٹ ہے ۔ آدم پور میں جہاں گہرائی ۹۰ فٹ ہے ۔ بے حد تکلیف اُٹھانی پڑی ہے چند سال گذرے ۴۰۰۰ روپیہ صرف کرکے ایک پختہ کنواں اُتارا گیا تھا۔ گاؤں کے ہر گھر نے دس روپے چندہ دیا تھا ۔ اور جیسی مزدوری کے لئے انہیں رکھا گیا تھا ۔ وہ بھی کی تھی ۔ لیکن باوجود اس کے کہ اسے تالاب کے نزدیک اُتارا گیا تھا ۔ (میٹھا پانی حاصل کرنے کیلئے) دو سال بعد اس کا پانی کھارا ہو گیا ۔ اور پینے کے قابل نہ رہا ۔ ایک اور کنواں بارہ سو روپیہ کی لاگت سے اُتارا گیا تھا ۔ (یہ وقتی علاج تھا) اور اس کی مٹھاس بھی جاتی رہی ۔ اب تیسرے کیلئے اینٹیں جمع کی جا رہی ہیں ۔ جب کوئی صورت کارگر نہیں ہوتی ۔ تو پانی ایک گاؤں کے تالاب سے لایا جاتا ہے ۔ جو نصف میل کے فاصلہ پر واقع ہے ۔ لیکن اس کام میں سخت محنت درکار ہے ۔ اور عام طور پر سال کے ایسے حصے میں کرنا پڑتا ہے ۔ جبکہ دھوپ جھلس دینے والی ہوتی ہے ۔ اور ہلکے سے ہلکا بوجھ بھی بار معلوم ہوتا ہے ۔

دیہاتی تالاب

اگر تالاب کافی گہرے نہ ہوں ۔ تو ممکن ہے وہ تمازتِ آفتاب شروع ہونے سے بھی بہت پہلے سوکھ جائیں ۔ آج یہی صورت تھی ۔ تالابوں میں سے ایک سوکھ گیا ہے ۔ اور اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر اسے گہرا کیا جا رہا تھا ۔ تیس برس کی تلچھٹ جمی ہوئی ہے اور اب یہ اس قدر چھچھلا ہے ۔ مگر زور کی بارش میں یہ فوراً بھر جاتا ہے ۔ اور کناروں سے

اچھل کر قریب کی ایک سڑک پر آ گرتا ہے۔ اسے صحیح جمہوریت کا احساس رکھتے ہوئے
گھڑا کیا جا رہا ہے۔ یہاں ۱۲۰ گھر ہیں۔ اور ہر گھر کو خواہ وہ امیر ہے یا غریب۔ ۵ گز مربع اور
دو فٹ گہری جگہ صاف کرنی ہے یا اس کے عوض دو روپے کی رقم دینی ہے۔ جس سے اس
کام کے لئے چار آدمیوں کو مزدوری پر رکھا جا سکتا ہے۔ پانچ آدمیوں کی ایک پنچایت
نے تالاب کے طاس کو شطرنج کے تختے کی طرح ۱۲۰ مربعوں میں تقسیم کر دیا ہے اس
پنچایت میں ہر طبقے کے نمائندے شامل ہیں۔ اور تمام پنچایت دو جاٹوں۔ ایک گوجر
ایک بنیا اور ایک مالی مزارع پر مشتمل ہے۔ یہ پانچوں شخص تمام انتظامات کے ذمہ دار
ہیں۔ منصفانہ برتاؤ کو یقینی بنانے کے لئے انہوں نے اپنے میں سے دو آدمیوں کو
کئے ہوئے کام کی پیمائش کے لئے مقرر کیا ہے۔ لیکن تالاب کا پانی سے بھرا ہوا
ہونا ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ اسے کبھی صاف بھی ہونا چاہیئے۔ اس مطلب کو حاصل
کرنے کے لئے اس کے کنارے ایک سادھو یا فقیر ایک ایسی کٹیا میں رہتا ہے۔
جو دھوپ میں سوکھے ہوئے سفید کیچڑ کا ایک بڑا چھتہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کا فرض
ہے کہ وہ یہ دیکھے۔ کہ کوئی انسان یا چوپایہ اسے گندہ نہ کرے۔ یا اس میں گندے
برتن نہ دھوئے۔ اور گاؤں کے سادہ دستور کے مطابق اس کے بدلے میں اسے
روزانہ کھانا اور فصل کے موقع پر کچھ غلہ بطور نذرانہ دیا جاتا ہے۔ بہت سے گاؤں
اس طرح کرتے ہیں۔ مثلاً آدم پور۔ وہاں تالاب کے قریب قریب کی جگہیں نہایت ہی
صاف تھیں۔

اس گاؤں کو چھوڑتے وقت مجھے افسوس ہوا۔ دراصل یہ ایک چھوٹی جمہوری
سلطنت ہے۔ اور ایسی صورت میں اگر ان کے سر پر کوئی ایسا بے غرض وارث
ہو۔ جو امن و امان قائم رکھے۔ لیکن ان کی روزانہ زندگی میں اتنا کم دخل دے جتنا کہ ممکن ہے
تو یہ ایک ایسی حکومت ہوگی جو کسان کے لئے نہایت موزوں ہے۔

جب ہم ہانسی میں داخل ہو رہے تھے جو کہ ۱۸۰۰۰ باشندوں کا ایک شہر ہے
تو ہمارے چاروں طرف پھلدار درختوں کے باغات تھے اور ان کا سایہ بڑا تھا۔ یہ درخت
آم۔ امرود۔ انار اور آڑو کے تھے۔ اور آڑوؤں کے درختوں پر گلابی پھولوں کا مینہ
برس رہا تھا۔ ہانسی ہندوستان کے قدیم ترین مقامات میں سے ہے۔ اور وہ نہر جو ذیر زشاہ

نے ۱۸۵۹ء میں بنائی تھی۔ پنجاب کی سب نہروں سے پرانی ہے۔ گذشتہ ہفتہ اونچے اونچے بنجر علاقے دیکھنے کے بعد یہ جگہ نہایت ہی فرحت بخش معلوم ہوتی ہے۔ اس کے باوجود دیہاتی زمانے کا یہ حال ہے کہ دس دن گذرے کسی تھانہ کے صحن میں بم پھینک دیا گیا۔ جو بہت زور سے پھٹا۔ لیکن حسنِ اتفاق سے کوئی نقصان نہ ہُوا۔

عمیق کاشت

نہر کے بغیر ہانسی کچھ بھی نہ ہوتی۔ گنے اور سبزی کے کھیتوں اور باغوں سے گھری ہوئی ہونے کی وجہ سے یہ اس بنجر علاقے سے کہیں مختلف ہے۔ جس میں سے ہم گذشتہ ہفتے گھوڑے پر سفر کرتے رہے ہیں۔ وہاں کاشتکاری اس کثرت سے کی جاتی تھی۔ جتنی کہ ہم نے پنجاب میں کسی اور جگہ دیکھی ہے۔ لیکن یہاں اتنی سرگرمی سے کی جاتی ہے جتنی کہ امرت سر اور جالندھر اور ارد گرد کے نواح میں۔ ذیلدار نے جو کہ گوڑ برہمن تھا ہمیں وہ زمین دکھائی۔ جو قیمتیں گرنے سے پہلے ۵۰۰ روپے کی فصل دیتی تھی۔ (۳۷ پونڈ دس شلنگ فی ایکڑ) اس نے حال ہی میں ۲½ ایکڑ زمین میں پونڈے گنے اور خربوزے بوئے تھے اور اس وقت تک ۱۰۰۰ روپیہ صرف کر چکا تھا۔ اگرچہ سوائے خوبصورتی سے ڈھیر کی ہوئی مٹی کی مینڈھوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اسے توقع ہے۔ کہ وہ اپنی تمام کی خربوزوں سے پوری کر لیگا۔ جو دو مہینے کے عرصے میں منڈی میں لے جانے کے قابل ہو جائینگے۔ اور اُن پونڈوں سے پورا پورا نفع اُٹھائے گا۔ جنہیں چوسنے والا اس کے نرم چھلکے اور میٹھے رس کی وجہ سے بہت پسند کرتا ہے۔ اس نے تقریباً ۲۰ ایکڑ زمین میں سبزیاں اور گنے بوئے ہیں۔ اور شہر میں ۶ اشخاص اور ہیں۔ جنہوں نے اتنی یا اس سے زیادہ زمین کاشت کی ہے۔ لیکن اس کے لئے بہت روپے کی ضرورت ہے۔ اور اس سے ہمیشہ فائدہ نہیں حاصل ہوتا۔ تین سال گذرے۔ اس حساب سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے ۴۰۰ روپیہ منافع آیا ہے۔ لیکن اگلے سال مشکل سے اس کی رقم پوری ہوئی۔ اور گذشتہ سال قیمتوں کے گر جانے کی وجہ سے اسے ۸۰۰ روپے کا گھاٹا آیا۔

زیادہ سرمایہ محض کھاد کے لئے درکار ہوتا ہے۔ جس کی (مثال کے طور پر) ۴۰ سے لیکر ۵۰ پونڈ تک فی ایکڑ ضرورت پڑتی ہے۔ ہانسی کے سرمایہ دار شہر کا کوڑا کرکٹ اور

گندگی خرید لیتے ہیں۔جس کا پانی بخزیہ ہو جانے کے بعد برہمن تک استعمال کرتے ہیں لیکن جو ایسا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اردگرد کے گاؤں سے کھاد خرید لیتے ہیں۔ اور ایک گاؤں کے رجس میں ہم آج بعد از دوپہر تھے) مالی مزارعین نے کہا کہ ہم اسے دس پندرہ میل کے اُن بارانی گاؤں سے مفت لے آتے ہیں۔جہاں یہ استعمال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ بارش اسقدر کم ہوتی ہے۔کہ وہ اسے گلا کر جزو زمین نہیں بنا سکتی۔وسطی پنجاب کے سبزی کاشت کرنے والوں کی طرح یہ لوگ بھی پیاز کی فصل کے لئے اُپلوں کی راکھ بطور کھاد استعمال کرتے ہیں۔اس وقت کریلے اور خربوزے گنوں کے ساتھ ملے جلے بوئے ہیں۔اور وہ امید کرتے ہیں۔کہ اپنا تمام خرچ (تقریباً ۳۵۰ روپے فی ایکڑ) پہلی دو چیزوں سے نکال لیں گے۔اور گنا سراسر نفع میں رہیگا۔وہ کپاس۔آلو۔سبزیاں اور مرچیں۔بھی اُگاتے ہیں۔اور گرمی کے موسم میں بہت سے لوگوں کی طرح وہ اپنے مویشیوں کو فربہ کرتے ہیں۔موسم بہار میں خریدتے ہیں۔اور خزاں میں فروخت کر دیتے ہیں۔درحقیقت ان کے ہاں مخلوط کاشت کا طریق نہایت عمدگی سے رواج پذیر ہے۔اور صرف یہی ایک صورت ہے جس سے تھوڑی جائیداد والا جو محض زمین پر گذارہ کرتا ہے۔خوشحال ہو سکتا ہے۔اس کا ثبوت اُن کے بینک سے ملتا تھا۔جن لوگوں سے ہم اس دورے میں ملے ہیں۔اُن میں سے اکثر ول نے قیمتیں گر جانے کی وجہ سے روپیہ کا لین دین بالکل بند کر دیا ہے۔صرف چند صورتیں ہیں جنہیں مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔تقریباً تمام کی تمام وہ انجمنیں تھیں۔جن کے ممبر کاشتکاری کے علاوہ کوئی اور ذریعہ آمدنی رکھتے تھے۔مثلاً فوجی ملازمت یا کپڑا بُننا۔یہ انجمن مختلف طرح کی تھی۔کاشتکاری کے تنوع کی وجہ سے وہ اب بھی پوری طرح سے زندہ ہے۔اور گذشتہ بارہ ماہ میں اپنے سینتالیس ممبروں کو اٹھاون قرضے دیئے ہیں۔اسکی بڑی وجہ کاشتکاری کی بوقلمونی ہے اور انہیں قیمتیں گر جانے سے اکثر لوگوں کی نسبت کم نقصان پہنچا ہے۔اسلئے کہ اس سے اناجوں اور روئی کی نسبت باغوں کی پیداوار کی قیمت میں کم فرق پڑا ہے۔

ہانسی میں ان کے قریب ہی ایک نہایت عمدہ منڈی ہے۔اور وہ اپنے گنے لاری سے رہتک میں بھیج سکتے ہیں۔جو یہاں سے چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔اور ان کی سبزیوں میں سے بعض بیکانیر تک پہنچتی ہیں۔جو یہاں سے ۲۰۰ میل سے زیادہ فاصلے پر ہے۔یہ دیکھ کر بہت حیرانی ہوتی ہے۔کہ سبزیاں کتنی کتنی دور بھیجی جاتی ہیں۔مٹر آگرہ سے بمبئی بھیجی جاتی ہے

جو وہاں سے ۱۰۰ میل سے زیادہ فاصلے پر ہے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ سبزیاں تھوڑی جائیداد والے کے لیئے اور شہری کی صحت کے لئے کس قدر اہم ہیں۔ اور یہ کہ اچھی منڈی کے بغیر وہ کہیں زیادہ پیمانے پر نہیں اگائی جا سکتیں۔ مال باہر بھیجنے کی سہولتیں بہم پہنچا کر کرایہ کی مناسب شرح کی اجازت دیکر ان کی کاشت کو ترقی دینے کے لئے ہر ممکن ذریعہ عمل میں لانا چاہیئے۔

سرگرمی سے کاشت کرنے میں کئی فائدے ہیں۔ اس کا یہ فائدہ بھی کسی طرح کم نہیں ہے کہ نہایت ہی گنجان آباد علاقے ہیں اس قدر لوگوں کے لئے روزگار بہم پہنچاتی ہے۔ بہت سا کام ہاتھ سے کیا جا سکتا ہے۔ اور اسے ضرور ہاتھ سے ہی کرنا چاہیئے۔ اس گاؤں میں بیلوں کی ایک جوڑی سے ۲۰ ایکڑ زمین پر کام کیا جا سکتا ہے۔ مزارعین کی صورت میں دوسرا فائدہ یہ ہے کہ انہیں بار بار تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اگر کسی شخص کا ایک یا دو سال بعد نکالا جانا اغلب ہے۔ تو وہ زمین میں نہ کھاد ڈالیگا۔ اور نہ اس پر بہت زیادہ محنت کرے گا۔ اس گاؤں میں زمین صرف ایک سال کیلئے اجارے پر دی جاتی ہے۔ لیکن اگر کوئی ظاہری سبب اس سے مانع نہ ہو تو اس کا اجرا خود بخود ہو جاتا ہے۔

مزارعین کو ہر چند سال کے بعد بدلنے کے عام دستور کی نسبت یہ طریقہ زمین اور مزارع دونو کے لئے زیادہ بہتر ہے ؎

باب دھم

رہتک

خشک سالی وسیلابی آمدنی اپنے آپ پر ٹیکس لگانا اور مویشی
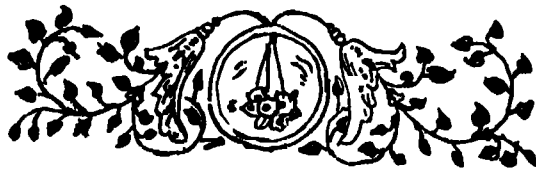
۱۰ فروری۔ سودکھی سے ماہم (۱۳ میل)

اس مہینے میں آج پہلی مرتبہ اتنی گرمی تھی۔ کہ دھوپ میں ناشتہ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن جب میز پر ناشتہ چنا جا رہا تھا۔ تو ایک اردلی کو کمان لیکر اُن بھوری بھوری ٹانگوں والے بندروں کو بھگانے کیلئے پاس کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ جو بیے صبری سے چاروں طرف کھیل رہے تھے۔ یہ دن خوشگوار تھا۔ اور آسمان پر ساکت بادل جنہوں نے کئی دن سے آسمان کو دھندلا کر رکھا تھا۔ اب اس طرح چھائے ہوئے تھے۔ گویا پُر سکون نیلے سمندر پر سفید رنگ کی چھوٹی کشتیوں کا بیڑا تیر رہا ہے۔ اور نیچے میدانی منظر میں رکاوٹ پیدا کرنے والی کوئی شے نہ تھی۔ سوائے اس کے کہ ایک چوڑا کوہان نما ٹیلہ کھڑا تھا۔ جہاں تھوڑی دور تک سفید سفید سڑک اوپر کی طرف پھیر کھا رہی تھی۔ اس سے ذرا پرے ہم نے دیکھا کہ چھ گھوڑے سوار ہمارے استقبال کے لئے منتظر ہیں۔ یہاں تک حصار کی حد تھی۔ اور اب ہم رہتک میں داخل ہو گئے تھے۔ مغربی نصف علاقہ جو سراسر بارانی ہے اور جہاں صرف ۱۶ انچ بارش ہوتی ہے۔ عرصے سے خشک سالی میں پھنسا ہوا ہے۔ جو اس وقت شروع ہوئی تھی۔ جب میں نے آخری مرتبہ اس علاقے کو دیکھا تھا۔ اس علاقے سے گذرنے کا بڑا مدعا یہ ہے۔ کہ دیہات پر خشک سالی کے اثرات کا کچھ اندازہ کیا جائے اس لئے پہلے ہی گاؤں میں (بھائی بہارا راج پورہ) جہاں کہ ہم پہنچے۔ اپنے گھوڑوں سے اتر پڑے تاکہ ہم لوگوں کے حالات سنیں۔

ہم ایک بڑے پختہ کنوئیں کے چبوترے پر بیٹھ گئے۔ اور باوجود اعتراض کرنے کے ایک کسان نے ہمیں گھر کے بُنتے ہوئے شال پر بیٹھنے کے لئے مجبور کر دیا۔ دیہاتی جلد ہی ہمارے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ تمام میں قدرت نے کچھ نہ کچھ نقص پیدا کیا ہوا تھا۔ کھیت خالی تھے۔ اور سوائے اس کے کہ مویشیوں کی نگہبانی کی جائے۔ اور کچھ کام نہیں ہے۔ اب ان کے پاس کافی خوراک ہے۔ کیونکہ گذشتہ فصل اچھی اتری تھی۔ لیکن اس سے پہلے پانچ فصلوں میں کاشت شدہ زمین میں سے صرف ۱۰ فیصدی نے فصل دی تھی۔ مطلب یہ کہ اڑھائی سال میں ان کی قابل زراعت زمین کے ⅕ سے بھی کم حصے میں سے نفع حاصل ہوا۔ اور انہیں اپنی رہی سہی پونجی یعنی بیلوں کو رکھنے میں سخت محنت اٹھانی پڑی۔ بدترین سال میں دو سو کو چرنے کیلئے کہیں دور بھیج دیا تھا۔ اور ان ۶۶۸ مویشیوں میں سے جو تین سال پہلے اُن کے پاس تھے۔ اب ۳۸۴ رہ گئے ہیں۔ میں نے دریافت کیا کہ پھر اُنہوں نے گذارہ کیسے کیا؟۔

گورنمنٹ نے دو دفعہ لگان کو التوا میں ڈال کر ان کی امداد کی ہے۔ اور ۱۳۴۶ کی آبادی میں سے ۸۰ جاٹ اور تقریباً ۱۰۰ کمین .... روزی کی تلاش میں کہیں اور چلے گئے ہیں۔ مغرب کی طرف بیکانیر میں اور شمال کی طرف بھٹنڈہ میں اور یہاں تک کہ چند لوگ لاہور میں پہنچے۔ باقی ماندہ لوگوں کے پاس کھانے کیلئے کافی ہے۔ لیکن ان کا غلہ قریب الاختتام ہے۔ اور وہ اب باجرہ خرید رہے ہیں۔ دو سال سے کوئی شادی نہیں ہوئی ہے۔ لیکن شادی غیر محدود عرصے تک التوا میں نہیں ڈالی جا سکتی۔ اور دس دن تک ایک لڑکے کی شادی ہونے والی ہے۔ اس پر صرف ۲۰۰ روپے خرچ آئینگے۔ لیکن جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔ اس رقم کا کچھ حصہ لیا جائیگا۔ قرض تمام لوگوں کی آمدنی کا بڑا ذریعہ ہے۔ اور گاؤں کے ۱۲۷ کنبوں نے ۴۲ ہزار روپیہ قرض اُٹھایا ہے۔

۲۰۰ مویشی فروخت کئے گئے	۱۰،۰۰۰ روپیہ
زیور گرو رکھا گیا	۴۰۰۰ روپیہ (اندازاً)
زمین رہن رکھی گئی	۸،۶۲۹ روپیہ (اندازاً)

موٹر اور گھوڑے

اس صورت میں جب کہ سڑک گرد آلود ہوا موافق اور پشت پر بہت سے گھوڑے اسوار تھے

گھوڑے کی سواری کچھ زیادہ دل خوش کن نہ تھی۔ گرد کے بادل اُٹھتے تھے۔ اور جب ہم چلتے تھے۔ تو یہ نہایت سرعت سے ہمیں ڈھانک لیتی تھی۔ لیکن آج گرمی کا پہلا دن تھا اور ہوا سڑک کے دو رویہ پیپل کے درختوں میں سے سریلی راگنیاں پیدا کر رہی تھی۔ ہمارے سامنے ایک پشتہ پہاڑی پر ماہم کا قدیم قصبہ آباد تھا۔ جس کی مسجد کا بڑا اسفید گنبد سب سے بلند نظر آرہا تھا۔ ان لوگوں میں سے جو ہمارے استقبال کے منتظر تھے ایک مستعفی افسر تھا جس نے مجھے گھوڑے سوار دیکھ کر خوشامدانہ طریق سے موٹر سواری کی اس عادت پر افسوس ظاہر کیا۔ جس کا میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے۔ اس نے ہاتھوں کے واضح اشاروں سے اس زمانے کا صاف صاف نقشہ کھینچ دیا۔ جب کہ افسران گھوڑوں کی پیٹھ پر آیا کرتے تھے۔ اس نے کہا۔ کہ اس وقت ہم گھوڑوں پر ہی ان کی ملاقات کیلئے آگے بڑھتے تھے۔ اور ہمیں گھوڑوں کی پیٹھ پر گذرتے ہوئے دیکھنا لوگوں کیلئے تماشا بن جاتا تھا۔ اب وہ موٹروں میں آتے ہیں۔ اور اسقدر جلد نکل جاتے ہیں۔ کہ وہ ہمیں نہیں دیکھتے اور نہ ہم ہی انہیں دیکھتے ہیں۔ ذیلدار نے کہا کہ آخری صاحب جو یہاں گھوڑے پر تشریف لائے۔ فنانشل کمشنر تھے۔ اس بات کو چار سال ہو گئے ہیں۔ اور جنگ عظیم سے لیکر اس سے پہلے تک کوئی یاد نہیں پڑتا۔

۱۱ فروری۔ ماہم سے لاہلی۔ (۱۵ میل)

تعلیم

آج ہم نے شاہی سڑک کو چھوڑ دیا۔ یہ وہ سڑک ہے جو دہلی سے ملتان جاتی ہے۔ اور جس پر ہم پہلی مرتبہ سرسہ کے قریب چڑھے تھے۔ ریتلی اور پہیئے والی سڑک ہونے کی وجہ سے یہ تبادلہ کچھ آرام دہ نہ تھا۔ ہم سات گھنٹے اسی سڑک پر رہے۔ ہم نے ان میں سے چار گھنٹے جاٹوں ایک گاؤں بھالیہ میں صرف کئے۔ وہاں ہمارا اجلاس پرائمری سکول کے صحن میں ہوا۔ کل سو حاضرین تھے۔ اور اس کیچڑ کی دیوار پر جو ہمارا احاطہ کئے ہوئے کوئی ایک درجن چادروں والی عورتیں جھکی ہوئی ہماری کارروائی کو غور [illegible] شروع ہوئی جو ہیڈ ماسٹر کے افکار کا نتیجہ تھی۔ (وہ بینک کا سکرٹری بھی تھا) اور دو چھوٹے لڑکوں نے گائی۔ جن میں سے ایک میلا پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ اور دوسرا خاکی نیکر اور پیلے رنگ کی جرابیں پہنے ہوئے تھا۔ جو اوپر کی طرف بتدریج ارغوانی اور سرخ ہوتا چلا گیا تھا۔

ایسی فضا میں جہاں سکول کا عنصر غالب تھا۔ تعلیمی گفتگو کا ہونا لازمی تھا۔ اگرچہ سکول یہاں ۴۷ سال سے قائم ہے۔ اور گاؤں میں ۴۰۰ گھر ہیں۔ لیکن ۲۵۰ (ممکن تعداد) میں سے صرف ۴۷ لڑکے سکول میں پڑھتے ہیں۔ اور گذشتہ پانچ سال میں طلبا کی تعداد میں محض پانچ کا اضافہ ہوا ہے۔ ۳۰ حاضرین میں سے صرف سات آدمی جن میں سے ۲ سپاہی تھے۔ پڑھ لکھ سکتے تھے۔ اور چھٹی جماعت سے آگے کسی کی تعلیم نہ تھی۔ ہم نے چند ایک سے دریافت کیا کہ تم اپنے بچوں کو سکول کیوں نہیں بھیجتے۔ ایک شخص نے جس کے ہاں ۱۰ برس کا بچہ تھا۔ یہ جواب دیا کہ اس میں خسارہ ہے بھیڑیں سے کسی نے کہا کہ اس کا لڑکا اُپلے جمع کرنے میں مصروف ہے۔ اس نے جواب دیا کہ یہ ہماری غربت کا نتیجہ ہے۔ اور یہ امر ممکن ہو سکتا ہے؟ یہی بات ایک تیسرے شخص نے کہی۔

تعلیم دلانے کا خرچ

اصطلاحی طور پر دیہاتی کیلئے پرائمری کی تعلیم مفت ہے۔ لیکن دراصل اسے کتابوں قلموں دواتوں اور کپڑوں پر کافی خرچ کرنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے (ایک سال کے لئے) جو ہمیں آج بتائے گئے ہیں۔ ظاہر ہے:-

کتابوں کا ایک سٹ	۲ روپے
(چونکہ لڑکے خراب کر دیتے ہیں۔ اس لئے کتابوں کے دو سٹ درکار ہوتے ہیں)	
دو سلیٹیں	ایک روپیہ
قلمیں کاغذ اور سیاہی	چار روپے (۸ آنے ماہوار ۸ ماہ تک)
کپڑے:- کوٹ	
ایک کوٹ سردی کیلئے	۵ روپے
ایک کوٹ گرمی کے لئے	۳ روپے
۲ قمیص	۲ روپے
۲ پاجامے	۲ روپے آٹھ آنے
چار پگڑیاں	۴ روپے
تین جوڑے جوتوں کے	۳ روپے آٹھ آنے (ایک روپیہ سے کم فی جوڑہ)
کل میزان خرچ	۳۲ روپے

اگر لڑکا سکول نہ جائے تو اس میں سے صرف پانچ روپے کا خرچ اُٹھانا پڑے گا۔ پس فیس کے نہ ہوتے ہوئے بھی تعلیم کے لئے ۲۰ روپے سالانہ سے زیادہ خرچ آتا ہے۔ اور یہ اتنی رقم ہے۔ کہ بہت سے لوگوں کو بطور لگان ادا کرنی پڑتی ہے۔ مزید براں یہ کہ جب فصلیں خراب ہو جاتی ہیں تو زمین کا لگان التوا میں ڈالا جا سکتا ہے۔ یا معاف کیا جا سکتا ہے۔ اور گذشتہ تین سال میں ماقبل الذکر پر یہاں آزادانہ عمل ہو رہا ہے۔ لیکن یہ اخراجات التوا میں نہیں ڈالے جا سکتے۔ اور معاف تو بالکل ہی نہیں کئے جا سکتے۔

پھر وہی پہلی دقت ہے۔ مویشی کون چرائیگا؟ رہتک اور حصار جیسے مویشی پالنے والے اضلاع میں چرانے کے لئے بیشمار مویشی ہیں۔ اس لئے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ کہ ایک معمولی کسان کے لئے تعلیم اور خشک سالی کا پہلو بہ پہلو ہونا اچھا نہیں ہے۔ تاہم پڑھنے لکھنے کے لئے شوق نمایاں ہے۔ اور دو سال تک بہت سے بالغ لوگوں نے اس نائٹ سکول میں پڑھا ہے جو اب محض روپیہ کی کمی کے باعث بند کر دیا گیا ہے۔

اُن تعلیم یافتہ نوجوانوں کے متعلق جو زمین کی طرف (کاشتکاری کی طرف) لوٹ جانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ مجھے اس قدر زیادہ مرتبہ نقادانہ حرف گیری کرنی پڑی تھی کہ اب یہ معلوم کر کے نہایت فرحت حاصل ہوئی۔ کہ ایک سارجنٹ کا مڈل پاس لڑکا کاشتکاری کرتا ہے۔ اور لوگ اسکی تعریف کرتے ہیں۔ پہلے پہل وہ کمزور تھا۔ لیکن اب (چھ سال بعد) وہ خوب مضبوط ہے۔ اور ہر کام سلیقے سے کرتا ہے۔ وہ ہل سیدھا چلاتا ہے۔ ایسا سیدھا جیسے کہ گولی جاتی ہے۔ لوگ ان تین نوجوانوں کے متعلق بہت نکتہ چینی کرتے تھے جنہیں ہم ایک دوسرے گاؤں میں ملے تھے۔ انہوں نے بھی وہی جماعت پاس کی تھی۔ اور کاشتکاری کرتے تھے۔ اُن کے پڑوسیوں نے کہا کہ وہ اتنے کمزور ہیں۔ کہ کاشتکاری نہیں کر سکتے۔ وہ گابوں کا دودھ تک نہیں نکال سکتے۔ جب گرمی پڑتی ہے تو انہیں اپنی صحت خراب ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اور وہ دہلی بھاگ جاتے ہیں۔ بورڈنگ کی چہار سالہ زندگی نے انہیں ناکارہ کر دیا تھا۔ کیونکہ بورڈنگ میں رہنے والے طلبا بیرونی دیہاتی زندگی سے بالکل الگ تھلگ رہتے ہیں۔ تعطیلات سے اس میں کچھ کمی ہونی چاہیئے۔ لیکن چھٹیوں میں کام اتنا ہوتا ہے۔ کہ کھیتوں میں کام کرنے کیلئے وقت نہیں بچتا۔

ایک ساہوکار کاروبار کی حالت میں

ایک اگروال ساہوکار کو میں نے باوجود کہ میں نے اسے اپنے پہلو میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ جانے کے لئے کہا۔ اور اس سے اس کاروبار کے متعلق دریافت کیا۔ جسمانی لحاظ سے وہ اپنی جماعت (ساہوکاروں) کا ایک نمونہ تھا۔ اس کی ساخت نرم اور بھاری تھی۔ اور گالیں چھوٹے خربوزوں کی طرح ابھری ہوئی تھیں۔ لیکن اس کی گھنی ابروؤں کے نیچے ایسی دور اندیشانہ و شفقت آمیز نظریں تھیں کہ مجھے فوراً ہی یہ محسوس ہوا کہ میں اسے پسند کرتا تھا۔ اپنے کاروبار کے لحاظ سے بھی وہ صحیح صحیح نمونہ تھا۔ دوکانداری۔ روپیہ کے لین دین اور غلے کی تجارت تینوں کو مخلوط کر رکھا تھا۔ وہ اتنا آسودہ حال ہے۔ کہ وسطی پنجاب کی کسی منڈی میں کمیشن ایجنٹ کو دس ہزار روپیہ پیشگی دے سکتا ہے۔ وہ ان سے ۶ فیصدی سود لیتا ہے۔ لیکن اس کے زمیندار سؤ کل کبھی بارہ سے کم نہیں دیتے۔ کیونکہ (بقول اس کے) ان سے روپیہ ۶ ماہ تک واپس نہیں آتا۔ اور اگر فصل خراب ہو جائے۔ تو ایک سال تک نہیں ملتا۔ اور جب خشک سالی ہو تو سالوں تک واپس نہیں ملتا۔ آخری صورت میں اس کا یہ مطلب تھا کہ شاید اور رقم واپس نہ ملے گی۔ تین سال سے کوئی قابل ذکر خشک سالی نہیں آئی ہے۔ لین منڈیوں میں سے روپیہ جلد واپس مل جاتا ہے۔ اور وہاں اسکی کبھی کوئی رقم ماری نہیں گئی۔ وہ زمینداروں سے عموماً ۱۸¾ فیصدی سود لیتا ہے۔ لیکن دوسرے لوگوں کی طرح وہ ان سے کم لیتا ہے۔ جو سال بھر میں ادا کر دیتے ہیں۔ اس دورے کے حالات قطعی طور سے اس امر پر دلالت کرتے ہیں۔ کہ گاؤں اور شہر دونوں میں وقت پر لین دین کرنے سے شرح میں معقول کمی ہو جاتی ہے۔

چونکہ بینک میں ایک سال سے زیادہ کا سود بقایا میں پڑا تھا۔ میں نے اس سے دریافت کیا۔ کہ اس طرف تمہاری کیا حالت ہے؟۔ اس نے کہا خشک سالی سے میرا روپیہ واپس مل جاتا تھا۔ لیکن جب سے یہ دور شروع ہوا ہے مجھے کچھ نہیں ملا۔ اور اب میرے پاس قرض دینے کیلئے کچھ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اگر زمیندار بھی نہ ادا کریں تو ہم مجبور ہیں۔ ہے۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ روپیہ کی جلد ادائیگی نہ ہونے کی صورت میں بھی بینک کو قرضہ دیتے رہنا چاہیئے۔ ہاں! کھانے پینے اور کاشتکاری کیلئے ضرور روپیہ دینا چاہیئے۔ ورنہ کاشتکار زندہ نہ رہ سکے گا۔

کیا وہ اپنے مویشیوں کو نہیں فروخت کر سکتا؟

لیکن خریدار کہاں ہیں کوئی کسی چیز کو خریدنے کی حامی نہیں بھرتا۔ اگر تمہارے پاس اب روپیہ ہوتا۔ تو کیا تم مجھے قرض دیدیتے؟

یقیناً میں ضرور دیدیتا۔

سیٹھ جی ایک سوال اور ہے۔ آپنے ہمارا بینک اور اسکی کارگذاری دیکھی ہے۔ تمہارا خیال اس کے طریقے اچھے ہیں۔ یا تمہارے؟

اس نے نہایت خوش اخلاقی سے جواب دیا۔ "آپکے طریقے اچھے ہیں"۔ آپ کے حسابات صاف ہوتے ہیں۔ اور ہمارے نہیں۔

پھر تم قرض دینا کیوں نہیں چھوڑتے۔ اور کیوں اپنا روپیہ بنک میں جمع نہیں کراتے؟ زمینداروں سے بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس پر ایک قہقہہ لگا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس بات پر کچھ طنز آمیز تنقید کی گئی۔ کہ ساہوکار اپنے حسابات میں زمیندار کی پیداوار کی قیمت حسب منشا کم و بیش لگا لیتا ہے۔ اگر منڈی میں غلے کا بھاؤ ۱۸ اسیر ہو اور ہم اسے خریدنا چاہیں تو وہ چودہ سیر لکھتا ہے۔

ساہوکار نے توبہ توبہ کرتے ہوئے کہا۔ نہیں چودہ نہیں صرف ۱۶ اسیر۔ روپیہ چلانے کا کام چھوڑنے کے لئے ایک مرتبہ اور مجبور کیا جانے پر اس نے نیم باز آنکھوں میں مسکراتے ہوئے کہا۔ اگر میں نے اسے چھوڑ دیا تو میرے بیٹے اسے پھر شروع کر لیں گے۔

ان الفاظ نے تنقید کو دوستانہ ہنسی میں اُڑا دیا۔ یہاں اور اس کے آس پاس زمینداروں اور ساہوکاروں کے تعلقات دوستانہ ہیں۔ اور وہ ایک دوسرے کی شادیوں میں شرکت کرتے ہیں۔ لیکن یہ صورت ضلع کے حالات سے مختلف ہے۔

امداد باہمی کی مالی امداد اور خشک سالی

طویل خشک سالی کی صورت میں مشکل سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ امداد باہمی اپنے ممبروں کی کہاں تک مالی امداد کرے۔ جبکہ ان کے معمولی قرضے ختم ہو گئے ہیں۔ اور کھیتی باڑی کا کام رکا پڑا ہے۔ ساہوکاروں کی حکمت عملی یہ رہی ہے۔ کہ انہوں نے پہلے سال دل کھول کر قرضہ دیا۔ دوسرے سال تھیلیوں کے منہ بند کر لئے۔ اور تیسرے سال

انہیں اتنا کھولا۔ جتنا پرانے مؤکلوں کو گانٹھ رکھنے کے لئے ضروری تھا۔ دیہاتی بینکوں نے اپنی اپنی مالی حالت کے علیحدہ علیحدہ طرز عمل اختیار کیا ہے۔ گذشتہ سال صرف ان بینکوں نے معقول رقمیں قرض دی ہیں۔ جن کی مالی حالت بہت ہی اچھی تھی۔ اور بہت سے بینکوں نے دو سال سے کوئی قرضہ نہیں دیا ہے۔ حالات یقیناً زیادہ سے زیادہ احتیاط کو جائز ٹھیراتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی نہایت ضروری ہے۔ کہ ہر ایک اس قابل ہونا چاہیئے۔ کہ خشک سالی کے ... ہوتے ہی پھر کام شروع کر دے۔ اور امداد باہمی کے نہایت ہی سمجھدار ممبر جن سے میں ملا ہوں۔ خیال کرتے ہیں کہ قرضے بالکل بند نہیں کرنے چاہئیں۔ بلکہ ہلوں بیلوں بیجوں اور خوراک کے لئے محدود ہونے چاہئیں۔ بیلوں اور بیجوں کیلئے تو کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔ خوراک کے لئے بھی قرضہ دینا ناگزیر ہے۔ کیونکہ کوئی نہ کوئی مویشیوں کی دیکھ بھال کرنے اور پہلی ہی بارش پر ہل لیکر تیار ہونے کیلئے ضرور گھر پر رہیگا۔ بیلوں کے متعلق یہ دقت ہے۔ کہ ہل کی طرح انہیں بھی فوری استعمال کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ اور اس مقصد کے لئے بارش سے پہلے ہی قرضے دینے پڑتے ہیں۔ اور اگر بارشیں نہ برسیں تو قرض کی ادائیگی غیر محدود عرصے کے لئے ملتوی کرنی پڑتی ہے۔ اس امر پر عام اتفاق ہے کہ دوسرے مقاصد کے لئے قرضے نہ دینے چاہئیں۔ تا کہ کوئی ایسا شخص جو کہیں اور روزگار حاصل کر سکتا ہو۔ گھر پر بیکار زندگی نہ بسر کرنے دیا جائے۔ مختصراً یہ ہے وہ حکمت عملی جس پر ہم کاربند ہیں۔

دیہاتی کلب (انجمن)

رہتک کے بہت سے گاؤں کی طرح بہالیہ بڑا گنجان اور گندہ ہے۔ اور اتنی بلندی پر واقع ہے۔ کہ میلوں سے نظر آتا ہے۔ اور اس کے وسط میں سے بہت سی عظیم الشان مربع عمارتیں بلند ہیں۔ جن کو دیکھ کر زمانہ وسطی کے وہ قلعے یاد آتے ہیں۔ جو اٹلی کے شہروں میں بنائے گئے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ جاذب نظر ایک چوپال ہے۔ جسے دس سال گذرے۔ گاؤں کے ایک چوتھائی حصے نے (گاؤں چار پتیوں میں تقسیم ہے) ۱۲,۰۰۰ روپے خرچ کر کے بنوایا تھا۔ اس قسم کے کام بیشمار ہیں۔ اور اس طاقت کا بہترین مظہر ہیں۔ جو دیہات۔ صوبے اس حصے میں ابھی تک لئے ہوئے ہیں۔

لیکن اس وقت تک میں نے کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی جس پر اسقدر فضول خرچی کی گئی ہو۔ البتہ چندہ جمع کرنے کا طریقہ سبق آموز ہے۔ رائے عامہ سے اس محلے کے اسی یا نوے گھروں میں رہنے والے تمام مردوں پر ۲ روپے فی کس ٹیکس لگا دیا گیا۔ اور چونکہ یہ رقم اس کام کے لئے کافی نہ تھی۔ قاصدوں کو گرد و نواح کے ان چوبیس گاؤں میں چندہ لینے کے لئے بھیجا گیا جن میں محلے والوں کے رشتے ناطے تھے۔ اس امر کی تشریح ضروری معلوم ہوتی ہے کہ شادی کے موقعہ پر مہمان شادی کے اخراجات میں چندہ دیکر عام طور پر صرف چند روپے سے امداد کرتا ہے۔ اور جب اس کے گھر شادی ہوتی ہے۔ تو اس تکلف کا جواب دے دیا جاتا ہے۔ وصول شدہ رقموں کا نہایت احتیاط سے حساب رکھا جاتا ہے تاکہ تمام متعلقہ لوگوں کو معلوم ہو جائے۔ کہ کس قدر روپیہ دیا گیا ہے۔ اور کتنا اس کے عوض دینا ضروری ہے۔ چونکہ چوپال کا بڑا استعمال یہ ہے کہ وہ براتوں کے لئے جائے قیام کا کام دیں۔ اس لئے یہی اصول اس صورت میں بھی کام میں لایا گیا تھا۔ چوبیس گاؤں کے خوشحال لوگوں نے علیحدہ علیحدہ رقمیں دیں۔ اور باقیوں نے اپنے روپے مشترکہ چندے میں شامل کر دیئے۔ تمام انتظامات ایک پنچایت نے کئے جس میں محلے کے ہر حصے (یعنی تھولہ) کا نمائندہ شامل تھا۔ اور جب یہ کام ختم ہو گیا تو پنچایت توڑ دی گئی۔ گاؤں میں جھگڑوں کا فیصلہ کرنے کیلئے کوئی دوامی جماعت نہیں ہے۔ (آنکھیں چار نہیں ہوتیں) لیکن جب کسی مشترکہ کام کا بیڑا اٹھایا جاتا ہے۔ تو اس مقصد کے لئے پنچایت قائم کر لی جاتی ہے۔ اور یہ اس ضلع کا نمایاں پہلو ہے۔

اس گاؤں میں دس اور چوپالیں ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک پر قریب قریب اتنا ہی خرچ آیا ہے۔ جتنا کہ اس پر۔ دونوں کی دونوں اس وقت تعمیر کی گئی تھیں۔ جبکہ فصلیں اچھی اور قیمتیں بڑھی ہوئی تھیں۔ دولت فراواں تھی۔ اور ایک گاؤں دوسرے گاؤں سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ قابل افسوس بات یہ ہے۔ کہ ایک مرتبہ تعمیر کرنے کے بعد انکی احتیاط معمولی سے معمولی گھروں سے زیادہ نہیں رکھی جاتی۔ وہ چوپال جو ہم نے آج دیکھی ایسی معلوم ہوتی تھی کہ کوئی محل گندے کوچے میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ بہت سے نقوش کی آب جاتی رہی تھی۔ اور بان کی پرانی چارپائیاں لے دے کر وہاں کا سامان آرائش تھیں۔ ان میں سے بعض پر سونے والے لیٹے ہوئے تھے۔ جنہیں بستروں نے مکمل طور پر چھپایا ہوا تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ لوگ یہاں آرام لینے آئے ہیں۔ یہاں انہیں گھروں کی نسبت زیادہ سکون حاصل ہے۔

اپنا سفر جاری رکھتے ہوئے ہم نے اپنا راستہ ایسے علاقے میں اختیار کیا جو ہموار

اونٹ کی پیٹھ کی طرح بھورا اور چٹیل تھا۔ لیکن لاہلی کے نزدیک ہم ایک نہر کے پاس پہنچے اور غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی روشنی میں ننھے ننھے گیہوں کے کھیتوں کو دور دور تک پھیلے ہوئے دیکھا۔

۱۲ فروری - لاہلی سے بیری - (۱۵ میل)

اس نخلستان میں سے ہم جلد باہر نکل گئے۔ اور ایک بار پھر بنجر علاقے میں سے چلنے لگے۔ شمال مغربی ہوا جو سرسے ہمارا پیچھا کئے ہوئے تھی۔ ہمارے گھوڑے کے سُموں سے اُٹھائی ہوئی ریتلی گرد سے ہمارے مُنہ ناک اور آنکھوں کو بھر رہی تھی۔ البتہ یہ بھی ٹھنڈا رہنے میں امداد دے رہی تھی۔ اور اس وقت یہی ہمارے دلی توانسع کے لائق تھی۔ کیونکہ دودن سے سورج اپنی مخفی قوتوں کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ہم ابھی تک اس بڑے میدان میں سے چل رہے تھے لیکن سفر کے اختتام کے قریب یہ اپنی جگہ چھوڑنے لگا۔ اور پہاڑوں کے قریب ہونیکی علامات شروع ہو گئیں۔

مسجد کی عمارت

بنیک کا معائنہ کرنیکے لئے ہم ایک ٹوٹے پھوٹے گاؤں رگدی بلالہ میں پہنچے۔ جہاں مسلم راجپوتوں کی آبادی تھی۔ اور ایک بڑی مسجد مع اپنے تین گنبدوں کے تمام گاؤں پر چھائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اسکی تعمیر ۱۹۲۷ء میں ختم ہوئی تھی۔ اور اسے بنانے میں سات سال لگے تھے۔ لوگوں نے کہا۔ چونکہ ہمارے وسائل تھے۔ ہم نے ایسا کر لیا۔ حسب معمول پنچایت قائم کی گئی تھی۔ لیکن صرف تین آدمیوں کی جن میں سے ہر ایک ایک محلے کا نمائندہ تھا۔ دگاؤں کے بانی کے ہاں تین بیٹے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کی اولاد علیحدہ علیحدہ رہتی ہے) کل والی چوپال کی طرح یہاں کوئی باقاعدہ ٹیکس نہیں لگایا گیا تھا۔ بلکہ ہر ایک گھر نے حسب توفیق ۲۵ - ۱۵ - اور پانچ روپے چندہ دیا تھا۔ بعض نے جنس کی صورت میں چندہ دیا۔ اور ایک بڑے جاگیردار نے ۴۰۰۰۰ اینٹیں دیں۔ یہ امر تعجب خیز ہے۔ کہ گاؤں والے جس کام کو اہم خیال کرتے ہیں۔ تو اس کیلئے کتنی بڑی بڑی رقمیں فراہم کر لیتے ہیں۔ اس گاؤں میں صرف ساٹھ یا ستر گھر ہیں۔ اور انہوں نے دس ہزار روپیہ یا لوں کہو کہ سالانہ زمین کے لگان (۸۰۰ روپے) کا بارہ گنا دیا۔ یہ ہے وہ وسیلہ کہ جس سے بھائی

زندگی کی از سرِ نو تعبیر کی جاسکتی ہے۔ لیکن پہلے دیہاتی کو یہ ترغیب دینی چاہیئے۔ کہ اصلاح نہایت ضروری ہے۔

مُرغیاں پالنا اور عزّت

اس سرزمین کے رواج کے مطابق صرف پنچ لوگ مُرغیاں پالتے ہیں۔ وہ ناپاک ہوتی ہیں۔ مذہب ان کے پالنے کی اجازت نہیں دیتا۔

میں نے کہا "لیکن شمالی حصّوں میں لوگ انہیں پالتے ہیں۔ اور وہاں لوگ مسلمان ہیں۔"

ممکن ہے۔ وہاں وہ پاک ہوں۔ یہاں وہ غلاظت کھاتی ہیں۔ اور اپنی چونچیں ہماری رکابیوں میں مارتی ہیں۔ انہیں بلی بھی کھا جاتی ہے۔ جب کسان کسی بات کے متعلق یوں کہتا ہے۔ کہ ہمارے مذہب کے خلاف ہے۔ تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے۔ کہ یہ رواج کے مطابق نہیں ہے۔ لیکن اس کیلئے رواج (اگرچہ اکثر بنیاد آرام طلبی۔ عزّت یا محض نقالی پر ہوتی ہے) قانون اور ساتھ ہی اسکی غیر محدود اقسام کا حکم رکھتا ہے۔ شکار گڑھ میں پہاڑیوں کے دامن میں بہت سے مسلمان راجپوت رہتے ہیں (وہ لوگ ہیں) مُرغیاں پالتے ہیں۔ اس پر بھی اگر کوئی مُرغی بھٹک کر کسی ہندو راجپوت کے گھر چلی جائے۔ تو وہ بھرشٹ ہوئی ہوئی جگہ کو گائے کے گوبر سے پوتر کرلیتا ہے اور انڈے تک بھی نہیں کھاتا۔ بینکنگ یونین کے صدر نے اس بات کی تشریح یوں کی۔ کہ ایک مرتبہ کسی مرغی نے ایک رشی کو اس قدر تنگ کیا۔ کہ اس نے غصّے میں آکر یہ بد دعا دی "کہ تو ہمیشہ فضلہ کھائیگی۔ اور جو کوئی تجھے کھائیگا۔ یقیناً نرک میں جائیگا۔ اور کسی نہ کسی حد تک کٹر ہندو کا (مرغ)ی کے متعلق یہی رویہ ہے۔ اور جہاں ہندو مذہب ابھی تک غالب ہے مسلمان بھی شبہات میں ہے۔

صوبے میں مجموعی مرغیاں پالنے کے متعلق تین بڑے بڑے نظریئے ہیں۔ دریائے جہلم کے شمالی علاقے میں اکثر زمیندار مُرغے اور مرغیاں پالتے ہیں۔ اور وہاں تڑکے کے وقت اصیل مرغ بانگ دیتا ہے۔ اور وہ انڈے اور مُرغیاں دونوں بیچتے ہیں۔ دریائے جہلم سے لیکر راوی تک اور جنوب مغرب کی طرف ممکن ہے۔ کہ لوگ مُرغیاں رکھیں۔ لیکن انڈے نہیں فروخت کرینگے وسطی اور جنوب مشرقی علاقے میں لوگ اسے معیوب سمجھتے ہیں۔ اور اگر وہ ہندو ہیں تو دونوں کو دھرم کے خلاف جانتے ہیں۔ اور کبھی کبھی یہ احساس اس قدر قوی ہوتا ہے۔ کہ گاؤں کا کمین تک بھی

انہیں نہیں پالتا۔تاوقتیکہ وہ بھنگی نہ ہو۔کیونکہ وہ کسی بات میں پس وپیش نہیں کرتا۔صوبے میں کسی جگہ بھی چند مرغیوں سے زیادہ رکھنے کا رواج نہیں ہے۔شمال مغرب میں انہیں زیادہ تر اسلئے رکھا جاتا ہے۔کہ وہ وقت بےوقت آنے والے مہمان کیلئے گوشت مہیا کر سکیں۔یہ سب باتیں یورپی کسان سے کس قدر مختلف ہیں۔اور کیا ان حالات میں ہندوستانی یورپی معیار زندگی کی توقع کر سکتا ہے؟۔

مویشی اور مذہب

تھوڑی جائیداد والے کیلئے جو پورے طور پر یا کسی قدر سبزی کاشت کرنے والا نہیں ہے اس کا جواب پُرزور نفی میں ہے۔تاوقتیکہ وہ کسی اور قسم کے مویشی نہ پالتا ہو۔اس گاؤں میں اور اس (مویشیوں سے رغبت رکھنے والے) علاقے کے بہت سے دوسرے گاؤں میں لوگ نہایت دانشمندی سے نوعمر یا دُبلے مویشیوں کو خرید لیتے ہیں۔اور ایک سال بعد انہیں اُڑد موٹھ وغیرہ کی دالوں سے موٹا کر کے فروخت کر دیتے ہیں۔ان کے ہاں دو سانڈ ہیں۔ان میں سے ایک ایک بنیئے نے دیا ہے۔جو یہاں سے تین میل کے فاصلے پر رہتا ہے۔اس نے اپنے والد کی وفات پہ اسے آزاد چھوڑ دیا تھا۔اور خشک سالی کے زمانہ میں دو ماہ تک اسے روزانہ چار سیر اور ساتھ ہی گھی بھی ہم پہنچاتا رہا۔اس مرتبہ یہ معاملہ قدر شناسی کا نہ تھا۔بلکہ مذہبی تھا۔کیونکہ اسنے اسے دراصل ثواب حاصل کرنے کی نیت سے کیا تھا۔لیکن جب وہ ہندو ہے اور تم مسلمان پھر اس نے تمہارے گاؤں کو سانڈ کیوں دیا؟

غیر متوقع جواب یہ ملا۔کہ وہ ہمارے ساتھ روپیہ کا لین دین رکھتا ہے۔اس انتظام سے دو فائدے پہنچتے ہیں۔ساہوکار کے مؤکلوں میں رہنے کی وجہ سے سانڈ کی اچھی طرح نگہداشت کی جاتی ہے۔اور اس کے ساتھ ہی ان کے مویشیوں کی تعداد میں اضافہ کر کے اور ان کی حالت کو بہتر بنا کر یہ ان کیلئے قرضوں کی ادائیگی آسان بنا دیتا ہے۔

شمال کی طرف دریائے جہلم تک ہم نے مسلمان راجپوتوں کو فوقتاً فوقتاً ثواب کی غرض سے سانڈ چھوڑتے ہوئے پایا۔غالباً اس لئے کہ ان کے اجداد ہندو تھے۔یہاں ہندوانہ ماحول و حسب نسب کے دوگونہ اثر کی وجہ سے لوگ اکثر ایسا کرتے ہیں۔لیکن وہ صرف چھوٹی عمر کے بھینسوں کو چھوڑنے کی ہی استطاعت رکھتے ہیں۔ہندو رواج کی پیروی کرتے ہوئے اکثر لوگ اُن کا لوگو

فروخت نہیں کرتے۔ جو ان کی خدمت میں بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ اُنہوں نے کہا۔ کہ اگر ہم کسی گائے کو بہت فائدہ اُٹھانے کے بعد اسے فروخت کر دیں۔ تو لوگ طعنہ دیتے ہیں۔ ان گایوں میں جو وقت سے اوسر ہو جاتی ہیں۔ اور ان میں جنھوں نے ان کی اچھی طرح خدمت کی ہوتی ہے۔ وہ نہایت عاقلانہ طور پر تمیز کرتے ہیں۔ تو پھر بلا شبہ ہم قصاب کے پاس بھی بیچ دینگے۔ ہم کیوں نہ بیچیں۔ جب ہمیں اس سے کوئی فائدہ ہی حاصل نہیں ہوا۔ اس کے گوشت کو ہم خود بھی کھاتے ہیں۔ ایک شہوانی آواز نے ساتھ ہی کہا۔ کہ بانجھ عورت کو کون رکھتا ہے؟ پھر اوسر گائے کو کون رکھیگا؟ یہ ایک ایسی بات تھی۔ جس پر ہم پچاس کے پچاس کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اگر ہندو بھی اسی طرح سے تمیز کریں۔ تو دریائے ستلج کے جنوبی علاقے میں مویشیوں کی نسل بڑھانی بہت آسان ہو جائے۔

لیکن اگر ہندو دھرم جان لینے سے روکتا ہے۔ (خواہ گائیں اچھی ہوں یا بُری) تو وہ اسے سختی کے وقت بچانے کیلئے خاص کوشش کرنے کی طرف راغب کرتا ہے۔ گذشتہ سال بیری کے مقام پر جبکہ خشک سالی نہایت ہی زبون حالت میں تھی۔ اور چارہ روپے کا صرف بارہ سیر ملتا تھا۔ (اس کے مقابلے میں اب اس کا بھاؤ ۸۰ سیر ہے) تو بہت سے بنئے زیادہ فاقہ زدہ مویشیوں کی راہ میں چارہ ڈال دیتے تھے۔ اور ان میں سے چارہ کے لئے ایسی فراخ جگہیں مہیا کرنے پر جہاں وہ دن بھر چر سکیں۔ ایک ہزار سے لیکر دو ہزار تک روپیہ صرف کیا ہے۔ اس طرح سے بہت سے جانوروں کو زندہ رکھا گیا تھا۔ اور اس سے زیادہ بہتر بات یہ ہوئی کہ اسکی وجہ سے بنیا اور جاٹ کے تعلقات استوار ہو گئے۔ اور یہ لوگ اس ضلع میں ایک دوسرے کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ یہ مثال اپنی قسم کی آپ ہی نہیں ہے۔ کیونکہ بھوانی واقع حصار میں بھی ایسا ہی کیا گیا تھا۔

مویشیوں کے میلے اور نقدی

ایسے علاقے میں جہاں مویشیوں کو موٹا کیا جاتا ہو۔ اور اُن کی نسل بڑھائی جاتی ہو۔ خرید و فروخت کی سہولتیں لازمی ہیں۔ اس لئے حصار اور رہتک دونوں میں بہت سی منڈیاں لگائی جاتی ہیں۔ اور وہاں دُور دور کے خریدار پہنچتے ہیں۔ پٹھان شمالی طرف سے۔ سکھ جاٹ وسطی اضلاع سے۔ زمیندار اُن علاقوں سے جو دریائے ستلج کے جنوب میں واقع ہیں۔ بیوپاری جمنا پار سے

اور جنوب کے اُن حصّوں سے جہاں آگرہ واقع ہے۔ عام طور پر مقابلہ تیز ہوتا ہے۔ اور قیمتیں اچھی پڑتی ہیں۔ لیکن خشک سالی اور قیمتیں گر جانے کی وجہ سے اب مویشی مانگ سے زیادہ ہیں۔ وہ زمیندار جو حال ہی میں دو جانہ کے میلے سے واپس آئے ہیں یہ کہتے ہیں۔ ایک بھی خریدار نہیں پہنچا۔ گاؤں میں مویشی اکثر ادھار فروخت کئے جاتے ہیں۔ لیکن منڈیوں میں چونکہ لین دین زیادہ تر اجنبیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ نقد روپیہ دینا پڑتا ہے۔ نوٹ نہیں بلکہ نقد روپیہ۔ (چاندی کا) روپوں کی مانگ کو پورا کرنے کیلئے جو ممکن چند لاکھ تک پہنچ جائے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کسی تاجر سے یہ ٹھیکہ کرلیتا ہے۔ کہ وہ نوٹوں کو روپیہ سے بدل دے۔ اس کے صلے میں ڈسٹرکٹ بورڈ کو اسے ہر سودے پر معمولی سی کمیشن لینے کی اجازت دے دیتا ہے۔ یہ سب باتیں قدیم ہیں۔ لیکن کسان پڑھ نہیں سکتا۔ اور اتنا نادان (لوگوں نے ایسا ہی کہا) ہے کہ وہ اچھے اور بُرے نوٹ میں تمیز نہیں کرسکتا۔ اور اگر کسی نوٹ کے دو حصّے آپس میں نہیں ملتے تو کبھی اس کا خیال نہ کریگا۔ اس میں ہولیشیوں کی طرف سے بھی خطرہ ہے۔ ایک جاٹ نے اپنی چادر جس کے ایک سرے پر کچھ نوٹ بندھے ہوئے تھے۔ زمین پر پڑی رہنے دی۔ (کھدر کے کپڑوں میں جیبیں نہیں ہوتیں) آخری چیز جو اس نے وہاں چھپائی تھی۔ گڑ تھا اور اس کی بھینی بھینی خوشبو ابھی تک اس کے آس پاس آرہی تھی۔ اس نے ایک گذرتی ہوئی گائے کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ یہی نوٹوں کے خاتمہ کا باعث ہوا ؂

۱۳ فروری۔ بیری سے جھجّر۔ (۹ میل)

دیہاتی تاجر

دس سے لیکر ۲ بجے تک دن کا نصف حصّہ ۵۴ جاٹوں کی صحبت میں گزرا۔ جو سب کے سب ہندو تھے۔ اور ان میں سے اٹھارہ منفعتی سپاہی تھے۔ ہم ٹاؤن ہال کے بڑے بالاخانہ میں اکٹھے ہوئے۔ بیری میں ۸۰۰۰ کی آبادی ہے۔ اور اُن لوگوں میں سے جو میرے دونوں طرف کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ایک آنریری کیپٹن۔ ایک رسالدار اور ایک صوبیدار تھا۔ یہ سب جنگ آزمودہ منفعتی افسر تھے۔ باہر برآمدے میں دیسی جوتوں کا ایک ڈھیر لگا تھا۔ جنہیں اُن بہت سے لوگوں نے باہر چھوڑ دیا تھا۔ جو فرش پر چوکڑی مارے بیٹھے تھے۔ آخرالذکر میں سے چودہ تعلیم یافتہ تھے۔ اور ان میں سے ایک جاٹ تھا۔ جو تاجر بن گیا تھا۔

وہ فوج میں کوارٹر ماسٹر سارجنٹ بھی رہ چکا تھا۔ اور جنگِ عظیم کے زمانہ میں ٹھیکے دینے کا رواج شروع ہونے سے وہ تجارت کے بھیدوں سے واقف ہو گیا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں جب قیمتیں یک لخت بڑھ گئیں۔ تو اس نے ایک چھوٹی سی دکان کھول لی۔ اور غلہ منڈی میں بطور کمیشن ایجنٹ (دلال) کام کرنا شروع کر دیا۔ اس وقت سے وہ اسمیں لگا ہوا ہے۔ اور جب وہ زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ تو اسکی بے باکانہ طرزِ نشست اور دُبلے مستحکم چہرے سے ہر شخص دیکھ سکتا تھا۔ کہ اس میں کام کرنے کی صلاحیت اور قوت موجود ہے۔

اگرچہ اسکی تعلیم محض اتنی تھی۔ کہ اس نے فوج میں ہندی کا سطحی علم حاصل کیا تھا۔ لیکن اس نے خوب ترقی کی تھی۔ اور ایک سپاہی بھائی کی مدد لیکر اپنی زمین کی کاشت بھی کرتا تھا۔ سات اور شخصوں نے اسکی تقلید کی ہے۔ اور سب نے اس بات پر اتفاق کیا کہ ہم اُن لوگوں سے زیادہ خوشحال ہیں۔ جو محض کاشتکاری کرتے ہیں۔ اسے پایۂ ثبوت تک پہنچانے کیلئے کیپٹن اُٹھا۔ اور ان میں سے ایک کی طرف بڑھکر اسے ہاتھ سے پکڑ لیا۔ اور اس کی انگلیوں میں سے ایک میں پہنی ہوئی سونے کی انگوٹھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ (اس پر ایک عام قہقہہ لگا) دوسرے لوگ بھی تجارت کرتے ہیں۔ اور وہ اپنی گاڑیاں لیکر میرٹھ جیسے بڑے بڑے شہروں میں چلے جاتے ہیں۔ اور وہاں سے گڑ روئی اور بیج ملاکر تھوڑے منافع پر دکانداروں کے پاس فروخت کر دیتے ہیں۔ تھوڑی جائیداد والا شخص جو اپنی زمین پر گذارہ نہیں کر سکتا ہمیشہ سے ایسا کرتا آیا ہے۔ زمین بارانی ہے۔ اور بیلوں کی ایک جوڑی اور ہل کو پورے طور سے کام لگائے رکھنے اور چار پانچ آدمیوں سے ایک کنبہ کا گذارہ چلانے کے لئے ۲۰ سے لیکر ۲۵ ایکڑ تک زمین درکار ہوتی ہے۔ بہت سے لوگوں کے پاس اس سے کم ہے۔ مثلاً رسالدار کے پاس ساڑھے بارہ ایکڑ اور کوارٹر ماسٹر کے پاس صرف گیارہ ایکڑ ہے۔ ایسے لوگ تجارت اور کاشتکاری کو ملا جلا کر ان لوگوں سے زیادہ خوشحال رہتے ہیں۔ جن کے پاس بڑی جائیدادیں ہیں۔ اور مجھے کسی ایسے تاجر کسان سے واسطہ نہیں پڑا جو کافی خوشحال نہ ہو۔

حسابات

اگرچہ اس قدر تجارت کی جاتی ہے۔ اور تین افسر بھی موجود ہیں۔ لیکن چک میں کوئی

نہیں رکھتا۔ اور نہ ہی اس کا استعمال جانتا ہے۔ دو شخص کبھی کبھی روپیہ کی ادائیگی کیلئے ہنڈی سے کام لیتے ہیں۔ اور کوارٹر ماسٹر اپنی تجارت کا حساب بتیں بہیوں میں رکھتا ہے۔ اگرچہ گھر کا حساب نہیں رکھتا۔ صرف کیپٹن اور رسالدار ایسا کرتے ہیں۔ کسی کے خیال کرنے کی نسبت زیادہ کاشتکار حساب رکھتے ہیں۔

ترن تارن۔ کے قریب میں ایک سکھ جاٹ سے ملا۔ جس نے اپنی ۱۲۰ ایکڑ زمین کا حساب اس وقت سے رکھا ہوا تھا جبکہ ۱۹۱۶ء میں اس نے خالصہ کالج چھوڑا تھا۔ اور کل دو مستعفی سپاہیوں نے جس میں سے ایک سارجنٹ اور دوسرا سپاہی تھا مجھے بتایا کہ ہم ہر سال باقاعدگی سے حساب کرتے ہیں۔ اور ہر سال اپنے حساب کی میزان لگاتے ہیں۔ سپاہی پندرہ سال سے ایسا کرتا چلا آیا ہے۔ اس نے کہا۔ کہ جنگ عظیم کے بعد ہر سال مجھے ۸۰۰ کا منافع ہوا۔ لیکن گذشتہ تین سال میں سے ہر سال ۴۲ روپے سے لیکر ۹۵ روپے تک خسارہ اٹھانا پڑا ہے۔ سارجنٹ نے بھی خسارت کا ذکر کیا۔ اور بتایا کہ گذشتہ سال خسارے کا اندازہ ۵۲ سے ۵۹ روپیہ تک تھا۔

خشک سالی اور اسکے اثرات

بیری نے خشک سالی سے اسقدر زیادہ تکلیف اٹھائی ہے۔ کہ گذشتہ ۶ فصلوں میں سے پانچ کا لگان معاف کرنا پڑا ہے۔ خوش قسمتی سے یہاں کے نوجوانوں میں سے سو آدمی سپاہی ہیں۔ اور بوڑھے آدمیوں میں سے سو فوجی پنشن لیتے ہیں۔ سلسلۂ نمک کے علاقے میں ہم نے دیکھا۔ کہ فوج (فوجی ملازمت) لوگوں کو خوشحال بنا سکتی ہے۔ یہاں اس نے غربت کے مقابلے میں ڈھال کا کام دیا ہے۔ اور لوگوں کو انتہائی مفلسی سے بچایا ہے۔ بنیوں کے خیرات کیئے ہوئے چارے نے بھی امداد دی ہے۔ زیورات فروخت کیئے گئے ہیں۔ اگر منافع کچھ نہیں ہوا ہے۔ کیونکہ جنوب مشرق میں زیادہ تر زیورات چاندی کے ہیں۔ اور چاندی کی قیمت نہایت زیادہ گر گئی ہے۔ گاڑی چلانے کا کام بھی بہت کیا گیا ہے۔ اور ہر گھرانے کے بیکار لوگ غلّہ کی منڈیوں میں بوجھ پہنچانے اور اتارنے چلے گئے ہیں۔ یہ کہا گیا جاٹ قلیوں کی طرح کام کرنے کو گوارا کر لیتے ہیں۔ بوڑھے کپتان کے لئے جسے خاندانی

روایات بہت عزیز تھیں۔ یہ بات بہت کھٹکی۔ اس نے سپاہیانہ جوش سے جواب دیا۔ جو ایسا کرتے ہیں وہ جاٹ نہیں ہیں۔ کوئی جاٹ بھی مرتے دم تک قلی کا کام نہیں کریگا۔ کسی نے صلح کن لہجے میں کہا۔ وہ اپنے گھروں کے نزدیک ایسا نہیں کرتے۔ لیکن اگر وہ دور ہوں۔ تو کر سکتے ہیں۔ جنگی گھوڑے نے پھر خرّاٹا مار کر کہا۔ "ہم قلی کے کام سے بہت نفرت کرتے ہیں"۔ اور ایک سچا جاٹ صوبے بھر میں یہی بات کہیگا۔ صرف جہلم کا شمالی علاقہ ایسا ہے۔ جہاں تھوڑی جائیداد والا کسان آزادی سے اس قسم کا کام کرتا ہے۔ اور وہ بھی قدرتی طور پر یہ چاہتا ہے کہ اس کا گاؤں نظر سے اوجھل رہے۔ دوسری جگہوں کی نسبت شمالی حصے میں تھوڑی جائیداد والے کے کم مقروض ہونے کی اور وجوہات میں سے ایک یہ بھی ہے۔ کہ وہ اپنے آپ کو حالات کے مطابق بدل لیتا ہے۔

خوراک اور سبزی خوری

طویل خشک سالی میں بہت زیادہ کفایت شعاری کو نمایاں طور پر عمل میں لانا چاہئیے۔ اور ایسی جگہوں میں جہاں لوگ اپنی خوراک کے زیادہ حصے کیلئے کھیتوں کی پیداوار پر انحصار رکھتے ہیں۔ معدہ اس تنگی کو محسوس کرتا ہے۔ البتہ مسلمان کسی حد تک اپنی خوراک میں گوشت کا اضافہ کر کے غلے کی کمی کو پورا کر سکتا ہے۔ اور یہ چیز مویشیوں کی ناگہانی خونریزی کی وجہ سے سستی اور افراط سے بہم پہنچتی ہے۔ لیکن ہندو جاٹ پکا سبزی خور ہے۔ اور انڈوں تک کو نہیں چھوتا۔ اس کے باوجود وہ کہتا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ دلیری۔ قوت برداشت اور مستقل مزاجی میں بڑے سے بڑے گوشت خور مسلمان کا ہم پلہ ہے۔ میرا خیال ہے۔ کہ دنیا میں اور کہیں بھی سبزی خوری کا اس سے زیادہ اچھا اشتہار نہیں مل سکتا کہ وہ اپنی بڑی طاقت قریب قریب سراسر مقدس گائے کے دودھ سے حاصل کرتا ہے۔ اسکی روزانہ خوراک کی تفصیل سنکر ہر شخص سمجھ جاتا ہے۔ کہ گائے کو کیوں مقدس خیال کیا جاتا ہے۔ تینتالیس برس کے ایک قوی ہیکل۔ کشادہ سینہ صوبیدار نے کہا کہ وہ خوراک جو مجھے سب سے زیادہ موافق آتی ہے۔ یہ ہے کہ روزانہ ۱½ اسیر دودھ۔ چار اونس (دو چھٹانک) گھی اور آٹھ اونس (چار چھٹانک) بالائی ملے۔ لیکن صوبیدار اکثر لوگوں سے زیادہ خوشحال ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ ایک عام درجے کے جاٹ کی خوراک ½ سیر ہی ہے جسے وہ استعمال کرتا ہے

جب وہ صبح کو اُٹھتا ہے۔ اور ½ سیر دس بجے کھیتوں میں تین اونس گھی دوپہر کو اور تین پاؤ ستے بجرا کر۔ سیر تک دودھ شام کو۔ البتہ سبزیاں۔ شکر۔ چاول اور روٹی اس کے ساتھ شامل ہے۔ سردیوں میں باجرے کی روٹی اور گرمیوں میں گیہوں کی روٹی، لیکن اب صبح دہی کی بجائے لسی اور دلیا استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ اور گھی کی مقدار ½ اونس اور دودھ کی ½ پونڈ (چار چھٹانک) کر دی گئی ہے۔ بھوکا کوئی نہیں رہتا۔ کھاتے اتنا ہی ہیں جتنا کہ پہلے کھاتے تھے۔ (مثلاً یہ کہ اب جبکہ دودھ کم ملتا ہے تو روٹی زیادہ کھائی جاتی ہے) لیکن نہ اب خوراک کی جنس اچھی ہے۔ اور نہ اس میں تنوع ہے۔ پیٹ بھر جاتا ہے لیکن جسم کو تقویت نہیں پہنچتی۔

کپڑے

اس کے بعد دوسری کفایت شعاری کپڑوں کی ہے۔ کرتے پہلے سے چند انچ چھوٹے ہوتے ہیں۔ اور دھوتیوں کا گھیرا کم ہوتا ہے۔ خاص خاص موقعوں کیلئے لوگ ایک دوسرے کی امتیازی اشیا مستعار لے لیتے ہیں۔ اور کتائی کا کام کہیں زیادہ کیا جاتا ہے۔ کپتان کے گھر میں دس برس کے سکوت کے بعد اب پھر چرخوں کی گھوں گھوں ہو رہی ہے۔ اور چار من کاتا ہوا سوت جلاہے کی راچھ کا منتظر ہے چرخہ کاتنا صرف چند گھرانوں نے چھوڑا تھا۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اور کہیں دیکھا ہے۔ اکثر لوگ اپنے چرخوں کو پہلے کی نسبت زیادہ محنت سے چلا رہے ہیں۔ زیادہ خوش حالی کے ایام میں دلہن اور ساس کے مطلوبہ کپڑے بازار سے خریدے جاتے تھے۔ لیکن بہت سے لوگ کسی چیز کو اس طرح حاصل کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے کئی سال گذرے کہ روئی اتنی سستی نہیں تھی جتنی کہ اب ہے۔ اور عورتیں اس سے کھیتوں میں کام نہ ہونے سے فائدہ اُٹھا کر اپنی بیٹیوں کے جہیز کیلئے کات کات کر کپڑا تیار کر رہی ہیں۔ خشک سالی کے چند مسرت بخش اثرات میں سے ایک یہ ہے۔ کہ ان کی شادیاں التوا میں ڈالی جا رہی ہیں۔ لڑکوں کی صورت میں یہ بات مشکل ہے۔ پنجاب میں عورتوں کی کمی اس قدر زیادہ ہے۔ کہ کوئی والد ایک مرتبہ مناسب دلہن مل جانے پر اپنے بیٹے کی شادی کو ملتوی کرنے کی جرات نہیں کرتا۔ لیکن خرچ بہت ہی کم کیا جا رہا ہے۔ یہ طرز عمل جنگِ عظیم کے بعد سے شروع ہوا۔ جنگِ عظیم کے ایام میں بیری کے بہت سے لوگوں نے سمندر پار خدمات انجام دیں۔

اور بہت سی نئی باتیں دیکھیں اور سنیں۔ جب وہ واپس آئے تو انہوں نے ایک پنچایت منعقد کی۔ اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ غمی کی دعوتیں نہ ہوا کرینگی۔ جہیز سو روپے سے زیادہ نہ ہونا چاہئیے۔ گاؤں کے کمیوں کو حسب دستور ۵، روپے دینے کی بجائے صرف گیارہ روپے ملنے چاہئیں۔ اور یہ کہ جاٹ آئندہ اپنی بیٹیوں کو فروخت نہ کریں۔ بوڑھے کپتان نے نئی روشنی کا پورا احساس رکھتے ہوئے کہا۔ کہ ہمیں بہت سی تقریریں کرنی پڑیں۔ اور ہم نے لوگوں کو بتایا۔ کہ اپنی بیٹیوں کو فروخت کرنا اتنا ہی برا ہے۔ جتنا کہ ڈاکہ ڈالنا ؛

فوج اور عورتیں

اُن تمام باتوں میں سے جو اس دورے میں میری دلچسپی کا باعث بنی ہیں۔ ایک یہ ہے۔ کہ جنگ عظیم نے کسان پر کیا کیا اثرات ڈالے ہیں۔ اور اس امر پر تعجب کرتے ہوئے کہ ان کا دائرہ عورتوں تک بھی وسیع ہوا ہے یا نہیں۔ میں نے احتیاطاً کہا کہ یہ بات مشہور ہے۔ کہ تمہاری عورتیں پنجاب کے ہر دوسرے حصے کی عورتوں سے زیادہ محنت سے کام کرتی ہیں۔ اور شاید اتنی محنت کرتی ہیں۔ کہ دنیا میں اور کوئی عورت نہ کرتی ہو۔

اس نے کہا "ہاں" وہ بہت محنت کرتی ہیں۔ لیکن اب وہ اسقدر توانا نہیں ہیں۔ جتنی کہ پہلے ہوتی تھیں۔ خشک سالی سے پہلے وہ دو دو گھڑے بغیر کسی کے سہارے کے اپنے سر پر اٹھا سکتی تھیں۔ اب انہیں مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔

میں نے کہا کہ وہ لوگ جو رہتک میں نہیں رہتے یہ کہتے ہیں۔ کہ تم اپنی عورتوں سے غلاموں کی طرح کام لیتے ہو۔ اور یہ کہ ان کے پاس بچوں کی نگہداشت کے لئے کوئی وقت نہیں بچتا۔ کپتان نے توبہ توبہ کرتے ہوئے کہا: نہیں، غلاموں کی طرح نہیں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ بچوں کی دیکھ بھال کیلئے بوڑھے آدمیوں کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا اور وہ محض اتنا کرتے ہیں۔ کہ جب بچے روتے ہیں۔ تو انہیں تھپکاتے اور پیار کرتے ہیں۔ لیکن ہم اسے بدلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ البتہ کسی گھر میں صرف میاں بیوی رہتے ہیں۔ تو ضروری ہے کہ وہ اپنے ہر بات میں اپنے خاوند کا ہاتھ بٹائے ورنہ کام نہ ہو سکیگا۔

میں نے پوچھا۔ کیا عورت وہ تمام کرتی ہے۔ جو آدمی کرتا ہے؟

اس نے کہا "ہاں۔ عورت سوائے ہل چلانے۔ بونے اور گاہنے کے باقی تمام وہ کام کرتی ہے۔ جو آدمی کرتا ہے۔ (ان باتوں کا رواج نہیں ہے) اور وہ بہت توانا ہو جاتی ہے وہ عورتیں جن کی بہت زیادہ احتیاط رکھی جاتی ہے۔ ہماری عورتوں کے درجے تک نہیں پہنچ سکتیں تاہم جنگ عظیم کے بعد سے ہم کوشش کرتے رہے ہیں۔ کہ ان کو کم کام دیا جائے۔ بعض کھاد کا کام بھنگیوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اور ایندھن اور باڑ کے لئے کانٹے دار جھاڑیوں کا کاٹنا پنچایت نے حکماً بند کر دیا ہے۔ یہ معاملہ عزت کا ہے۔ یہ بات اچھی نہیں ہے۔ کہ کوئی عورت جنگل میں اکیلی جائے۔

میں نے پوچھا۔ "یہ تبدیلیاں پہلے پہل کس نے کیں؟

اس نے کہا کہ سپاہیوں نے۔ یہ لوگ ان باتوں کی بہت احتیاط رکھتے ہیں۔ اور ان کے گھر دوسروں کی نسبت زیادہ صاف اور باترتیب ہیں۔ جنگ سے پہلے عورتوں کی کوئی عزت نہ تھی۔ اور لوگ انہیں جوتوں سے پیٹتے تھے (عام قہقہہ) لیکن تہذیب بہت پھیل گئی ہے۔ اور پٹائی بند ہو گئی ہے۔ اور عورت کی عزت دو آنہ روپیہ ہے۔ اور یہ اس لئے ہے۔ کہ ہم یورپ گئے تھے۔ کھلے میدان کے سرے تک افسران میرے ہمراہ پیدل چلے۔ اور جب میں گھوڑے کی پیٹھ پر آ رہا تو پیارے بوڑھے کپتان صاحب نے اپنی سفید پگڑی اتار کر اسے اپنے سفید و سیاہ سر سے اوپر اٹھاتے ہوئے اپنی تمنا بھری اونچی آواز سے جس میں وفاداری کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ہپ ہپ ہرّے (Hip Hip Hurrah) کا نعرہ بلند کیا۔ اور اس کا جھریوں اور داڑھی والا چہرہ بچوں کی سی خوشی سے تمتما اٹھا۔ اور دوسرے دو افسروں نے ادھیڑ عمر آدمیوں کی سی شائستگی سے اس کا ساتھ دیا۔

باب یازدہم

رہتک دہلی اور گوڑ گاؤں

جاٹ اور راجپوت عورتیں سرکاری قرضے۔ اشتمال اراضی

چونکہ دیکھنے بھالنے کی کوئی چیز نہ تھی۔ اس لئے ہم بغیر کچھ دیکھے بھالے گھوڑوں کی پیٹھ پر باتیں کرتے چلتے رہے۔ بھورے رنگ کا میدان ہمارے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا اور مغربی ہوا ہماری پشت کی طرف سے آ رہی تھی۔ اور ہم ریتلی گرد میں لپٹے ہوئے تھے۔ رہتک کا ایک جاٹ افسر جو چھٹی پر تھا۔ میرے ہمراہ تھا۔ جو کچھ ہم نے ابھی ابھی سنا تھا۔ اس کے عین مطابق میں نے جٹنی کی زندگی کے متعلق دریافت کیا۔ اس کا خیال تھا کہ ۹۰ فیصدی جٹنیاں اپنے گھروں میں خوش و خرم ہیں۔ اور ایک فیصدی بمشکل سے بدچلن ہیں یہ بات اس نے بچپن کی شادی پر محمول کی۔ جس کا رواج ہندوؤں کے علاقے میں عام ہے۔ اسکی اپنی شادی گیارہ برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ اور بہت سے ہندو کسان اس بات پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ کہ مذہب انہیں مجبور کرتا ہے۔ کہ وہ اپنی بیٹیوں کی شادیاں سن بلوغت سے پہلے یا اس تک پہنچتے ہی کر دیں۔ اس طرز عمل کو بند کرنے کی کوشش میں شاردا ایکٹ کی رو سے یہ خلاف قانون قرار دیا گیا ہے۔ کہ کوئی لڑکی چودہ برس کی عمر سے پہلے بیاہی جائے۔ لیکن گذشتہ سال جبکہ اس قانون پر عمل درآمد ہونے کو تھا۔ ہندوستان میں ہزاروں یہاں تک کہ گودیوں کے بچوں کی بھی باقاعدہ شادیاں کر دی گئی تھیں۔ میرے ہمراہی نے اسی گفتگو کے سلسلے میں کہا۔ کہ رہتک میں آدمیوں اور عورتوں کو خوش خوش رہنے کی جو بڑی وجہ میں سمجھتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ عورتیں اپنے آپ کو آدمیوں کا غلام سمجھتی ہیں۔ اور ہر بات میں ان کا حکم ماننے کو فرض خیال کرتی ہیں۔ وہ اپنے حقوق نہیں

جانتیں۔ اور نہ ہی ان کا مطالبہ کرتی ہیں۔ اور ان کے نیک رہنے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ محنت کرتی ہیں۔ ہر وہ شخص جس نے محنت شاقہ اٹھائی ہے۔ اس پر تکرار نہیں کرے گا۔ میں نے ان سے دریافت کیا۔ کہ تمہاری بیوی کب اٹھتی ہے؟ اس نے کہا کہ وہ چار بجے اٹھتی ہے۔ اور ایک یا دو گھنٹے آٹا پیستی ہے۔ جب ہم سب گھر ہوتے ہیں تو وہ دس سیر پیستی ہے۔ جس میں تقریباً دو گھنٹے لگتے ہیں۔ اور اگر اسے پیسنا نہ پڑے تو وہ کہتی ہے کہ آج میری ورزش نہیں ہوئی۔ میں کھانا ہضم نہیں کر سکتی۔ پسائی کے بعد وہ نہانے کیلئے پانی گرم رکھتی ہے۔ بھینسوں کا دودھ دوہتی ہے۔ گھر میں جھاڑو دیتی ہے۔ (بھنگی مویشی خانے کو صاف کرتے ہیں) اور صبح کا کھانا پکاتی ہے۔ اور دن کے مختلف اوقات میں چرخہ کاتتی ہے۔ کنوئیں سے پانی بھرتی ہے۔ اور اسے اپنے سر پر اٹھا کر لاتی ہے۔ اس طرح کہ ایک گھڑا دوسرے پر رکھا ہوا ہوتا ہے۔

میں نے پوچھا "کیا وہ کھیتوں کے کام میں بھی خاوند کا ہاتھ بٹاتی ہے"؟

بونے اور ہل چلانے کے علاوہ وہ ہر ایک کام میں مدد دیتی ہے۔ ہمارے ہاں شادی شدہ عورت کیلئے بونے کا کام لینا باعث شرم ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ ہمارے پاس کوئی آدمی ایسا نہیں ہے۔ جو ہمارے لئے یہ کام کر دے۔ اس لئے یہ الفاظ "جاؤ اور بوؤ" بطور طعن استعمال کئے جاتے ہیں۔ صرف بیوائیں ایسا کرتی ہیں۔ اگر کسی عورت کا خاوند گھر سے باہر ہوتا ہے۔ تو وہ اس کام کیلئے ایک چمار کو لگا لیتی ہے۔

میں نے پوچھا "اس قدر کام کے ہوتے ہوئے وہ اپنے بچوں کی دیکھ بھال کیسے کر سکتی ہے؟

اس کے پاس کام اسقدر زیادہ ہوتا ہے۔ کہ وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ اور وہ اپنے بچوں کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی۔

میں نے کہا "وہ سوتی کب ہے"؟

"دس بجے۔ اس کیلئے چھ گھنٹے کی نیند کافی ہے۔ اور وہ بہت مضبوط ہے۔ پہلے وہ اپلے تھاپا کرتی تھی۔ لیکن جب سے ہمارے ہاں [illegible] آیا ہے۔ جبکہ ہم سب تعلیم یافتہ ہو گئے تھے۔ ہم نے کہا کہ بات اچھی نہیں [illegible] ہے۔"

"تو کیا پھر تمہاری بیوی تعلیمیافتہ ہے"؟

"نہیں - یہ امر قابل افسوس ہے - اگر وہ تعلیم یافتہ ہوتی - تو وہ میرے ساتھ رہنے پر مصر ہوتی - اور یہ بات کہیں زیادہ اچھی ہوتی - اب میں کنبے کے خانگی اخراجات کی دیکھ بھال کیلئے اسے گھر چھوڑ دیتا ہوں - رہتک میں بہت سے لوگ اس ڈر سے کہ تعلیم ان کی تابعداری میں کمی پیدا کر دیگی - لڑکیوں کی تعلیم کے خلاف ہیں - وسطی پنجاب میں (اسکی ملازمت وہیں ہے) عورتیں کسی قدر پڑھی لکھی ہیں - اور اپنے خاوندوں کی آقا ہیں - غیر تعلیمیافتہ بیوی میں یہ برائی ہے - کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم یا تربیت نہیں دے سکتی - نہ اپنے گھر کیلئے اچھے انتظامات کر سکتی ہے - اور نہ اخراجات کا حساب رکھ سکتی ہے - نہ ہی وہ چیزوں کو با ترتیب رکھتی ہے - تعلیم یافتہ بیوی اس بات کا خیال رکھتی ہے - کہ کپڑے صاف ہوں اور برتنوں پر کوئی داغ یا دھبّہ نہ ہو - اور وہ اپنے بچوں کو کچھ نہ کچھ تربیت دیگی - انہیں کوئی تربیت نہیں ملتی - قطعاً نہیں ملتی - انہیں اجازت ہوتی ہے - کہ وہ جب چاہیں اور جہاں چاہیں رفع حاجت کریں - اور ایک مرتبہ میرے گاؤں کے ایک لڑکے نے اپنا بستر اس وقت گندہ کر لیا جبکہ اس کی بیوی اس کے ساتھ رہنے کیلئے آچکی تھی - اور جب گاؤں والوں نے اس کے متعلق سُنا تو خوب ہنسے ۔

۱۴ فروری جھجّر سے زاہد پور - (۹ میل)

جھجّر میں جو کہ ۱۲۰۰۰ باشندوں کا ایک قصبہ ہے - ہمیں اس نواب کے پرانے محصور بنگلے میں ٹھہرایا گیا - جس نے غدر کے ایّام میں غلط راستہ اختیار کرنے کا خمیازہ اپنی گردن دیکر اٹھایا تھا - چھت پر سے شاں شاں کرکے پانی کے زمین پر گرنے کی مسرت بیز آواز نے مجھے جگا دیا - بارش آخر آ ہی پہنچی - لیکن اس نے حالات کو خوب سمجھ لیا - اور محض ۱/۴ انچ برسی ۔

ایک پست درجہ کا گاؤں

ہم جھجّر سے تین بجے چل پڑے - اور بارش کی مہربانی سے آخر کار اس گرد سے

نجات ملی۔ جو سرسہ سے ہمارے گرد لپٹی ہوئی تھی۔ ہم نے پہاڑیاں بھی دیکھیں۔ یقیں تو بہت پست لیکن صحیح معنوں میں پہاڑیاں تھیں۔ اور اس بے پایاں میدان کا خاتمہ کرتی نظر آتی تھیں۔ ہم ایک گاؤں سیلانہ نامی میں ٹھیرے۔ اور دیکھا کہ حالت بہت خراب ہے تقریباً... دیہاتی حاضر تھے۔ اور ان میں سے اکثر جاٹ تھے۔ لیکن وہ گذشتہ دو ہفتوں کے جاٹوں سے بہت مختلف تھے۔ اگرچہ ہم ابھی رہتک میں تھے۔ لیکن اچانک ہی گوڑگاؤں کی فضا میں پہنچ گئے تھے۔ جو گندگی۔ بے بسی اور غلاظت لئے ہوئے تھی۔ آٹھ مستعفی فوجی سپاہی موجود تھے۔ ان کی جسمانی حالت کو دیکھ کر ہر شخص کو یہ حیرانی ہوتی تھی۔ کہ ان میں سے کوئی بھی فوج میں کس طرح پہنچ گیا تھا۔ یہاں تک کہ ان میں جو سب سے زیادہ چوکنا تھا۔ وہ بھی دبلا اور تنگ سینہ لئے ہوئے تھا۔ غیر صحت بخش حالت کی تمام برائیاں خراب فصلوں کے تواتر نے نمایاں کر دی تھیں اس دفعہ شکایت پانی کی قلت کی نہ تھی۔ بلکہ افراط کی تھی۔ کیونکہ برسات میں قریب کے پہاڑوں سے سیلاب زور و شور کرتے آتے ہیں۔ اور فصلوں کو بہا لے جاتے ہیں۔ یا تخم ریزی ناممکن بنا دیتے ہیں۔ اور جب موسمی ہوائیں ختم ہو لیتی ہیں۔ تو مہینوں بارش نہیں برستی۔ اور فصل ربیع نہیں ہونے پاتی۔ یہ لوگ بہت زیادہ رنجیدہ تھے۔ کیونکہ ہر سیلانی کی طرح (ایک بھٹر کی مار ایک گاؤں ہے) ان کے لگان کی گذشتہ قسط التوا میں نہ ڈالی گئی تھی۔ ہم نے پٹواری کو طلب کیا۔ اور جب اس نے یہ کہا کہ یہ لوگ ادا کر سکتے تھے۔ تو اس پر یہ کہتے ہوئے ٹوٹ پڑے "کیا تم اس وقت سوئے ہوئے تھے جب فصلیں دریا برد ہو گئی تھیں"؟ اس کے رجسٹروں سے یہ بات ظاہر تھی۔ کہ نصف فصل اُترا آئی تھی۔ لیکن اس نے تسلیم کیا۔ کہ سیلانہ اور سیلانی کے حالات یکساں تھے۔ البتہ سیلانی کا پٹواری اور تھا۔

جاٹ کے خانگی اخراجات

جٹی (جاٹ عورت) کے متعلق کل کی گفتگو نے مجھے اس امر پر متحیر رکھا کہ آیا یہ ممکن نہیں ہوگا۔ کہ اسکی اپنی زبان سے یہ سُنا جائے کہ وہ زندگی کے متعلق کیا خیال رکھتی ہے۔ اور جب ایک ادھیڑ عمر کا دور اندیش ہندوستانی ساتھی۔ مجھے مدد دینے

کیلئے تیار ہوگیا۔ نویں نے کوشش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ منتخب کردہ گھر ایک سابق نمبردار کا تھا۔ جو اب گردش میں آیا ہوا تھا۔ اسکی سولہ ایکڑ زمین میں سے پندرہ ایکڑ رہن رکھی ہوئی تھی۔ اور وہ لگان ادا کرنے یا وصول کرنے کے ناقابل تھا۔ اس لئے مجبوراً اسے دوسرے کو جگہ دینی پڑی تھی۔ اس کا گھر اسکی غربت کا پتہ دیتا تھا۔ ڈیوڑھی اتنی بڑی تھی کہ اس میں بیلوں کی ایک جوڑی اور ایک ڈونگی (پانی کا بڑا برتن) سما سکتی تھی۔ صحن اسی کا جواب تھا۔ اور برآمدہ جو اسی میں کھلتا تھا۔ تین چار پائیوں سے اٹا پڑا تھا۔ جن پر وہ خود اسکی بیوی اور اس کے پانچ بچے تین لحافوں میں سوتے تھے۔ برآمدے میں سے ہوتے ہوئے ایک اور تھا۔ اور یہ حسب معمول ایک اندھیرا غار تھا۔ غلے کی کوٹھیاں خالی تھیں۔ اور انہیں محض اپنی خوراک کیلئے غلہ خریدنا پڑتا ہے۔ وہ اس سے چپاتیاں بنا لیتے ہیں۔ اور انہیں چنے کے ساگ سے روکھی ہی کھا لیتے ہیں۔ اور ساگ میں بھی مکھن یا گھی نہیں ہوتا۔ ان کے پاس دودھ نہیں ہے۔ کیونکہ ان کی دو گائیں خشک سالی کے ایام میں چل بسی تھیں۔ اور گاؤں میں دودھ فروخت کوئی نہیں کرتا۔

انکی غربت اپنی انتہا تک پہنچی ہوئی تھی۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ کیونکہ اسکے ہاں آٹھ بچے ہوئے تھے۔ جن میں سے پانچ زندہ تھے۔ سب سے بڑا بچہ اس وقت پیدا ہوا تھا۔ جب کہ اسکی والدہ ۱۴ برس کی تھی۔ وہ مر چکا ہے۔ یہی حال اس بچے کا ہوا۔ جو اس کے بعد وجود میں آیا۔ اور آخری مرتبہ جوڑے پیدا ہوئے۔ ایک پیدائش کے پانچ ماہ بعد چل بسا۔ اس کا بھائی باقی ہے۔ لیکن اس کا بھی دیر تک رہنا مشکل ہے اسکی ماں نے بتایا۔ کہ اس کا دوسرا سال ہے۔ لیکن وہ صرف ۴ ماہ کا معلوم ہوتا تھا اور زیادہ سے زیادہ ۱ پونڈ (۵ سیر) وزنی ہوگا۔ وہ ابھی بھی اسے دودھ پلاتی ہے۔ اس نے اپنے تمام بچوں کو دو دو اور اڑھائی اڑھائی سال دودھ پلایا ہے۔ میں نے پوچھا کہ جو ماں خود دودھ نہیں پیتی وہ بچوں کو کس طرح دودھ پلا سکتی ہے؟ اس وقت بھی جب ہم باتیں کر رہے تھے۔ اس نیم مردہ سوکھے ہوئے بچے نے اپنا سر خشک چھاتیوں تک پہنچایا۔ اور ہاتھ درمیان سے بے فائدہ ادھر ادھر ٹٹولا۔ یہ ایک نظارہ تھا۔ کہ پتھر سے بھی آنسو پھوٹ بہتے۔ مگر آٹھ بچے ہونے کے کیا معنے؟ غربت کا پہلا سبب یہی تھا۔

دو برس ابھی اس طرح کا تھا۔ دو سال گذرے۔ سب سے بڑی لڑکی کی شادی نو برس کی عمر میں کی گئی تھی۔ اور باوجود اس کے کہ گاؤں پہلے ہی خشک سال کا مارا ہوا تھا۔ ۵۰۰ روپیہ شادی پر صرف کر دیا گیا۔ ۲ صد روپیہ بنک سے ۱۲½ فیصدی سود پر قرض لیا گیا تھا۔ اور اس لئے کہ بنک اور قرض نہ دے گا۔ ۳۰۰ روپے ایک بنئے سے ۱۸¾ فیصدی شرح سے لئے گئے۔ یہ کہنا لاحاصل ہے کہ ایک پائی بھی ادا نہیں کی گئی۔ یہی کچھ اس وقت کیا گیا جبکہ ایک بیٹے کی شادی رچائی گئی۔ اور اب سابق نمبردار ۸۴۰ روپے کا مقروض ہے۔ جسمیں سے زیادہ رقم (۶۲۵ روپیہ) پر ۱۸¾ فیصدی سود ہے۔ وہ اپنی بدقسمتی کا الزام اپنے باپ پر نہیں لگا سکتا کیونکہ اس نے کوئی قرضہ نہ چھوڑا۔ نہ ہی وہ اپنی لڑکی کی شادی کے موقع کی کوئی مفید چیز دکھلا سکتا ہے۔ کوئی زیور نہیں خریدا گیا تھا۔ دلہا کو سو روپے نقد دئے گئے تھے۔ اور ۱۰۰ اجھانوں کی دو دن تک مہمان نوازی کی گئی تھی۔

اس وقت تک ہم تقریباً خاوند سے ہی باتیں کرتے رہے تھے۔ اب ہم بیوی کی طرف مخاطب ہوتے۔ چار برس کی عمر میں شادی ہونے کے بعد (اس کا خاوند ۹ برس کا تھا) چودہ برس کی عمر میں اس کے ہاں پہلا بچہ پیدا ہوا۔ اور جب وہ اپنی دوسری لڑکی کو دودھ پلاتی تھی تو یہ دونوں پلیگ کا شکار بن گئے۔ اس کی لڑکی کے جسم پر ابھی تک اس کے نشانات باقی ہیں۔ کیونکہ اس کی کمر اپنی بہن کی کمر کے نصف کے برابر ہے۔ غربت کے باوجود دونوں لڑکیاں (آٹھ و گیارہ برس کی) سونے کی چھوٹی چھوٹی نتھلیاں پہنے ہوئے تھیں۔ ماں منہ اندھیرے جو پیسنے کے لئے اٹھ بیٹھتی ہے۔ پھر اپنا اور اپنے بچے کا ہاتھ منہ دھوتی ہے۔ بچے کو دودھ پلاتی ہے۔ احاطے کو صاف کرتی ہے پانی بھر کر لاتی ہے۔ ناشتہ تیار کرتی ہے۔ اور اپنے خاوند کا حصہ کھیتوں میں لے جاتی ہے واپسی پر کچھ ایندھن لاتی ہے۔ گھنٹہ آدھ گھنٹہ کاتتی ہے۔ کنوئیں سے اور پانی بھرتی ہے۔ شام کا کھانا پکاتی ہے۔ اور علیٰ ہذا القیاس میں نے پوچھا کیا یہ تمام کام کرنے کے بعد تم تکان نہیں محسوس کرتیں؟

اس نے کہا "عادت ہو جاتی ہے"۔

کیا تم دن میں کبھی نہیں سوتیں؟

آدھ گھنٹے اور وہ بھی صرف گرمیوں کے دنوں میں۔ سردیوں میں چھوٹے بچے کو ہر روز غسل دیا جاتا ہے۔ اور دوسرے بچوں کو ہر تیسرے چوتھے دن۔ گرمی کے موسم میں سب دن میں

معمر عبہ نہاتے ہیں کپڑے ہفتے میں دو بار دھوئے جاتے ہیں۔ اس قدر عزت اور تفکرات کے باوجود ان میں خوبصورتی و خوش اسلوبی کا انداز پایا جاتا تھا۔ اور سب سے زیادہ تعجب خیز امر یہ تھا کہ اس کے جوان چہرے پر کوئی جھری نہ تھی۔ سر اور کندھے نہایت خوبصورتی سے ایک پھولدار سرخ شال سے آراستہ تھے۔ اور نیچے لمبے شمار پلیٹوں والا ایک لہنگا پہنا ہوا تھا۔ اسکا پست قد بے بس خاوند کھدر کے میلے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اور دونوں ننگے پاؤں پہلو بہ پہلو کھڑے ہماری طرف ایسے بچوں کی سی معصومیت اور بے چارگی سے دیکھ رہے تھے۔ جو اپنا راستہ بھول گئے ہوں۔ اور انہیں اس حقیقت کا محض احساس ہوا ہو۔ یہ ان کا قصور نہیں ہے۔ کہ وہ اس قدر غلط راستے اختیار کرتے رہے ہیں۔ کیونکہ ان کی رہنمائی کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اور اب کون ہے جو ان کی رہنمائی کر کے انہیں امن و اماں کی طرف لے جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس غار کی تاریکی میں جنم لینے کے بعد عمر بھر اندھیرے میں رہنا ان کے لئے مقرر ہو چکا ہے۔ یہانتک کہ چیتا کی روشنی کون جانے ان کی کس طرف رہنمائی کرے۔ گھوڑوں کی پیٹھ پر ہم خاموش فضا میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ اور ابر آلودہ دن شفق کی سرخیوں میں تمام ہو گیا۔

۱۵ فروری قیام
ایک اور جاٹ کا گھرانہ

اتوار کا دن تھا۔ کام کا بقایا صاف کرنے میں صرف ہو گیا۔ شام کے وقت ہم نے اپنے آس پاس کی چیزوں پر نظر ڈالی۔ دیکھا کہ پشت پہاڑوں کے دائرے میں ایک مستطیلی وادی ہے۔ جسکے وسط میں سے ایک ٹیلہ بلند ہے اور اسکی شاخیں زاہد پور کے چھوٹے گاؤں کی صورت میں پھوٹ نکلی ہیں۔ کل کی آزمائش کو دھرانے کی فکر میں میں اور میرا ساتھی سب سے نئے گھر پہنچے۔ عمدہ کناروں والی سرخ اینٹوں کی ایک نفیس عمارت تھی۔ بڑے دروازے میں سے گذر کر ہم نے اپنے آپ کو ایک فراخ ڈیوڑھی میں پایا۔ جسے تین محرابوں کی ایک قطار نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اور یہ محرابیں بے ڈول بنی ہوئی چوٹیوں والے پتھروں کے تین چھوٹے ستونوں سے قریب قریب نوک کی صورت میں اٹھتی چلی گئی تھیں۔ اس سے پرے حسب معمول برآمدے والا صحن اور بغیر کھڑکیوں والے کمرے تھے۔ یہ گھر ہندو جاٹوں کے ایک کنبہ کا تھا۔ اور اس کی تاریخ ہمیں ان دو بیواؤں نے سنائی جو اس گھر کی مشترکہ خواتین ہیں۔ اول اول تو انہوں نے اپنے چہرے پھٹے ہوئے شالوں میں چھپائے لیکن پھر اپنے

بی بہن سے تازگی پاکر انہوں نے پردہ دور کر دیا۔ اور ہمارے ساتھ اتنی بے تکلفی سے باتیں کرنے لگیں کہ وہ یورپ کی دہقانی عورتوں کے ہم پلہ نظر آنے لگیں۔ اس گھر میں کبھی چار بھائی رہتے تھے۔ جنہوں نے یوسف کی طرح بہت خوشحالی حاصل کر لی تھی صرف بارہ ایکڑ زمین میراث میں پانے کی وجہ سے انہوں نے اور اجازت پر لے لی۔ اور کفایت شعار و محنتی ہونے اور اپنی شادیوں پر کم خرچ کرنے کی وجہ سے وقت آنے پر انہوں نے کئی ہزار روپیہ جمع کر لیا۔ اور ۲۰۰ ایکڑ زمین رہن رکھ لی۔ پھر کتک کی بیماری " جیسا کہ ۱۹۱۸ء کے خوفناک انفلوئینزا (وبائی نزلہ) کو بیماری آنے والے مہینہ کے نام پر پکارا جاتا ہے۔ آ پہنچی۔ اور چار بھائیوں میں سے تین اس کا شکار ہو گئے۔ چار سال بعد چوتھا بھی چل بسا۔ اور یہ دو بیوائیں اور چھ بچے باقی رہ گئے۔ گھر کی تعمیر جنگ کے بعد شروع کی گئی تھی۔ اور اس میں پانچ سال لگے تھے۔ کاریگر " جھجر " کا ایک بیمار تھا۔ بڑھئی اور وہ صرف دو ہی آدمی ملازم رکھے گئے تھے۔ چھت کی عمارتی لکڑی خریدی گئی تھی۔ لیکن اینٹیں اور چونا دونوں گھر کے لوگوں نے تیار کیا تھا۔ اور مزدور بھی بہم پہنچائے تھے۔ اس پر بھی گھر بنانے میں تقریباً ۴۰۰۰ روپیہ خرچ آیا اور پندرہ برس لی پونجی تمام ہوئی۔ " ہم نے اسے ہاتھ پاؤں ملا کر کمایا تھا " پھر خشک سالی کا دور آیا۔ اور اب حالات دگرگوں ہیں۔ مشکلات اتنی نہیں ہیں جتنی کہ کل والے گھر میں بچوں کا فی دودھ بہم پہنچانے کے لئے دو بھینسیں رکھی ہوئی ہیں۔ اور ان سے فروخت کیلئے بھی گھی مہیا ہو جاتا ہے۔ آٹے کے لئے وہ صرف وہ جو کو استعمال میں لاتے ہیں۔ جو دو سال پہلے کی فصل سے حاصل ہوئے تھے۔ یہ کچھ زیادہ تازہ یا اشتہا خیز تو نہیں ہیں۔ لیکن کم از کم ان کی اپنی فصل کے ہیں۔ وہ ان کی چپاتیاں پکاتے ہیں۔ اور عام طور پر بگھارے ہوئے چنوں کے ساگ سے کھاتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی محض نمک مرچ سے بھی کھا لیتے ہیں۔

دونوں بیوائیں موٹے موٹے کھدر کا لباس پہنے ہوئے تھیں۔ جو اسقدر بوسیدہ اور میلا تھا جتنے کہ پرانے چیتھڑے۔ ہم نے ان میں سے زیادہ باتونی عورت سے پوچھا " کیا تمہارے پاس ان سے زیادہ اچھے کپڑے ہیں؟ وہ اپنی چادر کے بل آگے کرتے ہوئے بولی " میرے لئے یہی ریشم ہیں " اس کی عمر تینتالیس برس کی تھی اور اس میں سے کل والی جٹنی کی نفاست سراسر مفقود تھی۔ لیکن اس کے موٹے موٹے خد و خال میں ایک ایسی قوت جلوہ گر تھی۔ جو اسکی نسبت صانع کی صنعت کا زیادہ مظاہرہ کر رہی تھی۔ کل والی جٹنی پو پھٹے اٹھتی ہے۔ اور یہ کافی سویرے ہے۔ لیکن یہ عورت دن چڑھے سے دو گھنٹے پہلے چکی پیسنے اٹھتی ہے۔ اور چونکہ اسکا خاوند گذر چکا ہے یہ بیج بھی بوتی ہے۔ میں نے پوچھا کیا تم کبھی دوپہر کو بھی سوتی ہو۔ اس نے کہا " جب سے حضور کے ضلع میں آئی ہوں (یہاں وہ آداب بجا لائی)

ایک پہر بھی دن میں نہیں سوئی،، وہ پہاڑیوں کے اس پار سے آئی ہوئی تھی۔ اور اتنی کم سن بیاہ دی گئی تھی۔ کہ اسے یہ بھی یاد نہ آسکا۔ کہ وہ وہاں کب آئی تھی۔ اس کے ہاں پہلا بچہ پندرہ برس کی عمر میں ہوا تھا۔ اور سات اس کے بعد۔ لیکن اب صرف چار زندہ ہیں۔ اس نے ہر ایک کو باری باری سے دودھ پلایا۔ یہاں تک کہ دوسرا پیدا ہوگیا۔ بچے کی پیدائش کے بعد وہ دس سے بیس دن تک آرام کرتی تھی۔ کل والی بجٹی ایک ماہ آرام لیتی تھی۔ میں نے پوچھا۔ کیا تم لڑکے اور لڑکی میں کوئی فرق سمجھتی ہو؟ اس نے جواب دیا "نہیں،، اور دفعتہً اس کی پُر زور آواز شفقتِ مادری سے بھرا گئی۔ "ماں اور باپ کی نظروں میں بیٹا بیٹی ایک ہی ہیں"۔ گرمیوں میں وہ تقریباً ہر روز نہاتی ہے۔ اور سردیوں میں ہر تیسرے یا چوتھے دن۔ اس کی لڑکی پندرہ برس کی عمر میں بیاہی گئی تھی۔ اور دُلھا کو محض ۲۵ روپے نقد اور دو جوڑے کپڑوں کے دئے گئے تھے۔ اور صرف بیس آدمی برات کے ساتھ آئے تھے یہ باتیں کل کے حالات سے کس قدر مختلف تھیں۔ یہ دونوں صورتیں اسباب غربت پر پوری پوری روشنی ڈالتی ہیں۔ اسی کنبے کو لیجئے۔ ان کے پاس زمین کم تھی۔ لیکن ان میں دو ایسی خصوصیات ہیں جو ہر جگہ انسان کو فارغ البالی کی طرف لیجاتی ہیں۔ اور وہ قوت ارادی، کفایت شعاری ہیں۔ نتیجہ یہ ہے۔ کہ وبا اور خشک سالی میں سے کسی نے بھی اسے پامال نہیں کیا ہے۔

ایک عورت کے ہاں کتنے بچّے ہونے چاہئیں

لیکن دونوں گھرانوں میں ایک بات مشترک ہے۔ اور کسی حد تک وہ اسبات میں ہندوستان کے اور کروڑوں گھرانوں کے ساتھ ایک ہیں۔ ہر گھر میں آٹھ آٹھ بچّے ہوئے ہیں اور کئی چل بسے ہیں۔ سولہ بچوں میں سے صرف نو زندہ ہیں۔ اسبات سے مسلسل خیالات کا راستہ صاف طور پر کھل گیا۔ اور جٹنی (جٹی)، اور میرے ساتھی کے مابین قابلِ ذکر گفتگو ہوئی۔

اس نے پوچھا "تمہارے خیال میں عورت کے کتنے بچّے ہونے چاہئیں؟"

"دھرتی ماتا کی پیاس بارش کی کسی مقدار سے نہیں بجھتی اور نہ ماں کی طبیعت بچوں کی تعداد سے بھرتی ہے۔ کسی بنجر کھیت یا بانجھ عورت کو کون لیگا؟"

"لیکن کیا ایک عورت کے بیشمار بچّے نہیں ہوسکتے؟"

"بچے نہ ہوں تو آدمی کہاں سے ہوں اور آدمی نہ ہوں گے تو خدا کی مخلوق کی رکھوالی کون کریگا۔ تالاب کون کھودیگا۔ تاکہ ان میں پینے کا پانی جمع ہوسکے؟"

"لیکن اگر بچے بہت سے ہیں تو کیا وہ غریب نہ ہونگے؟"

"دنیا کا کام چلانے کے لئے امیر و غریب دونوں کی ضرورت ہے۔ اگر آپ کی طرح سے سب امیر ہوں تو آپ کے گھوڑے کے لئے گھاس کون کاٹے گا؟"

"تم بہت سے بچوں کو کھانا کیسے دوگی؟"

"یہ کام ماں کا نہیں ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ وہ انہیں جنے اور پرورش کرے۔ دوسری چیزیں خدا مہیا کرے گا۔"

"تو کیا پھر ایک عورت کے بہت سے بچے نہیں ہو سکتے؟"

"تعداد جتنی بھی ہو کم ہے۔ کتک کی بیماری چار ہی دن میں میرے کنبے کے تین آدمیوں کو لے گئی۔"

"یورپ میں لوگ چند بچے پیدا کرتے ہیں۔ کیونکہ انہیں یہ فکر دامنگیر ہوتی ہے کہ وہ کیسے رہیں گے اور کیا کھائیں گے؟"

"وہ مور کھ ہیں۔ جو ایسی باتیں سوچتے ہیں۔ خدا نے انہیں دوسرے ملکوں کی حکومت دی ہے۔ اور ہم نے یہ ملک اپنے ہاتھوں سے اس لئے دیدیا کہ اپنی بیٹیوں کو ہلاک کر دیا۔"

"گاندھی جی بھی یہی چاہتے ہیں کہ لوگ اپنے بچوں کی تعداد پر قابو رکھیں۔"

"اسکے ہاں کتنے بچے ہیں؟"

"مجھے یقینی طور پر معلوم نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ چار ہیں۔"

"اتنے ہی میرے ہاں ہیں۔ اور اتنے بچے جننے کے بعد میری بات کون سنتا ہے (مطلب یہ تھا کہ پھر گاندھی جی کی بات کیوں سنی جائے)

ایک سوال اور بچہ جننے کے بعد تم نے بحال ہونے کے لئے کیا چیز کھائی؟"

"خشک ادرک۔ کھانڈ۔ گھی اور گیہوں کا آٹا تمام کو ملا جلا کر۔"

"یہ بہت مقوی ہے؟"

اس کی مثال ایسی ہی ہے۔ جیسے کہ زمین کو فصل کاٹ لینے کے بعد کھاد دیا جاتا ہے۔ بلاشبہ یہ بات ایسی تھی۔ گویا کہ زمین ہی کے منہ سے نکلی تھی۔ میرے ساتھی نے کہا۔

لیکن ایسی عورتیں کمیاب ہیں۔ اور ہر جگہ کمیاب ہیں۔

پست درجہ کا ایک اور گاؤں!

افسوس ہے کہ یہ گھرانہ اس گاؤں میں سے بطور تمثیل نہیں پیش کیا جاسکتا۔ وہ لوگ جو بنک کے اجلاس کے لئے اکٹھے ہوئے چہروں پر خوشی کے آثار نہ رکھتے تھے۔ بلکہ اُن پر غربت اور خرابی صحت کی تمام بیرونی اور نمایاں علامات موجود تھیں۔ یعنی اُن کی گالیں پچکی ہوئی۔ رنگ زردی مائل نظریں بے بصر و متحیر۔ سینے تنگ۔ پگڑیاں پھیکے رنگ کی اور ڈھیلی ڈھالی لپٹی ہوئی اور لباس پرانے کھدر کا تھا۔ حاضرین میں سے ایک سپاہی تھا۔ اور صرف وہی شخص ایسا تھا جو پڑھ سکتا تھا گذشتہ چار فصلوں میں سے دو میں زمین کا لگان التوا میں ڈالنا پڑا تھا۔ اور حال ہی کی مردم شماری سے ظاہر ہوتا ہے کہ دس سال پہلے ۷۲ گھر آباد تھے۔ اور اب صرف ۵۱ ہیں۔ بنک کا سود ۲ ۱/۲ سال سے بقایا میں پڑا ہے۔ اور قرضے کی اوسط ۸۴۵ روپے فی کس ہے۔ جائدادیں معمول سے زیادہ بڑی ہیں۔ اور اوسطاً ۲۲ ایکڑ فی کس ہیں۔ لیکن فصلیں اتنی غیر یقینی ہیں کہ چار یا پانچ افراد کے ایک کنبے کے لئے ۲۰ ایکڑ سے زیادہ زمین درکار ہوتی ہے۔ جون ۱۹۲۹ء سے یہاں کسی کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ اور اسی وقت سے کسی بنئے یا بنک نے کوئی قرضہ نہیں دیا ہے۔ تاہم جب ہم نے یہ بات تجویز کی کہ یہ بند کر دینا چاہیے۔ اس کے خلاف پر زور صدائے احتجاج بلند کی گئی وسطی پنجاب میں یہ بات شاذ دیکھنے میں آئی ہے کہ کوئی کاشتکار اس قدر گر گیا ہو کہ اس کے پاس ایک بیل رہ جائے۔ لیکن اس علاقے میں خشک سالی کے وقت سے یہ بات عام ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں دس ہیں۔ اور خشک سالی سے پہلے سب کے پاس ایک سے زیادہ بیل ہوتے تھے اب جب وہ ہل چلانا چاہیں تو ضروری ہے۔ وہ ایک دوسرے کی طاقت سے کام لیں۔ ضروریات ہے۔ دب کر تو کمینوں نے گاؤں چھوڑ دیا ہے۔ اور اپنے کنبے کے ساتھ لے گئے ہیں۔ اب صرف چار باقی ہیں۔ بس جاٹ بھی چلے گئے ہیں۔ لیکن اپنے کنبوں کو ساتھ نہیں لے گئے ہیں۔

۱۶ فروری زاہد پور سے فرخ نگر (۹ میل)

ہم گھوڑوں پر بیٹھے سرسبز کھیتوں میں سے نکلتے گئے۔ یہ اب ہمیں اتنے کم نظر آتے ہیں کہ یہ علاقہ ہمیں خوشحال معلوم ہوتا تھا۔ اس پر بھی وہاں افراط کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ گیہوں اور جو محض دو دو فٹ اونچے کھڑے تھے۔ اور ان کی بالیدگی اسقدر مسدود ہو گئی تھی کہ چھونے سے

محسوس ہوسکتی تھی۔ آسمان آئے دن کی طرح ڈھکا ہوا تھا۔ لیکن تمام وہ بارش جو ان بادلوں نے برسانی وہی چھینٹا تھا۔ آدھ گھنٹے تک جھجرّ میں پڑا۔ چند میل چلنے کے بعد ہم کتانی پہنچے۔ یہ گاؤں ہندو راجپوتوں کے ایک گھرانے کی ملکیّت ہے۔ اس علاقے میں جو کبھی خود سر لوگوں سے آباد تھا۔ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح وہ ایک حصار نما گاؤں میں رہتے ہیں۔ ایام غدر میں جھجرّ کے نواب نے لوگوں کو اس پر حملہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ اور انہوں نے اسکا بڑا دروازہ اڑا دیا تھا۔ اور یہ اب بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ خیال کرکے اب سب کچھ جاتا رہا ہے راوی کے دادا نے اپنی تلوار اٹھائی اور اپنی بارہ پردہ دار عورتوں کی عصمت بچانے کے لئے انہیں قتل کر دیا اور پھر نکل بھاگا۔

پردہ

ہر ایک راجپوت خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان اپنی عورتوں کو پردہ میں رکھتا ہے۔ اور یہ وہی چادر دیواری کا ہیبتناک پردہ ہے۔ اس لئے مجھے یہ معلوم کرکے بہت تعجب ہوا کہ چار یا پانچ لڑکیاں لڑکوں کے سکول میں جاتی ہیں۔ لیکن بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح یہاں کے لوگ بھی ایک خاص عمر تک انہیں کوئی ہرج نہیں سمجھتے۔ اور یہ عمر انہوں نے آٹھ برس بتائی۔ کیونکہ نو برس سے پردہ شروع ہو جاتا ہے۔ مغربی خیال والے کیلئے چار دیواری کا پردہ اس قدر باعث نفرت ہے۔ کہ جب کبھی وہ اسے کہیں دیکھتا ہے تو وہ حیران ہوتا ہے کہ لوگ اسے کس طرح جائز ٹھہراتے ہیں۔ اس لئے میں بھی کچھ کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"کل ہی مسلم راجپوتوں نے ہمیں بتایا کہ ہمارے ہاں اس لئے پردہ کرتے ہیں کہ یہ ہمارا مذہبی حکم ہے۔ ہندو تم کیوں کرتے ہو؟"

"یہ رواج کی بات ہے"

"کیا تمہاری عورتیں چکی پیستی ہیں؟"

"نہیں ہمارا گھرانہ قدیمی ہے۔ ہم راجاؤں کی اولاد ہیں۔ اس لئے ہم انہیں پیسنے نہیں دیتے۔ البتہ وہ کاتتی ہیں اور بعض جرابیں اور دستانے بُنتی ہیں"

"تو کیا پھر ان کی کوئی ورزش نہیں ہوتی؟

"یہ اللہ جانتا ہے"

"کیا وہ کبھی باہر نہیں جاتیں؟"

"نہیں وہ گاؤں کی گلیاں تک نہیں جاتیں۔ کبھی کبھار وہ شہر چلی جاتی ہیں۔ اور اسوقت وہ برقعہ نہیں بلکہ چادر پہنتی ہیں (برقعہ مسلمان عورتیں پہنتی ہیں)۔

"آپ تعلیمیافتہ لوگ ہیں۔ کیا کبھی آپ کو یہ خیال آتا ہے۔ کہ پردے کی سختیاں کم کرنی چاہئیں۔"

"خیال دل میں آتا ہے۔ لیکن ہم اسے اپنے سے دُور ہی رکھتے ہیں۔ عورتیں بھی اسکے خلاف ہیں۔ وہ یہ کہتی ہیں کہ ہمیں پانی بھرنا اور کھیتوں میں کام کرنا پڑیگا۔ یہ ہمارے باپ دادا کی رسم ہے اور ہم اسے بدل نہیں سکتے۔

وہ مسلم راجپوت جنکی طرف اوپر اشارہ کیا گیا تھا۔ گدی بالا کے لوگ تھے۔ وہاں ایک پردہ نہ کرنے والے گاؤں کے ہندو جاٹ کی موجودگی سے پردہ کے متعلق ہماری بحث گرم ہوگئی تھی۔ ایک راجپوت کو یہ بتاتے ہوئے سنکر کہ ہماری عورتیں کبھی باہر نہیں جاتیں۔ اس نے طنزاً کہا "آدمی تمام دن ہل چلائے اور شام کو کچھ ایندھن لائے تاکہ اسے کچھ کھانے کو مل جائے"۔ اس ہلکی سی پوچھا گچھ نے دلچسپ جوابات نکلوائے۔ ایک نے کہا "ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہماری عورتیں گلیوں میں پھریں"۔ دوسرے نے کہا "ہم عورتوں کی کمائی نہیں کھانا چاہتے"۔ تیسرے نے کہا "ہمارا خیال ہے کہ عورت نہ کوئی نکلنے والی چیز ہے۔ نہ کوئی دیکھنے والی چیز ہے اور نہ کوئی ایسی چیز ہے کہ جس سے خدمت لی جائے"۔

میں نے پوچھا کہ اگر وہ باہر نہ جائیں تو طاقتور کیسے رہ سکتی ہیں؟

بلاشبہ وہ کمزور ہوتی جارہی ہیں۔ مگر ان کا حوصلہ ابھی تک قوی ہے۔

پھر تم بھی کمزور ہو جاؤ گے؟

قوی دل راجپوتوں نے یہ جواب دیا۔ کہ ہمیں کسی کام پر لگادو فوراً کر دیں گے

تھوڑی دیر بعد ہمیں پتہ لگا کہ یہاں کی دایہ ایک بھنگن ہے۔ اس قابلِ رحم مقابلے پر میری احمقانہ تنقید یہ تھی کہ یہ بات مضحکہ خیز ہے۔ لیکن میرے ساتھی کا فقرہ عقلمندانہ تھا۔ اس نے کہا "رونے کی بات ہے"۔

پردہ اور صحت

گاؤں کے معمولی گھروں میں بند رہ کر جن کو کوئی شخص محض قیاس کر سکتا ہے۔ عورتیں اپنا دن

کیونکہ کاٹنی میں ملتکٹانی ہیں وہ نہ دودھ دُہتی ہیں اور نہ کپڑے صحتی یہاں کی ورزش صرف یہ ہے کہ وہ دودھ بلوئیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس تحصیل کے پندرہ یا بیس گاؤں میں یہی صورت ہے۔ گنڈی بلالہ میں عورتیں کم از کم پیس تو سکتی ہیں۔ اور یہ کہ یہ بات اُن کی صحت کے لئے اچھی ہے۔ اسبات سے ظاہر ہے جو دو راجپوتوں نے (ایک ہندو اور ایک مسلمان) مجھ سے کہی۔ ہندو کا بیان ہے کہ میرے ایک پڑوسی نے ایک مرتبہ اپنی بیوی کے متعلق جو درد میں مبتلا تھی۔ ایک ڈاکٹر سے مشورہ لیا۔ ڈاکٹر نے جو بظاہر کسی قدر علم النفس سے واقف تھا۔ اس عورت سے کہا کہ تم ہر روز ایک سیر آٹا پیسو اور گائے کو کھلاؤ۔ اس نے اس کی نصیحت پر عمل کیا اور جلد اچھی ہو گئی۔ دیندار ہندو ہونے کی وجہ سے اس نے صحت یاب ہونے کو مقدس گائے کے لئے روزانہ کا وخیر کرنے پر معمول کیا۔ مسلم راجپوت نے مجھے بتایا کہ جب میرے چچا کئی سال بعد آسٹریلیا سے واپس آئے تو پردہ دار عورتوں کی بیمار صورتیں دیکھ کر اور اسبات پر یقین رکھتے ہوئے کہ یہ حالت چکی پیسنا چھوڑنے کی وجہ سے تھی۔ (اس کی عدم موجودگی میں ایک آئل انجن اگاؤں میں، لگادیا گیا تھا) اس نے انہیں طلب کیا اور کہا، میں وہ رقم نہیں بچانا چاہتا۔ جو آئل انجن والوں کو دی جاتی ہے۔ (میرے پاس روپیہ کافی ہے) بلکہ یہ کہ اگر تم چکی پیسو گی تو بالکل تندرست رہو گی۔ اور آٹا زیادہ اچھا ملے گا۔ اب سب سویرے اُٹھتی ہیں اور ایک یا دو گھنٹہ چکی پیستی ہیں۔ اور اسکی وجہ سے ان کی حالت کہیں زیادہ اچھی ہے۔ یہ بات نہایت آسانی سے کہی جاسکتی ہے۔ کہ جب کوئی پردہ دار عورت پیسنا چھوڑ دیتی ہے۔ تو یہ وقت اس کے لئے پردے سے باہر آجاتا ہے۔ مثلاً مجھے ایک اور راجپوت کا ذکر سُنایا گیا۔ (ایک سرکاری افسر) جو اپنی بیوی کو اسقدر خلوت میں رکھتا تھا۔ کہ جب وہ کمرے سے باورچی خانے تک بھی جاتی تھی۔ جو کہ صحن میں تھا۔ تو اسے مکمل طور پر لبادہ اوڑھنا پڑتا تھا۔ اس کی ٹانگیں آہستہ آہستہ مرتی جارہی تھیں۔ جبکہ اس کے ایک پردہ نہ رکھنے والے دوست نے اسبات کا احساس کرکے اسے ہر شام غروب آفتاب کے بعد باہر چہل قدمی کے لئے لے جانا شروع کیا اور اس بات نے اسے بچالیا۔

کٹانی میں راجپوت مزارع پردے کے متعلق اتنا سخت نہیں ہو سکتا جتنا کہ جاگیردار اور ان کی عورتیں نہ صرف چکی پیستی ہیں بلکہ صبح و شام کھیتوں میں نکل جاتی ہیں۔ لیکن وہ بھی کھیتوں میں کوئی کام نہیں کرتیں۔ میں سوار ہو کر چل پڑا تو اسی طرح جیسا کہ میرے آنے پر ہوا تھا۔ ایک بوڑھے سقے نے پانی کی ایک مشک میرے سامنے زمین پر خالی کر دی۔ اس قدیم مبارکباد کے لئے

جو اُن لوگوں کو پیش کی جاتی ہے۔ جن کی عزت کرنے میں قلعہ کا سردار مسرت محسوس کرتا ہے۔ اسے انعام دیا گیا ؛

موجودہ اور گذشتہ قحط

اب ہم اُن پست ریتلی پہاڑیوں کے علاقے میں داخل ہوئے جو ضلع گوڑگاؤں کا نہایت عمدہ منظر پیش کرتی تھیں۔ اور وہ اس وقت ہمارے سامنے صاف اور چمکدار نظر آ رہا تھا لیکن جو لوگ ہمیں آ کر ملے اُنکے چہروں پر کہیں خوشی کی جھلک نہ تھی۔ ہم ایک ایسے گاؤں میں پہنچے جہاں زمین کا لگان گذشتہ پانچ سال سے ملتوی رکھا گیا ہے۔ اور اب دیہاتی سوائے اس کے کہ سرکنڈا گھاس سے کنوئیں کے رستے بانٹیں یا گاڑیوں کے چھپر بنائیں اور کچھ کام نہیں کرتے۔ یعقوب پور میں (یہی اس کا نام ہے) ایک بنک ہے۔ لیکن اس نے دو سال سے کوئی قرض نہیں دیا ہے۔ اور ایک سال سے تو ساہوکار نے بھی کسی کو بھی اُدھار نہیں دیا ہے۔ میں نے ایک بوڑھے آدمی سے جو اپنے گھر کے سامنے لاپرواہی سے بیٹھا تھا پوچھا کہ کیا سنہ ۱۹۰۰ء کے قحط میں جو خاص طور پر سخت تھا حالات اتنے ہی خراب تھے جتنے کہ اب ہیں اس نے کہا کہ اس وقت ہمیں روپیہ مل گیا تھا اب کچھ نہیں ملتا۔ لیکن اس وقت گیہوں آٹھ سیر تھے۔ دکھوں کی مقدار بڑھتی ہے۔ وہ لوگ جنہیں خوراک کے لئے غلہ خریدنا پڑتا ہے (اور اکثر ایسا کر رہے ہیں) کم از کم اسے سستا خرید سکتے ہیں۔

سنہ ۱۹۰۱ء کا قحط صرف دو سال رہا اور دو سال تک ساہوکار قرض دیتا رہتا ہے۔ لیکن تیسرے سال میں اسکی تھیلیاں یا تو خالی ہو جاتی ہیں یا ان کے منہ بند ہو جاتے ہیں۔ اور ہمیں یہاں چوتھا سال گذر رہا ہے۔ اس لئے لوگ یہ کہتے ہیں کہ گذشتہ قحط روٹی کے تھے۔ اور اب نقدی کا ہے اور وہ اسے اور بھی زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ کیونکہ زندگی کا معیار پہلی نسل کے معیار سے زیادہ بلند ہے۔ اس کی مختلف ضروریات کو پورا کرنے کیلئے زیادہ روپیہ درکار ہے۔ یہاں تک کہ اب روپیہ بھی اس شرط پر قرض دیا جاتا ہے کہ وہ نقدی کی صورت میں واپس کیا جائے۔ جیسا کہ ایک سُرخ شال والی شادی شدہ عورت نے پرجوش الفاظ میں کہا "برے دن ہیں۔ دُنیا بڑے دُکھ میں ہے"

سیرت اور مالی حالت !

اس سچی مگر مایوس کن بات کو سُنکر ہم گوڑگاؤں کی سرزمین میں داخل ہوئے اور گوڑگاؤں کی

حالت اتنی ہی بُری ہے جتنی کہ رہتک کی۔ وہاں حسب معمول گھوڑوں سے اُترے ہوئے سواروں کی قطاریں ہماری آمد کی منتظر تھیں۔ اور ان کے پیچھے کھدّر کی دھوتیاں اور کرتے پہنے ہوئے دیہاتیوں کا ایک گروہ تھا۔ جو اس اُمید سے کہ اپنے بنک اور اپنے متعلق صاحب سے دو دو باتیں کریں گے۔ میل دو میل سفر طے کرکے آئے تھے۔ ہم ان کی داستان سُننے کے لئے سڑک کے کنارے ایک کنوئیں کے قریب بیٹھ گئے۔ یہ یعقوب پور والوں کی داستان سے کچھ کم حزن انگیز تھی۔ کیونکہ ان کے گاؤں میں کنوئیں تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ ہماری قسمت بُری ہے۔ لیکن ان کی ہم سے بھی زیادہ بُری ہے۔ ان کے پاس کچھ نہیں ہے۔ اس پر پیچھے سے ایک فاقہ مست آواز یہ کہتی سُنائی دی۔ وہاں بچوں کو تین تین دن کھانا نہیں ملتا۔ گاؤں والوں کے حالات سُنکر زاہد پور کی یاد پھر تازہ ہوگئی۔ پانی کی گہرائی بہت کچھ اتنی ہی ہے۔ ۱۲ سے ۱۸ فٹ تک۔ اور پچاس کنوئیں کام دے رہے ہیں۔ لیکن خشک سالی نے پانی میں کھار پیدا کردیا ہے۔ اور صرف بیس استعمال میں لائے جاسکتے ہیں۔ کنوؤں کی تعداد اسباب کا کافی ثبوت ہے کہ گاؤں کے لوگ محنتی اور حوصلہ والے ہیں۔ اور دونوں گاؤں میں سب سے بڑا فرق یہی ہے۔ زاہد پور کے جاٹ کاہل اور کمزور طبیعت ہیں۔ لیکن وہاں موزصفت قوم اہیر بھی آباد ہے۔ جو صوبے کی نہایت ہی کفایت شعار اور محنتی قوموں میں سے ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ روپیہ اب ان میں اور ان کے بنک میں پانی کی طرح بہتا ہے۔ سیرت اور مالی حالت کا تعلق ایک مرتبہ پھر نمایاں ہوگیا۔ اس صورت میں سیرت کی سخت آزمائش قحط ہے۔

ایک اور دیہاتی بنک کے ممبر ہماری گھات لگائے بیٹھے تھے۔ ان کے متذبذب چہروں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ یوں کہہ رہے ہیں کہ کیا وہ ٹھہر کر ہم سے باتیں کریں گے؟ ہم نے ایسا کیا اور ایک مرتبہ پھر بے ثمر موسموں اور طویل صبر کی داستان سُنی۔ زمین کے بیش بہا پھل کے لئے ان لوگوں نے تین سال انتظار کیا ہے۔ اور اس مرتبہ پہلی بارش ہوئی ہے۔ لیکن آخری بارش جو مدتوں ایسی معلوم ہوتی رہی ہے کہ برسنے والی ہے کبھی نہیں برستی اور گیہوں مرجھا جاتے ہیں۔

دُلکی چلتے چلتے ایک گھوڑا اڑ گیا اور ایک سب انسپکٹر کو ہمارے پہلو سے آگے نکال لے گیا۔ اس آڑے وقت میں اسکی زین کی پیٹیاں ڈھیلی پڑگئیں۔ اور بڑی صفائی سے قلابازی کھاکر نیچے آ رہا۔ فرخ نگر کے نزدیک ہم ایک ریلوے سٹیشن پر پہنچے (آخری مرتبہ ہم نے اسکو دیکھا تھا) اور دیکھا کہ پھر ایک نہایت ہی بوسیدہ قیام سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ پُرانے بھنگوں کی وجہ سے اس کے چھپّر میں اس قدر عفونت تھی۔ کہ میں نے خیمے میں آرام کرنے کو خوشی سے قبول کرلیا۔

۷ افروری۔ فرخ نگر سے گوڑگاؤں براستہ راؤنڈ (۱۵ میل)

آزمائش گوڑگاؤں

اس سفر کا آخری اور سب سے لمبا دن تھا۔ ہم دوپہر کے وقت چلے اور شام کے سات بجے تک نہ پہنچے۔ صبح کا تمام وقت للکارنے والوں کے ساتھ گذر گیا۔ ان میں سے ایک زمیندار تھا۔ جسے حال ہی میں انعام دار مقرر کیا گیا تھا۔ اس نے مسرت آمیز لہجے میں کہا "پرمیشور مجھ سے خوش ہے۔ گیارہ برس ہوئے میرے والد کو کسی نے قتل کر دیا تھا۔ وہ روپیہ کا لین دین کیا کرتے تھے۔ اور اس کی وجہ سے دشمنی پیدا ہو گئی تھی۔ پھر میرے تین بھائی مر گئے۔ ایک بی اے۔ ایل ایل بی تھا۔ اور اب مجھے انعام دار بنا دیا گیا ہے۔ اور میرا بھرم بہت ہے۔ تین سال پہلے کی دیہات سدھار کوشش کی طرف بہت سے اشارے گئے۔ اب کھاد کے گڑھے اور رہٹ کے سوا کوئی چیز باقی نہیں رہی ہے۔ اور یہ بھی اس جگہ ہیں۔ جہاں حالات موافق ہیں۔ اکثر جگہ زمین اتنی نرم ہوتی ہے۔ کہ کنارے اندر گر پڑتے ہیں۔ اور لوگ اتنے سست ہیں کہ دوبارہ نہیں کھود سکتے۔ ایک معائنہ کرنے والے شخص نے مجھے یقین دلایا۔ کہ ہمارے گاؤں میں گڑھوں کا پورے طور پر رواج ہو گیا ہے لیکن اس کے بعد جب ہم گاؤں کے پاس سے گذرے تو دیکھا کہ محض ایک گڑھا تھا۔ اور وہ بھی آک کے زہریلے پودوں کا ذخیرہ بنا ہوا تھا۔ اور ۲۸۰۰۰ روپیہ جو گورنمنٹ نے ان کی خرید کے لئے پیشگی دیا تھا۔ واپس دینا پڑا تھا۔"

گورنمنٹ کے قرضے

ایک ایسے ملک میں جو ترقی کے لئے چیخ رہا ہو اور سود کی شرح میں گرانی، باعث زراعتی ترقی کے لئے گورنمنٹ کے قرض ناگزیر ہیں۔ ساہوکار طویل الایام مقاصد کے لئے قرض دینے پر نارضامند ہوتا ہے۔ اور دیہاتی بنک محض قلیل الایام قرضوں سے تعلق رکھنے اور غیر محدود قرضوں کی بنا پر ایسا کرنے کے لئے غیر موزوں ہے۔ اور انتیس ضلعوں میں سے صرف نو میں رہن رکھنے والے بنک ہیں۔ اس لئے جبتک کوئی مالکِ زمین اپنی جائداد کا کچھ حصّہ بیع کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔ وہ محض گورنمنٹ کی وساطت سے ہی زمین کو ترقی دینے کے لئے مناسب سود پر قرض لے سکتا ہے۔ اور اسی قسم کا قرضہ انسان کو اکثر اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ کوئی کنواں اتار لے یا پشتہ باندھ لے۔

لیکن اسمیں خطرے ہیں۔ اوران میں سے ایک یہ ہے۔ کہ ممکن ہے قرضے کوتاہ اندیشی سے دیدیئے جائیں۔ گوڑگاؤں کا بل اسی قسم کی مثال ہے۔ اور رہتک میں سے گذرتے ہوئے میں نے اسی طرح کی دو باتیں اور دیکھیں جو اس سے کم درجے کی تھیں لیکن بالکل مشابہ تھیں۔ دونوں رہٹ سے متعلق ہیں اور دو یا تین سال گزرے اسوقت وقوع میں آئی تھیں۔ جب کہ یہ فرض کرلیا گیا تھا۔ کہ کنوئیں کے لئے چرس یا چمڑے کے ڈول کی نسبت رہٹ زیادہ مضبوط ہے اور خاص خاص صورتوں میں یہ ہے بھی یونہی جسطرح کہ حصاری بیل وطہانی کی نسبت بہتر ہے، لیکن تمام صورتوں میں ہرگز نہیں۔ قطع نظر اس کے دو مال افسروں نے دو ایسے گاؤں کا معائنہ کیا جہاں پشتہا پشت سے چرسہ استعمال ہوتا چلا آیا تھا۔ اور رہٹ اور ۴ فی صدی یا کم وبیش پر گورنمنٹ کے پیش کردہ قرض کا ذکر جو ہر رہٹ خریدنے والے کو دیا جاسکتا تھا۔ اچھے الفاظ میں کیا۔ ۲۰۰ یا معہ سود کچھ زیادہ روپیہ لاگت آتی ہے۔ اور ۵ سال تک قرض ادا کرنیکی ضرورت نہیں۔ بظاہر یہ انعام نہایت دلکش نظر آتا تھا۔ اور سیلانہ میں جو اُن گاؤں میں سے ایک ہے جن کا ذکر کیا جارہا ہے۔ اکیس کاشتکاروں نے اسے قبول کرلیا۔ لیکن اب وہاں بہت واویلا ہے۔ ۶۰ فٹ گہرائی پر پانی ملنے کی صورت میں بیلوں کا طاقتور ہونا ضروری ہے۔ اور وہ آدمیوں کی نسبت کچھ زیادہ طاقتور نہیں ہیں۔ اور جب کوئی رہٹ خراب ہوجاتا ہے (چونکہ یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا) تو نجف گڑھ سے لوہار کو بلا کرلانا پڑتا ہے۔ اور وہ ہمیشہ نہیں ملتا اس لئے کئی ایک رہٹ بیکار پڑے ہیں۔ اور دو کو قطعی طور پر چھوڑ کر چرس استعمال میں لایا گیا ہے۔ اس پر اُس کا ٹریکٹر (وہ انجن جو زراعت کے کام میں لایا جاتا ہے) یاد آتا ہے۔ اس معاملے سے پھر یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ دیہات سدھار کے لئے ہر قدم اُٹھانے سے پہلے نہایت ہوشیاری سے تحقیق کرنی چاہیئے۔

دوسرا خطرہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ قرض کا روپیہ اس مقصد کے لئے نہ صرف کیا جائے جس کے لئے لیا گیا ہے۔ اور ایسا اکثر ہوتا ہے۔ سرسہ کے نزدیک ۵۰۰۰۰ روپیہ ایسے کنوئیں بنانے کے لئے دیا جو ہرگز تعمیر نہیں کئے گئے۔ اسکی ایک اچھی مثال ہے اور ایک ابھی اور ہے جس کے مجھے کل ہی اشارتاً معلوم ہؤا ہے۔ ایک مستعفی افسر نے مجھے بتایا کہ میں نے حال ہی میں ۲۵۰۰ روپیہ لگاکر ایک کنواں اتارا ہے اور اس رقم کا زیادہ حصہ گورنمنٹ نے پیشگی دیا ہؤا تھا جب میں نے یہ تحقیق کی کہ آپ کو کچھ اور بھی ادا کرنا پڑا تھا۔ تو اس نے پُرزور لہجے میں

جواب دیا: " پانچ چھ روپے کی گڑبڑ ہوگئی تھی"۔ رہی یہ بات کہ وہ اس سے آسانی سے بچ نکلا سو یہ اسکے مرتبے کی وجہ سے تھی۔ معمولی دیہاتی کا حال بُرا ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ جب مجھے اتفاقیہ ایک نئے کنوئیں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ تو میں نے دیکھا کہ اگرچہ صرف ۲۰۰ روپیہ قرض لیا گیا تھا۔ لیکن ۲۰۰ روپے کی گڑبڑ تھی۔ اس موقع پر مجرموں میں سے ایک کو آڑے ہاتھوں لیا گیا اور معطل کردیا گیا۔ بڑی حد تک یہ اس قسم کی گڑبڑ کا اچھا دفعیہ ہے۔ لیکن ہمارا شاندار مغربی طرزِ عمل بھی اکثر محکمہ کے عمل کو بے کار ثابت کر دیتا ہے۔ دوسرے خطرات سے بچنے کے لئے تحصیلداروں اور نائب تحصیلداروں کو دیہاتی قرض کے متعلق ابتدائی تربیت دینی چاہیئے۔ اور وہ لوگ جو تحصیلوں کا معائنہ کریں اس بات پر زور دیں کہ اُن قواعد کی پابندی کی جائے۔ جن سے اکثر غفلت برتی جاتی ہے +

دھلی کے قرب و جوار میں

آج مشرقی ہوا سامنے سے آ رہی تھی۔ اور گذشتہ دو ہفتے تک پُشت کی طرف سے آنے والی ہوا کی یہ تبدیلی نہایت بھلی معلوم ہوئی۔ اور یہ اور بھی زیادہ اچھی لگی۔ کیونکہ وہ ۴۰۰ میل لمبا میدان جو دریائے جہلم اور ہمارے درمیان حدِ فاصل تھا اب قریب الاختتام تھا۔ اب ہم ایک بلند سطح پر چل رہے تھے۔ اور چونکہ دن بلّور کی طرح صاف تھا۔ ہمیں اپنے سامنے وہ تمام وسیع علاقہ نظر آ رہا تھا جو دور نیلی پہاڑیوں تک پھیلا ہوا تھا۔ پنجاب کی خوبصورتی اس میں ہے۔ کہ یہاں فراخ میدانی زمینیں ہیں۔ اور یہاں زرد و سبز و سبز و سنہری رنگوں کا دائمی مقابلہ پیش نظر رہتا ہے (یہ مقابلہ چنے اور گیہوں یا چاول و سرسوں یا گنے اور دریائی گھاس میں ہوتا ہے۔ اور ایک اور مقابلہ جو غروب و طلوعِ آفتاب کے وقت ہمیشہ اپنی رنگ آمیزی و نوعیت کے اعتبار سے تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ آج مقابلہ محض چارے کی فصل کا تھا۔ جو گیہوں کے درمیان جزیرہ سا معلوم ہوتی تھی۔ پھر بھی جب فضا صاف ہوتی ہے تو دھوپ کی سحر طرازی کا یہ اثر ہوتا ہے کہ یہ منظر سراسر شانِ دلبری لئے ہوئے معلوم ہوتا ہے۔ چند میل طے کرنے کے بعد ہم راؤنٹہ پہنچے۔ اور یہاں سے ہی ہم صوبہ دہلی میں داخل ہوگئے۔ وسعت کے لحاظ سے یہ ایک معمولی ضلع کے نصف کے برابر ہے۔ لیکن یہاں نیا دارالخلافہ ہے۔ جس پر ۱۴ کروڑ سے زیادہ روپیہ صرف کیا گیا ہے۔ یہ صرف بیس میل کے فاصلے پر تھا۔ لیکن درمیان میں پورا ایک زمانہ حائل تھا۔

ہماری ملاقات کے لئے تین گاؤں اکٹھے ہوئے تھے۔ اور تقریباً ۲۰۰ کسان موجود تھے لیکن ان میں مشکل سے ایک بھی ایسا نہ تھا جو اپنا نام نہ لکھ سکتا ہو اور ہر ایک بنک کے لئے بیرونجات سے ایک ایک سیکرٹری مقرر کیا گیا تھا۔ حالانکہ تینوں گاؤں میں ۲۰۶ گھر ہیں البتہ مدارس روبہ ترقی ہیں۔ اور سکول جاری کئے جا رہے ہیں۔ ایک امیر نے دسویں جماعت پاس کر لی ہے۔ لیکن بہت سے ان دوسرے دیہاتیوں کی طرح جنہوں نے ایسا کر لیا ہے اسے کوئی کام نہیں ملتا۔ اور وہ اپنے آبائی کھیتوں سے کنارہ کش رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ان میں ہل بھی نہیں چلا سکتا۔ اگرچہ ہم دہلی کے اس قدر نزدیک تھے۔ لیکن انتظام سلطنت کے متعلق سوالات دریافت کرنے کا نتیجہ حسب معمول نکلا۔ لوگ یہ جانتے تھے۔ کہ ان کا حاکم چیف کمشنر ہے اور یہ کہ اس سے اوپر وائسرائے کا ہاتھ ہے۔ لیکن انہیں اسباب کی متعلق خبر نہ تھی کہ ان کے درمیان کون کون لوگ ہیں۔ اور چونکہ ڈسٹرکٹ بورڈ سے علاوہ اور کسی ادارے کے لئے کوئی رائے دینے کا حق نہ رکھتا تھا۔ اس لئے قدرتی طور پر وہ اسمبلیوں کونسلوں اور گول میز کانفرنس کے متعلق کچھ نہ جانتے تھے۔ "چراغ تلے اندھیرا"

اشتمال اراضی

لیکن وہ بات جسے وہ خوب جانتے تھے اور جس پر بہت خوش تھے۔ یہ تھی کہ امداد باہمی کی وساطت سے انکی زمینیں یکجا کر دی گئی تھیں۔ صوبہ دہلی میں راؤنڈہ سب سے پہلا گاؤں ہے جس نے اس جاں بخش طرزِ عمل کو اختیار کیا ہے۔ جس کے ساتھ مسٹر کیلورٹ کا نام ہمیشہ لیا جائے گا۔ گاؤں کے اس وسیع نقشے سے جو ہمارے سامنے پڑا تھا۔ یہ ظاہر ہوتا تھا۔ کہ ۲۰۵۰ کھیتوں یا ٹکڑوں کو کم کر کے ۴۷۰ بنا دیا گیا تھا۔ یا یوں کہو کہ ہر پانچ کھیتوں کا ایک بنا دیا گیا تھا۔ ۷۰۰ ایکڑ سے زیادہ زمینیں نشیب و فراز لئے ہوئے ہیں۔ اور بارش کی افراط یا قلت سے اطمینان حاصل کرنے کے لئے تمام یہ چاہتے تھے کہ انہیں دونوں قسم کی زمینیں ملیں۔ اس خواہش کا نتیجہ یہ ہوا کہ کھیت ۹۰۰ اور ۱۲۰۰ گز لمبے اور صرف ایک یا دو گز چوڑے بنے۔ ان میں سے تقریباً ۲۰۰ کھیتوں کو اکٹھا کرنا پڑا۔ اور بعض تو اسقدر تنگ تھے کہ نقشے پر بھی نہ دکھلائے جا سکتے تھے۔ یہی صورت بہت سے آس پاس کے گاؤں میں ہے۔ ایسے حالات میں ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ وہ سب سے آخر

میں بوئے تاکہ ایسا نہ ہو کہ اس کا پڑوسی حدود سے تجاوز کر کے ہل چلا کر بیج ڈال دے۔ اور فصل کے موقع پر یہ ضروری ہے کہ کاٹنے والا دھجی (کھیت) وار پار اسکی چوڑائی کو ظاہر کرنے کے لئے ایک چھڑی رکھ کر کاٹے۔ اور کنوئیں سے آبپاشی ناممکن ہے۔ لیکن اب بہت سے کنوئیں بنانے کی تجویز کی گئی ہے۔ فوائد اس قدر صریح ہیں کہ پاس کے ایک گاؤں والوں نے ہمارے پاس ایک وفد بھیجا تاکہ وہ ہم سے درخواست کرے کہ ہم وہاں جائیں اور ان کی امداد بھی کریں۔ راؤنڈ کے کسی شخص نے بآواز بلند کہا "اب ہمارے بچے جیتے رہیں گے" مسٹر برین کی مفید تجویز پر عمل کرتے ہوئے ایک ایکڑ زمین کا بہترین حصّہ سکول، کھیل کے میدان اور باغیچے کے لئے علیحدہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور انتہائی رحمدلی کو کام میں لا کر زمین کا ایک ٹکڑا گاؤں کے چماروں کو کنواں لگانے کے لئے دے دیا گیا ہے۔ اس وقت ان کا اپنا کنواں کوئی نہیں ہے۔ اور اچھوت ہونے کی وجہ سے انہیں گاؤں کے کنوئیں سے پانی بھرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اور اس وقت تک کہ دوسرے لوگ اس قدر صاحبِ مروّت ہوں کہ ان کے لئے پانی بھریں۔ ان کے لئے ٹھہرنا ضروری ہے۔ استمال اراضی کا تمام خرچ گورنمنٹ برداشت کرتی ہے۔ اس صورت میں یہ محض ایک روپیہ فی ایکڑ ہے۔ اور موٹے حساب سے یہ زمین کے ایک سال کے لگان کے برابر ہے۔ وہ بات جو اسے حیرت خیز مہم کا درجہ دیتی ہے یہ ہے کہ اس کام کی غیر محدود پیچیدگیوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے آخری فیصلہ سب نے قبول کر لیا۔ اسے روکنے کے لئے ایک ہی شخص ہی ناموافقت کافی ہوتی۔ اور یہ صورت ہمیشہ پیش آتی ہے۔

دوسرے گاؤں نے (دولت آباد) جسکا ہم نے معائنہ کیا یہی معجزہ کر دکھایا تھا۔ اور اس کا فوری اثر یہ ہوا کہ چھبیس کنوئیں اُتارے گئے۔ ایک کھوجی (پانی کا پتہ لگانے والا) الور سے بلایا گیا تھا۔ اور اسے ہر اس کنوئیں کے عوض جس کے لئے وہ پانی لگاتا سوا روپیہ کی عاجزانہ گرپڑ شگون رقم دی گئی۔ عورتوں کو اب صبح کا کھانا لے جاتے وقت اپنے خاوندوں کو اِدھر اُدھر تلاش نہیں کرنا پڑتا تھا۔ جیسا کہ بکھرے ہوئے کھیتوں کی صورت میں لازمی ہے اور وہ اس قدر خوش تھیں کہ انہوں نے ایک گیت میں جو اس موقع کے لئے لکھا گیا تھا متعلقہ سب انسپکٹر کو اوتار کا درجہ دیا گیا۔ اب زراعتی ترقی ممکن ہے۔ چھ رہٹ لگ چکے ہیں۔ منتخب کیا ہوا بیج (پنجاب ۸ اے) تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اور دو ایکڑ زمین میں سبزی لگا دی گئی ہے۔ اور

پانچویں ایکڑ میں تمباکو راؤنڈ کی طرح یہاں بھی ایک ایکڑ زمین سکول، کھیل کے میدان اور پانی پینے کے کنوئیں کے لئے علیحدہ کر دی گئی ہے۔

ایک نئی چوپال

جب ہم سواری کرتے ہوئے دولت آباد پہنچے تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ اس پر بھی ہم نے دیکھا کہ مقامی ہیڈ ماسٹر سرگرد گی میں دیہاتیوں کا ایک اور بڑا جمگھٹ ہمارا انتظار کر رہا تھا اور ایک کوڑی لڑکے اس لئے کہ میرا نام یا کوئی ایسا لفظ مثلاً خوش آمدید بن جائے۔ اپنے آپ کو زمین پر ناممکن صورتوں میں پیچ دے رہے تھے۔ اجلاس گاؤں کی چوپالوں میں سے ایک میں منعقد ہوا۔ یہ ایک بڑی ڈیوڑھی تھی۔ جسمیں پیلپایوں کی تین قطاریں نہایت ہی منقش محرابیں لئے ہوئے تھیں۔ خشک سالی کی ابتدا سے پہلے ختم ہونے کی وجہ سے اس پر ۴۰۰ روپیہ لاگت آیا تھا۔ اور یہ تمام روپیہ اس پتی (جس نے اسے تعمیر کرایا تھا) رہنے والے تیس عجیب گھرانوں نے دیا تھا۔ ہر مرد پر ۱۰ روپے لگائے گئے تھے۔ اور زیادہ امیر آدمیوں نے زیادہ دیا۔ مثلاً ایک ساہوکار نے ۱۲۵ روپے دئے۔ اس نے اُن لوگوں کو جو اپنا حصّہ ادا نہ کر سکتے تھے بلاسود قرض بھی دیا۔ اور ایک اور بنئے نے بھی ایسا ہی کیا۔ آج شام چوپال ایک سرے سے دوسرے سرے تک کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ اور اسقدر دلچسپ گفتگو ہوئی کہ اُن کو جُدا ہونا مشکل ہو گیا۔ لیکن جب ایک لالٹین لائی گئی اور اسے دھواں دینے کی وجہ سے بجھانا پڑا۔ تو اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ لوگوں کا ایک لہریں لیتا ہوا جمگھٹ ہمیں ہمارے گھوڑوں تک چھوڑنے آیا۔ اور ہم ہلکی ہلکی روشنی میں طوفانی آسمان کے نیچے چل پڑے۔ آخری تین میل میں ہماری روشنی محض وہ بجلی تھی جو مغرب میں چشمک زنی کر رہی تھی۔ جب قیام تک پہنچے ہی تھے۔ کہ طوفان ٹوٹ پڑا اور کوڑے لگانے شروع کئے۔ نہیں بلکہ بیچاری خشک زمین پر تڑا تڑ اولے برسانے شروع کئے۔

انیس جنوری کو لاہور چھوڑنے کے وقت سے اب تک میں نے ۴۰۲ میل گھوڑے پر سفر کیا ہے +

۱۹۳۴ء کی قحط سالی پر تبصرہ

ممکن ہے پنجاب سے باہر کے لوگ اس بات پر حیران ہوں کہ قحط سالی جو گذشتہ دوابواب کا

خاص موضوع رہی ہے۔ کتنے عرصے تک رہی۔ ۱۹۲۸ء کی فصل خریف سے شروع ہو کر یہ مشکل سے ابھی تک دور نہیں ہوئی۔ گذشتہ موسم گرما میں ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اسکا انجام آگیا ہے مون سون ہوائیں خوب شروع ہوئیں۔ اور ستمبر تک یہ یقینی طور پر معلوم ہوتا تھا کہ فصل خریف نہایت اچھی ہوگی۔ پھر برسات شروع ہوگئی۔ اور سیلاب آگئے۔ اور انہوں نے ہر چیز تباہ کر دی۔ قحط سالی کی وجہ سے رہتک میں کافی بُری حالت ہے۔ لیکن گوڑگاؤں کو قریب قریب پامال کر دیا ہے۔ اور اس کا اثر یہ ہے کہ ضلع دوالیہ ہے۔ گورنمنٹ انکی نجات کے لئے جلد پہنچی۔ اور ۱/۲ ۷ لاکھ روپیہ بطور امداد صرف کیا۔ اور ۲۴ لاکھ روپیہ مناسب شرائط پر قرض دیا۔ انیس لاکھ میں سے وہ سات لاکھ روپیہ بھی جو انہوں نے خشک سالی کی ابتدا۔ سے پہلے چھ سالوں میں فضول خرچیوں میں اُڑایا تھا معاف کر دیا۔ امداد باہمی کی انجمنوں نے بھی حتے الوسع کوشش کی ہے۔ لیکن ان کے ذرائع آمدنی قریب قریب ختم ہو چکے ہیں۔ اور ان کے قرضے کی رقمیں جو ۱۹۱۸ء میں ۸۸۵ روپے فی انجمن تھیں ۱۹۳۲-۳۳ء میں اتنی کم ہوگئی ہیں کہ ۶۳ رہ گئی ہیں۔ اور اس سال انہوں نے شروع سال میں دئے ہوئے قرضے میں سے ۱/۲ ۲ فیصدی رقم وصول کی۔ اور اس کے آخیر میں ۱/۲ ۲ سال کا سود لوگوں کے ذمے تھا۔ اس روپے نے جو دیہاتی نے گورنمنٹ امداد باہمی اور ساہوکار سے بھی قرض لیا۔ اسے بحال رکھنے میں ٹھوس امداد باہمی ہے۔ لیکن دیہاتی کے معیار زندگی میں بھی پر اثر تخفیف کر کے اسے تقویت دینی پڑی تھی۔ ضلع بھر میں پھیلی ہوئی امداد باہمی کی تیس انجمنوں کے عملے نے مفصل تحقیقات کی تھیں۔ ممکن ہے مندرجہ ذیل اعداد نقشہ جات اعداد وشمار کی رُو سے ٹھیک نہ ہوں لیکن ان سے کسی حد تک یہ پتہ ضرور لگتا ہے کہ اس موقع کو کس طرح سنبھالا گیا۔ سالانہ بجٹ ۲۴۰ روپے سے (قحط سالی سے پہلے) کم ہو کر ۱۵۷ ہو گیا ہے۔ اور بڑی سے بڑی تخفیف درج ذیل ہے۔

رسومات ——————— ۵۷ فیصدی

لباس ——————— ۴۴ فیصدی

خوراک ——————— ۳۵ فیصدی

ان اعداد کا اندازہ لگانے وقت قیمتیں گرنے کے اثرات ہرگز فراموش نہیں کرنے چاہئیں اور اس کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۳۰ فیصدی اخراجات قرض اور زیورات و زمین کو رہن رکھ کر پورے کئے گئے ہیں۔ جہاں تک خوراک کا تعلق ہے ایسا معلوم ہوتا ہے

کہ دیہاتیوں کی بڑی تعداد کو اپنی ضرورت سے کم کھانا پڑا ہے۔ اور بہتر اجناس کی نسبت کم درجے کے غلّے کھانے پڑے ہیں۔ اور بہتر اجناس معہ گھی کے انہیں اپنی ضروریات پورا کرنے اور احسانات کا بدلہ اُتارنے کے لئے مجبوراً فروخت کرنی پڑی ہیں۔ میرے دورے کی تاریخ تک اچھے دنوں کی امید میں شادیوں کو التوا میں ڈالا جا رہا تھا۔ لیکن یہ طرز عمل غیر محدود عرصے کے لئے نہیں اختیار کیا جا سکتا تھا۔ اور گذشتہ سال بہت سی شادیاں کی گئی ہیں۔ اگرچہ معمول سے بہت زیادہ کم خرچ پر کی گئی ہیں۔ یہ توقع ہو سکتی تھی کہ ممکن ہے نقل مکانی بہت بڑے پیمانے پر شروع ہو جائے (خاص طور پر گاؤں کے کمینوں میں)، اور میرے رسالے میں کئی بار اس کا ذکر بھی آیا ہے لیکن مقامی اسسٹنٹ رجسٹرار نے دیہاتی آبادی کو بصورت مجموعی لیتے ہوئے اندازہ لگایا ہے کہ دس یا پندرہ فی صدی سے زیادہ نہیں گئے ہیں۔ جنوب مشرقی علاقے میں دیہاتی (اپنے جنوب مغربی ساتھی کی طرح) اپنا گاؤں مشکل سے چھوڑتا ہے۔

جہاں تک ساہوکار کا تعلق ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ رویہ جس کا روزنامچے میں ذکر آیا ہے۔ جاری رہا ہے۔ اسسٹنٹ رجسٹرار لکھتا ہے۔ کہ یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے۔ کہ وہ بہت صلح جو ہے۔ اور وقت کا جائزہ لیتا ہے۔ اپنے موکلوں کی وفاداری سے ہاتھ کھینچ لینے کو پسند کرتے ہوئے وہ حتے المقدور ہر چیز قبول کر لیتا ہے۔ یہاں تک کہ چڑھی ہوئی قیمتوں پر بھی۔ اس میں ناکامیاب ہونے پر وہ کوشش کرتا ہے۔ کہ ختم ہونیوالے حسابات نئے سرے سے جاری ہو جائیں۔ اور جب وہ عدالت میں جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں دیکھتا تو پھر بھی اگر اسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ہاتھ نہ آئیگا تو وہ ڈگری جاری کرانے کی کوشش نہیں کرتا۔ بعض ساہوکاروں نے مقدمے کے اخراجات برداشت کرنے سے یہ بہتر سمجھا ہے کہ حساب کی میعاد ختم ہونے دیدی جائے۔ اور یہ اس خیال سے کہ جب اچھی فصلیں آئیں گی تو اُنکے موکل روایات کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے فرائض ادا کر دینگے۔

اس مختصر شرح اموال ودالواب کا مطالعہ کرتے وقت جنکی طرف یہ اشارہ کرتی ہے اگر یہ بھی ذہن میں رکھا جائے۔ کہ آج سے ۱۰۰ سال پہلے پانچسالہ قحط سے کیا مراد ہوتی تو بہتر ہوگا۔ اور ساتھ ہی یہ کہ اگر انتظام سلطنت درہم برہم ہو جائے۔ جیسا کہ روس میں ۱۹۲۱ء کے سخت قحط میں ہوا تو آج سے ۱۰۰ سال بعد اس سے کیا مراد ہوگی ؎

تیسرا حصّہ

جنوب مغرب

باب دوازدہم ۱۲

نیلی بار کا علاقہ

ایک نہری آبادی اور قیمتوں کا گرنا

۵ مارچ پاک پٹن سے عارف والہ (۱۹ میل)

نیلی بار کی بستی

پنجاب کی قابلِ ذکر خصوصیات میں سے ایک اس کی نہری بستیاں ہیں۔ جنہوں نے گذشتہ چالیس سال میں (۵۵۰۰۰۰۰) پچپن لاکھ ایکڑ نئی زمین کو قابل کاشت بنایا ہے۔ میں نے کسی اور جگہ انکا بالتفصیل لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور ان میں دو کا حال گذشتہ و موجودہ دور کے حالات میں زیادہ واضح طور پر دیا ہے لیکن اب ان دونوں میں آبادکاروں کی دوسری نسل آباد ہے۔ اور میں بہت بے چین تھا۔ کہ کوئی بستی آباد ہوتی ہوئی دیکھوں۔ تاکہ میں یہ سیکھوں کہ اس قسم کی بڑی مہم کا کیوں سر کی جاتی ہے۔ اس لئے میں کل لاہور سے روانہ ہوا۔ اور جنوب مغرب کی طرف سفر کرتے ہوئے ۱۰۰ میل تک ریل میں آیا اور ۳۰ میل موٹر سے اور یہاں سے دس میل کے فاصلے پر نیلی بار کی بستی یا (نیلی پری) میں داخل ہوا۔ اس کا دوسرا نام اس کی زمین کی زرخیزی کی وجہ سے ہے۔ اس بستی کی آبپاشی دریائے ستلج کے پانی سے کی جاتی ہے۔ جو اسکی مشرقی حد

بنانا ہے۔ اور جب یہ تمام منصوبہ جس کا یہ ایک حصہ ہے، مکمل ہو جائے گا۔ تو یہ ہر سال ۱۰ لاکھ ایکڑ سے زیادہ زمین سیراب کریگا۔ اس کا تقریباً نصف حصہ ابتدا ہی سے شاہی بنجر زمین میں داخل تھا۔ اسے آباد کرنے کے لئے کاشتکاروں کو صوبے کے تمام اطراف سے کھینچا گیا ہے۔ قدیم اطالوی رواج کے مطابق ۸۶۰۰۰۰ ایکڑ زمین اُن لوگوں میں سے بعض میں تقسیم کی گئی ہے۔ جنہوں نے جنگ عظیم میں اچھی خدمات انجام دی تھیں۔ اور دس کروڑ روپیہ جو اس سکیم پر لاگت آئے گا، کا کچھ حصہ پورا کرنے کے لئے ۴۰۰۰۰۰ ایکڑ زمین نیلام کے لئے مخصوص کر دی گئی ہے۔ پانی ۱۹۲۶ء سے جاری ہوا اور تقریباً اُسی وقت سے نو آبادی شروع ہو گئی۔ اور ابھی تک انجام کو نہیں پہنچی۔ اس لحاظ سے یہ نو آبادی پنجاب کی سب بستیوں سے بعد کی ہے۔ اور اسکا سنڈریلہ (ایک لڑکی کی طرف اشارہ ہے۔ جسکا ذکر پریوں کی داستانوں میں ہے) بھی ہے۔ اس کی پیدائش خوشحالی کے ایام میں ہوئی۔ اور اس کے ذرائع اور زندگی کے طریقے اسی کے مطابق ترتیب دئے گئے۔ اور اب یہ دقیقہ یابی کرنے کی، سوتیلی ماں کے زیر اثر ہے اور اسے اشد ضرورت ہے۔ کہ بڑھی ہوئی قیمتوں کی افسانوی دھرم ماتا اسے اپنے پاؤں پر کھڑا کر دے۔ اس نو آبادی میں کوئی شخص اس احساس کے بغیر ایک دن بھی نہیں گذار سکتا۔

ایک نئی منڈی

عارف والہ کے سفر میں سے جو موٹر میں کیا گیا تھا۔ کوئی بات قابلِ ذکر نہیں ہے۔ موٹر میں بیٹھے ہوئے سڑک اور اس کے نواحی قریب قریب خالی رہ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ مسلسل گفتگو بھی مشکل ہوتی ہے۔ علاقہ سراسر مسطح تھا۔ لیکن جب ہم نہری فضا میں پہنچے تو کافی سرسبز تھا۔ نہر کے اونچے اونچے کنارے پہلو میں ہونے کی وجہ سے مغرب کی طرف کی تمام چیزیں نظر سے اوجھل تھیں۔ شام کے وقت ہم منڈی دیکھنے گئے۔ اور دلّالی کی دکان کا معائنہ کیا۔ اگرچہ میں نے پہلے ہی منڈی کا حال بیان کر دیا ہے۔ لیکن میں اس کے متعلق ضرور کچھ کہوں گا۔ کیونکہ یہ نئی ہے اور وہ پرانی تھی ہم اس کے گودام کے محراب دار برآمدے میں بیٹھے۔ پہلے پہل صرف ایک درجن ڈائرکٹر حاضر تھے۔ (جن میں سے بہت سے مستعفی افسر تھے) لیکن اس سے پہلے کہ ہم وہ جگہ چھوڑیں (دو گھنٹہ بعد) تمام جگہ پُر ہو گئی۔ یہانتک کہ تین محرابوں

نیچے کھڑے ہونے تک کو جگہ نہ تھی۔ اجلاس کا رحجان یہ تھا کہ روپیہ کے لین دین اور منڈی کی خرید و فروخت کے متعلق بحث کی جائے۔

یہ ۱۹۲۷ء میں جاری ہوئی تھی۔ اور تمام کی تمام دکانوں کی چار قطاروں پر مشتمل ہے جو ایک بڑی فراخ جگہ کے گرد مربع شکل میں چلی گئی ہیں۔ میدان قریب بغیر درخت کے ہے۔ دکانوں کے سامنے چاروں طرف چوڑا چبوترہ تعمیر کیا ہوا ہے۔ اور اس پر وہ غلہ جمع ہے۔ جسے تولنا، امتحان کرنا اور بیچنا ہے۔ کہیں کہیں کی سبزی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ یہ صرف دیکھنے میں ہی سنہری تھے۔ کیونکہ قیمت اب بھی مشکل سے دو روپے من سے زیادہ ہے یہاں ۳۶ دلال ہیں۔ لیکن ان میں سے صرف دو (ایک سکھ جاٹ اور ایک اروڑا جاگیردار) زراعت سے کچھ تعلق رکھتے ہیں۔ منڈی کا نصف قطر حسب معمول ۱۵ میل ہے۔ لیکن لاری کی وجہ سے اسمیں توسیع ہو رہی ہے۔ اور مناسب قیمتیں لگانے پر تیس میل اور اس سے زیادہ فاصلے سے روئی یہاں کھینچ لایا کرے گی۔ پرانی نوآبادیوں میں سڑکیں سب سے بعد میں بنائی جاتی تھیں۔ لیکن اس ایک میں عقلمندی سے کام لیتے ہوئے انہیں پہلے بنایا گیا ہے اور چونکہ بہت سی سڑکیں پختہ ہیں۔ لاریوں کی آمد و رفت خوب ہے۔ پختہ سڑکیں۔ بیل گاڑی کیلئے بھی سہولت پیدا کرتی ہیں۔ اور گاڑی والے ہر اس منزل کیلئے جو ان کے کنارے ہے۔ ایک یا دو آنے کم کرایہ لیتے ہیں۔ بونے والے کے لئے اسمیں فائدہ ہے۔ اور یہی بات سڑک بنوانے کے اس قدر خرچ کو جائز قرار دیتی ہے۔ لاری اور بیل گاڑی کے علاوہ باربرداری کے دو اور ذرائع بھی ہیں۔ ایک اونٹ اور دوسرے گدھا۔ ایک اروڑا نے چاروں کی خوبیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے بیل گاڑی کو پہلا، لاری کو دوسرا اور گدھے کو آخری درجہ دیا۔

منڈی کی مالی حالت

بنک کوئی نہیں ہے۔ لیکن ایک سال ہوا امپیریل بنک نے (بغیر شاخ کھولتے) پیداوار دیکھکر، سے ۵/۱ فیصدی سود پر روپیہ چلانا شروع کیا تھا۔ ایک دلال نے کہا کہ اس کا اثر ہم پر بہت بڑا پڑا ہے۔ اس نے ہمیں اپنی طاقت سے زیادہ غلہ جمع کرنے کی ترغیب دی ہے۔ "ہمارا ایک لاکھ" روپے کا نقصان ہو گیا ہے۔ یہی داستان میں نے دوسری منڈیوں میں بھی سنی ہے۔ اور غلے کی قیمت گر جانے سے ہوا ہے۔ نقصان بھاری ہوا ہے۔ اور

یہ بات کہ یہ نقصان پیدا کرنے والے کی نسبت کہیں زیادہ لین دین کرنے والے کو اٹھانا پڑتا ہے۔ ایک ایسا نکتہ ہے جو اُن لوگوں کو یاد رکھنا چاہیئے جو اوسط طبقہ کی مذمت کرتے ہیں۔ گذشتہ ایام میں بہت سے لوگوں نے کسان کو نصیحت کی ہے۔ اور معقول نصیحت کی ہے کہ وہ اپنی پیداوار جمع کرکے رکھے۔ لیکن درحقیقت گیہوں یا کپاس میں سے کسی ایک کو بھی عرصے تک جمع رکھنے سے اُسے گذشتہ آٹھ سالوں میں سے صرف دو میں نفع ہوتا۔ لیکن اس وجہ سے کہ امپیریل بنک اُنکی پشت پر تھا۔ یہاں اور اور کہیں کم ہی جمع کیا گیا ہوگا۔ اور کم ہی نقصان ہوا ہوگا۔ قرض کی سہولتیں زمیندار اور بنیا دونوں کے لئے پرخطر ہیں۔ کیونکہ بنیا باوجود تاجرانہ ذہنیت کے لین دین کے متعلق خیالی گھوڑے دوڑانے کی طرف آسانی سے راغب ہوجاتا ہے۔ جیساکہ کورٹ کپورہ زیادہ خوشحال ساہوکار ۹ یا ۱۲ فیصدی پر روپیہ قرض دیتے ہیں۔ لیکن تجارتی بنکوں کے برعکس وہ اسباب پر اصرار نہیں کرتے کہ پیداوار پر شخصی قبضہ کیا جائے۔ اور نہ ہی وہ قیمتیں گرنے پر اپنے پرانے مؤکلوں کو اسباب کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ کہ وہ غلّے کی قیمت اور قرض دیئے ہوئے روپے میں خاص گنجائش رکھیں۔ اُنھوں نے کہاکہ یہ اعتبار کی بات ہے۔ ہندوستانی میں تجارت کے دیسی طریق کار میں ساکھ سے جو کام نکلا ہے۔ اسمیں مبالغہ سے کام لینا مشکل ہوگا۔ اور وہ سبب جو بعض اوقات ان کے زوال پر محمول گردانا جاتا ہے یہ ہے کہ اب لوگ پہلے کی نسبت ایک دوسرے پر کم اعتبار رکھتے ہیں۔ یہ شکایت عام ہے۔ اور اس کا بے بنیاد ہونا مشکل ہے۔ بالآخر جب ہم منڈی کے فراخ حصّے میں باہر نکل آئے تو اینٹوں سے تعمیر کی ہوئی دکانوں کے مربع سے پچھلی طرف شام کا وقت ہونے کی وجہ سے آسمان پر گلابی اور سبز نمودار ہو رہے تھے۔ سٹیشن کے قریب سے گذرتے ہوئے ہم نے شمار کیاکہ تیس بڑی لاریاں دوسری گاڑی کر رہی ہیں۔ کسی نو آبادی میں ہندوستانی گاؤں کی قدیم تنہائی قصۂ پارینہ بن چکی ہے۔

۶ مارچ عارف والہ سے رسول پور براستہ چک ۱۴۷ (۱۰ میل)

گورنگا ؤں سے اپنی گھوڑی بذریعہ ریل آجانے پر میں پھر زین پر آرہا۔ اور ایک مرتبہ پھر انسانوں سے بات چیت ہونے لگی۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ سڑک میں جان پڑ گئی ہے۔ پہلے ملاقاتیوں میں سے ایک شخص ایک پستہ قد اور دراز کاندار تھا جو ایک چھوٹے بھورے ٹٹو پر

سوار تھا۔ اس کے قمیض پر سرخ اور ارغوانی رنگ کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ ہولی اور اسکی مستانہ رنگ رلیاں ابھی ابھی ختم ہوئی تھیں۔ اور ظاہر تھا کہ اس نے انہیں نہایت ذوق شوق سے منایا تھا۔ اس وقت وہ منڈی جارہا تھا تاکہ دال اور گڑ خرید کر اپنے مال کی کمی کو پورا کرے۔

ذرا اور آگے چل کر ہم نے ایک اور بھورا ٹٹو دیکھا۔ اس مرتبہ روئی سے بھولے ہوئے تین تھیلوں پر ایک چھوٹا لڑکا قریب قریب چھپا ہوا بیٹھا تھا۔ یہ روئی گاؤں کی عورتوں نے نمک اور تیل کے بدلے اس کے والد کو دی تھی۔ اور وہ اسے بیچنے کے لئے عارف والہ لئے جارہا تھا اس قسم کے تبادلے کا رواج عام ہے اور اس سے کسان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ بلکہ اسے اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ وہ اپنی ضروریات سے زیادہ خریدے۔ اور بنئے کو اس کے نام قیمتیں لکھنے کا موقع ملے +

فوجی سپاہیوں کی ایک بستی

اب ہم چک نمبر ۲۴۷ میں پہنچ گئے تھے۔ اور یہ اس کا غیر افسانوی سرکاری نام ہے۔ یہ گاؤں اُن مستعفی سپاہیوں کی بہت سی بستیوں میں سے ہے۔ جنہیں جنگ عظیم میں خدمات بجا لانے پر اس کے صلے میں زمین دی گئی ہے۔ دیہاتی چوک کے وسط میں جہاں یہ نہ تھا۔ ہمارے بیٹھنے کے لئے بان کی چار پائیاں بچھائی ہوئی تھیں۔ چونکہ دھوپ تیز تھی۔ میں نے سپاہیوں سے کہا۔ "کیا آپ سایہ میں بیٹھنے کی تکلیف اٹھائیں گے"۔ انہوں نے کہا کہ دھوپ ہو یا سایہ ہمارے لئے برابر ہے۔ ہم دونوں کو برداشت کر لیتے ہیں۔ کیا ہم نے سرحد پر خدمات نہیں انجام دی ہیں؟ اس بات نے مجھ میں نازک شہری ہونے کے احساسات پیدا کر دئے۔ تمام کے تمام سپاہی سکھ تھے۔ لیکن سب جاٹ نہ تھے۔ گیارہ کھتری تھے۔ جن میں اکثر راولپنڈی اور جہلم کے تھے۔ اور ایک برہمن بھی تھا۔ نو آبادیوں کے دستور کے مطابق افسر گرفت امربع فی کس اور این۔ سی۔ او (غیر سرکاری کمشنر) کو ایک دیا گیا تھا۔ وہ سات ضلعوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اور یہی صورت گاؤں کے کمینوں کی تھی۔ موخر الذکر میں پانچ بھنگی، سات چمار اور انبالہ جیسی دور جگہ کا ایک بڑھئی و ایک لوہار۔ ایک پروہت، ایک کمہار، ایک موچی، ایک چوکیدار اور ایک نائی شامل تھے۔ ممکن ہے کوئی یہ خیال کرے کہ سکھوں کو حجام کی ضرورت نہیں پڑتی۔ لیکن وہ ان کے ناخن تراشتا ہے اور اپنے ہم پیشہ ساتھیوں کے سر مونڈتا ہے جب

میں اُن کی اسباب پڑھنا اور انہیں اپنے انگریزی دستور کے متعلق بتایا۔ تو ایک مستعفی سپاہی نے یہ کہتے ہوئے دخل دیدیا " ہاں ہمارا کمانڈر فرانس میں اپنی حجامت خود کیا کرتا تھا۔ اور یہاں تک کہ اپنے جوتوں کی مرمت بھی کر لیتا تھا " یہ آخری بات اس لئے کہی گئی تھی۔ کہ ایک دن اس نے اسے ایک بیج ٹکاتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے پوچھا کہ تم دھوبی کے بغیر کیسے کام چلاتے ہو؟ سوائے جنٹلمین کے باقی سب اپنے کپڑے خود دھوتے ہیں معلوم ہوا کہ وہ جنٹلمین ایک آنریری لفٹینٹ تھے۔ ایک رسالدار بھی اپنے کپڑے باہر بھیجتا تھا۔ لیکن مرتبے میں کچھ ہی کم ہونے کی وجہ سے وہ اپنے کپڑے نہایت مناسب طور پر چند میل کے فاصلے پر عارف والہ بھیجتا تھا۔ کبھی یہاں ایک سقہ بھی ہوتا تھا۔ لیکن اب وہ چلا گیا تھا۔ اور اب دیہاتی چوک کے وسطی کنوئیں سے سب اپنا اپنا پانی بھرتے تھے۔ اور یہ کار دشوار ہے کیونکہ پانی پچاس فٹ سے کھینچنا پڑتا ہے۔ وطن سے دور خدمات بجالانے کی بنا پر مجھے یہ دیکھکر بہت خوشی ہوئی کہ گاؤں کے کمینوں کو ان کے اصلی گاؤں کی نسبت زیادہ اُجرت دی جاتی تھی۔ لا جلا کر یہاں چورانوے (۹۴) گھر ہیں۔ اور آبادی ۳۱۹ ہے۔

آباد کار ۱۹۲۶ء میں یہاں پہنچے تھے۔ اور اب گارے سے لپی ہوئی خشک اینٹوں کا اچھا خاصہ گاؤں آباد ہے۔ دوران جنگ میں اپنی معقول تنخواہ میں سے اور مستعفی ہونے پر اپنی پنشن میں سے اس قدر روپیہ بچالیا گیا تھا۔ کہ اس وقت تک جبکہ قیمتیں گر گئیں۔ قرض لینے کی ضرورت نہ پڑی تھی۔ پھر لوگ بنک کی طرف رجوع ہوئے۔ اور حال ہی میں بارہ آدمیوں نے گورنمنٹ کے واجبات ادا کرنے کے لئے ۱۷۰۰ روپیہ قرض لیا ہے۔ اُنہوں نے اس حقیقت کو نہایت وثوق سے بیان کیا کہ ہم نے انتہائی لاچاری میں قرض اُٹھایا ہے۔ اس پر بھی جب میں نے یہ دریافت کیا کہ کیا تم نے پہلے اپنے زیورات فروخت کئے تھے۔ ایک نے صاف صاف الفاظ میں یہ تسلیم کیا کہ میرے گھر میں ۳۰۰۰ روپے کے زیورات ہیں۔ اور اگر یہاں بنک نہ ہوتا تو میں ضرور ان میں سے کچھ فروخت کر دیتا۔ اس نے اپنے بچاؤ کے لئے کہا کہ ہمارے ہاں قرض لینے کا رواج ہے۔ چونکہ اُن میں سے اکثر فرانس ہو آئے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ فرانس کا کسان قرض سے کس قدر خوف زدہ ہے۔ اُنہوں نے خوش خلقی سے جواب دیا۔ " ہمیں ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے "

چیک بکیں (بنک سے روپیہ وصول کرنیکی کاپیاں)

ایک بات میں تو تعلیمیافتہ زمیندار نے بھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔ کسی کے پاس شاذ ہی چیک بک دیکھنے میں آتی ہے۔ بنیری میں کسی کے پاس نہ تھی۔ اور یہی صورت یہاں تھی۔ حالانکہ اس سے گورنمنٹ کے واجبات ادا کرنے میں بہت سہولت پیدا ہو جائیگی۔ موجودہ صورت میں جب کبھی لگان ادا کرنا پڑتا ہے۔ تو ضروری ہے کہ آباد کار تین میل چل کر عارف والہ جائے اور نقد روپیہ لائے۔ پھر نمبردار اسے تحصیل کے صدر مقام میں لے جاتا ہے۔ یہ تمام کارروائی پاکپتن کے مرکزی بنک کے نام چیک کاٹ دینے سے ہوسکتی ہے۔ لیکن یہ پرانے زمانے کے طریقے محض زمینداروں تک ہی محدود نہیں ہیں۔ حال ہی میں جب میں ....۰۰ باشندوں کے ایک قصبے میں ھندو دکانداروں کے ایک بنک کا معائنہ کر رہا تھا۔ تو باوجود اس کے کہ ان میں کچھ اشخاص انکم ٹیکس ..... ادا کرتے تھے کسی کے پاس چیک بک نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام چھوٹے شہروں میں یہی حالت ہے۔ اور امداد باہمی کے مرکزی بنکوں کیلئے یہ فائدہ اٹھانے کا موقع ہے۔ اور اس سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے"۔

کھتری اور جاٹ

کھتریوں نے یہ دعویٰ کیا کہ ہم ایسے ہی کاشتکار ہیں جیسے کہ جاٹ۔ لیکن تحقیق کرنے سے ظاہر ہوا کہ صورت حالی یہ نہیں ہے۔ ان میں سے صرف ایک شخص اپنی زمین میں کاشت کرتا ہے۔ لیکن جاٹ تقریباً سب ایسا کرتے ہیں۔ اب جبکہ قیمتیں گر گئی تھیں عطا کی ہوئی جاگیروں پر گذارہ کرنے کے متعلق بڑی شکایت تھی۔ ایک کھتری افسر نے کہا کہ اگر ہماری پنشنیں نہ ہوتیں تو ہم نکمے ہو جاتے۔ ایسی ملازمت کے عوض جس سے ہمیں روٹی اور کپڑے میسر ہو جائیں۔ ہم نہایت خوشی سے اپنی زمینیں چھوڑ دیں گے۔ ایک اور کھتری نے کہا کہ اگر حالات نہ بدلے۔ تو دس سال کے اندر اندر ہم سب چلے جائیں گے۔ جاٹوں میں سے ایک نے بڑبڑاتی ہوئی آواز میں کہا کہ جاٹ مرتے مرتے بھی زمین کو نہیں چھوڑتا۔ جالندھر کے ایک جاٹ نے ساتھ ہی کہا "اچھا ہمیں نہر کا پانی دے دو۔ اور کنوئیں کا لے لو۔ اس پر ایک عام قہقہہ لگا"۔

ایک سپاہی کیلئے کتنی زمین درکار ہے

نئی اختیار اور غیر ذی اختیار افسر میں فرق پیدا کرنے والی بات یہ ہے کہ ماقبل الذکر اپنے آپ کو اتنا ممتاز سمجھتا ہے کہ ہل نہیں چلاتا۔ لیکن ایک رسالدار نے کہا کہ موسمیں بدل جاتی ہیں اور ہمارے حالات اتنے نازک ہو رہے ہیں کہ ممکن ہے ہمارا دستور بھی بدل جائے بعض نے کہا کہ ایک افسر کے گذارے کے لئے اب تین مربوں کی ضرورت ہے۔ اور این۔ سی۔ او۔ کو ڈیڑھ کی۔ لیکن جالندھر کے ایک جاٹ کا خیال تھا کہ موخر الذکر کے لئے ایک بھی کافی ہے بشرطیکہ وہ اس کی کاشت خود کرے۔ ابھی ابھی میری ملاقات ایک ارائیں سے ہوئی تھی اس نے کہا کہ ایک کنبہ نصف مربع پر گذارہ کر سکتا ہے۔ جب میں نے انہیں یہ بات کہی تو ان میں سے ایک نے کہا "حضور تمام پنجاب میں پھرتے ہیں۔ اور ہم سے زیادہ عقلمند ہیں۔ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ ہمارے اخراجات بہت زیادہ ہیں۔ میرا ایک لڑکا اوکاڑہ کے ہائی سکول میں پڑھتا ہے اور اس کا خرچ بیس روپے ماہوار پڑتا ہے۔ ۱۵ روپے اس کی فیس اور خرچ خوراک کے لئے اور ۵ روپے دوسرے اخراجات تیل اور کتابوں وغیرہ کے لئے۔ اور میری پنشن صرف ۱۵ روپے ہے۔ ایک افسر نے ساتھ ہی کہا۔ میرا لڑکا کالج میں پڑھتا ہے اور اس کا خرچ ۷۰ روپے ماہوار پڑتا ہے۔ آجکل جیسا کہ ہم نے رہتک میں دیکھا پرائمری تعلیم بھی کسان پر شاق گذرتی ہے۔ اور جب مڈل سکول کی باری آتی ہے تو اسکی چبھن بڑے آدمیوں کو محسوس ہوتی ہے۔ نارضامندی عام تھی۔ اگرچہ اسے نہایت موٴدبانہ طور پر ظاہر کیا گیا تھا۔ اور بعض ایک اور بستی کے افسروں کے متعلق جنہیں ۵ مربعے ملے تھے حاسدانہ الفاظ میں ذکر کیا ایک نے کہا کہ یہ تین نسلوں تک کافی ہے۔

کنبوں کی حدبندی

اس پر ایک نہایت اہم سوال پیدا ہو گیا۔ جس کے متعلق عرصہ نہیں گذرا کہ ہم زاہد پور کی جٹنی سے بحث کر رہے تھے۔ یہ بات صاف ہے ۲۵۔ ایکڑ کی ایک مستقلیل بڑے کنبے کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ میں نے دریافت کیا کہ کیا انہوں نے کبھی ضبط تولید کے متعلق سوچا ہے سب این سی او حیرانی میں پڑ گئے۔ اور ہنسی ہنسی میں یہ کہا کہ یہ قدرت کا کام ہے۔ لیکن افسران زدہ

وریافلنی تھے۔ اور ایک نے کہا ”ہمارے لوگ اس قدر مہذب نہیں ہیں کہ وہ ایسی باتیں سوچ سکیں۔“ دوسرے نے یہ خیال ظاہر کیا کہ میرے ہاں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے۔ اور یہ میرے لئے کافی ہے۔ میں نے ان کی تعلیم پر ۰۰۰۰۰ ۴ روپیہ صرف کیا ہے۔ اور اگر میرے ہاں صرف ایک ہی لڑکی ہوتی تو یہ بھی کافی ہوتی۔ بہت سے بچے ماں کی زندگی برباد کر دیتے ہیں اور باپ کی بھی (اس نے ساتھ ہی مسکراتے ہوئے کہا) میں ۶۲ برس کا ہوں۔ اور اس بازو کو دیکھو (اس نے اپنا دایاں بازو برہنہ کیا) کتنا مضبوط ہے۔ اگر میرے کنبے میں بہت سے لوگ ہوتے تو ہم سب بھوکے ہوتے اور بچے کتوں کی طرح اِدھر اُدھر پھرتے۔ سب نے اسبات پر اتفاق کیا کہ اگر شادی کو التوا میں ڈالا جائے تو یہ ایک اچھا اقدام ہوگا۔ افسر نے کہا کہ تعلیمیافتہ لوگوں نے اس کے متعلق سوچنا شروع کر دیا ہے۔ کسی نے اجازت لے کر ایک انگریز کی مثال پیش کی۔ جس نے اسے یہ کہا تھا کہ میں اس وقت تک شادی نہیں کروں گا جب تک اپنی بیوی کا خرچ نہ اُٹھا سکوں۔ اور اتنا بوڑھا ہو گیا تھا کہ شادی کا اس کے کام میں نہ دخل دینا ہی بہتر تھا۔ رسالدار نے صاف صاف کہ دیا کہ میں اپنی موجودہ لڑکی کی شادی اس وقت تک نہیں کروں گا جب تک کہ وہ ۲۵ برس کی نہ ہو جائے۔ لیکن پہلی کی شادی اس نے ۱۷ برس کی عمر میں کر دی تھی۔ اس پر بھی یہ زمینداروں کے عام دستور سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ اور ہانسی کے اُن دیہاتیوں سے کہیں زیادہ اچھی ہے۔ جن میں سے ایک نے گذشتہ ماہ مجھ سے کہا تھا۔ کہ میں نے حال میں چار و چھ برس کی بچیوں کو اُن سے ایک یا دو سال بڑے دو لڑکوں سے بیاہا ہے لیکن وہاں ہنارو بہت کا غلبہ ہے۔

اس کے بعد ہم نے مسلمان مستعفی سپاہیوں کا ایک گاؤں دیکھا اور وہاں لوگ بلا توقف یہ کہتے تھے کہ جتنے بچے ہو جائیں اُتنے ہی اچھے ہیں۔ ایک سرخ داڑھی والے صوبیدار میجر نے مسکراتے ہوئے کہا ”ہم چاہتے ہیں کہ وہ شہنشاہی ہوا کریں“ ان مثالوں سے یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی باتیں ہمیشہ قدرت کے ذمہ چھوڑ دی جاتی ہیں۔ لیکن جیسا کہ مجھے گذشتہ دورے میں معلوم ہوا صورت حال یہ نہیں ہے۔ اور حال ہی میں ایک ہندوستانی لورت نے جو سرکاری طور پر گاؤں در گاؤں پھرتی تھی۔ مجھے یہ بتایا کہ دیہاتی عورتوں نے یہ بات پوچھنی شروع کر دی ہے کہ آیا اس قدر بچے پیدا کرنے ضروری ہیں۔ اور اس سے بارہا پوچھا گیا تھا۔ کہ میموں کے ہاں کیوں اس قدر کم بچے ہوتے ہیں۔ قدرتی طور پر سب ایک یا دو بیٹوں کی خواہش کرتی ہیں۔ لیکن اب ہمیشہ

قدیم الایام بڑے بڑے کنبوں کی خواہش نہیں کی جاتی۔ اسکے ملازموں میں سے ایک کی بیوی نے کہا کہ میں اپنے خاوند کو چھوڑ کر میکے چلی جاؤں گی۔ میرے ہاں چودہ بچے پیدا ہوئے ہیں۔ اور اب اور بچہ جننے کی مجھ میں تاب نہیں ہے۔ اس نے ایک جان پہچان دایہ کا بھی ذکر کیا جس نے کسی ماں کو غیر ضروری نویں بچے میں سے پیچھا چھڑانے میں امداد دی تھی۔ اس نے ایک اور کا ذکر کیا جو ایسی عورتوں کو جو اور بچے جننا نہ چاہتی تھیں۔ یہ نصیحت کرتی تھی۔ کہ بچہ جننے کے بعد ہی گرم گھی کا ایک پیالہ پی لو۔ شہروں میں ضبط تولید تعلیمیافتہ طبقے میں نہایت سرعت سے پھیل رہی ہے۔ اور اب بہت سے کنبے ایسے ہیں جن میں محض دو یا تین بچے ہیں۔ بعض اپنا مقصد پرہیز سے حاصل کرتے ہیں۔ اور ایسے لوگوں میں سے ایک میرا دفعدار مسلمان ہے۔ اس نے اپنے بھائی کا جو ہر بات کو تقدیر پر چھوڑ دیتا ہے۔ اور اپنا موازنہ کر کے دیکھا تو اس نے کہا کہ میرے پاس ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں اور میں ان کی مناسب پرورش کرنے کا انتظام کر دوں گا۔ لیکن میرا بھائی ایسا کس طرح کر سکتا ہے۔ جبکہ اس کے ہاں ہر دوسرے سال بچہ ہو جاتا ہے +

۷ مارچ۔ رسول پور سے بھورے والہ براستہ چک ۱۳/۵ (۷ میل)

نو آباد کاروں کی سختیاں

آج ہم کوئی سات گھنٹے باہر رہے۔ اسمیں سے آدھا وقت ہم نے نو آباد سپاہیوں کے ایک اور گاؤں میں گذارا۔ اس گاؤں کی ابتدا ۱۹۲۸ء میں ہوئی تھی۔ اور اس کے چاروں طرف کی وہ زمین جو کبھی بے ثمر اور سخت تھی۔ اب اٹھتی ہوئی گیہوں سے سرسبز تھی۔ حسب معمول ہم اسمیں فراخ کھلی گلی میں سے داخل ہوئے۔ اور بنک کا معائنہ نمبردار کے صحن کے وسط میں ایک چھپر کے نیچے لیا گیا۔ گاؤں میں سب سے پہلا تعمیری کام یہ تھا۔ اور چند ہفتوں تک آباد کار اس کے نیچے اور اس کے چاروں طرف دھوپ اور بارش سے پناہ لینے کیلئے چھوٹی چھوٹی چھولداریوں میں گھسا ہوئے رہے۔ وہ اپنی تکلیفوں کے متعلق بہت لسانی سے کام لیتے تھے۔ ایک بڈھا صوبیدار میجر جس نے فرانس میں جنگ کی خدمات انجام دی تھیں بولا " ایسی سختیاں اٹھائی ہیں۔ کہ میں نے پہلے کبھی نہیں اٹھائیں۔ جب ہم یہاں زمین پر قبضہ کرنے کے لئے آئے تو ہمیں کھلے میدان میں ڈیرے ڈالنے پڑے اور نہر کا پانی پینا

پڑا۔ اور جب نہر بند ہو جاتی تھی تو ہم نے چھپڑیوں کا گندہ پانی پیا۔ اور اسے بھینسیں بھی پیتی تھیں۔ اور اپنا پیشاب بھی شامل کر دیتی تھیں۔ آبادکار مارچ کے مہینے میں پہنچے تھے اور ان میں سے اکثر کو تمام آتشیں گرم موسم کے دوران میں کھلے میدان یا ترپال کے نیچے رہنا پڑا تھا۔ اور رسد عارف والہ سے لانی پڑتی تھی۔ جو یہاں سے گیارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ صرف صوبیدار میجر کو مکان مل سکا۔ اس کا انتظام اس نے قریب ہی جنگلیوں کے ایک گاؤں میں گیا۔ جہاں اسے خوشی سے اجازت دے دی گئی تھی۔ کیونکہ وہ تھوڑی بہت حکمت جانتا تھا۔

نو آبادی کے ساہوکار

آبادکاروں میں ۱۸ افسر، چھ این، سی، او، تین سپاہی اور آرمی ہیڈکوارٹر کے چھ کلرک شامل تھے۔ جو شاید اس لحاظ سے خوش نصیب تھے کہ وہ ان عطیات میں شریک تھے۔ جو در اصل بہادری اور سختیاں اُٹھانے کے صلے میں دئے گئے تھے۔ لیکن بلاشبہ شملہ بھی اپنی تکلیفیں لئے ہوئے ہے۔ آبادکار چھ ضلعوں سے کھچ کر آئے ہوئے ہیں۔ اور سب کے سب مسلمان ہیں۔ اور یہی مذہب اُن میں دُکانداروں کا ہے۔ جن کے متعلق عجیب بات یہ ہے کہ اُن میں سے ایک راجپوت، ایک ارائیں اور ایک درزی ہے۔ اس کی تشریح اُنہوں نے ان الفاظ میں کی کہ ہمیں ساہوکار سے ڈر آتا ہے۔ اور ہم اسے یہاں آباد نہیں ہونے دیتے۔ در حقیقت نو آبادی میں ساہوکار اور کسان کے تعلقات عام طور پر دوستانہ ہیں۔ کسان کی طرح ساہوکار بھی عام طور پر غریب الوطن ہوتے ہیں۔ اور بہت سے ضلعوں سے آتے ہیں۔ عام طور پر اُن سے جو مغرب میں ہیں۔ اور بعض میانوالی اور اٹک جیسے دور کے ضلعوں سے بھی آتے ہیں۔ قرضے کی بھاری مانگ کو پورا کرنے کے لئے (جس کا ہونا ہی بستی میں لازمی ہے) وہ اپنے تجارتی روپیہ کا کافی حصہ منڈی کے کمیشن ایجنٹ سے ۹ یا ۱۲ فیصدی سود پر لے لیتا ہے۔ اور پھر اسے ۱۸¾ یا ۲۵ فیصدی شرح سود پر قرض دے دیتا ہے۔ اور (حصار و رہتک کے ساہوکاروں کے برعکس) وہ اب بھی قرض دیتا ہے۔ اور اپنی ضمانت کے لئے نہر پر بھروسہ کرتا ہے۔ اور اسکی وجہ کہ وہ اب بھی قرض دیتا ہے۔ یہ ہے کہ اسے اپنے سے اچھی طرح دور رکھا جاتا ہے

بستی کی لاگت

ان اعداد و شمار کی رو سے جو ہمیں دئے گئے ہیں۔ آبادکاروں نے لصف لاکھ روپیہ صرف آباد ہونے پر خرچ کیا ہے۔ اس پر بھی اُن لوگوں کے لئے جنہوں نے فوج میں اچھی خدمات انجام دی ہیں۔ ایسی سونے کی کان فوج ہی جبکی وجہ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ قرض بہت کم لیا گیا ہے۔ نمبردار نے ۰۰۰۰ روپے خرچ کئے اور اُدھار کچھ نہ لیا۔ ایک صوبیدار میجر نے ۴۰۰۰ روپیہ صرف کیا اور صرف ۸۰۰ روپے قرض لئے۔ لیکن وہ بھی اس وقت جب قیمتیں گر گئی تھیں۔ نمبردار کے مصارف کا لصف سے زیادہ حصّہ (۵۰ ہزار روپیہ پندرہ کمروں والے اس گھر پر خرچ ہُوا۔ جو اس نے اپنے اور اپنے مزارعین کے لئے بنوایا ہے۔ لیکن اس پایہ کے گھر چند ہی لوگ بنواتے ہیں۔ اور اکثر آبادکار دو یا تین کمروں پر قناعت کرتے ہیں۔ اور بہت سے لوگوں کے پاس صرف ایک ہی ہوتا ہے۔ ۱۹۲۸ء میں ایک انسپکٹر کی تحقیقات سے پتہ لگا کہ سات گاؤں میں آباد ہونے کی اوسط اس وقت ۱۱۰۰ روپیہ تھی)۔ اس لئے مندرجہ ذیل اعداد کو جو ایک سارجنٹ کے ذریعے ہم تک پہنچے ایک متموّل آبادکار کے اخراجات کی تمثیل سمجھنی چاہئے۔ لیکن اسمیں آبائی گاؤں سے منتقل ہونے کا خرچ شامل نہ تھا:۔

(۱) گھر تین کمرے	۸۰۰	روپے
(۲) زمین کی صفائی اور ہموار کرنا	۹۰	"
(۳) فی ایکڑ شرح۔ وہ قیمت جو گورنمنٹ نے پانی کے راستے بنانیکے عوض لی (۳ روپے فی ایکڑ)	۷۵	"
(۴) پانی کے راستوں کو مکمل کرنیکا خرچ وغیرہ	۱۵۰	"
(۵) حصّہ داری:۔		
(ا) پینے کے پانی کا کنواں	۵۰	"
(ب) مسجد (کچی)	۱۰	"
(ج) مسافروں کے لئے ڈیرا	۵	"
میزان کل	۱۱۸۰	روپے

نمبر ۳ و نمبر ۴ قدرے تشریح کے محتاج ہیں۔ ان کا اشارہ پانی کے اُن راستوں کیطرف ہے۔ جن کے ذریعے سے نہر کا پانی گاؤں کے کھیتوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی ندیاں آبادکاروں کی طرف سے گورنمنٹ بنا دیتی ہے۔ اور ان سے صورت طبعی کا اندازہ کرنے کھدائی اور پلیوں کا خرچ پورا کرنے کے لئے تین روپے لے لئے جاتے ہیں۔ یہ ہے نمبر ۳ کی وجہ۔ اور اگر کام مناسب طریق سے انجام دیا جائے تو مد نمبر ۵ کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ دُنیا نامکمل ہے۔ اور نو آبادی کے ابتدائی ایام میں جب بلا شبہ ہزاروں باتیں دباؤ ڈالتی تھیں تو معمولی افسر اپنے کام کو بیگار سمجھتے تھے۔ اور آباد کار کی محنت سے کمائے ہوئے روپے اور پیشانی کے پسینے سے اسے درست کرنا پڑتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک مشہور افسر نے جو صاف ظاہر ہے۔ کہ جگہ کو جا کر دیکھنے پر یقین نہ رکھتا تھا۔ یہ فرض کر لیا کہ وہ رقبہ جہاں آبپاشی کرنی ہے بالکل ہموار ہے۔ جیسا کہ یہ دفتر کی کھڑکی لسے نظر آتا ہے۔ اور اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ہر ایک پانی کے نالے کے لئے جبکہ وہ مجوزہ نقشے کے مطابق نہایت اچھی طرح بنائے جا سکتے ہیں۔ علیحدہ علیحدہ تخمینہ لگانا اور خاکے کھینچنا وقت اور روپے کو ضائع کرنا ہے۔ تاہم چونکہ تمام علاقہ مسطح نہ تھا۔ اس کا انجام یہ ہوا (ایک معتبر شاہد نے مجھے یہی خبر دی تھی) کہ بیسیوں نالے ایسے بنے جو تودوں اور ریتلی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر سے اور بغیر پُل کی گہرائیوں میں سے گذرے۔ اس قسم کی باتوں کو روکنے کے لئے افسر نو آبادیات نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ آئندہ پانی کے کسی نالے کی قیمت نہ ادا کی جائے۔ تاوقتیکہ پانی صحیح اسکے انجام تک نہ پہنچ جائے۔ اور اُن لوگوں کا جنہوں نے زیادہ تکلیف اُٹھائی تھی۔ حرجانہ بھرنے کے لئے گورنمنٹ نے زائد فصلوں کا لگان معاف کر دیا تھا۔

رشوت ستانی

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سست یا کوتاہ اندیش معمولی افسروں کے ہاتھوں کسان کو کس قدر تکلیف پہنچنی ممکن ہے۔ سرکاری قرضوں کے سلسلے میں میں نے پہلے بھی اس کا ضمناً ذکر کیا ہے۔ اور ناچار مجھے اسکی طرف پھر توجہ دلانی پڑتی ہے۔ کیونکہ اس کتاب کا تعلق دیہاتی زندگی سے ہے۔ اور دیہاتی زندگی اس سے چھپنی ہوئی پڑی ہے۔ ایسی باتیں نو آبادیوں میں خاص طور پر دیکھنے میں آتی ہیں۔ اس لئے کہ ان کے خون کا دوران اور اسکی

روانی تک بھی سرکاری ضبط کے ماتحت ہوتی ہے۔ اور اس لئے بھی کہ گذشتہ ایام میں یہاں دولت غیر معمولی طور پر فراواں رہی ہے۔ کشمکش میں پھنسے ہوئے کاشتکار کی مشکلات میں سے ایک یہ ہے کہ جب کبھی اسکی فصل ماری جاتی ہے تو اسے زمین کے لگان اور پانی کے محصول سے معافی نہیں ملسکتی۔ (جو قوانین کی رو سے مباح ہے) تا وقتیکہ وہ ایک معقول رقم ایک یا دو چھوٹے بڑے معمولی افسروں کو لطور فیس نہ ادا کرے۔ امداد باہمی کے ایک سے زیادہ ممبروں نے مجھے بتایا ہے۔ کہ اس تخفیف کا نصف سے زیادہ حصہ انہیں دینا پڑتا ہے۔ اور میری اس دورے کی تحقیقات اور اُن ذی مرتبہ آباد کاروں کی گفتگو سے جو مجھے کہیں اور ملے تھے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کوئی زیادہ مبالغہ نہیں ہے۔ موخر الذکر میں سے ایک کا جو ایک مستعفی افسر ہے یہ بیان ہے کہ گذشتہ خراب فصل کے موقع پر میرے دیہاتی ساتھیوں نے آپس میں اس بات پر اتفاق کیا کہ اس مرتبہ کچھ نہ ادا کیا جائے۔ لیکن جب اس کا موقع آیا تو خوف یا بے اعتباری اُن پر غالب آگئی۔ اور حسب معمول ادائیگی کر دی گئی۔ ایک اور شخص نے جو صوبے بھر میں کچھ عزت رکھتا ہے مجھے بتایا کہ حال ہی میں جب میں نو آبادی میں اپنی سنہری زمین دیکھنے کے لئے گیا تو میں نے دیکھا کہ ضلع دار سیلاب سے تباہ شدہ روئی کی فصل دیکھنے کے لئے گاؤں میں آیا ہوا تھا صاف ظاہر تھا کہ بہت بڑی تخفیف کی ضرورت تھی۔ لیکن اس واجبی سفارش کے لئے ۲ روپیہ فی ایکڑ کا مطالبہ کیا گیا۔ اس قسم کے سودے میں ہاتھ ڈالنے سے کشیدہ خاطر ہوتے ہوئے وہ تاریکی کے پردے میں گاؤں میں سے کھسک آیا۔ بعد میں اُس نے سُنا کہ اس معاملہ کا تصفیہ ۵۰ روپیہ میں کیا گیا تھا۔ نہری بدرو میں رشوت ستانی کا ایک اور ذریعہ بہم پہنچاتی ہیں۔ اگر اُن کے ذریعے سے گاؤں کو پانی کی ٹھیک مقدار دینی ہے تو ضروری ہے کہ ان کا حجم بالکل ٹھیک ہو۔ ایک یا دو انچ کی کمی بیشی سے ممکن ہے کہ پانی کی بہم رسانی پر حقیقتاً اثر پڑے۔ اور یہی ایک یا دو انچ ہے۔ جسکی وجہ سے لالچ کو راہ مل جاتی ہے۔ ایک افسر جس کی زمین ایک اور نو آبادی میں ہے۔ یہ بیان کرتا ہے۔ کہ عرصہ نہیں گذرا کہ ہمارے گاؤں کو ٹھیک حجم کی پختہ بدرو بنوانے کے لئے ۴۰۰ روپے (۷ روپے فی مربع) دینے پڑے تھے۔

اگر محض یہی بھلا مانس جو ایسی باتیں مجھے خلوت میں بتاتا ہے۔ انہیں عوام میں اعلانیہ دہرانے کے لئے تیار ہو تو ان پر قابو پانا بہت آسان ہو جائے۔ رہی یہ بات کہ انہیں بالکل ہی دبا دینا ممکن ہے۔ سو کوئی ایسا شخص جو بیس برس سے زیادہ گرم آب و ہوا میں زندگی بسر کرتا رہا ہو۔ ایسی تجویز

پیش کرنے کا خیال ہی نہیں کرے گا۔ اور نہ ہی یہ فرض کر لینا چاہیئے کہ دست درازی کسی محکمے تک محدود ہے۔ ہمیشہ تو نہیں لیکن عام طور پر موقع کے ساتھ اس کا قریبی تعلق ہوتا ہے۔ نہری آبادی میں چونکہ گورنمنٹ پانی بہم پہنچاتی ہے۔ اسکا موقع قدرتی طور پر زیادہ ہے۔ اسکی مخالفت کرنے کے لئے سخت سے سخت نگرانی لازمی ہے۔ اس ضمن میں قدم اٹھاتے ہوئے یہ بہتر ہوگا اگر محکمہ انہار کے سب ڈویژنل افسروں کو مجبور کیا جائے کہ وہ بجائے ایسا من موہنا موٹر بائیسکل رکھنے کے ایک اونٹ یا گھوڑا پالیں جو محض گرد اُڑاتا ہے۔ اور جس سے گورنمنٹ پر کافی خرچ پڑتا ہے۔ لیکن کاشتکار کو کوئی نفع نہیں پہنچتا ممکن ہے قصورواروں سے جواب طلب کرنے کے لئے اس سے زیادہ سادہ اور مجمل طرز عمل بھی ہو سکتا ہو۔ بہت سے سرگرم افسر ایسے ہیں جنہوں نے اس دن کے لئے افسوس کیا ہے جس دن اُنہوں نے اپنے بے ایمان یا دست درازی کرنے والے ماتحت کے خلاف کارروائی شروع کی ہے۔ اس کا لابدی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زائد کام بہت بڑھ جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ سراسر بے ثمر ہوتا ہے۔ اور اس پر ہمہ روز اوّل کی مثال صادق آتی ہے۔ بدترین خطاکار اکثر اتنے چالاک ہوتے ہیں کہ پکڑے نہیں جاتے۔ لیکن اتنے ہوشیار صرف چند ہوتے ہیں۔ کہ ان کی بداعمالیاں عوام تک نہ پہنچیں۔ اور جو بات عوام میں پھیلی ہوئی ہو اس کی تحقیق کی جا سکتی ہے۔ بعض اسپر رائے زنی کرتے ہیں۔ اگرچہ ایسی صورتوں میں جن میں لوگ دستور کی حدود سے تجاوز نہیں کرتے حقیقت کا یقین ہونا مشکل ہے۔ لیکن میرے خیال میں ایک ایسے افسر کے لئے جو دور دور کے دورے کرتا ہے اور مشہور رشوت ستانی کرنے والوں کی تحقیقات کرنے میں انصاف سے کام لیتا ہے۔ ایسا کرنا بلاشبہ ممکن ہے۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ اُن لوگوں کا پتہ لگانا ممکن ہے۔ جو ایمانداری میں بہت محتاط ہیں۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ ہر محکمہ میں ان کا خمیر اُٹھ رہا ہے۔ یہاں تک کہ ادنے سے ادنے فضا میں بھی۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ ایک صورت میں ترقی بند کر دینی چاہیئے۔ اور دوسری صورت میں زیادہ۔ مجھے یقین ہے کہ تمام وہ لوگ جو کسانوں کی حالت سے خوب باخبر ہیں۔ اس اصول کے قائم کرنے میں میرا ساتھ دیں گے۔ اور یہ کہ اسے عام طور کام میں لانے سے اس بُرائی کو بہت کچھ مٹایا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ سرکاری افسروں کی صورت میں پہلی ہی کیا جا چکا ہے۔

جنگ عظیم کے وقت سے پنجاب گورنمنٹ نے مؤخرالذکر کے متعلق نہایت سختی سے کام لیا ہے۔ اور مناسب تحقیقات کے بعد بہت سے ایسے ذمہ دار افسروں کو

ملازمت سے برطرف کردیا ہے جو بہت زیادہ رشوت خور تھے۔ اور اس کا اُن لوگوں پر بہت اچھا اثر پڑا ہے۔ جن کے لئے اعلےٰ مراتب پر پہنچنے کی راہیں کھلی ہیں۔ یونیورسٹی کی اشاعت تعلیم نے بھی گزیٹیڈ افسروں میں اپنی عزت آپ کرنے کی حس تیز کر دی ہے۔ اور میری صوبہ بھر کی تحقیقات یہ بتا رہی ہیں۔ کہ اکثر محکموں میں (لیکن شاید تمام میں نہیں) مو خرالذکر لوگوں کی وہ تعداد جس پر شبہ کیا جا سکتا ہے کم ہو رہی ہے۔ جہاں تک ادنےٰ طبقے کا تعلق ہے ذمہ داری کا زیادہ حصہ انہی لوگوں کی ذات پر ہے۔ کیونکہ جب کبھی کوئی ایسی بات ہوتی ہے جس سے وہ خاص طور پر خائف ہوتے ہیں۔ یا اسکی خواہش رکھتے ہیں تو وہ رشوت دینے میں دیر نہیں لگاتے۔ اور بہت سی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے جو روس اور ہندوستان کے دیہاتیوں میں مشترکہ پائی جاتی ہیں۔ ایک قوم پرور تیز طبیعت نوجوان یوں بیان کرتا ہے کہ جنگ عظیم کے دوران میں جب جرمن والوں نے روس کے کچھ حصے پر قبضہ کر لیا تو دیہاتیوں نے اس کام سے بچنے کے لئے جسے وہ ناپسند کرتے تھے اپنی پرانی حکمت عملی یعنی رشوت کی پناہ لی۔ اور جرمنوں کے پاس تحائف لانے شروع کئے (انڈے، مکھن سوئر کا گوشت، پھل اور دوسری چیزیں) ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ رشوت قدیم طرز حکومت کا ایسا ہی جزو تھی جیسا کہ وردی۔ اور یہ کہ بغاوت روس کے ابتدائی ایام میں کسان رشوتیں دینے میں اتنا اسراف کرتے تھے جتنا کہ زار روس کے زمانے میں۔ اور اس نے بہت سے ایماندار کارندوں کو بُرے راستے پر ڈالدیا۔ جہاں اس قسم کا رویّہ عام ہو۔ تو یہ برائی چوکنا رہنے اور سخت سزائیں دینے سے روکی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کا دائمی علاج محض تعلیم ہے ؎

پانی کی تقسیم

اگرچہ پانی کی بہم رسانی سرکاری طور پر قابو میں رکھی جاتی ہے۔ لیکن گاؤں کی زمینوں میں اس کی تقسیم آبادکاروں کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اس گاؤں میں پانی بہم پہنچانے کے لئے دو کھالیں ہیں۔ اور ہر ایک کا پانی باقاعدہ تقسیم کرنے اور تمام جھگڑوں کا فیصلہ کرنے کے لئے آبادکار اپنے میں سے ایک کو منتخب کر لیتے ہیں۔ اس شخص کے لئے ضروری ہے کہ اسکے ہاں کلاک یا گھڑی ہو تاکہ وہ اُن تمام لوگوں کو جو دریافت کرنا چاہیں یہ بتا سکے کہ ان کی باری کب شروع ہوتی ہے۔ اگر کسی شخص کی زمین ایک مربع کے فاصلے پر ہے تو اسے وہاں تک پہنچنے کے لئے پانچ منٹ دئے جاتے ہیں۔ اور ہر دوسرے مربع کے لئے جسے گذر کر اسے آگے جانا پڑے پانچ منٹ دئے جاتے ہیں

یہ کام کوئی زیادہ گراں بار نہیں ہے۔ کیونکہ ہر شخص کی باری بارہ گھنٹے کی ہوتی ہے۔ جیسا کہ کسی نے شاہ پور میں جہاں اس قسم کے انتظامات ہیں۔ یہ بتایا تھا کہ جن کی کلائیوں پر گھڑیاں ہوتی ہیں وہ انہیں دیکھ لیتے ہیں۔ اور ہم باقی لوگ اگر رات ہو تو ستاروں کو دیکھتے ہیں اور اگر دن ہو تو سورج کو۔ وقت کا اندازہ رکھنے والا شخص اپنے عہدے پر اس وقت تک قائم رہتا ہے۔ جبتک کہ منتخب کرنے والوں کی مرضی ہو۔ اور اس کا معاوضہ یہ ہے۔ کہ اسے پانی کچھ زیادہ دیا جاتا ہے۔ ہر ایک گاؤں میں یہی طرز عمل نہیں ہے۔ اور بعض میں ایک بے ضابطہ پنچایت اس پر قابو رکھتی ہے ؛

ڈپٹی کمشنر

تمام جھگڑوں کا فیصلہ پنچایت نہیں کر سکتی۔ ایک اور نو آبادی میں ایک دن جب میں کام کر رہا تھا۔ تو بکرے کی سی داڑھی والا ایک جوان سکھ دروازے پر آیا۔ اس نے تعظیماً پگڑی اتاری اور کانپتے ہوئے اسے پھر پہن کر دست بستہ آگے بڑھا۔ اور اسقدر جھک کر کہ اسکی پیشانی قریب قریب میرے سے آ لگی۔ اور پہلے بائیں طرف اور پھر دائیں طرف دیکھتے ہوئے گویا وہ لب کشائی کیلئے امداد کا متلاشی تھا۔ یوں پھوٹ پڑا۔ میرے بھائی نے میری پانی کی کھال بند کر دی۔ میں تحصیل میں گیا۔ اور شکایت کی۔ کسی نے نہ سنی۔ عدالت میں مجھے اجازت نہ ملی۔ میں واپس آیا اور سنا کہ بادشاہ سلامت کہیں آس پاس ہی آئے ہوئے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس جب میں نے اسے یہ بتایا کہ میں ابھی ابھی ڈپٹی کمشنر سے ملنے جاؤں گا۔ اور اس سے اس کا ذکر کروں گا۔ تو اس کے مضطرب چہرے کے تمام تفکرات پُر شکن مسکراہٹ سے بدل گئے۔ پنجاب میں اُن لوگوں میں سے جو دیہات میں رہتے ہیں ۹۰ فیصدی کے لئے ڈپٹی کمشنر ہی حقیقی بادشاہ ہوتا ہے۔ یہی ایک ایسا اعلیٰ افسر ہے جس تک ہر شخص کی آسانی سے رسائی ہو جاتی ہے۔ (پانچ یا چھ ضلعوں کا مالک کمشنر دور رہتا ہے) جو غریب سے غریب آدمی کی شکایات سننے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ اور جو اکثر ظلم کو روک سکتا ہے۔ اور بعض اوقات چارہ سازی بھی کر دیتا ہے۔ کسان کے لئے وہ کہکشاں کے اُس تمام مجموعے سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ جو اس کے سر پر واقع ہوتا ہے۔ اور امدادی افسروں کی اُس ٹڈی دل فوج کے مقابلے میں جو اس کے ماتحت ہوتی ہے۔ جائے پناہ کا کام دیتا ہے۔

جب ہم روانہ ہوئے تو اڑھائی بجے کا وقت تھا۔ اور ابھی ہم کو تپتے ہوئے سورج کی دھوپ میں پندرہ میل طے کرنے تھے۔ "تار کول کی سڑک کی انتہائی وسعتوں تک دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور

جونہی یہ افق کے قریب پہنچتی تھی۔ دفعتہً شیشے جیسی صاف نیلی جھیل میں غوطہ کھاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی جسکی حقیقت قریب جانے پر سیراب سے زیادہ نہ ثابت ہوتی تھی۔ جب ہم بھورے والہ میں داخل ہوئے تو دن قریب قریب ختم ہوچکا تھا۔ اور جونہی کہ ہم داخل ہوئے ایک ریل گاڑی مغرب کیطرف سے گرد کے بادل کو چیرتی ہوئی نمودار ہوئی۔ گرد غروب آفتاب کی شعاعوں سے سُنہری نظر آرہی تھی۔ اور سیاہ و کوہ پیکر انجن جو گاڑی کو کھینچ رہا تھا۔ اس نئی روشنی کا نشان معلوم ہوتا تھا جو اس دُنیا میں داخل ہورہی ہے۔ جو کبھی اس سے محروم تھی+

۸ پارچ (اتوار) رسولپور سے مچھیاں والہ براستہ چک ۲۵۴ (۱۴ میل)

آباد ہونے کی دقتیں

بعد از دوپہر کی گرمی سے بچنے کے لئے جو اب موسم گرما کی آگ کا نمونہ ہے۔ ہم جلد روانہ ہوئے اور چند میل طے کرنے کے بعد ایک ایسی جگہ پہنچے جو بے اندازہ کوڑہ کرکٹ کے ڈھیر میں بھینسوں کا ڈیرا معلوم ہوتی تھی۔ یہ اُن آبادکاروں کی عارضی بستی تھی۔ جن کا بنک دیکھنے کے لئے ہم آئے تھے وہ سب سیالکوٹ کے سکھ جاٹ تھے۔ اور ۱۹۲۸ء کے موسم گرما میں یہاں آئے تھے۔ اور پہلی بات جو اُنہوں نے یہ کی تھی۔ کہ اپنے لئے گھاس سے چھتے ہوئے کیچڑ کے جھونپڑوں کی چھاؤنی قائم کی تھی۔ رہا یہ کہ وہ اب بھی اسی طرح رہ رہے ہیں۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ حکام بالا سے گاؤں کے تعمیر کرنے کی جگہ کے متعلق جھگڑا طول کھینچ گیا ہے۔

سیالکوٹ میں جب ان کے پاس یہ خبر پہنچی کہ اُن کی گھر یلو دلدلی زمینوں کی بجائے انہیں نیلی بار میں زمینیں دی گئی ہیں۔ تو وہ بہت خوش ہوئے۔ ان کے حاسد پڑوسیوں نے کہا کہ تم سب چوہدری بن جاؤ گے اور بیویوں نے خاوندوں کی خوش قسمتی کی خبر سُنکر زیادہ زیورات کیلئے اُن پر دباؤ ڈالا۔ اُنہوں نے کہا کہ ہم سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور دوڑ پڑے۔ اُنہوں نے حقیقتاً یہی کیا کہ اپنے بیوی بچوں اور سامان کو گاڑیوں میں لادا اور خود پیدل چل پڑے سفر میں پندرہ دن لگے۔ اور یہ سب کام گرمی میں کیا گیا ہوگا۔ کیونکہ وہ یہاں جون کے مہینے میں پہنچے۔ جبکہ چھپکلی تک بھی سائے میں خوش ہوتی ہے (چیل بھی انڈا چھوڑ دیتی ہے) اُنہوں نے بہت جلد گارے اور پھوس کے چھپر بنالئے۔ لیکن فرحت زندگی سے کوسوں دور تھی۔ "مچھر ہماری کھال نوچتے تھے۔ اور خوراک اور چارہ بھورے والہ سے لانا پڑتا تھا (چار میل کے فاصلے پر) ہم آٹا، دال، نمک، مرچ

اور پیاز پر گذارہ کرتے تھے۔ پیاز مقوی نہیں ہے لیکن ہم اتنے خوش تھے کہ انہیں ہی کھا کھا کر موٹے ہو گئے۔ اور ہر ایک سختی خندہ پیشانی سے برداشت کی۔ ہم جانتے تھے کہ سانگل بار اور گنجی بار میں لوگ کسقدر خوشحال ہو گئے تھے اور ہمیں یقین تھا کہ ہم بھی خوشحال بن جائیں گے۔ زمین بھی اچھی تھی۔ لیکن اس وقت سے ہمارے لئے مصیبت ہی مصیبت رہی ہے +

پانی کی قلت

ہم نے ان کی پُرالم داستان سننے کے لئے ایک جھاؤ کے درخت کے نیچے ڈیرا ڈالدیا۔ (تاحدِ نظر محض یہی ذرا سی چھاؤں تھی) تقریباً ۴۰ آبادکار ہمارے سامنے دریوں پر بیٹھے تھے۔ اور ان کے جوتے بجری بیڑوں کی شکل میں بیرونی کناروں کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے تھے یہاں دو خاص تکلیفیں تھیں۔ ان کے گاؤں کا محلِ وقوع اور پانی کی کمی۔ انہوں نے بار بار دُھرایا کہ ہماری کوئی نہیں سنتا۔ اس پر کہ نمبردار کی سرکاری کتاب میں اس شکایت کو صاف طور پہ رد کیا ہوا تھا۔ اسسٹنٹ افسر نوآبادیات نے لکھا ہوا تھا۔ کہ کسی چک نے مجھے اس سے زیادہ تکلیف نہیں دی۔ پانی جسکے بغیر کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا اس کے متعلق یہ شکایت تھی۔ کہ یہ خیالی اور ناکافی ہے۔ ایک شخص نے کہا کہ گزشتہ چھ فصلوں کے دوران میں میری زمین صرف دو مرتبہ سیراب کی گئی ہے۔ اس پر یہ کہ پہلی تین فصلوں کے بعد جن کے لئے گورنمنٹ کوئی رقم طلب نہیں کی اسے ۵ روپے فی مستطیل دینے پڑے تھے۔ البتہ اس نے فصل ماری جانے کے قواعد کے ماتحت معافی کیلئے کبھی درخواست نہیں کی تھی۔ لہٰذا اس لئے کہ ایسا کرنا بیفائدہ تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ایک اور آبادکار ۔ کی یہی حالت تھی۔ گھر گیا ہوا تھا تاکہ وہ اپنی آبائی زمین کو رہن رکھ کر گورنمنٹ کی واجبات ادا کرے۔ اسمیں شک نہیں کہ یہ خاص خاص صورتیں تھیں لیکن جو بات عام معلوم ہوتی تھی وہ یہ تھی کہ بہت سے لوگوں کو اتنا پانی بہم نہ پہنچ سکا تھا۔ کہ وہ ربیع کی فصلوں کی پوری نشوونما دے سکتے۔ اُن لوگوں کو جن کے کھیت کھالوں کے قریب تھے۔ کوئی شکایت نہ تھی۔ اور کئی ایک نے تسلیم کیا اُنہوں نے ۸ یا ۱۰ من فی ایکڑ کپاس کی عمدہ ترین فصل حاصل کی تھی۔ لیکن پیچھے بعد دیگرے انہوں نے ایک یا دو من کا ذکر کیا۔ اور ایک نے کہا کہ میں نے نو ایکڑ زمین میں سے کل پچاس من کپاس حاصل کی ہے۔ یہ سُنکر میں نے بلا امتیاز ۲۰ مردہ آدمی لے لئے۔ اور ان میں سے دس آدمیوں کے ہاں تقریباً

ایک من فی ایکڑ کپاس حاصل ہوئی تھی۔ یہ اعداد گرے ہوئے ہیں اور قریب قریب غیر یقینی طور پر گرے ہوئے ہیں۔ لیکن مجھے اس امر پر شبہ ہے۔ کہ یہ معیار سے بہت زیادہ درست ہیں۔ کیونکہ نمبردار نے ان میں سے کئی ایک اصلاح کی اور اس نے اور چند دوسرے لوگوں نے یہ تسلیم کیا۔ کہ ہمارے ہاں کافی اچھی فصلیں اُتری ہیں۔

ہر بڑی سکیم میں دقتیں ہوتی ہیں۔ اور نیلی بار بھی اس سے مستثنےٰ نہیں ہے۔ اس علاقے نے خاص طور پر تکلیف کیونکہ اس کی سطوح غیر متوقع طور پر بے قاعدہ ثابت ہوئیں یہاں کی مٹی اس قدر پھس پھسی اور ریتلی تھی۔ کہ نہر کے کنارے بار بار ٹوٹتے تھے۔ اور نہر کو ریلوے لائن کے پار لے جانے کے لئے پل بنانے پر بہت زیادہ عرصہ لگا۔ اسلئے ان سیالکوٹیوں کی شکایت بجا تھی۔ (کوئی وجہ نہیں کہ نہری آبادی میں یہ صورت ہمیشہ نہ پیش آتی ہو) ان میں سے ایک نے کہا کہ اگر یہاں بنک نہ ہوتا تو ہم سب دوڑ جاتے زمین کا لگان ہم نے اسی کی مدد سے دیا ہے۔ جہاں کہیں کوئی بنک نہیں ہے بعض لوگ دوڑ گئے ہیں۔ اور یہ ایک حقیقت ہے۔ جس کی حال ہی میں ایک افسر نے تصدیق کی۔ ایک اور شخص نے کہا کہ گورنمنٹ موجودہ لگان کی بجائے ہماری پیداوار کا نصف لے لیا کرے تو بہتر ہوگا۔ اور ہم خوش ہونگے۔ تیسرے نے کہا۔ "اگر حالات کی روش یہی رہی تو کسی کے ہاں بچہ نہ ہوگا۔"

آباد ہونے کا خرچ

فصل در فصل نقصان کم محسوس کیا جاتا اگر باوجود حد درجہ کفایت شعاری کے سیالکوٹ سے کوچ کرنے میں تمام سرمایہ نہ ختم ہو جاتا۔ بہت سے لوگوں نے اپنی زمینیں آپ صاف کیں اور دوسروں نے اس پر تقریباً ۰۰ روپے تک خرچ کیا۔ پچاس کے لگ بھگ روپیہ سامان اور اثاث البیت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں لگ گیا۔ اور کوئی کنبہ ایسا نہ تھا۔ جو پہلی ہونے تک کھا۔ نئے پینے کا خرچ اُٹھانے میں ۰۰ روپیہ سے کم صرف کر سکا ہو۔ پھر یہ کہ حسب معمول مطالبات بھی تھے۔ سرکاری و غیر سرکاری۔ گاؤں کی کھالوں کے لئے اب ۰۰ سے لیکر ۰۰ روپیہ تک کی متوسط لاگت سے نئے مکان تعمیر کئے جا رہے ہیں۔ اس طرح سے ہر آباد کار کو ابتدائی اخراجات کیلئے ۰۰ سے لیکر

۰۰۰ روپیہ تک کی ضرورت پڑی ہے۔ اور یہ خرچ کل کے سپاہیوں کے اخراجات سے کہیں کم ہے۔ اور ایک اوسط درجے کے آبادکار کے لئے انسپکٹر کے اندازے (۰۰ ۱۱ روپیہ) سے بھی کم ہے۔ اس میں سے زیادہ خرچ پس انداز روپے میں سے اُٹھایا گیا ہے (جیسا کہ سپاہیوں کی صورت میں)، لیکن فصلیں اس قدر مایوس کن ثابت ہوئی ہیں اور قیمتیں اس قدر گر گئی ہیں۔ کہ چونتیس میں سے اٹھائیس کو بنک سے قرض لینا پڑا تھا جن میں سے دس نے گورنمنٹ کے واجبات ادا کرنے کے لئے لیا تھا۔

گاؤں چھوڑ دینے کے بعد ہم نے پرانی بار کا کچھ حصہ طے کیا اور اپنا راستہ کبھی ایسی بکھری ہوئی جھاڑیوں میں سے نکال لے گئے جو درخت نما تھیں اور کبھی ایسے بکھرے ہوئے درختوں میں سے جن کے نصف حصے جھاڑیوں جیسے تھے زمین کبھی سخت تھی اور کبھی نرم۔ سخت وہاں تھی جہاں مٹی صدیوں سے تمازت آفتاب میں پکتی رہی تھی۔ اور نرم وہاں جہاں اسفنج نما کھار کسی قدر پگھلی ہوئی برف کی طرح پڑا ہوا تھا۔ زندگی کی بڑی علامت یہ تھی کہ کہیں کہیں اونٹ کی لید پڑی تھی۔ اور کوئی علاقہ اس سے گندہ نہیں معلوم ہوتا کہ خالق اسے بنا کر بھول گیا ہو۔ تاہم صبح و مسا، طلوع و غروب آفتاب کے وقت اس پر خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے اور شرق و غرب انتہائی خوبصورتی سے تمتما اٹھتے ہیں۔ دن گرم تھا اور آج پہلی مرتبہ یورپی کپڑے اتنے گاڑھے محسوس ہو رہے تھے کہ برداشت نہ ہو سکتے تھے وقت آنے پر ہم ملتان جانے والی سڑک پر چڑھ آتے جو آگے آگے جاتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ یہاں تک کہ یہ دور کے سراب میں غائب ہو جاتی تھی۔

۹ مارچ۔ چھیانوالہ سے وہاڑی براستہ چک ۱۲۱ (۱۰ میل)
حد سے زیادہ گھنے دیہات

آبادشدہ علاقے میں گاؤں کا بے قاعدہ اور ایسی اونچی نیچی سطح پر واقع ہونا جو گذشتہ ایام کا کوڑا کرکٹ چاروں طرف اکٹھا ہونے پر ہمیشہ بلند ہی بلند ہوتی جاتی ہے۔ خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔ نو آبادی میں وہ ٹھیک ہموار میدان سے اُٹھنا شروع ہوتے ہیں۔ اور سال کے ان ایام میں ان کی سفید کیچڑ سے لپی ہوئی دیواریں گیہوں کی متبسم فصلوں کے درمیان مربع شکلوں میں کھڑی ہیں۔ لیکن چیزیں باہر سے خواہ کتنی ہی فرحت خیز کیوں نہ معلوم ہوں اندر تاریکی ہی تاریکی

تھی۔ آج صبح جب میں نے انتظار کرنے والوں کا مزاج پوچھا "کیا تم اچھے ہو؟" تو انہوں نے پُرملال طریق سے سر ہلایا۔ میں نے دیکھا کہ گاؤں کے چوراہے میں حسب معمول پینے کے پانی کا کنواں نہ تھا۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس سے پہلے اتنے غریب تھے کہ کنواں نہ اُتار سکتے تھے یہاں پانی ۹۰ فٹ کے فاصلے پر ہے اور اس پر ۱۴۰۰ روپے صرف ہونگے۔ لیکن اب ہم اسے بنا لیں گے۔ اور ٹھیکہ دے دیا گیا ہے۔ ہمیں اپنے اجلاس کے لئے سوائے ایک پرانے جنڈ کے درخت کے اور کسی چیز کا سایہ نہ ملا۔ اور وہاں ہم تین گھنٹے تک گھچ پچ ہوئے بیٹھے رہے اور بیرونی قطاریں سائے سے باہر دھوپ میں رہیں۔

آباد کار زیادہ تر مسلمان یا سکھ ورک تھے۔ اور ۱۹۲۶ء میں گوجرانوالہ کے ۱۳ ولد لی گاؤں سے یہاں آئے تھے۔ نمبردار کے سوا کسی کے پاس ایک مستطیل سے زیادہ زمین نہ تھی۔ اور سوائے دس صورتوں کے باقی سب میں ایک مستطیل دو یا تین بھائیوں کو دی گئی تھی۔ درحقیقت ۲۶ صورتوں میں موخرالذکر طریق پر زمین دی ہوئی تھی۔ اور اس امر کی پر زور شکایت تھی۔ کہ گذارہ ناممکن ہے۔ اور موجودہ حالت میں بلاشبہ یہ ہے بھی مشکل۔ اسوقت ایک کنبے کے لئے ایک مستطیل (۲۵ ایکڑ) پر گذارہ کرنا بشرطیکہ وہ خود اس کی کاشت کریں۔ غالباً ممکن ہی ہے۔ لیکن جب دو یا یہاں تک کہ تین کنبوں کا خرچ اُٹھانا پڑے۔ تو ۲۵ ایکڑ زمین بالکل کافی نہیں ہو سکتی۔ لیکن جب کبھی قیمتیں چڑھی ہوئی ہوں گی تو انہوں نے اس طرح بھی ضرور گذارہ کیا ہوگا۔ اور یہ ضرور یاد رکھنا چاہئے۔ کہ یہ عطیات قیمتیں گرنے سے پہلے دئے گئے تھے اور زمین کے لئے خواہش اسقدر زیادہ ہے کہ آباد کاروں کو منتخب کرنے والے ڈپٹی کمشنروں کو لازمی طور پر یہ فکر ہوئی کہ وہ اپنے زیادہ سے زیادہ بہترین کاشتکاروں کے لئے ضروریات مہیا کریں اور اُن میں سے ایک نے مجھے بتایا کہ ایک مرتبہ چار بھائیوں نے ایک مربع کے لئے درخواست دی۔

بنک کے صدر نے فوج میں ملازمت کرنے کے بعد کسی طرح دسویں جماعت پاس کر لی تھی۔ اور یہ بات اس کی آبرو میں ایک غیر معمولی اضافہ تھا۔ چونکہ تمام حساب کتاب رکھا ہے اس لئے وہ ہمیں اچھی طرح بتا سکا کہ گذشتہ سال حالات کیسے رہے تھے۔ وہ اعداد و شمار جو اس نے ہمیں بتائے مختصراً درج ذیل ہیں:۔

تھوک آمدنی ۲۵۰ روپے

(معہ دس من گیہوں قیمتی ۱۵۰ روپے جو گھر کے اخراجات کے لئے رکھی گئی)

سرکاری واجبات ۲۳۸ روپے

بقایا میزان ۱۲۲ روپے

یہ اوسط درجے کی بقایا رقم کسی صورت میں بھی خالص منافع نہیں ہے۔ کیونکہ بیج اور آلات و مویشیوں کی قیمت گرنے کے حساب میں کچھ بھی شامل نہیں کیا گیا۔ اس نے پہلی دو فصلوں میں سے ۶۰۰ روپیہ بچایا۔ ان کا لگان معاف تھا۔ اور قیمتیں اچھی مل گئیں۔ پھر چار سو روپیہ گھر پر اور ۲۰۰ روپیہ دیگر مصارف میں لانے کے بعد اس نے ۵۰ روپے قرض بھی لئے۔ گذشتہ سال کے دوران میں اس نے تن تنہا مستطیل پر کام کیا۔ اور صرف دو یا تین دفعہ جب کام کا زور ہؤا تو اس نے اپنے پڑوسی سے ایک دن ہل چلانے کی خدمت لی۔ گاؤں کا نمبردار ہونے کی حیثیت سے اب اسے ½ ۱۲۔ ایکڑ زمین اور دی گئی ہے۔ اور اس سمیت اب اس کا گذارہ ہونا چاہیئے۔

کیا ایک مستطیل کافی ہے؟

لیکن کیا کوئی شخص اور اس کا کنبہ ایک مستطیل پر گذارہ کر سکتا ہے؟ یہ ایک نہائیت ضروری سوال ہے۔ کیونکہ اس بستی میں عام کسان کے پاس اس کے علاوہ کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہے۔ اس لئے میں نے ایسے اعداد و شمار اکٹھے کرنے کی سخت کوشش کی ہے۔ جن سے اس سوال کا جواب دیا جا سکے۔ ان میں سے وہ جو مجھے دھاڑی کے گورنمنٹ سیڈ فارم کے مینجر نے دئے نہائیت واضح و اہم ہیں۔ فارم کے ½ ۸ مستطیلوں میں سات مزارعین کاشتکاری کرتے ہیں۔ گذشتہ سال خوراک اور مزدوری کو چھوڑ کر محض پیداوار کے اخراجات منہا کر کے انہیں اوسطاً ۱۶۰ روپے فی مستطیل (فی مزارع) گذارہ کرنے کے لئے بچے۔ یہ تقریباً ۱۳ روپے ماہوار یا سات آنے روز بنتے ہیں۔ اور یہ رقم قلی کی آمدنی سے زیادہ نہیں ہے اسکے اہم ہونے کی وجہ یہ ہے۔ کہ وہ نہایت ہی موافق حالات کے زیر اثر کاشتکاری کر رہے ہیں۔ زمین اچھی ہے بیج بہترین استعمال کیا جاتا ہے۔ اور نگہبانی کرنے والے لوگ ماہرین فن ہوتے ہیں گیہوں ۱۵ من فی ایکڑ اور کپاس ۱۰ سے ۱۲ من فی ایکڑ حاصل ہوئی تھی۔ جبکہ اس علاقے میں گیہوں سے

ہم گذر کر آئے ہیں۔ گیہوں کی دس یا بارہ من فی ایکڑ اور کپاس کی ۵ یا ۶ من فی ایکڑ توقع کی جا سکتی ہے۔ ابھی ایک بات اور ان کے حق میں ہے۔ اس نو آبادی کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ پانی کی وہ مقدار جو بہم پہنچائی جاتی ہے۔ بذات خود مقررہ رقبے کا صرف ۵۱ فیصدی حصہ سیراب کرنے کیلئے کافی ہوتی ہے۔ اور مقابلتاً لائلپور میں ۷۵ فیصدی کے لئے کافی ہوتی ہے۔ یہ کام دانستہ کیا جاتا ہے۔ تاکہ پانی کو احتیاط سے استعمال کرنے کا حوصلہ پیدا ہو۔ اور اسے لاپرواہی سے ضائع کرنے سے پرہیز کیا جائے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صرف ۵۱ فیصدی زمین ہی کاشت کیجا سکتی ہے۔ کیونکہ کسی قدر بارش کی بھی توقع کی جا سکتی ہے۔ اس کی مدد سے بشرطیکہ پانی کی پوری مقدار بہم پہنچائی جائے۔ اور کھالیں خوب چلتی رہیں۔ رقبے کو کافی وسیع کیا جا سکتا ہے۔ اور اس صورت میں یہ رقبہ تمام زمین کا ۶۰ فیصدی تھا۔ مگر بدقسمتی سے نو آبادی کے بڑے حصے میں پانی کی مقدار کم پہنچائی گئی ہے۔ کچھ تو متذکرہ بالا وجوہات کی بناء پر لیکن زیادہ تر اس وجہ سے کہ دریائے ستلج نے وہ اُمیدیں پوری نہیں کیں۔ جو اس سے اسکی پہلی روداد وں کی وجہ سے وابستہ تھیں۔

تاہم آؤ یہ فرض کرلیں کہ نو آبادی کا کاشت شدہ رقبہ بصورت مجموعی ۶۰ فیصدی ہے۔ اور کپاس ½ ۶ من فی ایکڑ اور گیہوں ۱۰ من فی ایکڑ ہوتی ہے۔ اور ان کی قیمت گاؤں میں بالترتیب ۶ روپے اور ۲ روپے پڑتی ہے۔ انہی مفروضات کے باوجود جو ذرا خوش اُمیدی کی بنا پر ہے ایک کنبہ جس کے پاس ایک مستطیل ہے ۱۲۱ روپیہ سالانہ یا تقریباً ۱۰ روپیہ ماہوار کمائے گا۔ تاکہ وہ سال بھر خانگی ضروریات اور متفرق اخراجات کو پورا کرے۔ اس تخمینے میں آلات یا قیمتوں کے گر جانے کے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے (جیساکہ فارم کے مزارعین کی صورت میں کیا گیا تھا۔ نو آبادی میں مشکل سے کبھی ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ یہ رقم کاشتکار کی توقع سے زیادہ ہو۔"

میں سڑک پر دو دفعہ ارائین مزارعین سے ملا ہوں۔ اُنہوں نے کہا کہ ہم نصف مستطیل پر گذارہ کرتے رہے ہیں۔ لیکن یہ صورت بہت زیادہ قیمتیں گرنے سے پہلے تھی۔ اور ان میں سے ہر نے اسے لیکر ½ ۱ ایکڑ تک مرچیں، تمباکو اور سبزیاں کاشت کیں۔ حصار میں ہم نے دیکھ لیا کہ پُرزور طریق پر کاشت کرنے سے کسقدر فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اگر یہی چارۂ کار تمام آباد کاروں کے لئے عام ہو جائے تو اسکی حالت بالکل مختلف ہو جائے۔ لیکن نو آبادی کے زیادہ حصے میں بغیر کنوئیں کے سبزیاں وغیرہ کاشت کرنا ناممکن ہے۔ دریائے ستلج پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اور

پانی کی سطح ۴۰ فٹ یا اس سے زیادہ گہری ہونے کی وجہ سے آبپاشی کے کنوئیں کھودنا ممکن العمل نہیں ہے۔ اس گاؤں میں جو آج سے دو دن پہلے دیکھا گیا تھا۔ آلوؤں کا تجربہ ناکامیاب رہا تھا۔ اور ایک آبادکار جس نے سبزیاں اُگانے کی کوشش کی۔ نازک وقت میں پانی نہ ملنے پر فصل کے بہت سے حصّے سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ جوں جوں پانی نہریں سے رس رس کر زمین میں جذب ہوتا رہیگا تو وقت آنے پر بلاشبہ پانی سطح کنوئیں کی گہرائی تک بلند ہو جائے گی۔ لیکن موجودہ مشکلات کے اس طرح رفع کرنے کا وقت ابھی بہت دور ہے۔ موجودہ صورت میں سوائے اس جگہ کے جہاں حالات غیر معمولی طور پر موافق ہیں۔ ایک کنبہ ایک مستطیل کی آمدنی پر محض گذارے کی توقع رکھ سکتا ہے۔ اور جہاں مستطیل میں سے دوسروں کے ساتھ حصہ بانٹنا پڑے وہاں گذارہ بھی ناممکن ہے۔ البتہ ایک طرح سے اس غریب کا بھلا کیا جاسکتا ہے۔ گورنمنٹ زمین کی مالک ہے۔ اور یہ اپنی واجبات میں کمی کر سکتی ہے۔ اور ایسا کرنے کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس سکیم پر زیادہ لاگت آنے کی وجہ سے اس نوآبادی میں واجبات دوسری جگہوں کی نسبت زیادہ ہیں۔

گورنمنٹ کی واجبات

قیمتیں گرنے سے پہلے ہر جگہ گورنمنٹ کی واجبات مناسب سہولت سے ادا کر دیجاتی تھیں۔ نہری علاقوں میں جہاں زمین کا لگان اور اس کے ساتھ ہی پانی کا محصول بھی دینا پڑتا ہے۔ یہی واجبات بار معلوم ہوتی ہیں۔ اور بہت سے لوگ صرف قرض لیکر ہی انہیں ادا کر سکتے ہیں۔ نہری علاقوں میں ہمارے تمام راستے کی روک ان کا تذکرہ رہا ہے۔ اور اس گاؤں میں بارہ ممبروں نے اپنی گذشتہ قسط ادا کرنے کے لئے ۱۰۰۰ روپیہ بنک سے قرض لیا۔ نو اور آدمیوں نے ۴۰ سے لیکر ۱۰۰ روپیہ تک ساہوکار سے قرض لیا۔ سات نے ۱۸¾ فیصدی شرح پر اور دو نے ۳۷½ فیصدی پر اور قریب قریب ہر صورت میں ایک آنہ فی روپیہ وضع کر لیا گیا تھا۔ دو صورتوں میں سے ایک میں چونکہ قرض لینے والے کے ہمراہ نمبردار نہ گیا تھا اس لئے شرح سود ۳۷½ فی صدی کے حساب سے لگائی گئی تھی۔

وہ ہر قرض لینے والے کے ہمراہ جاتا تھا۔ اس لئے نہیں کہ ضامن ٹھہرے۔ بلکہ ساہوکار کو اسبات کا یقین دلانے کے لئے کہ اگر ضرورت پڑی تو میں قرض وصول کرنے میں تمہاری امداد

کروں گا۔ دوسری صورت میں ایک ورک اپنے ساتھی ورک کے پاس گیا۔ اور چالیس روپے پر ۱/۲ ۳۲ فیصدی سود لیا گیا۔ اور ساتھ ہی حسب معمول کٹوتی بھی کی گئی۔ ایک اور مسلمان شخص جسکے ہاں ایک بیوی اور دو بیٹے ہیں۔ اپنے بھائی کے ساتھ ایک مستطیل میں حصّہ دار تھا۔ اس نے کھڑے ہوکر کہا۔" میں نے نمبردار کو ۶۶ روپے دئے ہوئے ہیں۔ اور ابھی ۲۰ روپے اور دینے ہیں۔ یہ رقم مجھے کہاں سے ملے گی؟ میں داڑھی میں آیا ہوں۔ لیکن کسی نے مجھے قرض نہیں دیا۔ اور میں نے ۶۶ روپے ادا کرنے کے لئے اپنی تمام روئی فروخت کر دی ہے۔

کیا تم ایک بیل نہیں فروخت کر سکتے؟

میرے پاس صرف دو ہیں اور ایک بیمار ہے۔ اور دوسرا بُری حالت میں ہے۔ کوئی اسے دیکھیگا بھی نہیں۔

اور زیورات کیا ہوئے؟

میرے پاس زیورات کیسے ہو سکتے ہیں۔ آپ کی قسمت اچھی ہے۔ میری بُری۔ میں نے اپنا پیٹ کاٹ کر ۶۶ روپے دید ئے ہیں۔ میں اب اور کچھ نہیں کر سکتا۔

میں بنک کے صدر کی طرف مخاطب ہوا اور دریافت کیا کہ کیا یہ مناسب ہوگا کہ اسے ممبر بنا لیا جائے اور یہ بیس روپیہ کی رقم دے دی جائے؟ اس نے سر ہلا دیا اور مجھے کوئی حیرانی نہ ہوئی۔ کیونکہ وہ اپنی پریشان صورتِ حالات سے مخصوص طرح کا وعدہ شکن معلوم ہوتا تھا۔

گاؤں کی عورتیں

ہم نے اپنا معائنہ دو عورتوں کی گفتگو پر ختم کیا جو ایک گھر کی کیچڑ سے لپی ہوئی صاف دیوار کے ساتھ سہمی ہوئی کھڑی تھیں۔ ایک بہت شرمیلی تھی۔ دوران گفتگو میں زیادہ دیر تک ماسوائے ناک کے جو اوڑھنی کے کنارے کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کا اور کوئی حصّہ نظر نہ آیا۔ دوسری جو کہ مسلمان تھی بڑی باتونی تھی۔ اس نے ایک لمبا سیاہ کُرتا پہنا ہوا تھا۔ اور حسب معمول خاکستری رنگ کی ایک میلی چادر اپنے سر پر لئے ہوئے تھی پہلے تو اس نے اسے اپنے چہرے پر آڑے لیا ہوا تھا۔ لیکن پھر سرک جانے دی۔ اور اس گندمی رنگ کی ۳۵ سالہ صحت مند عورت کے دیہاتی نقش و نگار کو عریاں کر دیا۔ اس کی شادی گیارہ برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ اور اس کا خیال تھا کہ شادی کی بہترین عمر گیارہ یا بارہ برس ہے

کبھی کبھی شادی ۱۷ برس کی عمر تک بھی نہیں کی جاتی۔ لیکن اس کی اپنی لڑکی کی شادی گیارہ برس کی عمر میں ہوئی تھی اور مہمانوں کی آؤ بھگت و خورد و نوش پر ۲۰۰ روپے صرف ہوئے تھے۔ خواہ گھر میں روپیہ ہو یا نہ ہو۔ زیورات ضرور دئے جائیں۔ ورنہ جب لڑکی اپنے سسرال جائے گی تو اسے کوئی نہیں پوچھے گا۔ ایسی دلیل کی بناء پر اسے جہیز بھی ضرور ملنا چاہیئے۔ جو لوگ استطاعت رکھتے ہیں۔ ۲۱ بڑے زیور دیتے ہیں۔ باقی لوگ گیارہ اور تین سے کم کوئی نہیں دیتا۔

کام کے متعلق سوال دریافت کرنے پر زیادہ بالونی عورت قریب قریب لسانی سے کام لینے لگی۔ اس نے کہا کہ تڑکے سے پہلے ضرور چکی چلانی شروع کر دینی چاہیئے کیونکہ سورج نکلے ہمیں دودھ بلونا پڑتا ہے۔ اور چونکہ یہاں کنواں کوئی نہیں ہے ضروری ہے کہ پانی کھیتوں کی کھالوں سے لایا جائے۔ پھر پکانے کا اور خاوند کا کھانا باہر لے جانیکا وقت ہو جاتا ہے۔ اب چونکہ روپیہ نہیں ہے۔ کپڑے خریدے نہیں جا سکتے۔ اس لئے دو یا تین گھنٹے روزانہ چرخہ کاتنا پڑتا ہے۔ خراس کا خرچ بچانے کے لئے پسائی زیادہ بھی کی جاتی ہے۔ میری آنکھیں تھکن سے چور ہو جاتی ہیں۔ اور صرف گرمی کے موسم میں مجھے ایک دو گھنٹے دوپہر کو آرام حاصل ہوتا ہے۔ جو کچھ ہمیں رہتک میں بتایا گیا تھا۔ اس سے یہ کچھ بہتر ہے۔ یہ رواج نہایت پُر رحم ہے کہ بچہ کی پیدائش کے بعد چالیس دن تک آرام دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ دیہاتیوں میں اکثر دیکھنے میں آتا ہے بچوں کو دیر تک دودھ پلایا جاتا ہے۔ لڑکوں کو ۲½ سال تک اور لڑکیوں کو دو سال تک۔ لڑکی چھ یا سات سال کی عمر میں کام کرنا شروع کر دیتی ہے۔ اور پہلے پہل وہ بچوں کے ساتھ کھیلنا اور برتن دھونا سیکھتی ہے۔ پھر گھر صاف کرنے کے لئے اس کے ہاتھ میں جھاڑو دیدیا جاتا ہے۔ اور اسے آٹا گوندھنا اور پکانا سکھایا جاتا ہے۔ اور اسے کاتنے کی باری آتی ہے اور آخر کار نو یا دس برس کی عمر میں وہ آٹا پیسنے میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ یہ سب سے زیادہ سخت کام ہے۔ لیکن پہلے پہل وہ صرف اتنا کرتی ہے۔ کہ چکی کے دستے کو ہاتھ سے محض پکڑے رکھتی ہے۔ اور اصل کام ۱۶ یا ۱۷ برس کی عمر تک نہیں کیا جاتا گذشتہ ماہ حصار میں ایک عورت نے کہا تھا کہ اس سے پہلے طاقت نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ ہی جب کوئی لڑکی اپنے خاوند کے ساتھ رہنے کے لئے آتی ہے۔ تو ایک یا دو سال تک اسے

ہلکا کام دیا جاتا ہے۔ میں ایسے رواج کے متعلق کچھ کہے بغیر نہ رہ سکا جسکی لڑکی کو بالغ ہونے تک چکی چلانے کی محنت سے نو بچایا جاتا ہے۔ لیکن بچّہ جننے کی تکلیف سے دور نہیں رکھا جاتا ۔

کل بھی ہم نے ایک دیہاتی عورت سے باتیں کہیں تھیں۔ وہ ۵۴ برس کی ایک سِکھ جٹنی تھی۔ وہ ایک جنگلی درخت کے نیچے زمین پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اور موٹے کھدّر کے میلے کپڑے پہنے ہوئی تھی۔ اور اس کے لہنگے میں سے پانچ مردانہ پاؤں کی پھیلی ہوئی اُنگلیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اس کے نقش خوبصورت اور ٹھوڑی نوکدار تھی۔ اور وہ ہمیں نہائت بے تکلفی و سادگی سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ و پریشانی کے ہمارے تمام سوالوں کے جوابات دئے اور اسی طرح بولتی رہی گویا وہ دیہاتی زندگی کی ناگوار سختیاں اُٹھانے کی عادی تھی۔ اسکی شادی ۱۲ برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ اور اس کے چھ بچوں میں سے پہلا بچّہ ۱۶ برس کی عمر میں پیدا ہُوا تھا۔ سوائے ایک کے سب زندہ رہے تھے۔ اور پہلے چار ۱۰ سے لیکر ۳۰ برس کی عمر تک کے لڑکے تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان میں سے ایک کی بھی شادی نہ ہوئی تھی۔ کنبہ اس قدر غریب تھا اور بلا شبہ اس انتظار میں تھا کہ دس برس کی لڑکی اتنی بڑی ہو جائے کہ اپنے بھائیوں میں سے ایک کی دُلھن سے بدل لی جا سکے۔ اسکی ماں کی یہ تجویز تھی۔ کہ ۱۵ یا ۱۶ برس کی عمر تک شادی نہ کی جائے۔ اور اب اس کی برادری میں یہی شادی کی عمر تھی۔ اس کی جوانی کے ایّام میں اس سے دو یا تین سال پہلے شادی کر دی جایا کرتی تھی۔ یہ تغیر وسطی پنجاب کا خاص حصّہ ہے اور خاص طور پر سکھوں کا۔ جو اس قسم کی تمام باتوں میں پیش پیش ہیں۔ جو بات کم خصوصیّت رکھتی ہے۔ وہ شائد یہ ہے کہ اس کے خیال کے بموجب تعلیم لڑکیوں کو کام سے جی چرانے کی عادت پیدا کر دیتی ہے۔ اس مشکل سوال کا کہ عورتوں میں کیا ضروری تبدیلی واقع ہوئی تھی اس نے یہ جواب دیا کہ سب سے بڑی تبدیلی خوراک کی ہے۔ جواب زیادہ اچھی ہے۔

جب ہم گاؤں سے نکلے تو دن ذرا ڈھل گیا تھا۔ اور ہم پر نہائت تیزی سے چمک رہا تھا ہم پرانی بار کے کچھ علاقے میں سے گذرے اور تار کول سے بنی ہوئی نیلی سڑک اور اُن بنجر پشتوں میں جو ہمارے دونوں طرف جلوہ گر تھے زمین و آسمان کا فرق تھا۔ یہ علاقہ قریب

قریب ویران تھا۔ اور چند میل تک سوائے اونٹوں کی ایک قطار کے اور کوئی آثار نظر نہ آیا۔ اور وہ بھی سڑک کو ایک فضول اختراع خیال کرتے ہوئے اس سے متکبرانہ طور پر کنارہ کش تھے وہاڑی کی طرف پھر آبپاشی کا پتہ لگنے لگا۔ اور ہر جھاڑی و درخت کی طرف اندر آنے والے جوار بھاٹے کی طرح سبز گیہوں کا طوفان آیا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ جب میں پہلی مرتبہ کھانا کھانے بیٹھا تو تقریباً تین کا وقت تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وقت بھی ساتھ ساتھ سرپٹ دوڑتا ہے •

۱۰ر مارچ۔ چک ۵۳۲ کی طرف روانگی اور پھر واپسی (۸ میل)

جنگلیوں کا ایک گاؤں

کیا کوئی اس بستی میں خوش ہے؟ یقیناً جنگلی ہیں۔ جن میں ہم آج آئے ہوئے ہیں۔ اس صبح میں نے محتاط الفاظ میں خیر و عافیت دریافت کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری کیا حالت ہے؟ اُنہوں نے کہا ہمارے پاس کوئی جاگیر نہیں ہے۔ ہماری زمین لے لی گئی ہے اور ہمارے پاس بیٹھنے کو بھی جگہ نہیں ہے۔ دو ہٹی کٹی عورتیں آگے در آئیں اور ڈنڈوت کرتے ہوئے میرے پاؤں سے چمٹ گئیں (اور میں کشمکش و پیچ میں رہا) نہایت مشکل سے اُنہوں نے مناسب وضع اختیار کی۔ اور ہم سب اس کھیڑے کے (جو گیارہ نیم گنوار و گھروں کا ایک مجموعہ تھا) خس و خاشاک سے اُٹے ہوئے کنارے پر بیٹھ گئے۔ چند سال گذرے جب یہ علاقہ صحرا تھا تو اسے گاؤں سمجھا جاتا تھا۔ اب اسکی طرف سوائے اس کے اور کوئی توجہ نہیں دی جاتی کہ یہ پرانا ہونے کی وجہ سے گرد و نواح کے میدانی علاقے سے ذرا بلندی پر واقع ہے۔ دونوں عمر رسیدہ عورتیں آلتی پالتی مار کر سامنے بیٹھ گئیں اور فوراً سُر ملا کر الیا بعید الفہم اور ڈرامائی نغمہ پیدا کیا گویا کہ وہاں ناٹک ہو رہا تھا۔ لیکن اسمیں ترنم اس سے کہیں کم تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے دونوں کے گانے کو ایک کے گانے میں تبدیل کیا۔ میں اسکے مضمون کا صرف خلاصہ بتا سکتا ہوں۔ اس نے کہا کہ ہم یہاں انگریزوں سے پہلے آئے یہاں تک کہ ساون مل کے زمانے سے بھی پہلے۔ اور سات پشتوں سے یہاں رہتے آئے ہیں ہم نے دو کنوئیں اُتارے اور جہاں کہیں بارش کا پانی مل سکا جنگل کو کاشت کیا۔ ہمارے اونٹ جہاں اُن کا جی چاہتا تھا چرتے تھے۔ اسوقت ہم جنگل کے مالک تھے۔ لیکن اب ہماری زمین چرالی گئی ہے۔ (اس پر دو بازو نہایت غصے سے میری طرف بڑھائے گئے) اور ہم اپنے اونٹوں کو لیکر اِدھر اُدھر نہیں جا سکتے ہیں۔ بلکہ

ہمارے لئے ضروری ہے ۔ کہ ہم مزدوری پر کام کریں ۔ اور کپاس چنیں ۔ اور ہمارے آدمی اپنے اونٹ کرایہ پر چلائیں ۔ بہت سے آدمیوں نے گاؤں چھوڑ دیا ہے ۔ اور کام کی تلاش میں جنگلوں میں چلے گئے ہیں ۔ ہم اپنی بھیڑوں اور اونٹوں کا دودھ جی بھر کر پیا کرتے تھے لیکن اب ہمارے دودھ دینے والے اونٹ صرف چند ہیں ۔ ان کیلئے کہیں چارہ نہیں ہے ۔ کچھ مر گئے ہیں اور باقی ماندہ دبلے ہیں ۔ آخر کار میں نے اس کے متعلق چند سوالات دریافت کر کے اس کی روانی تقریر کو بند کیا ۔ اس کے تین بیٹے ۲۶ ۔ ۲۲ ۔ اور ۱۲ برس کی عمر کے تھے ۔ اور ان میں سے صرف بڑے کی شادی کی گئی تھی ۔ دوسرے کی شادی وہ اس وقت کریگی ۔ جب اسکی لڑکی کی عمر شادی کے قابل ہو جائیگی ۔ اور بیٹے کا دولہن بدل لینے کا انتظام کیا جائیگا ۔ کل والی گوجرانوالہ کی عورت کے خلاف اس نے اپنے بیٹوں کو دو سال تک اور بیٹی کو اڑھائی سال تک دودھ پلایا تھا ۔ اس نے کہا کہ یہ میں نے شریعت کے قانون کے مطابق کیا ہے ۔

میں نے پوچھا ۔ "فرق کی کیا وجہ ہے" ؟

"لڑکی کا مرتبہ کم ہے ۔ اور خداوند تعالیٰ اس پر رحم فرماتا ہے" ۔

"تو کیا پھر مائیں اپنے بیٹوں کو بیٹیوں سے زیادہ چاہتی ہیں" ؟

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ دونو کوکھ سے پیدا ہوتے ہیں" ۔

لیکن وہ لوگ جو چارپائی کی طرف کھڑے تھے ۔ اس بات پر متفق ہو گئے ۔ کہ باپ بیٹوں کے مشتاق ہوتے ہیں ۔ اور مائیں بیٹیوں کی ۔ کیونکہ بیٹا باپ کا ہاتھ بٹاتا ہے ۔ اور بیٹی ماں کا ۔ میں نے پوچھا کہ لڑکی کب ماں کو سہارا دینا شروع کرتی ہے ۔ انہوں نے کہا کہ پانچ یا چھ برس کی عمر میں وہ چیزیں لانا سیکھتی ہیں ۔ پھر وہ اپنی ماں کے بالوں میں سے جوئیں دیکھتی ہے علی ہذا القیاس جیسا کہ کل کی گفتگو سے ظاہر تھا ۔

جنگلیوں کی رہائش

یہ لوگ سراسر مفلس اور کمزور تھے ۔ لیکن ان کے گھر نہایت صاف ستھرے تھے ۔ میں نے انہیں گھر کہہ دیا ۔ لیکن دراصل وہ خیمے اور گھر کے بین بین ایک قسم کی رہائش گاہیں تھیں ۔ بلاشبہ ان کی دیواریں حسب معمول کیچڑ سے لپی تھیں ۔ لیکن چھت سرکنڈے گھاس

کی ڈالی ہوئی تھی۔ اور درختوں کے چھوٹے پیچیدہ اور بے رنگ تنوں کا سہارا دی گئی تھی ایک جگہ سرکنڈہ گھاس میں بڑے بڑے سوراخ بھی بنائے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود بھی کمرہ نہایت صاف تھا۔ اور اس کی تمام اشیاء روارنش کئے صندوق زنگار رنگ کی ٹوکریاں۔ مٹی کے برتن نہایت ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ بعض کے گرد سے بچانے کیلئے بھیڑ کی اُون اور اونٹ کے بالوں سے بنے ہوئے کمبل سے ڈھانپا گیا تھا۔ دیوار پر سکا مدار کپڑے کی ایک کا مدار دھجی لگی ہوئی تھی۔ جس پر کشیدہ کاری سے ایسے جانور بنائے ہوئے تھے۔ جن کو دیکھ کر ہنسی آتی تھی۔ یہ کام ایک لڑکی نے کیا تھا۔ اور اس کا یہ فرق تھا۔ کہ وہ دن میں دو مرتبہ ہر ایک چیز کو جھاڑتے۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہمیں بغیر کھانے کے بھی رہنا پڑے۔ اور یہ دو وقت تک ہو سکتا ہے۔ تو پھر بھی ہم ہر چیز کو صاف اور اسکی جگہ پر رکھتے ہیں۔ یہ عزت کا معاملہ ہے۔ (یہاں عزت کا لفظ صحیح معنوں میں استعمال ہو رہا تھا) اس کے باوجود بقول پولیس گاؤں کے تمام لوگ مویشی چرانے والے ہیں۔ لیکن جنگلیوں میں مویشی چرانا ایک باعزت کھیل ہے +

خانہ بدوش ایک محدود جگہ میں

واپسی پر ہم نے جنگلیوں اور ان کی داستانِ غم کے متعلق تذکرہ کیا۔ یہ ایک پرانی شکائت ہے۔ اور جہاں کہیں میں اُن سے ملاقات کرتا ہوں یہی سنتا ہوں۔ لیکن اس کی بنا پر اسے کبھی بھی شائستہ نہیں کہا جا سکتا۔ ہر شخص اس موجودہ سنگدلانہ قانون کو معلوم کر کے افسوس کرتا ہے۔ جس کی رو سے ہر وہ شخص جو کم پیدا کرتا ہے اپنی جگہ زیادہ پیدا کرنے والے کو دیدیتا ہے۔ زیادہ سے یہ کیا جا سکتا ہے کہ اس قاعدے کو اتنا قابلِ برداشت بنا دیا جائے جتنا کہ ممکن ہے۔ اور اس کے بدلے میں نئی تہذیب کی بہترین چیز دی جائے نیلی بار میں اس مسئلے کو حل کرنے میں عجیب وغریب مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ پنجاب کی باروں میں سے یہ سب سے آخری بار تھی جسے اب آباد کرنا تھا۔ اور وہ جنگلی جنہیں اور کہیں زمین نہ ملی تھی اپنی قسمت آزمائی کے لئے یہاں پہنچ گئے تھے۔ افسر نوآبادیات نے جو شروع سے آخر تک آبادکاروں اور جنگلیوں دونوں کی خاطر لڑتا رہا ہے۔ اونٹ کی پیٹھ پر کئی مہینے صحرانوردی میں گذارے تاکہ وہ ان کے مطالبات کا ایسی جگہ معائنہ کر سکے مشتبہ

مطالبات کو بھی تسلیم کر لیا گیا تھا۔ دیہاتی بستیوں میں جنگلیوں کے اجتماع نے ناگزیر طور پر جھگڑے اور مصیبتیں کھڑی کر دیں۔ بہت سے مطالبات دور افتادہ جگہوں کے متعلق تھے اور ان سے کہیں زیادہ کا تعلق بکھری ہوئی زمینوں سے تھا۔ چونکہ جنگلیوں اور آبادکاروں کو گیہوں اور چنے کی طرح نہیں ملایا جا سکتا تھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ خیالات کو مرکز کیطرف لایا جائے اور یہ پرانے تعلقات کا پورا پورا لحاظ رکھ کر کیا گیا۔ کہیں کہیں پُر جوش اپیل کے جواب میں دور افتادہ گروہ رہ گئے تھے۔ اور وہ ہمیشہ سے وہیں رہتے آئے ہیں۔ لیکن آخرکار ہر ایک نے باری باری یہ درخواست کی ہے۔ کہ ہمیں دوبارہ اپنے بھائی بندوں میں آباد کیا جائے۔ مختصر یہ کہ یوں کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس نو آبادی ہر دوسری نو آبادی کی طرح افسر نو آبادیات نے جنگلیوں کو اپنی خاص حفاظت میں لے لیا ہے۔ اور ان میں سے ایک کو ان کے متعلق اس قدر زیادہ احساس ہوا کہ ایک شام اپنی سالانہ رپورٹ مرتب کرتے وقت اس نے مندرجہ ذیل خیالات قلمبند کئے "۔

یہ سال صحیح معنوں میں ترقی کا سال ہے۔ صحرا کی کھلی جگہوں کو جگہ جگہ چھوٹی موٹی مستطیلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جنگل کے درخت گرا دئے گئے ہیں۔ اور بنجر علاقے کے ہیر پھیر کھاتے ہوئے اونٹوں کے راستوں نے اپنی جگہ پبلک کی پختہ سڑکوں کو دے دی ہے۔ جو بغیر کسی موڑ یا نشیب و فراز کے میلوں چلی گئی ہیں۔ چرواہوں کی بانسریاں اور شتربانوں کے محبت بھرے نغموں کی تھرائی ہوئی آوازیں خاموش ہیں۔ خانہ بدوشوں کے سرکنڈے کی جھونپڑیوں میں خوب دھوپ اور ہوا آتی تھی۔ اور جو اتنی صاف ہوتی تھیں جتنا کہ ناچ گھر کا فرش اب اپنی جگہ وسطی پنجاب کے تاریک، گوبر سے لتھڑے ہوئے کیچڑ کے گھروں کو دے چکی ہیں خانہ بدوش لوگ خود بھی جو کبھی بار میں آزاد پھرتے تھے اور اپنے پڑوسیوں کے مویشیوں پر کھلے دل سے ہاتھ ڈالتے تھے۔ اب ۲۵ کیلہ زمین میں محدود کر دئے گئے ہیں۔ جبکہ بڑی کے گدھ (جو بغیر نام کے ہی رہینگے) اپنی ناپاک چونچیں اس کے اعضائے زندگی میں دور تک لے جاتے ہیں۔

لیکن اس کا ایک پہلو اور بھی ہے اور یہ ہمیں ایک جاٹ نے سمجھا دیا جسے ہم سڑک پر ملے تھے۔ وہ پستہ قد گٹھا ہوا اور ۶۵ برس کی عمر کا تھا۔ اور اپنے بھائی کیساتھ شرکت کے لئے ۵۰ میل کے فاصلے پر خانیوال جا رہا تھا۔ اس کے بھائی نے اُن ایام میں

جب قیمتیں چڑھی ہوئی تھیں ۔ ۵۰۰ ۳ روپے میں ۱/۲ ۶ ایکڑ زمین خرید لی تھی۔ نہر اور اس کے ساتھ ہی ایک کنوئیں کے پانی کی مدد سے وہ اب بھی اس قابل ہے کہ اپنا اور اپنے کنبے کا خرچ اُٹھائے بچتا کچھ نہیں لیکن وہ زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اس جاٹ کا بھی کنبہ ہے۔ ایک بیوی اور تین بچے۔ اُن کا خرچ اُٹھانے کے لئے وہ نیلی بار میں اِدھر اُدھر پھرتا رہا ہے۔ تاکہ اسے حسب منشا زمین مل جائے۔ لیکن اس کی محنت رائگان گئی ہے اور اس کی ناکامیابی اور شدتِ احتیاج نے اسے لسّان بنا دیا۔

اس نے کہا "سرکار مجھے زمین کیوں نہیں دیتی۔ ہمارا کام کاشتکاری ہے۔ ہم اور کیا کر سکتے ہیں اور کہاں جا سکتے ہیں۔ ہمیں ضرور زمین ملنی چاہیئے"۔

"سرکار ہر شخص کو زمین نہیں دے سکتی۔ جاٹ بہت ہیں اور زمین محدود"۔

"پھر یہ امیروں کو زمین کیوں دیتی ہے اور غریبوں کو کیوں نہیں؟"

"سرکار نے بہت سے غریبوں کو بھی زمین دی ہے۔ خاص طور پر اُن لوگوں کو جو اُس کی خدمت بجا لائے ہیں"۔

"لیکن میں نے ہی کونسا قصور کیا ہے۔ کوئی چوری نہیں کی ہے کہیں ڈاکہ نہیں مارا ہے۔ مجھے کیوں نہیں زمین دی جا سکتی۔ میرے ہاں ایک بیوی اور دو بچے ہیں۔ اور زمین صرف تین گھماؤں ہے"۔

یہ الفاظ سادہ تھے لیکن ایسے جوش میں ادا کئے گئے کہ اُن سے جاٹ کا اصلی جوہر اور زمین کے لئے کسان کی ازلی اشتہا ظاہر ہو رہی تھی۔ اور یہ بات جنگلیوں کو آزادی سے محروم رکھنے کے جواز میں ہے۔

نیلی بار کی بستی کے متعلق چند سطور

افسر نو آبادیات مسٹر ایف پی ولیس آئی سی ایس جنہوں نے از راہ کرم اس باب کا خلاصہ پڑھا ہے۔ یہ خیال کرتے ہیں کہ اس زمانے کے لئے جس کا اسمیں تذکرہ کیا گیا ہے یہ نو آبادی کی بہ حیثیت مجموعی اوسط درجے کی خاصی اچھی تصویر پیش کرتا ہے۔ رہا یہ کہ اسقدر دھندلی ہے۔ سو اس کی تین خاص وجوہات ہیں۔ اوّل تو یہ کہ دریائے ستلج میں سے غیر متوقع طور پر پانی کی مقدار متواتر کم بہم پہنچتی رہی۔ دوسرے یہ کہ سکیم کے بھاری اخراجات کو

پورا کرنے کے لئے دام لگانے کا معیار سابقہ نو آبادیوں کی نسبت بلند رکھا گیا۔ اور تیسرے یہ کہ قیمتیں دفعتہً گر گئیں۔ یہ سمجھ لینا آسان ہے۔ کہ ان مخصوص حالات میں افسر نو آبادیات کے لئے ... سخت ... کا سامنا تھا۔ کیونکہ اسے پروجیکٹ کے وسائل آمدنی کو خطرے میں ڈالنے کا ڈر اور آبادکار کے لئے سہولتیں پیدا کرنے کی خواہش پھاڑ چیاڑ کھاتے تھے۔ خوش قسمتی سے یہ بستی اچھے ہاتھوں میں رہی ہے۔ اور مسٹر ویس کا قائم کردہ اعلےٰ معیار اسکے جانشین مسٹر ایچ ڈی بھنوٹ آئی سی ایس نے برقرار رکھا ہے۔ گورنمنٹ نے آبادکار کو مالی رعائتیں بہم پہنچا کر اور محکمہ نہر نے پانی کی بہم رسانی پر پورا پورا قابو رکھ کر مسٹر بھنوٹ کا ہاتھ بٹایا ہے۔ البتہ قیمتوں کی کمی اسی طرح باقی ہے۔ اور وہ نو آبادی پر تاریک پردہ ڈالتی ہے اس کے باوجود افسر نو آبادیات نے ۱۹۳۲ء میں یہ لکھا کہ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ نیلی بار کا علاقہ اتنی اچھی حالت میں نہ پہنچے کہ ۱۹۲۷ء میں اس سے توقع کی گئی تھی۔ لیکن پھر بھی یہ ایسے محتاط کاشتکاروں کا گھر ہوگا۔ جو اپنی زمین میں دور اندیشی سے کاشت کرتے ہیں۔ اور پانی سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ لکھتا ہے کہ کسی دوسری نو آبادی نے کاشتکار کو اس قدر کفایت شعاری سے پانی استعمال کرنا نہیں سکھایا جتنا کہ نیلی بار نے۔ اور یہ ایک ایسا سبق ہے جسکی دوسری نو آبادیوں میں بھی اشد ضرورت ہے۔" ۱۹۳۴ء

حصّہ چہارم

شمال مشرق کیطرف

بابِ سیزدہم

گورداسپور اور سیالکوٹ

جٹّی بہ حیثیتِ بیوی و ماں۔ ایک ہل والا کسان

اِتوارہ ۱ر مارچ۔ رام داس سے ڈیرہ بابا نانک (۸ میل)

دو سال سے کچھ زیادہ عرصہ گذرا میں گورداسپور سے اپنے پہلے دورے کے لئے روانہ ہوا تھا۔ میرا خیال تھا۔ کہ میں اپنی گردش کا چکّر اس کے قرب و جوار میں اپنا دوسرا دورہ ختم کر کے پورا کر لوں گا۔ ہر ایک کہانی کا انجام اگر پُر مسرّت نہ ہو تو پُر امن ضرور ہونا چاہئیے اور پنجاب میں امن حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انسان بڑے پہاڑوں کے دامن میں چلا جائے۔ لیکن وہ ابھی بھی ۵۰ میل کے فاصلے پر ہیں۔ لیکن کل جب میں نے فتح گڑھ سے سوار ہو کر پہلی مرتبہ کوچ کیا تو دولہ دھار کی وسیع سایہ دار ہئیت نظر کے سامنے تھی۔ گورداسپور کا ضلع کسی تفصیل کا محتاج نہیں ہے۔ کیونکہ "پنجابی کسان" میں میں نے پہلے ہی اس علاقے کا مفصّل بیان دیدیا ہے۔ جسمیں گورداسپور واقع ہے۔ یہ درحقیقت پہاڑ کا دامن ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں بارش خوب ہوتی ہے جائدادیں قلیل ہیں۔ اور سبزی کی افراط ہے چونکہ میں نے امداد باہمی کی بابت یہاں کے سادہ اور کسی قدر دور اندیش کسانوں سے

سکیں تھی۔ اس لئے میں اس کے لئے اپنی ایک خاص کمزوری کو تسلیم کرتا ہوں۔ آج صبح جب میں نے ا... نے ایک قدیم ملاقاتی کی نشریف آوری کے سلسلے میں چک اٹھائی۔ تو وہ فوراً یہ کہتے ہوئے ایک قدم لیٹ کر کمرے کے وسط کی طرف پیچھے ہٹا۔ "نہیں نہیں میں پرانے خیالات کا آدمی ہوں"۔ یہ بات اپنے اندر پرانے رواج کی خوبیاں لئے ہوئے ہے۔

صحت وصفائی اور اپنے آپ پر ٹیکس لگانا

یہاں آتے ہوئے سنگھ پور میں مقامی بنکنگ یونین کے اجلاس میں شامل ہونے کے بعد میں نے گاؤں پر ایک نظر ڈالی۔ اسمیں ۵۰ گھر ہیں۔ ۱۹۲۹ء میں ذیلدار (جو یہیں رہتا ہے) کے روح پھونکنے پر گاؤں والوں نے گاؤں کو صاف رکھنے کے لئے ایک پنچایت قائم کی۔ ایکٹ کے مطابق قائم نہ ہونے کی وجہ سے یہ صحیح معنوں میں نمائندگی کے اصولوں پر بنی ہے۔ اور تین جاٹوں، ایک مقامی ہیڈ ماسٹر، ایک ڈاکٹر، ایک تیلی اور ایک بھنگی پر مشتمل ہے۔ ایک بھنگی کو گلیاں صاف رکھنے کے لئے ۵ روپے دئے جاتے ہیں۔ (اس کی بیوی کام کرتی ہے) پانی پینے کے کنوؤں میں جراثیم کش ادویات ڈالی جاتی ہیں۔ چھپڑیوں اور نشیبوں کو پُر کیا جا رہا ہے۔ اور پانی بھرنے کے لئے مٹی کے برتنوں کی بجائے (جو ڈسٹرکٹ کنوئیں کو اٹ دیتے ہیں) صاف کے ماسن استعمال کرنے کے لئے لوگوں کی ہمت بڑھائی جاتی ہے۔ روپیہ اس طرح جمع کیا گیا ہے۔ کہ ۵۰ روپے کی رقم دیہاتی فنڈ، درخت فروخت کئے جاتے ہیں، میں سے اور چالیس روپے دیہاتی بنک میں سے لئے ہیں۔ اور ہر سبزی کی ٹوکری پر جو گاؤں میں لائی جاتی ہے۔ ایک آنہ وصول کیا جاتا ہے۔ اور گاؤں کے چوکیدار کے لئے جو روپیہ وصول کیا جاتا تھا (۴۴ روپے) اسے دوگنا کر دیا ہے۔ موخر الذکر رقم کو ذرا بھاری محسوس کیا گیا۔ اور روایتی کاموں کے لئے (عام طور پر مذہبی کیلئے) اپنے آپ پر ٹیکس لگانے کی رسم عام ہے اور میں نے اسکی بہت سی مثالیں دی ہیں۔ لیکن صحت وصفائی کے لئے شاذ ہی ایسا کیا جاتا ہے۔ اس دورے میں مجھے تحصیل موگا کے ۱۶ گاؤں جن کا ذکر صفحہ ۱۱۶ پر کیا گیا ہے۔ اور ایک گاؤں امرتسر کا یاد پڑتا ہے۔ جس نے ۵۰۰ روپیہ گلیوں میں فرش لگوانے پر صرف کئے۔ گذشتہ دورے میں بھی اس قسم کی ایک یا دو مثالیں میرے دیکھنے میں آئی تھیں۔ تاہم کسی ایک مثال کا ہونا

اس کے امکان کو ظاہر کرتا ہے۔

ایک نہایت ہی خوشگوار دن کا سب سے زیادہ دلپسند پہلو وہ گفتگو تھی جو رسالے کے ایک مستعفی سارجنٹ (ایک سکھ جاٹ) کے ساتھ کی گئی۔ ہم نے اسے ایک چھوٹے مگر صاف ستھرے صحن میں چرخہ کاتتے ہوئے دیکھا اور اسکی شادی شدہ جوان لڑکی اس کے برابر میں بیٹھی تھی۔ ماں کھدر کے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ اور اس نے اپنا چہرہ قریب قریب تمام چھپائے رکھا۔ لیکن لڑکی جو شلوار پہنے ہوئے تھی۔ بے نقاب تھی۔ اور پہلے لمحے کے بعد بغیر کسی حجاب کے ہماری طرف دیکھتی رہی۔ وہ ایک نہایت خوبصورت گداز جسم کی لڑکی تھی۔ اس کے نقش خوب گول بھرے ہوئے اور چہرہ ایسا تھا۔ جیسے مشرقی شاعر ماہ کامل سے تشبیہ دیا کرتے ہیں۔ بشرے سے کسی قدر مستعدی بھی ٹپکتی تھی۔ وہ ان آٹھ بچوں میں سے ایک تھی۔ جن میں سے تین راہی عدم ہو چکے تھے۔ وہ [illegible] جیتے تھے۔ [illegible] کی ماں بھی۔ اور اب پہلا پہلوٹھی کا (گیارہ ماہ کا) بچہ دکھا رہی تھی۔ [illegible] وہ خوش اور سسرال کی تمام پابندیوں سے آزاد تھی۔ اس کا [illegible] تھا کہ ۱۶ یا ۱۷ برس کی عمر شادی کے لئے بہترین عمر ہے۔ لیکن اسکی ماں کی شادی ۱۲ برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ [illegible] کے داداکی تعلیم کی مہربانی سے (اس کے متعلق ہمیں کچھ پتا نہ چلا) [illegible] اب گاؤں میں یہی دستور ہے۔ اگرچہ اس کا خاوند ۵۴ برس کا تھا۔ لیکن وہ چالیس برس سے ایک دن بھی بڑا نہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کی [illegible] سے بے تکلفی در نرمی ٹپکتی تھی۔ اور جب ہم اس کی گھریلو زندگی کے متعلق [illegible] رہے تھے۔ تو اس کا مردانہ داڑھی والا چہرہ سراسر نسوانی [illegible] کا منظر بن جاتا تھا۔ گاؤں میں عورتوں کے لئے یہ دستور ہے کہ وہ بچے کے پیدا ہونے کے بعد چالیس دن تک آرام لیتی ہیں۔ اور بالکل کوئی کام نہیں کرتیں۔ ماں اور بیٹی دونوں نے ایسا ہی کہا تو جب [illegible] اس کے پہلوٹھی کے بچے کے متعلق دریافت کیا تو وہ اچھل پڑی اور ایک [illegible] جو صحن کو [illegible] تقسیم [illegible] دونوں بازو ان لڑکے اور لڑکیوں کی طرف بڑھا [illegible] تھا۔ اور چھوٹا سا [illegible] لیکر آئی [illegible] اس کا بچہ [illegible] تالی بجاتے ہی اس کے چہرے پر تبسم [illegible] اور اس کی آنکھوں کی پتلیاں خوشی سے ناچنے لگیں۔ یہ [illegible] اور خوبصورت [illegible]

ماں برف سی سفید روئی کات رہی تھی۔ اور بیٹی اپنے بچے کو گود میں نچا رہی تھی۔ اور اُن کی پشت کی جانب چھوٹے صحن کی کیچڑ سے لپی ہوئی اونچی صاف ستھری دیوار تھی۔ اور اس کی چوٹی پر پچاس لڑکے لڑکیاں رنگا رنگ لباس میں تھے۔ بعض جوشِ مسرت سے چہک رہے تھے۔ باقی عالمِ محویت میں بے خود تھے۔ اور بہت سے اُن اُپلوں کی فصیل پر جھکے ہوئے تھے۔ جو دھوپ میں سوکھ رہے تھے۔ ماں یا بیٹی دونوں میں سے کسی نے بھی بچہ جنتے وقت تکلیف نہ اُٹھائی تھی (سارا معاملہ دو یا چار گھنٹے کا تھا) اسمیں شاذ ہی اس سے زیادہ وقت لگتا ہے۔ اس کی مدد کے لئے گاؤں کی دایہ وہاں موجود تھی۔ وہ عین نازک وقت میں کچھ زیادہ مدد نہیں دے سکتی۔ لیکن وہ جانتی ہے کہ اس کے بعد کیا کرنا چاہیئے۔ ماں نے اپنے بچے کو ۲½ سال تک دودھ پلایا۔ اور بیٹی نے ۱¾ سال تک۔ میں نے پوچھا " یہ فرق کیوں ہے"؟ اس نے کہا کہ " لڑکا زیادہ پیارا ہوتا ہے"۔ سارجنٹ نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ لڑکا بڑا ہو کر زمین کا مالک بنے گا۔ خواہ کچھ بھی ہو محض یہی فرق سمجھا جاتا تھا۔ میں نے ماں سے دریافت کیا کہ تمہارے خیال میں کتنے بچے کافی ہیں؟ اس نے جواب دیا " دو"۔ اسی صورت میں ان کی دیکھ بھال کی جا سکتی ہے۔ اب میں نے بیٹی کی طرف مخاطب ہو کر کہا اور تمہارا کیا خیال ہے۔ اس نے ایک لفظ میں جواب دیا۔ " ایک" اور اسکے ساتھ ہی اپنے خوبصورت نیم برہنہ پہلوٹھی کے بچے کو اپنے سامنے نچایا۔

ماں پانچ بجے اُٹھتی ہے۔ اور سب سے پہلا یہ کام کرتی ہے کہ اُن دو گایوں اور بھینس کے آگے چارہ ڈالتی ہے۔ جنہوں نے گھر والوں کے ساتھ صحن میں حصہ لیا ہوا ہے ان کا تھان نہایت خوبصورتی سے صاف کیا ہوا ہے۔ اس کے بعد منہ دھوئے جاتے ہیں دہانی تو کر لاتا ہے، اور ایک یا دو گھنٹے دودھ بلونے میں صرف کئے جاتے ہیں۔ اور اسی طرح دن بھر ایک چھوڑ دوسرا کام ہوتا رہتا ہے۔ اور جب کوئی کام نہیں ہوتا تو وہ کاتتی ہے۔ اس کی انتہا کوئی نہیں ہے۔ کیونکہ ابھی دو اور بیٹیوں کی شادی کرنی ہے اور انکے کپڑے بنانے ہیں۔ ہر ایک کو پانچ جوڑے ملیں گے۔ جن میں تین گھر تیار کئے جائیں گے اور دو خریدے جائیں گے۔ اُن میں جوڑوں کی تیاری میں چھ ماہ لگ جائیں گے۔ بڑی لڑکی کی شادی پر کچھ زیادہ خرچ نہیں اُٹھانا پڑا تھا۔ زیورات پر کچھ نہ خرچ کیا گیا تھا۔ کیونکہ نئے خیالات کے مطابق نہ زیورات لئے گئے تھے اور نہ دئے گئے تھے۔ سب سے بڑا خرچ

مہمانوں کی خاطر تواضع تھی۔ اور قرض محض جنس کی صورت میں مثلاً گھی وغیرہ وغیرہ پڑوسیوں سے لیا گیا تھا۔ اور بعد میں واپس دے دیا گیا تھا سارجنٹ کفایت شعار شخص ہے۔ اور ۲۵۔ ایکڑ معمولی زمین کا مالک ہونے کی صورت میں اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ محتاط رہے۔ ساس نے اپنی بڑی لڑکیوں کو تعلیم نہیں دلوائی۔ لیکن چاہتی ہے کہ سب سے چھوٹی لڑکی کو تعلیم دلائے موجودہ زمانے کی یہ ایک نمایاں مثال ہے۔ اس نے کہا کہ نئے خیالات پیدا ہو گئے ہیں۔ لیکن نفلظہی ایک تبدیلی ایسی تھی۔ جسے اس نے تسلیم کیا۔ اور اس نے صاف لفظوں میں کہا کہ میری بیٹی مجھ سے زیادہ آزاد نہیں ہے۔ اور اس کے وہی خیالات ہیں۔ جو میرے اور وہ اتنی ہی محبت کرتی ہے جتنی کہ میں۔ گھر کے باہر وہ بہت کم کام کرتی ہیں۔ لیکن اندر ہر چیز کو شیشے کی طرح صاف ستھرا رکھتی ہیں۔ اور بھنگی محض وہ کوڑا کرکٹ اٹھانے کا کام کرتا ہے اور جو ہر روز ایک کونے میں ڈھیر کر دیا جاتا ہے۔ ماں اس تمام غلے پر قابو رکھتی ہے۔ جو گھر میں صرف ہوتا ہے۔ اگرچہ سارجنٹ باقی ماندہ غلے کو فروخت کر دیتا ہے۔ لیکن وہ فروخت کرنے سے پہلے اسکی رائے لے لیتا ہے۔ یہ گھر مسرت بخش تھا۔ ہر ایک کمرے میں پلستر کیا ہوا تھا۔ آرائش سادہ تھی۔ اور اس سے بڑھکر یہ کہ کھڑکیاں کافی رکھی ہوئی تھیں۔ اور تمام برتن اور توانگاریاں نیچے رکھے ہوئے باترتیب صندوقوں پر نہایت خوبصورت قطاروں میں ترتیب دیئے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ سے سادگی اور خلوص کی بو آتی تھی۔ خواہ کوئی سارجنٹ کی طرف دیکھے یا اسکی بیوی کی محجوبانہ دھیمی دھیمی آواز کو سنے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دولے ہوں دلوں کی شادی کی گئی تھی۔

پرانی تہذیب اور ملازمت

میں اس ذیلدار کی ہمراہی میں گھوڑے سوار چلتا رہا۔ جو با وجود ۷۰ سال کا ہونے کے اپنے آپ کو اتنا سیدھا رکھتا تھا۔ جتنا کہ وہ پچاس برس سے زیادہ گذرے لارڈ رابرٹس کے ساتھ کابل جاتے وقت رکھتا تھا۔ وہ ایک سکھ ہے۔ اور جوانمرد جاٹوں کی نسل میں سے ہے۔ اور اس کا دادا اور باپ دونو پرانی تہذیب کے قابل ستائش نمونے تھے۔ اس کے دادا کے چال چلن میں خصوصاً بیباکانہ صداقت تھی۔ جس کی تشریح مندرجہ ذیل واقعہ سے ہوتی ہے۔ اس کا ایک انگوٹھا خمیدہ تھا۔ جسے وہ آسانی سے حرکت نہ دے سکتا تھا۔ ایک دن اس سے دریافت کیا گیا

نکلنے میں ان کی مدد کریں۔ اس میں ایک خاص وصف یہ تھا۔ کہ درختوں کا بہت دلدادہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بنیا درخت لگانے یا کسی پودے کو سیدھا کئے بغیر کبھی کسی گاؤں میں نہیں گیا۔ اور جب وہ مرا تو اس کے درختوں کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی ممکن ہے یہ اعداد فرضی ہوں۔ لیکن اس کے پوتے۔ نے مجھے یقین دلایا ہے کہ جب وہ سنگھپور آیا تھا تو یہ علاقہ ہتھیلی کی طرح صاف تھا۔ اور جب اسے چھوڑا تو یہ کیکر، شیشم اور پھلاہی کا باغ تھا۔

ایسا اچھا جاگیردار فرض کی جانب سے لاپرواہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر وہ دیکھتا کہ اسکے آدمیوں میں سے کوئی شخص بال بال قرض میں پھنسا ہوا ہے۔ تو وہ اس وقت تک چین نہ لیتا۔ جب تک کہ حسابات تسلی بخش طور پر صاف نہ ہو جاتے۔ وہ قرضخواہ کو صرف اسی رقم کا مطالبہ کرنے دیتا جو جائز ہوتی۔ لیکن مقروض کو بھی مجبور کرتا کہ وہ جو کچھ فروخت کر سکتا ہے کرے۔ یہاں تک کہ اپنے مویشی بھی! اور اگر اس پر بھی رقم اتنی نہ ہوتی کہ حساب صاف ہو جائے۔ تو وہ بقایا رقم اپنے پاس سے ڈال دیتا۔ اس کے بعد صحت کی باری تھی۔ وہ گاؤں کے ۵ برس سے لیکر ۲۰ برس تک کے لڑکوں کی ایک فہرست رکھتا تھا اور برسات کے دنوں میں وہ ان سب کو دن میں ایک بار اپنے سامنے بلواتا اور گڑ۔ گھی اور پیاز کی ایک ایک خوراک دیتا۔ تاکہ وہ بخار سے محفوظ رہیں۔ اس کے حسابات سے پتہ لگتا ہے۔ کہ اس طرح اسے ہر سال ۱۲ سے لیکر ۱۶ کنستر تک گھی اور ۲۰ من گڑ خرچ کرنا پڑتا تھا۔ ایک اور پہلو سے بھی وہ اپنے زمانے کے لوگوں میں پیش پیش تھا۔ اور وہ یہ کہ وہ بچپن کی شادی کو اسقدر برا سمجھتا تھا۔ کہ وہ سترہ برس سے کم عمر کے لڑکے اور چودہ برس سے کم عمر کی لڑکی کی شادی سے کوئی سروکار نہ رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ انہیں مبارکباد بھی نہ دیتا تھا۔

لیکن اسکی حددرجہ ہردلعزیزی کا باعث وہ احساسات تھے۔ جو وہ ملازمین کے لئے رکھتا۔ جب کبھی وہ کہیں جاتا تھا وہاں پہنچنے پر اس کا پہلا کام یہ ہوتا کہ وہ یہ دیکھے کہ اس کا نوکر آرام دہ گھر میں رہتا ہے۔ (اب بھی ایک لازمی احتیاط ہے) اور کھانا کھاتے وقت وہ اسے اپنے پاس بٹھا لیتا اور اپنی تھالی اس کے آگے سرکا دیتا تاکہ ان میں کسی قسم کا امتیاز باقی نہ رہے۔ وہ کہا کرتا کہ اس آدمی کو جو پیدل چلتا ہے۔ سواری کرنے والے کی نسبت

زیادہ خوراک درکار ہے۔ گاؤں کے کمیتوں میں سے وہ دھوبی اور بھنگی کو سب سے بڑا درجہ دیتا تھا۔ کیونکہ انسان اور اسکی جائے رہائش کو صاف رکھنے میں اُن کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ اور جب ان میں سے کوئی اُسے ملنے کیلئے آتا تو وہ پہلے اسکی مزاج پُرسی کرتا گاؤں کے بھنگیوں میں سے کم از کم ایک کو یہ غیر معمولی مدار حاصل ہوتا۔ اس نے زمین کا اتنا اچھا انتظام کیا ہوا تھا۔ اور اسکی اتنی عزت کی جاتی تھی۔ کہ قریب وجوار کے لوگ اسے چوہدری کہتے تھے۔ ایک دن سردار نے اسے کھاد اکٹھا کرتے اور اُٹھاتے ہوئے دیکھا۔ اس نے پوچھا کہ جب اسکی ضرورت نہیں ہے تو تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ اس پر اسے یہ جواب ملا۔ کہ اگر میں یہ کام نہ کروں جو میرا اپنا کام ہے تو مجھے نجات دکھتی) نہ ملیگی اسی خیال کے مطابق رنجیت سنگھ کے مسٹر کی بیوی جو گاؤں میں رہتی تھی۔ باوجود خوشحال ہونے کے ہر روز کسی نہ کسی گھر پانی کا گھڑا لے جاتی تھی۔ ان تمام باتوں میں سردار مسٹر اور بھنگی نے اس ہندو وانہ عقیدہ کے مطابق عمل کیا ہے۔ جس کی رو سے ذات کی بنیاد اپنی مرضی پر نہیں۔ بلکہ اپنے فرض اور اس بات پر ہے۔ کہ تمام لوگوں کو وہ کام کرنا چاہیئے۔ جو ان کے آبا و اجداد نے اُن سے پہلے کیا ہی۔ اور اسے خدمت سمجھ کر بجا لانا چاہیئے۔ اور یہی پرانی تہذیب کا نچوڑ ہے۔ اور نئی تہذیب پرانی سے بہتر کوئی بات نہیں ہے۔

۱۶ مارچ۔ ڈیرہ بابا نانک سے کلانور۔ (۸ میل)

شام کو دیر میں کلانور پہنچنے پر مجھے وہاں کی چھ امداد باہمی کی انجمنوں میں سے ایک کے ممبروں نے گھیر لیا۔ اور مجھے کہا کہ میں ایک چھوٹی لائبریری کا جسے انہوں نے حال ہی میں شروع کیا تھا۔ افتتاح کروں۔ میں ایک ایسی غیر معمولی درخواست کو رد نہ کرسکا۔ کچھ اس لئے بھی کہ یہ ایسی چیز سے تعلق رکھتی تھی۔ جس میں میں خود دلچسپی رکھتا تھا۔ اس سے پہلے کہ یہ رسم ادا کی جائے۔ ہلکا ہلکا اندھیرا چھا گیا تھا۔ لیکن اس نے ایک طویل سپاسنامہ کے پیش کئے جانے اور اس کے بعد ایک نظم کے پڑھے جانے میں کوئی مزاحمت نہ کی۔ جس میں مجھ جیسے حد سے زیادہ اثر پذیر شخص کا نام بار بار آیا۔ آخرکار ہم لائبریری ہی میں چلے گئے۔ یہ بازار میں ایک کمرے میں تھی۔ جو ۱۰ فٹ لمبا اور چھ فٹ چوڑا تھا۔ اور اب حقیقی معنوں میں اس کا افتتاح کرنے کیلئے اسے رسم ادا کرنے کی خاطر ایک لمحہ کیلئے بند کر دیا گیا تھا۔ میں نے ایک بڑا تختہ جس پر لائبریری کا نام لکھا ہوا تھا۔ ایسی میخوں پر لٹکایا

لٹکایا جنہوں نے اسے تھامنے سے جواب دیدیا۔ البتہ اس وقت اندھیرا ہو گیا تھا۔ کہ اس قسم کی خرابی صاف طور پر معلوم نہ ہوتی تھی۔ میرے دو دوروں میں یہ چوتھی لائبریری ہے۔ جو میرے دیکھنے میں آئی ہے۔ اور یہ نئی تہذیب کی بہترین علامات میں سے ہیں:۔

۷ مارچ۔ کلانور سے ٹرمو براستہ شاہپور (۱۶ میل)

یہ ایک طویل گرم دن تھا۔ جسکی ابتدا ۹ بجے سے پہلے اور انتہا چار بجے کے بعد ہوتی تھی۔ اسکی ابتدا ہم نے اس جگہ سے کی جہاں تیرہ برس کی عمر میں نا خواندہ اکبر کو جو کہ تیمور اور چنگیز خاں کی اولاد میں سے تھا۔ ہندوستان کا شہنشاہ بنایا گیا۔ (اس قدر بڑے واقعہ کیلئے کس قدر معمولی جگہ تھی) وہاں سوائے تین فٹ اونچے چوڑے چبوترے کے جس کے ایک طرف پلستر کی ہوئی اینٹوں کی لمبی ٹھوس نشستگاہ بنی ہوئی ہے۔ اور کچھ نہیں ہے۔ یہ شہنشاہ کا تخت تھا۔ اور اس کے سامنے اسی چبوترے کے اندر چار فٹ مربع ایک گہرا حوض ہے۔ قریب ہی آموں کے چند درخت سنتریوں کی طرح کھڑے ہیں۔ اور ان کے سائے میں ایک کنواں ہے جس کے متعلق یہ کہا گیا کہ اس پر بارہ رہٹ چل سکتے ہیں۔

حکومت جمہوری

ہم ایک گاؤں لکھن خورد کی بنکنگ یونین کا معائنہ کرنے کے لئے ٹھیرے۔ ۸۰ حصہ دار حاضر تھے۔ اور ان میں دیہاتی بنکوں کے ۱۸ صدر بھی شامل تھے۔ ابھی ابھی اخبار میں ایک مشہور سیاست دان کا دارالعوام میں دیا ہوا یہ بیان پڑھکر کہ حکومت جمہوری کی تحریک اب دیہات کے کونے کونے میں جا پہنچی تھی۔ میں نے سوچا کہ میں یہ معلوم کروں گا۔ کہ ان حصوں میں یہ کہاں تک درست ہے؟ حاضرین میں سے دو ایک صدر دوسرا ایک تعلیمیافتہ ساہوکار اصلاحات کی سکیم سے بخوبی واقف تھے۔ میں نے دوسرے ۸۶۔ آدمیوں سے دریافت کیا کہ تم لاہور کی مجلس قانون ساز کے متعلق کیا جانتے ہو؟ ایک شخص نے اور محض ایک شخص نے یہ کہا۔ کہ یہ قوانین بنانے کے لئے ہے۔ دوسرے لوگوں میں سے جنہوں نے رائے دینے کی جرأت کی ایک نے کہا۔ کہ یہ حفظ امن کیلئے ہے۔ دوسرے نے کہا ملک کے کام کیلئے تیسرے نے کہا۔ کاشتکاروں کی بہتری کیلئے اور چوتھے نے تیر نشانے کے قریب قریب مارتے ہوئے کہا

کہ اس امر پر بحث کرنے کیلئے کہ گورنمنٹ کو ابھی کیا کام کرنا ہے۔ ساتھ ہی اس نے کہا کہ ہم میں اتنی ہی سمجھ ہے۔ صدر اور ساہوکار کے سوا کسی کو اس بات کا ذرا بھی خیال نہ تھا۔ کہ کونسل کتنے افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ اور جو تیاس انہوں نے دوڑایا وہ یہ تھا کہ چار ہیں۔ جب میں نے یہ تسلیم کیا۔ کہ میں ان میں سے کوئی بات بھی نہ جانتا تھا۔ تو لوگ بہت ہنسے۔ یہ وہ شخص جوان جوابات کو سنتا۔ یہ بخوبی فرض کر لیتا۔ کہ ان میں سے کسی کو بھی کونسل کیلئے رائے دینے کا حق نہیں ہے۔ لیکن جب رائے دہندگان کو اپنے ہاتھ اٹھانے کیلئے کہا گیا۔ تو ۲۶ ہاتھ باہر نکل پڑے۔ ان میں سے صرف تین اشخاص اسمبلی یا کونسل آف سٹیٹ کیلئے رائے دے سکتے تھے۔ اور ان میں سے ایک شخص یہ جانتا تھا۔ کہ اسمبلی بڑے قوانین بناتی ہے۔ اور کوئی بھی دونو کے متعلق کچھ نہ جانتا تھا۔ ایک نے بہانہ کے طور پر کہا کہ ہم زمیندار ہیں۔ اور کچھ واقفیت نہیں رکھتے۔ جب وزیروں کے متعلق سوالات شروع ہوئے۔ تو قریب قریب وہی عالمگیر جہالت دیکھی گئی۔ یونین کا ایک ڈائرکٹر (اس کا ایک بھائی عدالت عالیہ میں ملازم ہے) جانتا تھا کہ وزیر تین ہیں۔ اور عزرا یخی نے بتایا کہ ان کا کام یہ ہے۔ کہ جو حکم اوپر سے آئے اُسے لوگوں تک پہنچا دیں اس بات پر صدر بظاہر اس امر کا احساس کر کے کہ زمینداروں کو معافی مانگ لینے کی ضرورت ہے کھڑا ہو گیا اور کہا۔ کہ وہ لوگ جن کے شکم پُر ہیں۔ ان باتوں کو جان سکتے ہیں۔ لیکن وہ جن کی قسمت میں فاقے اُٹھانا لکھا ہے۔ نہیں جان سکتے۔

یہ واقعہ سے ظاہر کرنا مقصود ہے۔ کہ یہ پنجاب کی بہترین بنکنگ یونین کا حال بتاتا ہے (تین سال گذرے سائمن کمیشن نے اسے دیکھا تھا) اور یہ کہ مجمع میں دیہاتی بنکوں کے صدر اور ان کی کمیٹیوں کے ممبر شامل تھے۔

امداد باہمی میں پیش روی کرنیوالا شخص

یونین کی بنا اس کے صدر چوہدری اللہ رکھا نے ڈالی تھی۔ یہ ان لوگوں میں سے ہے جنہوں نے پنجاب میں امداد باہمی کی تحریک جاری کی ہے۔ اور اسکی وجہ سے اپنی حالت بھی سنوار لی ہے وہ ایک نمونہ کا چھوٹا جاگیردار ہے۔ اور اگرچہ وہ قد میں چھوٹا ہے لیکن اس کا جھریوں والا چہرہ چمکدار آنکھیں ہر جگہ نظر پڑتی ہیں۔ وہ ۱۸۷۱ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۲ برس کی عمر میں اس کے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اور اپنے کنبے کی مانند وہ نور کا خرچ نہ اٹھا سکنے کے سبب اس نے سکول بالکل چھوڑ دیا

وہاں تین سال رہنے کے بعد وہ محض پڑھ سکتا تھا۔ لیکن آگے پڑھنے کا مستحکم ارادہ رکھنے کی وجہ سے اس نے اپنے آپ کو تعلیم دی۔ اور اپنے ارادے کو انتہائی کامیابی سے ایسا کیا کہ اس نے کئی سال تک دیہاتی بینک اور یونین کے حسابات رکھے۔ اسے صرف ۴½ ایکڑ زمین باپ سے ترکے میں ملی۔ لیکن اس نے اور اجارے پر لے لی۔ اور سخت محنت و انتہائی کفایت شعاری کی بنا پر اس نے ۱۰۰ روپیہ فی سال بچایا۔ اور ۱۹۰۳ء میں ۱۲۰۰ روپے کے عوض ۱۲ ایکڑ زمین خرید لی۔ اس نے کہا کہ میری خوش نصیبی کا بڑا سبب یہ تھا کہ میں ۱۲ سال تک ایک ہی بیلوں کی جوڑی سے کام لیتا رہا۔ لیکن اس پر بھی یہ بڑی بھاری کامیابی تھی۔ کیونکہ اسے ایک بوڑھی ماں۔ ایک بیمار ہمشیرہ اور ان کے ساتھ ہی بیوی اور ایک بچے کا خرچ اٹھانا پڑتا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں اُسے گاؤں کا نمبردار بنا دیا گیا تھا۔ اور اس چیز نے امداد باہمی سے اس کا تعلق پیدا کر دیا۔ جو ۱۹۰۶ء میں شروع کی گئی۔ اس سال اس نے اور نو اور شخصوں نے (کم سے کم ممبروں کی تعداد نو ہے) اس امر پر اتفاق کیا کہ ایک دیہاتی بینک قائم کرنا چاہیئے۔ لیکن جب کام بننے کا موقع آیا تو وہ نو اس عالمگیر ڈر سے کہ سرکار ہمارا روپیہ لوٹ لیگی۔ پیچھے سرک گئے۔ اس نازک وقت میں اسے ۵۰۳ روپے کا قرضہ رہن واپس مل گیا۔ اور اس نے یہ تمام روپیہ بینک میں جمع کرانے کیلئے پیش کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ کہا۔ کہ ان تمام لوگوں کے حصے کی پہلی قسط جو اس میں شامل ہونگے۔ میں دوں گا۔ اس طرح روح پھونکی جانے پر دوسروں نے پیچھے کھسکنے والوں کی جگہ لے لی۔ اور بینک کھول دیا گیا۔ اگلے سال انہوں نے ۹ فیصدی شرح پر ۲۵۰ روپے بطور سرکاری قرض لئے۔ اور ایک سال بعد اللہ رکھا نے اور رقم جمع کرائی۔ جو قرضہ زمین کا ثمرہ تھی۔ اور اس طرح سے تھوڑا تھوڑا کر کے بینک بڑھتا گیا۔ ہر صبح کو وہ کھیت کے کام میں مشغول رہتا۔ لیکن دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد جب دوسرے آرام لیتے تو وہ امداد باہمی کی تعلیم کا پرچار کرتا پھرتا۔ اس کے جوش کی یہ حالت تھی کہ اس کے پڑوسی کہتے تھے "کہ امداد باہمی نے اس پر جادو کر دیا ہے"۔ ۱۹۱۴ء میں قرب و جوار کے دیہاتی بینک ملا جلا کر ایک بینکنگ یونین بنا دی گئی۔ تاکہ توازن قائم رکھنے کے لئے مرکز کا کام دے۔ اور بیرونی دنیا سے مالی تعلق قائم رکھے۔ اب یہاں ۴۱ سوسائیٹیاں ہیں۔ اور یونین کا جمع شدہ روپیہ قریباً ۱ ½ لاکھ ہے۔ جس میں سے سب سے زیادہ رقم سوسائیٹیوں سے آتی ہے۔ لیکن سب سے بہتر بات یہ ہے۔ کہ یونین کے چاروں طرف پانچ پانچ میل کے فاصلے تک ۸۵ فیصدی گھروں کے مالک امداد باہمی کے ممبر ہیں۔ اللہ رکھا اب پانچ مختلف قسم کی انجمن ہائے امداد باہمی کا صدر ہے۔

اور امداد باہمی کے دو صوبجاتی اداروں کا ڈائرکٹر ہے۔ وہ ایک مقامی پنچایت کا بھی صدر ہے۔ صوبے بھر میں اس سے بہتر اور زیادہ سرگرم معاون امداد باہمی ملنا مشکل ہے۔

جب ہم اپنے صابر گھوڑوں پر پھر سوار ہوئے تو بہت گرمی تھی۔ کھیت سنسان تھے۔ لیکن رہٹ ابھی چل رہے تھے۔ ان میں کوئی ترنم نہ تھا۔ کیونکہ اس علاقے میں مٹی کی ٹینڈوں کو نفایت شعارانہ مگر بدنما لوہے کے ڈولوں سے بدل لیا گیا ہے۔ البتہ نیل کنٹھ کی ترنم ریز آواز ضرور سنائی دیتی تھی۔ اور راستے کے ساتھ ساتھ لگی ہوئی کیکر کی قسم کی جھاڑیوں سے خوشبو بھی آ رہی تھی۔ ہر طرف گندم ہی گندم پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس کا گہرا سبز رنگ نیلی نیلی ندیوں کے مقابلہ میں جہاں سنی کے پھول آ رہے تھے بھلا معلوم ہوتا تھا۔ سب کو فیض پہنچانیوالے سورج کے نیچے واقع ہونے کی وجہ سے تمام کی تمام زمین مسرت و کامرانی سے سرشار معلوم ہوتی تھی۔ گرمی شدت کی تھی۔ اور مجھے اُن لوگوں پر رشک آتا تھا۔ جو قریب قریب ننگی حالت میں کنوئیں پر غسل لے رہے تھے۔ اور ان کے ہلکے بھورے جسم پر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد دھوپ پڑتی تھی۔ بیر کے عظیم الشان درخت آرام اور ٹھنڈک کے متلاشیوں کے لئے گہرا سایہ دے رہے تھے۔ اور جن گاؤں کے نزدیک سے ہم گذرے۔ ان کے صحنوں میں عورتیں کاتنے میں مصروف تھیں۔ چار بجے ہم نے برف سے سفید خیمے دریائے راوی کے کنارے دیکھے۔ اور یہ ایک ایسی پایاب جگہ کے قریب تھے۔ جہاں ۱۸۵۷ء میں تمام رات سفر کرنے کے بعد نکلسن نے باغیوں کی ایک بڑی جماعت کو شکست دی۔ جو سیالکوٹ میں خونی کارنامے کرنے کے بعد دہلی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ غروب آفتاب کے وقت میں نے غسل لیا۔ اور جب میں غسل لے رہا تھا۔ تو بھینسوں کا ایک گلہ ریتلی گرد کی ہلکی سفید دھندمیں دریا کی طرف آیا۔ اور اندر کودتے ہی کم گہرے پانی میں شاہانہ طور پر حرکت کرنے لگا۔ ان کی توندیں سیاہ تھیں۔ اور وہ مغربی آسمان کے مقابلے میں چمک رہی تھیں۔ اس وقت دیوی (اسکی دیوی جیسی صورت کی وجہ سے میں اسے ہمیشہ ایسا ہی کہتا رہا ہوں) اس بادل میں سے جس نے اسے تمام دن چھپائے رکھا تھا۔ بڑی سایہ دار اور برف سی سفید نمودار ہوئی۔

۱۸ مارچ۔ ٹریمو سے کوٹ نائینن (۲ میل)

آج صبح جب ہم آٹھ بجے روانہ ہوئے تو دیوی اپنی بعید الفہم گہرائیوں میں چھپ گئی۔ شبنم آلود گیہوں میں راستہ نکالتے ہوئے ہم بہت جلد دریا کے پاس پہنچ گئے۔ اور ہمارے گھوڑے پانی میں

گذرتے ہوئے جو شکل سے اُن کے گھٹنوں تک تھا۔ چھپ چھپ کرنے لگا۔ لیکن جب ہم اسکے معاون دریائے اوجھ تک پہنچے۔ جس میں سے کسی نہر نے چھید نہیں کیا تو ہمیں اپنی ایڑیوں کو خشک رکھنے کے لئے انہیں پیچھے اُٹھانا پڑا۔ دریا کے درمیان چھپ کی آواز بہت زور سے آئی اور پیچھے مُڑ کر دیکھا تو میرے ساتھیوں میں سے ایک گندے تھوڑے پانی میں پیٹھ کے بل پڑا تھا۔ اور اس کا گھوڑا اس کے پاس چکر کاٹ رہا تھا۔

راجپوت دُلہنیں

اب ہم شکر گڑھ تحصیل میں تھے۔ اور چند میل تک نہایت سرسبز گیہوں میں سے چلنے کے بعد اس جگہ پہنچ گئے۔ جہاں ایک اور بینکنگ یونین قائم تھی۔ ہم نے دیکھا کہ تقریباً چالیس ممبران امداد باہمی صدر کے باغ میں جمع تھے۔ یہ نہایت خوشنما باغ تھا۔ ایک آڑو کے درخت میں ابھی تک پھول آئے ہوئے تھے۔ انار کے درختوں میں شگوفے پھوٹ رہے تھے۔ اور اس آم کے درخت پر جس کے نیچے ہم بیٹھے تھے۔ بُور آنیکو تھا۔ اطراف مکمل حالت میں تھیں۔ اور ہوا ٹھنڈی تھی ہر ایک چیز کا نقشہ اتنا اچھا بنایا تھا کہ رسمی طور پر معائنہ کرنے کی نسبت اس کے متعلق دوستانہ گفتگو کرنے کو جی چاہتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چار گھنٹے تک گفتگو ہوتی رہی۔ ہم نے پہلے پہل انکی رسومات شادی کا ذکر چھیڑا۔ حاضرین میں سے اکثر ہندو راجپوت تھے۔ اور یہ ایک ایسی قوم ہے۔ جو بہت سے احتیاط سے ترتیب دیئے ہوئے فرقوں میں منقسم ہے۔ ہر شخص کی آرزو یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی اپنے سے اعلٰی فرقے والے سے کرے۔ لیکن اس کیلئے اسے ۱۰۰۰ روپیہ سے لیکر ۲۰۰۰ روپیہ تک دلہن کی قیمت کے طور پر ادا کرنا پڑتا ہے۔ جواب قیمتوں کے کم ہو جانیکی وجہ سے ۵۰ سے لیکر ۵۰۰ روپیہ تک کم ہو گیا ہے۔ اتنی بڑی رقم عام طور پر ضرور ادھار لی جائیگی اور اس کا کچھ حصہ تو بہر کیف لیا جائیگا۔ اس کے برعکس یہ ہے کہ جو شخص روپیہ کمانا چاہتا ہے (اور کوئی لفظ استعمال نہیں کیا جاسکتا) اپنی بیٹی ایک شخص سے بیاہتا ہے۔ جو ادنٰی فرقے سے تعلق رکھتا ہے ۵ فیصدی کے علاوہ باقی سب (یہ بتایا گیا تھا) ایک نہ ایک طریق پر عمل کرتے ہیں۔ یہ بات مسلمہ طور پر باعثِ شرم تھی۔ لیکن ایک فرد اسے بدلنے سے عاجز تھا۔ اس کا اقدام تمام قوم کی طرف سے ہونا ضروری ہے۔ اور یہ ایسے افراد کے ساتھ جاتنے بڑے رقبے میں پھیلی ہوئی ہو۔ جس میں قریب کی جموں ریاست بھی شامل ہو مشکل ہے۔ ایک اور بُری رسم (دختر کشی) کبھی یہاں عام تھی۔

لیکن پانچ برس گذرے۔ مہاراجہ جموں و کشمیر نے اس کے خلاف سختی سے قدم اٹھایا تھا۔ اور اب اس کا وجود جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے۔ نہ ہونے کے برابر ہے۔

زمینداروں کی تکالیف

صدر لے اس بات کے متعلق بہت کچھ کہا کہ کسانوں پر ٹیکس کا بھاری بوجھ ہے۔ میں نے پوچھا تم اسے کیسے کم کر دگے؟ اس نے کہا کہ گذشتہ ایام میں پنجاب ایک لیفٹنٹ گورنر ایک فنانشل کمشنر کے ماتحت ہوا کرتا تھا۔ اور اب یہاں ایک گورنر۔ دو ممبر۔ تین وزیر اور دو فنانشل کمشنر ہیں۔ اور کیا حالات پہلے سے بہتر ہیں۔ یا ابتر؟ اس نے طنزاً دریافت کیا۔ اور ساتھ ہی کہا۔ کہ وزیروں کی تنخواہ کم کر دینی چاہیئے۔ اور لگان میں تخفیف کرنی چاہیئے۔ میں نے کافی واضح طور پر بتایا۔ کہ اگرچہ ان کی تنخواہیں جو ۵۰۰۰ روپیہ ماہوار ہیں۔ جو کہ ۵۰۰۰ پونڈ سالانہ انگلستان کی وزارت کے بہت سے وزیروں سے بھی زیادہ ہے، اڑا دینے سے پانی کی شرح اور لگان کی رقم میں تخفیف نہ ہو سکے گی۔ جس کی سالانہ میزان تقریباً ۸ کروڑ روپیہ ہوتی تھی۔ کسی نے (اس دورے میں یہ پہلی ہی مرتبہ نہیں) اس سے کہیں زیادہ مؤثر علاج تجویز کیا۔ اور وہ یہ کہ تمام تنخواہوں میں کمی کر دینی چاہیئے۔ میں نے کہا کہ میں نے پہلے ہی یہ تجویز ایک اعلیٰ افسر کے سامنے پیش کی ہوئی ہے۔ اور وہ خود بھی رضامند تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر وہ دیہاتی کی ان تمام تکالیف کو دیکھیں جو میں نے گذشتہ تین ماہ میں دیکھی ہیں۔ تو ان میں سے اکثر رضامند ہو جائیں۔ اب ہم نے دوسری شکایت کو لیا۔ یعنی اس دقت کو لیا جو زمینداروں کو اپنے ان بیٹوں کیلئے ملازمت تلاش کرنے میں اٹھانی پڑتی ہے جنہیں وہ بہت زیادہ روپیہ خرچ کر کے تعلیم دلاتے ہیں۔ صدر نے کہا کہ کل شام جب میں یہاں بیٹھا تھا تو میں نے بہت شور سنا۔ ایسا جیسا کہ کسی بلوہ میں ہوتا ہے۔ ایک انٹرنس پاس لڑکا اپنے والد کو سزا دے رہا تھا۔ کیونکہ اس نے اسے ملازمت نہیں دلائی تھی۔ اور لوگ انہیں چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔ انٹرنس پاس زمیندار دھوبی کے کتے کی طرح نہ گھر کا ہوتا ہے نہ گھاٹ کا۔ زمیندار غریب ہیں اور انہیں کچھ نہیں ملتا۔ لیکن وہ لوگ جن کے گھر میں کھانے کو کافی ہے۔ خواہ وہ بیوقوف بھی ہوں انہیں عقلمند سمجھا جاتا ہے۔

ایک عالی ہمت کھتری

شام کو ایک صاف ستھرے چھوٹے چمکدار آنکھوں والے کھتری نے مجھے اپنا باغ دکھایا۔ اور کسی صورت میں بھی اس دورے میں یہ پہلا کھتری نہیں ہے جس کے پاس کسی قسم کی کوئی نہ کوئی چیز دکھانے کیلئے نہ ہو۔ وہ محکمہ نہر کے ایک افسر کا بیٹا ہے۔ ۱۹۱۷ء میں بی۔اے کرنے کے بعد وہ سر گیانشی سر پرتاب سنگھ کا پرائیویٹ سیکرٹری (منشیر خاص) بن گیا۔ اور ۱۹۲۴ء تک یہاں نہ آیا۔ اس وقت تک اس نے اس ۳۰۰ ایکڑ زمین کی طرف توجہ تک نہ دی۔ لیکن اب ان میں سے ۴۰ ایکڑ میں چار مزدوروں کی مدد سے وہ خود کاشتکاری کرتا ہے گیہوں کی قیمت کم ہونیکی وجہ سے وہ زمین کے زیادہ حصے میں تمباکو اور توریا لگاتا ہے۔ اس نے حال ہی میں تمباکو لگایا ہے۔ اسکی سب سے زیادہ خوشنما ملکیت ثمردار درختوں سے بھرا ہوا ایک باغ ہے۔ یہاں اس دیوی کا منظر شاندار ہوتا ہے۔ جو شام کی روشنی میں پھر نمودار ہوئی۔ اگرچہ بہت دھندلی نظر آرہی تھی۔ مقامی مڈل سکول کا ہیڈ ماسٹر ہمارے ساتھ تھا۔ میں نے یہ سنکر کہ وہ قریب وجوار کا رہنے والا تھا۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ یہ دیوی کیا کہلاتی ہے۔ اس کا بہترین جواب یہ تھا۔ کہ کوہ ہمالیہ۔ لیکن کسی اور مستحقق طبیعت والے نے آگے بڑھ کر کہا۔ "دیوی ماتا" اور یہ لاشبہ یہی اس کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اپنے برفانی بازوؤں کو پھیلاتی ہوئی میدانوں میں سے سیدھی اٹھکر اس تمام زمین پر جو اس کے پاؤں میں ہے مشفقانہ غور کرتی ہے۔

۱۹ مارچ۔ کوٹ نیناں سے شکار گڑھ (۷ میل)

ایک ہل میں پھنسا

یہ ایک نورانی صبح تھی اور باد نسیم چل رہی تھی۔ گیہوں کے سمندر میں میں آموں کے جھنڈ تاریک جزیرے معلوم ہو رہے تھے۔ اور دھوئیں چڑیوں کے سفید و سیاہ رنگ صاف آسمان کے مقابل میں چمک رہے تھے۔ بعض لوگ کھیتوں میں صبح کا دستی بیلچے بنا۔ شتہ کر رہے تھے۔ جوان کی بیویاں چمکدار پیتل کے برتنوں میں ان کے پاس لائی تھیں۔ اور ان کے کھانے کے وقت ان کے سامنے چار زانو بیٹھی تھیں۔ باقی لوگ اپنی بنجر زمینوں میں کپاس بیا

گیہوں کیلئے ناممکن ہے۔ جوار جلدی بونے کیلئے ہل چلا رہے تھے۔ ایک گھنٹہ پہلے جب کہ ابھی سورج نہ نکلا تھا۔ ان کی مویشیوں کو ہانکنے والی آوازوں نے مجھے نیند سے بیدار کر دیا تھا ہل چلانے والے کو جلد روانہ ہونا پڑتا ہے۔ کیونکہ اس علاقے میں بیل کے ساتھ بھینسے کو بھی ہل میں جوتا جاتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے۔ کہ اس کی قیمت اسی روپے کے جوڑی بیل کیلئے درکار ہوتی ہے۔ تیس یا چالیس روپے ہوتی ہے۔ اس کا عام استعمال اس بات کی علامت ہے۔ کہ زندگی کا معیار جو گنجان آبادی اور کم پیداوار کی وجہ سے قائم ہو گیا ہے۔ ادنیٰ ہے۔

راہگیر

سڑک پر لوگوں کی آمدورفت دیکھ کر آبادی کے گنجان ہونے کا پتہ لگتا تھا۔ نیلی بار کے علاقے میں کوئی شخص میلوں سفر کرتا چلا جائے۔ تو اُسے کوئی ذی روح نظر نہیں پڑتا لیکن یہاں ایک فرلانگ بھی مشکل سے گذرتا ہے۔ ہمارے راستے کے ملاقاتیوں میں سے ایک چماروں کا کنبہ تھا۔ جو باوجود اس کے کہ ماں کی گود میں بچہ تھا۔ اور باپ ایک پہلو میں چار برس کا بچہ اور دوسرے میں ایک حقہ اور پیٹھ پر کپڑوں کا گٹھڑ لئے ہوئے تھا۔ اس بات کی توقع لئے ہوئے تھا۔ کہ گوردا سپور پہنچنے کیلئے شام تک بیس میل کر لیگا۔ بچے نے اپنا بازو اپنے باپ کی پگڑی پر رکھ کر اپنا توازن قائم کیا ہوا تھا۔ اور اس کے اوپر سے وہیں خوش خوش دیکھ رہا تھا۔ یہ کنبہ دس ایکڑ زمین کی پیداوار پر گذارہ کرتا ہے۔ اور اس میں سے نصف انہیں اپنے جاگیردار کو دینی پڑتی ہے۔

پھر ایک عورت آئی جو اپنے بیٹے کو ملنے کیلئے جسے اس نے گاڑھے پسینے کی کمائی سے تعلیم دلائی تھی۔ پیدل گوردا سپور جا رہی تھی۔ جب اس کی عمر چند ماہ تھی۔ تو اس کا خاوند مر گیا تھا۔ بے باک و بے یار رہتے ہوئے بھی اس نے نہ صرف اس کی پرورش کی۔ بلکہ اسے تعلیم بھی دی۔ اور اب وہ گوردا سپور میں کلرک ہے۔ میں نے پوچھا "اماں یہ تم نے کیونکر کیا۔ اس نے کہا کہ میں نے دوسروں کا کام کر کے روپیہ کمایا۔ میں نے ان کا کھانا پکایا۔ ان کے برتن صاف کئے۔ اور ان کے کپڑے دھوئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ہمارے ملاقاتیوں میں سے بہت سے عدالتوں کو جا رہے تھے۔ ایک گاؤں کا ساہوکار تھا۔ جو اتنا ڈیلا اور مریل تھا۔ جتنا کہ اس کا چھوٹا بھورا ٹٹو جو اسے اُٹھائے ہوئے تھا۔ بارہ سال گذرے اس نے ایک

تو جیر کے خلاف ۲۰۰ روپے کی ڈگری لی تھی۔ اور اب کچھ وصول نہ ہونے کی وجہ سے عدالت جارہا تھا تا کہ اس کا آئندہ بارہ سال کیلئے اجرا کرائے۔ قرضخواہوں کی اس جماعت کی جو انتہائی مشکلات کے بعد اس رقم کا جو عدالتیں انہیں دلواتی ہیں۔ کچھ حصہ وصول کرتے ہیں۔ وہ ایک زندہ مثال ہے۔ اس کے برعکس ایک مثال مسلمان حجام کی تھی۔ جس کے ہاں ایک بیوی اور ایک بچہ تھا۔ بچہ سوکھ رہا تھا۔ (ایک پہلے ہی سوکھ گیا تھا اور مرگیا تھا) اور وہ اسے ہندوؤں کے ایک گاؤں میں لئے جارہے تھے۔ تاکہ اسکی پیٹھ کو آک اور گائے کے گوبر سے سینکا جائے۔ میں نے پوچھا تم یہ گھر کیوں نہیں کر لیتے؟ انہوں نے کہا۔ یہ گاؤں متبرک ہے۔ لیکن کبھی نہ کبھی ضرور کوئی پرہیزگار شخص یہاں رہا ہوگا۔

خوبصورتی کیا ہے؟

ہم آخر کار دریائے بیاس کے پاس آئے۔ سال اس حصے میں یہ محض ایک ندی ہے۔ لیکن برسات کے دنوں میں یہ اُن لوگوں کو غرقاب کیلئے کافی ہوتی ہے۔ جو اسے پایاب اترنا چاہتے ہیں۔ اس کی گذشتہ بھینٹ ایک ساہوکار تھا۔ جو عدالت کی طرف جارہا تھا۔ اس کے چوڑے ریتلے طاس میں سے اوپر کی طرف دیکھتے ہوئے نظر سیدھی پہاڑوں تک جا پہنچتی ہے۔ جہاں دیوی اپنی برفانی شان وشوکت لئے کھڑی ہے۔ میں اپنے ساتھیوں کی طرف مخاطب ہوا۔ اور کہا کیا تمہیں اس کی خوبصورتی کا احساس نہیں ہوتا۔ ایک مسلمان راجپوت نے کہا ہاں یہ خوبصورت ہے۔ یہ سرسبز علاقہ ہے۔ اور یہاں خوب بارش ہوتی ہے۔ جو کچھ ہمیں نظر آرہا تھا۔ وہ ایک دیوہیکل صورت تھی۔ جو نیچے خاکستری اور اوپر سفید رنگ لئے ہوئے تھی۔ لیکن وہ برسات میں جبکہ تمام پہاڑ سرسبز ہوتے ہیں وہاں ہو آیا تھا۔ اور اُسکی قوتِ یادداشت نظر سے تیز تھی۔ ایک ہندو راجپوت کا خیال بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا۔ اس نے کہا کہ یہ اس لئے خوبصورت ہے کہ ہمارے خویش واقارب وہاں رہتے ہیں۔ مسلمان نے اس پر سعدی کا یہ شعر مناسب طور پر ادا کیا۔

ے

زمین از تپ لرزہ آمد ستوہ
براو کوفت بردامنش میخ کوہ

اشتمال اراضی کیوں کر عمل میں آتی ہے؟

پنجاب میں امداد باہمی کا سب سے بڑا اعجوبہ اشتمال اراضی ہے۔ اس کے اثرات ہم نے دہلی کے قریب دیکھے۔ اور آج ہم نے ایک جھلک میں یہ دیکھا۔ کہ اسے کیونکر عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔ ایک نئی انجمن کے ممبر ہماری ملاقات کے لئے سڑک کے کنارے جمع تھے۔ چونکہ کام درحقیقت شروع تھا۔ اس لئے میں نے اُن سے کہا۔ کہ وہ کام کو اسی طرح جاری رکھیں۔ گویا کہ ہم وہاں موجود نہیں ہیں۔ پہلے پہل یہ بات بعض کو مشکل معلوم ہوئی خاص طور پر صدر کو۔ یہ بڑا تیز طرار تھا۔ اور میری طرف نظر جمائے رہتا تھا۔ لیکن جلد ہی وہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ اور آخرکار اس قدر جوش میں آ گئے۔ کہ بہت سے ڈاڑھی والوں میں سے سوائے ایک یا دو شخصوں کے کوئی بھی بالکل ہماری طرف نہ دیکھتا تھا۔ وہ تمام زمین پر کہنی سے کہنی اور ٹانگ سے ٹانگ ملائے ایک جمِ غفیر کی صورت نہایت ہی قریب قریب جکڑے بیٹھے تھے۔ ایک ہی نظر میں میں نے چھوت چھات کا جس کا ابھی تک اس علاقے کے ہندو راجپوتوں میں زور ہے مطلب سمجھ لیا۔ انہوں نے کہا۔ کہ جس شخص کی زندگی اس قدر مختلف ہو۔ اس کے بہت قریب بیٹھنا کون گوارا کر سکتا ہے۔ نصف دائرے کے وسط میں گاؤں کے حسابات کے کاغذات اور کپڑے کا بنا ہوا وہ نقشہ تھا جس پر گاؤں کے ۲۳ر۹۲۲ کھیت صاف صاف دکھائے ہوئے تھے۔ ۱۱۲۰ کھیتوں کو کم کر کے پہلے ہی ۵۰ بنا لیا گیا تھا۔ حیدر نے پھر گودرا سے جو ایک ادھیڑ عمر کا اور بڑا مربع شکل کا جھرّیوں والا چہرہ لئے ہوئے تھا۔ پوچھا کہ کیا تم اپنے بکھرے ہوئے کھیتوں کے عوض ایک خاص جگہ ایک ہی میل کے کھیت لینا چاہتے ہو؟ اس نے انکار کر دیا۔ پاس والوں نے دباؤ ڈالا۔ لیکن وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ اس کی زمین کے متعلق چند بُرے کلمات کہے گئے۔ اس نے کہا کہ میری زمین کس طرح بُری ہو سکتی ہے۔ جبکہ میں نے اسے ۰۰ روپے کے عوض رہن رکھا ہوا ہے۔ وہ غصے میں آ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور چھوڑ کر چلا جاتا۔ اُس کے دوست اُسے "سلوک نال"۔ "انصاف نال" خوشامدانہ باتیں سنا کر اس کی جگہ واپس لے آئے مطلب یہ تھا کہ دونوں باتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ایک پڑوسی نے نہایت آہستگی سے اس کا بازو تھام کر اور دوسرے نے اسے کلائی سے پکڑ کر بحث کو پھر تازہ کیا۔ اور کہا کیا

پھر تم یہ لو گے؟

یہ اچھی زمین ہے۔ تمہاری زمین کی طرح ناہموار نہیں ہے۔ غصّے کی ایک اور چنگاری اُٹھی اور اس نے کہا "میری زمین ایسی ناہموار نہیں ہے۔ جیسی دوسرے لوگوں کی۔ میں نے بہت سی مینڈھیں بنائی ہیں۔ میرے ہاتھ کی طرف غور کرو (اس نے اپنی ہتھیلی اوپر رکھتے ہوئے اپنا ہاتھ باہر نکالا) اور دیکھو کہ اس کتنی گانٹھیں (چندیاں) ہیں۔ جب تم لوگ ڈیرے میں بیٹھ کر حقّے کے دم لگاتے ہو تو میں مینڈھیں بناتا ہوں۔ تمہارے کھیتوں کی کھوپوں میں میرے کھیتوں کی طرح چنے نہیں بوئے ہوئے۔ ایک نقاد نے طنزاً کہا "چین سے بیٹھو ہم سب جانتے ہیں کہ تمہاری فصلیں کتنے آرام سے لیٹی ہوئی ہیں" (مطلب یہ تھا کہ وہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔) گو ورا پھر اُٹھ جاتا لیکن اس شخص نے جو اس کے پیچھے تھا اسے کمر سے مضبوط پکڑ لیا۔ اس نے جھنجھلا کر کہا "تم مجھے کیوں پکڑتے ہو؟" چند لوگوں نے ٹھنڈا کرنے کے لئے کہا۔ روٹھو نہیں۔ ساتھ ہی ایک پاس آنے والے نے ظریفانہ انداز میں کہا "گو ورا ٹھنڈا پانی پیو۔ پھر تم اپنے بھائیوں کے ساتھ متفق ہو جاؤ گے۔ اس نے الٹ کر جواب دیا "میں پہلے ہی سے ٹھنڈا ہوں۔ لیکن اس کی آواز اور ترش روئی اس کے ضدی اور جوشیلا ہونے کا راز افشا کرتی تھی۔ اور باوجود اس کے کہ دوسری تجاویز پیش کی گئیں۔ ہر طرح کی رضا جوئی بیکار ثابت ہوئی۔ اور آخرکار ان آخری الفاظ کے ساتھ مجھے ایسی زمین درکار ہے جسے میں اپنے دروازے سے دیکھ سکوں۔ اُٹھا اور چلا گیا۔ دوسری صورت میں بھی بہت کچھ لے دے ہوئی۔ اس نے کہا کہ میری زمین گاؤں کے نزدیک ہے۔ اور یہ دُور۔ میں سڑک کے پار نہیں جاؤں گا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن تھوڑی دیر میں اس نے تجویز سے اتفاق کر لیا۔ اور کمیٹی کے بارہ ممبروں میں سے ہر ایک نے باری باری اسپہات پر دستخط کئے کہ وہ رضامند تھا۔ اُن داڑھی والے لوگوں کے مجمع پر آخری مرتبہ نظر ڈالتے ہوئے صدر نے دریافت کیا "کسی کے ساتھ ناانصافی تو نہیں ہوئی؟" اور ان الفاظ کے ساتھ ہی ۷۲ ٹکڑوں کو ملا کر گیارہ ایکڑ کا ایک کھیت بنا دیا گیا۔ بحث ایک گھنٹے تک جاری رہی تھی۔"

معاملات کا فیصلہ شاذ ہی اس قدر جلد ہوتا ہے۔ جتنا کہ اس صورت میں۔ معمول یہ ہے کہ پٹواری ۵۰۰ ایکڑ زمین مشتمل کرنے میں ایک سال لگا دیتا ہے۔ اور اگر اُسے چاہی زمینوں کی تمام پیچیدگیوں کو سلجھانا پڑے تو ممکن ہے وہ ۴۰۰ ایکڑ بھی نہ کر سکے۔ ایک اور گاؤں میں بھی جہاں

ہم نے دوسرے دن قیام کیا استمالِ اراضی کا سلسلہ جاری تھا۔ ہر شخص جو اس کے نقشے کو دیکھتا یہی کہتا کہ ایک ناممکن کام کے لئے اقدام کیا جارہا ہے۔ ۹۲۰ ایکڑ زمین کو ۱۹۱۳ کھیتوں میں بٹی پڑی تھی۔ اور اس کا دو تہائی سے زیادہ حصّے کو (۴۷ ایکڑ) اکتالیس کنوئیں سیراب کرتے تھے۔ اور ۲۵۶ مالکوں کے قبضے میں تھے۔ جن کے حقوق کا نہایت احتیاط سے بندوبست کرنا تھا۔ ان میں سے ایک شخص نے جس کے پاس ۳½ ایکڑ اپنی زمین تھی۔ دو کنوئیں اتارے ہوئے تھے۔ کیونکہ اس نے زمین بالتصرّف محاصل جائیداد کی رو سے قرب وجوار کے بیشمار کھیتوں پر (کل ۳۰ ایکڑ زمین) جو مختلف مالکوں کے تھے۔ قبضہ حاصل کر لیا تھا۔ اب اسے کہا جارہا تھا کہ وہ ان کھیتوں میں سے بعض پر سے اپنے حقوق چھوڑ دے تاکہ ان کے مالکان اپنی تمام زمین ایک ہی جگہ لے سکیں۔ یا تھوڑی سی ترتیب پہلے ہی دی جاچکی تھی۔ اس نے کہا کہ میں اس پر راضی ہوں۔ لیکن مجھے آئندہ کا ڈر ہے۔ چونکہ ہر شخص کی اور اسکے ساتھ ہی ہر ایک مرتہن کی رضامندی حاصل کی جاتی ہے۔ اس لئے کوئی ناانصافی نہیں کی جاسکتی لیکن اس بات کا تصور کیا جاسکتا ہے کہ اسے حاصل کرنے کے لئے کسقدر مہارت، چالاکی اور نیک اندیشی کی ضرورت ہے۔ اور جہاں ان سب میں اشتراک نہیں ہے یا جہاں بے جا ضد اور لالچ سے سابقہ پڑجائے تو ممکن ہے کارروائی کبھی ختم ہی نہ ہو۔ اور انجام کار بے ثمر ثابت ہو۔ اب تک صرف ۲۰۰ ایکڑ زمین کو لبستہ کیا گیا ہے۔ اور مختلف حصوں سے جو شکایات موصول ہوئی ہیں۔ اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ممکن ہے۔ کہ اس صورت میں بھی فیصلہ آخری نہ ہو۔ زمین کو نوعیت کے لحاظ سے پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ تین حصّے سیراب شدہ زمین کے ہیں۔ اور دو بارانی کے۔ بارانی زمین کی صورت میں اچھی اور بُری زمین کو تبادلے کی نسبت ۲:۵ ہے۔ ہر اُس شخص کو جو کسی کنوئیں میں سے اپنا حصّہ چھوڑ دیتا ہے۔ اسکا معاوضہ نقدی کی صورت میں دیا جاتا ہے۔ یہی بات ثمردار درختوں کی صورت میں بھی ہے۔ دوسری قسم کے درخت تبادلہ سے پہلے کاٹ لئے جاسکتے ہیں۔ یہ دستور عام ہے اور بہت زیادہ درخت گرائے جاتے ہیں۔ لیکن اُن کنوؤں کے اردگرد جو استمالِ اراضی کے بعد تقریباً ہمیشہ لگائے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے پودے بہت جلد بڑھ جاتے ہیں ؛

۱۲ مارچ۔ تشکار گڑھ سے ظفروال (۱۷ میل)

کئی میل کا سفر اور گرمی کی شدت کا مقابلہ تھا۔ اسلئے ۴½ بجے روانہ ہوگئے۔ ہوا تازہ تھی

اور گیہوں کے کھیت سورج کی ترچھی کرنوں سے چمک رہے تھے۔ اور دور بہت دور انسانی نظروں سے اوجھل دیوی صبح کی دھند میں لپٹی کھڑی تھی۔ بیشمار ہل (بارہ ایکڑ کے ایک ٹکڑے میں ہم نے شمار کئے تو چھبیس تھے) پہلے ہی سے بنجر زمینوں کو نیشکر اور روئی کے لئے تیار کر رہے تھے۔ اور جہاں گنے بو دیئے گئے تھے۔ سرخی مائل بھوری نرم زمین پر لکڑی کی گیلی (سوہاگہ) سے اسے ایسا ہموار بنایا جا رہا تھا جیسی کہ ہموار ریت۔ ایک کھیت میں بیلوں کی پانچ جوڑیں (ہر ایک جوٹ میں چار بیل) ہموار کرنے والی لکڑی کے پوروں کو لئے ایک دوسرے کے پیچھے چکر کاٹ رہی تھیں۔ اور ہر ایک پر دو دو آدمی ایک ہاتھ میں چابک اور دوسرے میں بیل کی دُم لئے ہوئے رتھ بانوں کی طرح سیدھے کھڑے تھے۔ گیہوں کے کھیت سرسبز جنگلی پیازسے بھرے کھڑے تھے۔ اور ان کی درمیانی مینڈھیں لیسٹ اور ٹیڑھی تھیں۔ لیکن کپاس اور نیشکر کے لئے زمین کو خوب تیار کیا جاتا ہے۔ اور اچھی طرح کھاد دیا جاتا ہے۔ لیکن صرف مویشی خانہ کا کھاد استعمال کیا جاتا ہے۔ اور اگر اسے بطور ایندھن نہ جلایا جاتا تو زیادہ استعمال کیا جاتا۔ گرد و نواح میں لکڑی کی افراط ہے۔ لیکن اسے گھر، ہل اور کنوئیں کے لئے بچا بچا کر رکھا جاتا ہے۔ وہ لوگ جن کے ہاں اپنا کھاد کافی نہیں ہوتا گاؤں کے اُن کمیوں سے لے لیتے ہیں جو دودھ دینے والے مویشی رکھتے ہیں اور اس خیال سے کہ انہیں مختلف قسم کی بہت سی چیزوں مثلاً ایندھن، چارہ، ساگ۔ اور ممکن ہے تمباکو سے بھی فائدہ حاصل کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ کھاد کی کوئی قیمت نہیں ادا کی جاتی۔ عقلمند لوگوں کے ہاں چارے کی متحرک کھرلیاں ہوتی ہیں جنکو وہ کھیت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھراتے ہیں۔ تاکہ جب مویشی چارہ کھائیں تو انکے قیمتی پیشاب سے تمام کھیت کو کھاد دیا جاسکے۔ ظفروال کے نزدیک ہم نے ایک گاؤں میں ایک ایسی کھرلی دیکھی تھی۔ اور جب میں نے پوچھا تو ہمیں وہی جواب ملا جو اکثر سننے میں آتا ہے "اور کوئی بات نہیں ہے لوگ غریب ہیں" باوجود اس کے ساتھ ہی ڈسکہ کی تحصیل میں اُن کا استعمال عام ہے۔ اور ایک گاؤں میں ہم نے ۳۰ دیکھیں۔ چونکہ اُن پر صرف ۱۰ سے ۱۵ روپیہ تک لاگت آتی ہے وہ آسانی سے خریدی جاسکتی تھیں۔ لیکن روپیہ کی کمی کیوجہ سے ایسا نہیں ہوسکتا۔

یہی مشکل لکڑی کے رہٹ کو لوہے کے رہٹ سے بدلنے میں حائل ہوتی۔ ذاتی طور پر

میں اس کے لئے افسوس نہیں کر سکتا کیونکہ لوہے کے رہٹ میں کوئی ترنم ریز نغمہ قطعاً نہیں پیدا ہوتا۔ اور لکڑی کے رہٹ کا نغمہ وسطی پنجاب کی مخصوص موسیقی ہے۔ لیکن لوہے کا رہٹ یقیناً پائیدار ہوتا ہے۔ اور کمھار کو لکڑی کے رہٹ کی ٹینڈیں تبدیل نہیں کرنی پڑتیں اس پر یہ کہ اس کی قیمت صرف ۱۰۰ روپیہ ہوتی ہے۔ جب یہ بات ظفروال میں جتائی گئی تو ایک جاٹ نے بحث کے انداز میں کہا۔ لیکن ہم اس قدر روپیہ یکمشت نہیں دے سکتے۔ کمھار کو ہم تھوڑا تھوڑا کر کے دیتے ہیں۔ ہم نے کہا لیکن گنّے پیڑنے کی لکڑی کی مشین کو ہر جگہ لوہے کی مشین سے بدل لیا گیا ہے۔ تو پھر یہ تبدیلی بھی کیوں نہ کر لی جائے۔ جاٹ نے اُلٹ کر جواب دیا۔ بعض کرسیوں پر بیٹھتے ہیں اور اچھے کپڑے پہنتے ہیں۔ بعض غریب ہیں اور زمین پر بیٹھتے ہیں۔ پھر یہ کہ ہم سو روپیہ کہاں سے لائیں؟

روپے کا کال

بلاشبہ کہاں سے لائیں۔ اور میں یہ اُن حالات کی بنا پر کہتا ہوں جو میں پڑوس کے دو گاؤں میں دیکھ چکا ہوں۔ یونین کے ایک اجلاس میں ایک جاٹ نے کہا تھا۔ کہ اب زمیندار کو پانچ روپے نقد حاصل کرنے بھی دقت اُٹھانی پڑتی ہے۔ اور یہ کہ بہت سے گھروں میں ایک روپیہ نکلنا بھی مشکل ہو گا۔ چونکہ تمام لوگ رضامند دکھائی دیتے تھے۔ میں نے سوچا کہ میں اپنی تسلی کے لئے خود دیکھونگا۔ اس لئے میں نے دو گاؤں میں حاضرین سے دریافت کیا کہ اس وقت تمہارے پاس یا تمہارے گھروں میں کتنا روپیہ ہے۔ پہلے گاؤں میں تیئیس آدمیوں میں سے چار کے پاس ۵ روپے تھے۔ اور ۲۰ سے زیادہ کسی کے پاس نہ تھے۔ اس پر یہ کہ ان میں سے ہر ایک کے پاس اوسطاً ۲۱ ایکڑ زمین تھی۔ البتہ وہ بال بال قرض میں پھنسے ہوئے تھے۔ دوسرا گاؤں زیادہ خوشحال تھا۔ اور اکیس آدمیوں میں سے صرف ایک کے پاس ۵ روپے سے کم تھے۔ پانچ کے پاس پچاس یا اس سے زیادہ روپے تھے۔ لیکن ۸۰ روپے سے زیادہ کسی کے پاس نہ تھے۔ میرے عملے کا خیال تھا۔ کہ اعداد درست ہیں۔ پہلے گاؤں میں مجھ پر اس حقیقت کا بہت اثر پڑا کہ چھ آدمیوں نے آنے اور روپے بھی بتائے اور ایک نے تو پائیاں تک بتائیں۔ اس پر وہ بات یاد آتی ہے۔ جو کسی نے دہلی میں ہمیں سنائی تھی۔ یعنی یہ کہ آجکل روپیہ کا قحط ہے۔

لگان کی ادائیگی

اگرچہ روپیہ اس قدر کمیاب ہے۔ راستے میں ہمارے ساتھ ساتھ چلنے والے بہت سے لوگوں نے بغیر قرض اٹھائے لگان کی گذشتہ قسط ادا کرنے کا انتظام کر لیا ہے۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ جہاں نہر ہے اور پانی کا محصول اور اس کے ساتھ ہی زمین کا لگان دینا پڑتا ہے۔ ایسا کرنا بہت مشکل ہے۔ یہاں نہر کوئی نہیں ہے اور موجودہ لگان کی شرح جنگ عظیم سے پہلے مقرر کی گئی تھی۔ جبکہ نرخ موجودہ قیمتوں کی نسبت کچھ زیادہ چڑھے ہوئے نہ تھے۔ اس لئے اکثر لوگ اپنی واجبات ادا کرنے کے لئے نقل مکانی کر گئے ہیں۔ بہت سے دودھ، گھی، چارہ اور درخت تک فروخت کرکے اپنے ذرائع آمدنی میں اضافہ کر رہے ہیں۔ تاہم کافی لوگوں کو شاید ۱۰ سے لے کر ۲۰ فیصدی تک لوگوں کو قرض اٹھانا پڑا ہے۔ اور انہیں حسب معمول زیادہ شرح سود دینی پڑی ہے۔

زیورات

ضروری ہے کہ اب زیادہ تر روپیہ یا تو زمین یا زیورات کی ضمانت پر قرض لیا جاتا ہے۔ اور زمین کی صورت میں (ایکٹ انتقال اراضی کی رو سے) کسی زراعت پیشہ قوم کے فرد کے پاس زائد روپیہ ہونا ضروری ہے۔ یہ پہلے کی نسبت بہت کم سہل ہے لیکن ملازمت پیشہ لوگوں کے پاس روپیہ کا ہونا اغلب ہے۔ روپیہ حاصل کرنے کا سب سے ارزاں قاعدہ یہ ہے کہ زمین کو تصرف محاصل جائیداد کے طریق پر رہن رکھا جائے۔ اس طرح ۶ سے لیکر ۹ فیصدی تک سود دینا پڑتا ہے۔ جبکہ اس کے مقابلہ میں زیورات پر اب ۱۵ سے لے کر ۱۸¾ فیصدی تک دینا پڑتا ہے۔ شمال کی جانب سفر کرتے ہوئے میں نے اس امر کے متعلق بہت سی تحقیقات کیں۔ کہ اب کاشتکار کے پاس کس قدر زیورات باقی ہیں۔ (جاگیردار کے متعلق نہیں) اور یہی کچھ میں اس ہفتہ یونین کے اُن جلسوں میں کرتا رہا ہوں۔ جن میں میں شریک ہوا۔ اندازوں میں کافی فرق ہے۔ اور اسے لازمی طور پر انتہائی احتیاط سے تسلیم کر لینا چاہیئے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ ان دو اضلاع میں کم از کم نصف اور شاید دو تہائی تک زیورات بغیر

فروخت اور رہن کے باقی ہیں۔ بنک کے ایک اجلاس میں ایک صراف نے کہا کہ فروخت شدہ زیورات کا زیادہ حصّہ بمبئی اور دوسرے بڑے شہروں مثلاً لاہور امرتسر اور دہلی پہنچا ہے۔ اور اسے خاص طور پر ملازمت پیشہ لوگوں نے خریدا ہے۔ دوسری جگہوں کی طرح یہاں بھی شادی کے وقت زیورات پر پہلے سے بہت کم خرچ کیا جاتا ہے۔ اور اگر یہ صورت ہے تو اس کی وجہ بھی وہی ہے جو ایک سُنار نے ہمارے ایک اجلاس میں بیان کی۔ اس نے ۵۰۰ روپیہ ۲۴ فیصدی شرح پر شادی کے لئے قرض لیا تھا۔ اور جب اس سے دریافت کیا گیا کہ تم اس قدر بڑی رقم کس طرح ادا کروگے؟ تو اس نے جواب دیا کہ میں زیورات میں زیادہ کھوٹ ڈال دوں گا۔

قیمتیں گرنے کے عام اثرات

اسی قسم کا جواب ایک لمبی پتلی ناک والے بوڑھے چمار نے دیا جسے ہم آج سڑک پر ملے۔ وہ بہ حیثیت مزارعہ ۲۰ ایکڑ زمین کاشت کرتا ہے۔ اور جب اس سے یہ پوچھا کہ تم کس طرح کام کرتے ہو؟ تو اس نے کہا "میرا جاگیر دار میری نگرانی کرتا ہے۔ اور مجھے غلہ نہیں چرانے دیتا"۔ ان تمام لوگوں کی طرح جو دوسرے لوگوں کے زائد روپیہ پر گذارہ کرتے ہیں۔ جاگیر دار بھی اپنے واجبات وصول کرنے میں دقت محسوس کرتا ہے خاص طور پر اس صورت میں جبکہ وہ نقدی میں ہوں۔ ایک شخص جس کے لائل پور میں چار مربعے ہیں یہ بیان کرتا ہے کہ مجھے اپنی مالگذاری ۵۰۰ روپیہ فی مربعہ سے کم کرکے ۲۵۰ روپیہ رکھنی پڑی ہے۔ اور ایک اور شخص نے اپنے مزارعین کو محض لگان ادا کرنے کے عوض ہی کاشت کرنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ ممکن ہے کسی دن وہ بقایا بقایا رقم ادا کریں۔ سب سے زیادہ بُری حالت دیہاتی ساہوکاروں کی ہے۔ اور ان میں سے ایک نے مجھے بتایا کہ میں نے حال ہی میں اپنے لگائے ہوئے سرمائے کا چوتھائی حصّہ روپیہ چلانے کی بجائے تجارت میں لگا دیا ہے۔ بہت سے اور لوگ بھی یہی کچھ کر رہے ہیں۔ اور قیمتوں کے گر جانے سے دیہاتی ساہوکار کے اس ارادے کو قوت بہم پہنچ رہی ہے۔ کہ وہ شہر یا کسی منڈی میں نقل مکانی کر جاتے۔ بعض اپنے

روپے کا کچھ حصہ امداد باہمی کی انجمنوں میں جمع کرانے پر ہی قانع ہیں۔ اور ایک نے حال ہی میں مجھے بتایا کہ اس زیادہ مگر کم و بیش ہونے والے معاوضے کی نسبت جو مجھے پہلے ملتا تھا۔ میں نے اس باقاعدہ ۷ فیصدی سود کو کہیں زیادہ باعثِ اطمینان پایا۔ غریب لوگوں میں قیمتیں گرنے کے اثرات ایک آتشبازی فروخت کرنے والے کی مثال سے واضح کئے جا سکتے ہیں۔ جسے میں نے پاکپٹن میں دُکانداروں کی انجمن امداد باہمی میں دیکھا تھا۔ وہ ایک بڑے اُبھرے ہوئے ناک والا اور ایک سُرخ رنگ کی چھوٹی جھاڑی جیسی داڑھی لئے ہوئے بوڑھا شخص تھا۔ تین سال گذرے کوئی ہندو خواہ وہ کسی معیار کا کیوں نہ ہو آتشبازی کے بغیر شادی کو مکمل نہ سمجھتا تھا۔ پھر پنچایت میں اصلاح کی صورت پیدا ہوئی اور اس امر پر اتفاق کیا گیا کہ آئندہ اس پر چند روپوں سے زیادہ کوئی نہ خرچ کرے۔ اور یہ رقم کچھ پٹاخے اور گولے چلانے کے لئے کافی ہے اور اگر کسی اور جگہ کی برات کو اس سے زیادہ کی ضرورت ہو تو وہ اپنے ساتھ اپنی آتشبازی خود لائے۔ یہ بات کسی حد تک بُری تھی۔ لیکن پھر قیمتیں گر گئیں۔ اور اب باپ اور بیٹا دونوں محض دس روپے ماہوار کماتے ہیں۔ میں نے کہا پھر تم گذارہ کیسے کرتے ہو؟ اس نے متوکلانہ جواب دیا "خدا ہمیں ہماری روزی بھیجد یتا ہے"۔ ان لوگوں نے جو اردگرد کھڑے تھے یہ تنقید کی کہ اب جب قیمتیں گر گئی ہیں۔ یہ اچھی طرح گذارہ کر سکتا ہے۔ اس وقت تو میں نے یہ خیال کیا کہ یہ جو کچھ ہے۔ بھلائی کے لئے ہے۔ لیکن اس وقت تک میں نے تھوڑی جائیداد والے کی آمدنی کا حساب نہیں لگایا تھا۔

اتوار۔ ۲۲ مارچ ظفروال سے چونڈہ (۱۲ میل)

صبح کے وقت ایک اور طویل سفر (سات بجے سے ایک بجے تک) لیکن دلچسپی اور خوبصورتی سے پُر۔ خوبصورتی کا پہلا منظر صبح سویرے کی وہ روشنی تھی جو گیہوں کے فراخ اور کھلے کھیتوں، آموں کے جھنڈ، سُنہری سرکنڈہ گھاس (جو اس وقت ہماری سڑک کے دونوں طرف کھڑی تھی) اور دور فاصلے پر برف کی دھندلی لکیر پر پڑ رہی تھی۔ دیوی پیچھے رہ گئی تھی۔ لیکن اب نئی چوٹیاں جن میں پیر پنجال کی بلند چوٹی بھی شامل تھی۔ ہماری نظروں کا نشانہ بنی ہوئی تھیں۔ پہلے کی طرح بنجر زمینوں میں کھیتوں اور بیلوں کے بل

چلانے سے زندگی کے آثار نمودار تھے۔ اور ہالیوں کی ہا ہا ہا کی بلند آوازوں سے جن سے وہ اپنی جوڑیوں کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ ہوائیں گونج پیدا ہو رہی تھی۔

معمولی دیہاتی زمیندار کے ذرائع آمدنی

ہم اب سیالکوٹ کی حدود میں تھے۔ لیکن تغیر کی کوئی علامت رونما نہ تھی۔ یہ ضلع اپنی بڑی بڑی خصوصیات کے لحاظ سے گورداسپور سے بالکل مختلف نہیں ہے۔ اس گاؤں نے (دوگریاں اریاں) جہاں ہم نے قیام کیا ایک لحاظ سے مجھے حیران کر دیا۔ اور وہ یہ کہ یہاں کے ۲۱۰ مالکان زمین جن میں سے اکثر مسلمان جاٹ ہیں۔ اوسطاً فی مالک ۴½ ایکڑ کاشت شدہ زمین سے بھی کم پر گذارہ کرتے ہیں۔ اور یہ بھی ان کی اپنی نہیں ہے۔ جس بات نے مجھے متحیر کیا وہ اس اوسط کی کمی نہ تھی۔ (یہ وسطی پنجاب کی خصوصیت ہے) بلکہ یہ کہ اس گاؤں میں گذارہ کرنے کے لئے اس کے علاوہ اور چیزیں بہت کم ہیں کسی دوسرے گاؤں کا کوئی کھیت اجارے پر نہیں لیا جاتا۔ ایک شخص کے ہاں تین اونٹ ہیں اور ایک اور شخص کبھی کبھی بکریوں اور بھیڑوں کی تجارت کرتا ہے۔ لیکن یہاں ۲۱۱ گائیں ہیں (زیادہ تر بھینسیں) اوسطاً ایک مویشی ایک مالک زمین کے حصے میں آتا ہے۔ اور بہت سے کنبے گھی فروخت کرکے ۴ روپے سے لے کر ۵ روپے تک کما لیتے ہیں۔ دوسرا ذریعہ آمدنی محض فوجی ملازمت ہے۔ انتیس اشخاص اسمیں ملازم ہیں۔ اور دو فوجی پنشنر ہیں ایک دیوانی پنشنر بھی ہے۔ کاشتکاری کا طریق خاص طور پر پُرزور نہیں ہے۔ عام فصلیں پیدا کی جاتی ہیں، مثلاً گیہوں، منیکر، روئی، چارہ اور مکئی۔ محض ۵ ایکڑ زمین میں تمباکو بویا جاتا ہے۔ اور جتنی سبزیاں پیدا کی جاتی ہیں، سب سادہ قسم کی ہیں۔ اور صرف ایک کاشتکار فروخت کرتا ہے۔ بالآخر یہ کہ دو زمینداروں نے ایک ایک مرغی پالی ہوئی ہے۔

اسکے باوجود لوگ کسی نہ کسی طرح سے گذارہ کرتے ہیں۔ اگرچہ وہاں کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے افراط یا تعیش کے آثار پیدا ہوں (محض ان کی پگڑیاں کھدر کی نہ تھیں) لیکن پھر بھی ان کے چہروں یا جسموں سے یہ بات ظاہر نہ ہوتی تھی۔ کہ وہ کس چیز کے محتاج ہیں۔ ایک سفید ریش بوڑھے شخص نے ہمیں بتایا کہ چند ایکڑ زمین والا شخص کیا کچھ کر سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ میں ۱۰½ ایکڑ زمین کی پیداوار سے اٹھارہ جانوں کی پرورش کرتا ہوں۔ ان میں سے

صرف تین ایکڑ میری اپنی ہے۔ اور باقی تیرہ کے لئے پیداوار کا ½ حصہ مالک زمین کو دیتا ہوں۔ حالات صرف ایک ہی صورت میں اس کے مطابق ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ تمام کی تمام زمین چاہی ہے۔ اٹھارہ جانوں میں سے دس نابالغ ہیں۔ چار عورتیں اور باقی چار توانا بالغ ہیں۔ تین ہل رکھے ہوئے ہیں (اس علاقے میں ۷ ایکڑ چاہی زمین یا ۸ ایکڑ بارانی زمین کیلئے ایک ہل درکار ہوتا ہے) دو دودھ دینے والی بھینسیں گھر میں دودھ دیتی رہتی ہیں۔ اور فروخت کرنے کے لئے کچھ گھی بہم پہنچاتی رہتی ہیں۔

معمولی جائداد سے کتنی پیداوار حاصل ہوتی ہے

اب یہ دکھانا ان اعداد کا کام ہے کہ اس قدر قلیل جائداد کے ساتھ زندگی کے لئے کسقدر کشمکش کرنی پڑتی ہو گی۔ آؤ ایک ایسے شخص کی مثال لیں۔ جیسے پاس ایک ہل ہے (پنجاب کے اکثر کاشتکار ایک سے زیادہ ہل نہیں رکھتے) اور یہ فرض کر لیں کہ اسکی تمام زمین چاہی ہے۔ اس کا مطلب ایسی چھ ایکڑ زمین سے ہے جس سے مندرجہ ذیل طریق پر ۷ ایکڑ زمین کی پیداوار حاصل کی جاسکے۔

گیہوں .... ۴ ایکڑ   مکئی .... ۱ ایکڑ

نیشکر .... ½ ایکڑ   چارہ (چری) اور ....

روئی .... ½ ایکڑ   تمباکو (۱ کنال) .... ۱ ایکڑ

موجودہ قیمتوں کے لحاظ سے خام اشیاء سے مندرجہ ذیل آمدنی ہو گی۔

	پیداوار فی ایکڑ	دیہاتی نرخ	فصل کی قیمت
	من	فی من	روپیہ آنہ پائی
گیہوں	۱۲	۱ — ۸ — ۰	۷۲ — ۰ — ۰
گڑ (گنے سے)		۳ — ۴ — ۰	½ ایکڑ ۴۰ — ۱۰ — ۰
مکئی (صاف کی ہوئی)	۲۵	۱ — ۰ — ۰	۲۵ — ۰ — ۰
تمباکو	۱۵	۲۰ — ۰ — ۰	۲۰ — ۰ — ۰
گھی (۴ روپے ماہوار کے حساب سے)	—	—	۴۸ — ۰ — ۰
میزان			۲۰۵ — ۱۰ — ۰

اس طرح سے خام اشیا کی آمدنی صرف ۱۷ روپے ماہوار ہوتی ہے۔ نقد آمدنی اس سے کہیں کم ہوگی۔ کیونکہ پیداوار کے تمام اخراجات (سوائے چارے کے) اُٹھانے پڑتے ہیں۔ اور ساتھ ہی حکومت کے واجبات بھی ادا کرنے پڑتے ہیں۔ جب ان کو منہا کر دیا جائے تو ہمارا چھ ایکڑ والا کسان یقیناً ایک قلی یا مزدور سے یقیناً خوشحال ہوگا۔ اسکے باوجود کہا جاتا ہے۔ کہ یہ گاؤں اردگرد کے گاؤں سے بہتر حالت میں ہے۔ اور یہ اُن صفات کا نتیجہ ہے جن کی وجہ سے انسان ہر جگہ مالدار رہتا ہے (محنت اور کفایت شعاری) ان صفات کے موجود ہونے کی ایک علامت تو سود کی وہ شرح ہے۔ جس پر گاؤں کے لوگ قرض لیتے ہیں۔ اڑتیس حاضرین میں سے آٹھ نے کہا کہ ہم ۱۲ فی صدی شرح پر روپیہ لے سکتے ہیں۔ اور تیسرے کہا کہ ۱۸¾ فیصدی پر اور اس کے مقابلے میں اس تمام علاقے میں جس میں سے ہم گذر کر آئے سود کی عام شرح ۲۵ فیصدی ہے۔ کسان کے چلن کو انفرادی طور پر آزمانے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں کہ اسکی قرض لینے کی شرح کو دیکھا جائے۔

ایک ہل والا شخص کیونکر گذارہ کرتا ہے

لیکن اس لحہ شرح سود سے کہیں زیادہ اہم قرضے کی رقم ہے۔ قیمتوں کے گرنے سے قرض کا بوجھ دو چند ہو گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اکثر لوگ مجبوراً اسبات کے خواہشمند ہو گئے ہیں کہ وہ قرض لیں۔ حالانکہ وہ اتنا روپیہ ادا کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک مسئلہ ہے۔ اور جب اس میں رہتک یا گوڑگاؤں جیسی طویل خشک سالی کا یا نیلی بار کی طرح زیادہ سرمائے اور لگان کا یا بھاری قرض کا جیسا کہ اکثر نیم پہاڑی علاقوں میں ہے۔ اضافہ کر دیا جائے۔ تو یہ لاینحل معلوم ہوتا ہے۔ دیہاتی بنکوں سے اسکا گہرا تعلق ہے۔ کیونکہ ان کے وجود کا انحصار ہی ایسے ممبروں پر ہے۔ جو اپنی بساط سے بڑھ کر قرض نہ لیتے ہوں۔ اسبات کو حاصل کی خاطر ہر ممبر کے لئے ایک حد مقرر کر دی ہے۔ جسکی بنیاد اس کے چلن اور آمدنی پر ہے۔ اور ہر سال اسمیں ترمیم کی جاتی ہے چونکہ زراعتی آمدنی گذشتہ سال کی آمدنی کے نصف سے کسی طرح زیادہ نہیں ہے۔ مجھے یہ بات صاف صاف طور پر معلوم ہوئی کہ ان پابندیوں کو نہایت سختی سے کم کر دیا جائے۔

اور میں نے یونین کے اُن تمام جلسوں میں جن میں اس ہفتہ شرکت کی ہے یہ تجویز پیش کی ہے کہ ایسا کر دیا جائے۔ لیکن ہر جگہ اس پر نہایت پر جوش لہجہ میں یہ اعتراض کیا گیا کہ اب روپیہ کی اس قدر کمی ہے کہ لوگوں کو کم نہیں بلکہ زیادہ قرض لینے کی ضرورت ہے۔ یونین کے ڈائرکٹروں کو اس امر کا یقین دلانے کے لئے کہ عاقلانہ راستہ وہی دوسرا راستہ ہے۔ میں نے ان کی مدد سے یہ سوال حل کیا کہ ایک ہل اور دس ایکڑ بارانی زمین والا ایک کسان (پنجاب میں اس نمونہ کے طور پر کسانوں کی اکائی مانا جا سکتا ہے) اگر محض اپنی زمین پر ہی گذران کرتے تو اسے سال بھر میں کتنا خرچ اٹھانا پڑے گا۔ اسمیں بھی پہلے کی طرح چارے اور روئی سے قطع نظر کی گئی۔ لیکن سرکاری واجبات یا اخراجات کی کسی اور مد کے لئے کوئی رقم وضع نہ کی گئی۔ میرا تخمینہ یہ ہے کہ خام اشیاء سے اس کی آمدنی ۱۲۶ روپے یا دس روپے ماہوار سے زیادہ نہ ہو گی۔

یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ فی زمانہ ایک ہل والے شخص کے لئے بارانی زمین سے ایک کنبے کے لئے معاش بہم پہنچانا کسقدر مشکل ہے۔ خواہ وہ اسکا مالک ہی کیوں نہ ہو۔ اور یہی بات تمام صوبے پر چسپاں ہوتی ہے۔ سراسر سیراب شدہ زمین کے ذریعے سے انسان اس طرح اچھی زندگی بسر کر سکتا ہے جیسا کہ صفحہ نمبر ۷۵ کے اعداد و شمار سے ظاہر ہے۔ لیکن ایسے خوش قسمت لوگوں کی ذیل میں آنے والے محض ایک ہل کے مالک کسان چند ہیں۔ شکار گڑھ میں زمین کی اوسط فی کس صرف ۵۔ ایکڑ ہے۔ رہی یہ بات کہ کسان گذارہ کیوں کر کرتا ہے۔ سو اسکی وجہ یہ ہے۔ کہ عام طور پر اس کے کنبے کا ایک فرد فوجی یا کسی دوسری سرکاری ملازمت میں ہوتا ہے۔ اور جو بات شکار گڑھ پر صادق آتی ہے وہی کسی نہ کسی حد تک راولپنڈی سے لیکر جمنا تک کے نیم پہاڑی علاقے پر چسپاں کی جا سکتی ہے۔ اور وسطی پنجاب کے بہت سے حصے کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ جبکہ عین پہاڑی علاقے میں خواہ وہ کانگڑہ ہو یا کشمیر کا دامن زمینیں اتنی کم ہیں کہ زراعت ملازمت کیلئے تقریباً ایک امدادی پیشہ ہو گئی ہے۔

۲۴ مارچ۔ چونڈہ سے پسرور براستہ منڈیکی بیریاں (۸ میل)

سردی کا مبارک موسم اب قریب الاختتام ہے۔ اور اس وقت تک کہ سورج تپنگ کی

اونچائی تک پہنچے۔ صبح کی تازگی کافور ہو جاتی ہے اور تمازت اور چکاچوند شروع ہو جاتی ہے۔
دوپہر کے وقت گھر کو بند کرنا پڑتا ہے۔ اور صبح کے وقت آرام کرسیوں پر ٹانگیں پھیلا کر
آرام لینے کو ب حقارت سے نہیں دیکھا جاتا۔ لیکن راتیں ابھی تک اتنی ٹھنڈی ہیں کہ تڑکے
سے پہلے تیسرا کمبل لینا پڑتا ہے (کم از کم اس شخص کو جو برآمدے میں سوتا ہو ضرور لینا پڑتا ہی)
اور صبح کی ابتدا سراسر خوبصورتی اور تازگی لئے ہوئے ہوتی ہے۔ گیہوں کے بالوں والے
تنے سورج کی روشنی میں جھلمل جھلمل کرتے ہیں۔ چنے کی جھاڑی جیسے پودوں پر شبنم کے
روپہلی موتی آویزاں ہوتے ہیں۔ اور ہوا میں ہر طرف فاختہ کی حق سرہ سنائی دیتی ہے کسانوں
کی ہاہا ہاہا اور ہو ہو ہو ہو کی آوازیں کھیتوں میں گونج پیدا کرتی ہیں اور ہر گھوڑا چلنے کیلئے
بیتاب ہوتا ہے۔ ہر جگہ گیہوں خواہ وہ گھنی اور اونچی ہے خواہ چھدری اور پست تمام میدان پر
اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ سبزے کا ایک ایسا سمندر نظر آتا ہے۔ جسمیں کسی جھاڑی یا لکڑی کا
نشان نہیں۔ اس میں کہیں کہیں کتان کے آخری پھول اپنی نیلی نیلی آنکھیں ایک ایسے
آسمان کی طرف کھولتے ہیں جو قریب قریب اتنا ہی نیلگوں ہے۔ اور جہاں کہیں زمین ایک
فصل کے لئے بنجر پڑی رہی ہے۔ وہاں اس سال کی کپاس کے ایسے ننھے پودے نکل رہے
ہیں۔ جن میں ابھی دو ہی پتے ہیں۔ شیشم کے درخت بھی موسم سرما کی نیند کا خمار اُتار رہے
ہیں۔ ان کی ننگی ننگی ٹہنیاں میلوں ہماری سڑک کے دونوں طرف حد بندی کرتی آئی ہیں اور
ابھی تک گذشتہ سال کے خشک پتوں سے لدی پڑی ہیں۔ لیکن آج ایسا معلوم ہوتا تھا گویا
بہار جو ابھی تک پردے میں مخفی خزاں کی زنگ آلودہ جالیوں میں سے پھوٹ آئی تھی۔

عورت کا نظریہ

دیہاتی زندگی میں دیہاتی عورت کا نظریہ ایک ایسا اہم جزو ہے کہ میں نے یہ خیال کیا کہ
اس دورے کو ختم کرنے سے پہلے میں اس ساز کو ایک مرتبہ پھر چھیڑنے کی کوشش کرونگا۔
چنانچہ حسب معمول بنک کا معائنہ کرنے کے بعد مجھے ایک صحن میں لے گئے۔ جہاں مجھے
پہلے کی طرح ایک یا زیادہ سے زیادہ دو عورتیں دیکھنے کی توقع تھی لیکن اس کے برعکس
میں نے وہاں ایک درجن عورتیں دیکھیں۔ کیا کہیں اس سے زیادہ جرأت کی ضرورت ہو سکتی
ہے؟ لیکن چونکہ بھاگنا ناممکن تھا۔ میں اس ساز کی طرف رجوع ہوا جسکا نغمہ نہایت شیریں

بلکہ رقت انگیز ثابت ہوا۔ مزید برآں یہ کہ گاؤں میں عام موضوعات کے متعلق واقفیت افراد کی نسبت جماعت سے زیادہ صحیح طور پر حاصل کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ اگر کوئی غلط بیانی کی جاتی ہے تو اسے عام طور پر کوئی نہ کوئی درست کر دیتا ہے۔ سوائے ایک گاؤں کے خادم (کمین) کی بیوی کے باقی سب جٹیاں تھیں۔ اور وہی سب سے زیادہ سمجھدار ثابت ہوئی۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ وہ ذات کی میراسن تھی۔ گھر کی دیوار کے ساتھ ساتھ وہ ایک بل کھاتی ہوئی قطار بنائے چوکڑی مارے بیٹھی تھیں۔ سب کھدر پہنے ہوئے تھیں۔ اور ان میں سے اکثر گھونگھٹ نکالے ہوئے تھیں۔ لیکن ان کی چمکدار آنکھیں بھوری اوڑھنیوں کے سلوٹوں میں سے چمک رہی تھیں۔ صرف چند عورتیں کھلے منہ بیٹھی رہیں۔ کسی میں خوبصورتی یا نزاکت نہ تھی۔ لیکن میراسن میں زندگی کے آثار تھے اور اس کی آنکھیں منور تھیں۔ سنگھ پورہ کی طرح یہاں بھی کار۔ وائی کے لئے پاس والے کوٹھے کی چھت پر چھوٹے چھوٹے مشتاق بچوں کا جمگھٹا ہو گیا۔ اور اسی شوق کو لئے ہوئے ڈاڑھی والے چہروں نے صحن کا راستہ روک لیا۔ صحن آئینے کی طرح صاف تھا۔ ایک عورت نے کہا " ہر آٹھ پہر کے بعد میں خشک گوبر سے اسکی لپائی کرتی ہوں۔

میں نے پوچھا " تمہارا کام کس وقت سے شروع ہوتا ہے ؟ "

اس نے جواب دیا کہ جب صبح کا ستارہ طلوع ہوتا ہے ہم اُٹھ بیٹھتی ہیں اور اگر آٹا پیسنا ہوتا ہے (ہم ہر روز نہیں پیستیں) تو ہم پہلے اسے پیستی ہیں۔ پھر ہم دودھ بلو کر مکھن نکالتی ہیں۔ اور مویشیوں کا دودھ دوھتی ہیں اور حاضری کے لئے روٹی پکاتی ہیں۔ اسکا بہت فکر رہتا ہے اور جب تک ہم اسے کھیتوں میں لے جا کر اپنے خاوندوں کو نہ دے آئیں ہمیں اطمینان کا سانس نہیں آتا۔ پھر ہم واپس آتی ہیں۔ اور اس سے پہلے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم دوپہر کا کھانا تیار کر لیں۔ ہم اس وقت نہیں کھاتیں جب تک کہ وہ نہ کھا لیں۔ ہرگز نہیں۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ہمیشہ انتظار کریں۔ اور اگر وہ نہ آئیں تو ہم اُنکا کھانا کھیتوں میں ان کے پاس لیجاتی ہیں۔ دوپہر کے بعد اور جب ہمارے پاس کوئی کام نہیں ہوتا ہم چرخہ کاتتی ہیں۔ جب سے قیمتیں گر گئی ہیں ہم بہت زیادہ کاتتی ہیں۔ اب چیزیں خریدنے کی ہمت نہیں رہی ہے۔ سال بھر میں ایک شخص کے لئے ۵۰ گز کپڑا درکار ہوتا ہے پس ضروری ہے کہ ہم میں سے ہر ایک ہر سال ایک مانی (۵ من) روئی کاتے "

"کیا تم دوپہر کو آرام کرتی ہو؟"

"جب دن لمبے ہوتے ہیں تو ہم دو گھڑی کے بعد کچھ آرام کر لیتی ہیں۔ لیکن چھوٹے ہونے کی صورت میں نہیں۔ تب ہم تمام دن اور نصف رات گئے تک کام کرتی ہیں۔"

"تم زیادہ محنت کرتی ہو یا تمہارے آدمی؟"

"ہم بھی محنت کرتی ہیں اور وہ بھی محنت کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے کام میں برکت نہیں ہے۔ آدمیوں کے کام میں بہت بڑی برکت ہے۔ اسکی وجہ سے بہت پیداوار حاصل ہوتی ہے۔ لیکن عورتوں کے کام سے کوئی ایسی چیز نہیں حاصل ہوتی جس سے تبادلہ کیا جا سکے۔" ایک زمیندار بیچ بول پڑا۔

"اس کے باوجود اگر کسی کے ہاں بیوی نہ ہو تو وہ کاشت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ پھر اس کے لئے کون روٹی پکائے گا۔ اور کون چارہ کاٹ کر مویشیوں کے آگے ڈالیگا؟ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے میں نے دریافت کیا کہ اس قدر کام کے ہوتے ہوئے تم اپنے بچوں کی دیکھ بھال کیونکر کرتی ہو؟

ہم انہیں اپنی گود میں بٹھا لیتی ہیں (بولنے والی عورت نے اپنا دامن باہر پھیلا دیا) اور اس طرح کاتتی ہیں یا چکی چلاتی ہیں۔ یا ہم انہیں اپنے پہلو میں لٹا کر سلا دیتی ہیں۔

تجب تمہارے ہاں بچہ ہوتا ہے تو کتنے عرصے تک کام بند رکھتی ہو؟"

یہ بات عورت کے حالات پر منحصر ہے۔ اگر اس کے ہاں کوئی کھانے پکانے والا اور اسکا کام کرنے والا ہے تو وہ چالیس دن تک آرام کرے گی۔ لیکن اگر وہ تن تنہا ہو تو وہ گیارہ دن آرام کرے گی اور پھر کام لگ جائے گی۔ لیکن وہ اس کے بعد بھی کچھ عرصے تک پورا کام نہ کرے گی۔

"تم اپنے بچوں کو کب تک دودھ پلاتی ہو؟"

ایک نے کہا "ہم انہیں دو سال تک دودھ پلاتی ہیں"۔ دوسری نے کہا "تین سال تک" میراسن نے سامنے کے کچھ دانت نمایاں کرتے ہوئے کہا کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ تین سال میں تین بچے ہو جائیں گے۔ اس پر ایک پُرزور قہقہہ لگا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس جواب کی شوخی پہ کر اپنی بات کہو۔ کیونکہ وہ پانچ بچوں کی ماں تھی۔

"کیا تم لڑکے اور لڑکی میں کوئی تمیز کرتی ہو؟"

"ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں ایک ہی رحم سے پیدا ہوتے ہیں"۔ لیکن ایک اور نے ساتھ ہی کہا اس کے باوجود ہم لڑکے کو زیادہ پیار کرتی ہیں۔

میں نے پوچھا" تمہارے خیال میں عورت کے کتنے بچے ہونے چاہئیں؟"

"جتنے اللہ دے"۔ لیکن میر امن نے اس سے اتفاق نہ کیا اور کہا" دو لڑکے اور دو لڑکیاں، چار ہوں تو اچھا ہے۔ اگر زیادہ ہو گئے تو ہم ان کی مناسب پرورش نہ کرسکیں گی۔ انہیں کرتا اور جوتی نہیں مل سکتی۔ اور وہ ڈڈے (ایک قسم کی مچھلی) کی طرح ننگے ادھر ادھر اچھلتے پھرتے ہیں۔

"تمہارے بچے کس وقت سے اپنا کام کرنا سیکھتے ہیں؟"

"لڑکا جب چھ برس کا ہوتا ہے تو وہ مویشیوں کو لے کر باہر جاتا ہے۔ اور لڑکی سات برس کی عمر میں برتن مانجنے، ترتیب وار رکھنے اور ادھر ادھر ہلانے شروع کر دیتی ہے کچھ عرصہ بعد وہ کاتنا شروع کر دیتی ہے۔ (دس سال سے کم عمر کی بہت سی ایسی لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا گیا جو کات سکتی تھیں) اور اپنے باپ کا کھانا اس کے پاس کھیتوں میں لے جاتی ہے۔ اور سب سے آخر میں وہ چکی پیسنا سیکھتی ہے۔ یہ سب سے زیادہ سخت کام ہے۔ اسمیں بڑی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے"۔

"کیا زمانے میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے؟"

"زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ نئی ہوا چل رہی ہے اور اب بچے اپنے والدین کے احکام کی پرواہ نہیں کرتے۔ ان کی آنکھیں اوپر اٹھ گئی ہیں۔ اور کوئی شرم باقی نہیں رہی ہے"۔

"ایسا کیوں کر ہوا ہے؟"

"بڑا بھائی اپنے باپ کو گالیاں دیتا ہے اور چھوٹا انہیں سنتا ہے اور ویسا ہی کرتا ہے"۔

"تم انہیں سزا کیوں نہیں دیتیں؟"

"وہ ہماری اولاد ہیں اور ہمیں ان سے محبت ہے"۔

۲۵ مارچ۔ پسرور سے ندوھکی براستہ ڈھوڈا (۱۲ میل)

دنیا اور موسم بہار کی دنیا زیادہ سے زیادہ دلربا ہوتی جاتی ہے۔ تمام سڑک پر

گھاس ہی گھاس ہے اور اس کے دونوں طرف شیشم کے درخت اپنی بھوری وردی، سبز لباس سے بدل رہے ہیں۔ پکتی ہوئی گیہوں دونوں طرف دُور افق تک پھیلی ہوئی ہے۔ اور ایک سُنہرا سمندر بکھرے ہوئے درختوں اور گاؤں کے جزیرے سے پرے تک لہریں لیتا دکھائی دیتا ہے۔ ہماری پشت کی جانب ہمالیہ دیوی کی برفانی کلغی موسم گرما کے آسمان پر (ایک ایسا گھر جسے انسانی ہاتھوں نے تعمیر نہیں کیا۔ بلکہ ازل سے چلا آیا ہے) بادل کے ٹکڑے کی طرح تیرتی نظر آتی ہے۔ اگر انسان ان سب چیزوں کو دیکھے اور احساس پیدا کرے تو اس کی محنت شاقہ کا بہت بڑا ثمرہ ہے۔ لیکن شائد وہ ارادۃً ایسا نہیں کرتا +

لباس اور خیالات میں ترقی

ہم ایک ایسے گاؤں کے پاس پہنچے۔ جس کے باہر بیس کے قریب تین برس سے اوپر کی مختلف عمر کے لڑکے اُن کنوں کے چھلکے اُتارنے میں (اور چوسنے میں بھی) جنہیں اپنے کے۔ لئے دو دو شگوفوں والے ٹکڑوں میں کاٹا تھا۔ اس گاؤں میں جو پانچ سو گھروں کا ایک بڑا گاؤں ہے۔ دو بنک ہیں۔ اور ان کے ممبروں میں سے تیس یا چالیس ملاحظہ کے لئے سڑک پر کھڑے تھے۔ ہم ایک سیاہ نیم دائی گیدڑ کے خوش آیند سائے میں بیٹھ گئے۔ اور اپنے آپ کو ایک غیر معمولی طور پر ترقی پکڑتی ہوئی فضا میں پایا۔ بلاشبہ یہ فضا اس قدر ترقی پذیر تھی کہ دیہاتی سکول کے اُستادوں میں سے ایک ایک طرف پگڑی اور۔ دوسری طرف ہیٹ پہنے ہوئے آیا۔ اور ان دونوں کے درمیان ننگی ٹانگوں پر چمڑے کے تسموں سے اُودے رنگ کی جرابیں چڑھائی ہوئی تھیں۔ ان کے اوپر خاکی رنگ کی نیکر تھی۔ اور ہندوستانی رواج کے مطابق کسی قدر سفید قمیض ڈھیلا، ڈھالا لٹک رہا ہے۔ (ایک نہایت ہی حسین اور خوش خلق شخص تھا)۔ سکرٹری بالکل اسکاٹ تھا وہ ایک تیز فہم اور باتونی مہاجن تھا۔ جو کئی سال تک ملکینکل ٹرانسپورٹ میں کام کرنے کے بعد اپنے آبائی پیشے بنی دُکانداری کی طرف لوٹ آیا تھا۔ بے شمار لوگ اخبار پڑھتے تھے۔ اور اس کئی سومیل کے دورے میں یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ گول میز کانفرنس کا ذکر کیا گیا وہ لوگ جو زمین پر بیٹھے تھے۔ اس اشارے کو فوراً ہی سمجھ گئے تھے۔ اور یہ بھی کہ جب ہم

گاؤں کے کھیتوں کے متعلق باتیں کرنی شروع کیں تو کسی نے کہا (دوسرے اس کے ساتھ متفق معلوم ہوتے تھے) کہ ان کے بغیر بھی کام چل سکتا ہے۔ اور اگر مناسب طریق پر غور کیا جائے تو ان سے کوئی بھی نہیں ہے۔" یہ ٹھیک نہیں کہ ہم اچھا کام کریں اور دوسرے بُرا۔" میں نے پوچھا کہ تمہاری عورتوں کا اس کے متعلق کیا خیال ہے۔ انہوں نے کہا کہ انکا بھی یہی خیال ہے۔ کیونکہ ہمارا اُن سے تبادلۂ خیالات ہو جاتا ہے۔ یہ سب باتیں عوام کے نقطۂ خیال سے کہیں آگے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جوں جوں آدمیوں کے خیالات بدلیں گے عورتوں کے بھی بدل جائیں گے۔ کل ہی عورتیں کہہ رہی تھیں۔ " نئی ہوا چل رہی ہے۔"

ایک شخص جس نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا

گفتگو ایک عیسائی دبّاغ کی موجودگی سے شروع ہوئی۔ اس ضلع میں سات فیصدی لوگ عیسائی ہیں۔ اور ایک یا دو نسلیں پہلے تقریباً تمام اچھوت تھے۔ وہ اپنے کام کی وجہ سے اتنے اچھوت نہ تھے جتنے کہ عادات کی وجہ سے (ان میں سے اکثر بھنگی تھے) اور ایسے جانوروں کا گوشت کھا لیا کرتے تھے جو مر جاتے تھے۔ اور ہم انہیں اپنے درمیان اس طرح نہ بیٹھنے دیتے تھے۔ جس طرح کہ اب یہ آدمی ہے۔ اُن دنوں میں اسے دُور بیٹھنا پڑتا تھا (زیادہ فاصلہ ظاہر کرنے کے لئے ایک ہاتھ اُٹھایا گیا) اُنہوں نے ہمارے برابر کی شاہراہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔" ہم انہیں یہ سڑک بھی نہ استعمال کرنے دیتے تھے۔ جہاں کہیں میں نے تبدیلیٔ مذہب کے متعلق تحقیقات کی ہیں۔ اچھی اطلاعات بہم پہنچی ہیں۔ شاہ پور میں میں سیالکوٹ کے عیسائیوں کی ایک نو آبادی میں پہنچا جن کی خوبیوں کی سب لوگ تعریف کرتے تھے۔ کل والے گاؤں میں جہاں چالیس یا پچاس کنبے تھے۔ لوگوں نے کہا: "انہیں مت (سمجھ) آگئی ہے۔ اور وہ اسے اپنے بچوں کو دیتے ہیں اور ان کے بچے اسے اپنے والدین کو دیتے ہیں کیونکہ وہ سکول میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس سے پہلے وہ جانوروں سے کم نہ تھے۔ اور اپنے دشمنوں کے مویشیوں کو مار دیا کرتے تھے۔ اب وہ آدمی بن گئے ہیں۔"

ہماری گفتگو کا منشا ہمیشہ مذہبی نہیں ہوتا۔ ایک مسلمان افسر نے مجھے بتایا کہ کل یہ بھنگی

میرے پاس آیا اور اس نے اعلان کیا کہ میں عیسائی بننے والا ہوں تاکہ میں اپنی لڑکی کی شادی کر سکوں۔ وہ اسی ضلع کا رہنے والا تھا۔ اس نے بتایا کہ اب ہم میں سے اس قدر کم لوگ اپنے پرانے طریقوں پر قائم ہیں کہ مناسب دُلہا ملنا مشکل ہے۔ نئے نئے عیسائی زیادہ تر کھیتوں میں مزدوری کا کام کرتے رہتے ہیں۔ اور ان کی عورتیں زمینداروں کے گھروں میں سے کوڑا کرکٹ اُٹھاتی ہیں اور اُپلے تھاپتی ہیں۔ لیکن دوسری نسل میں وہ گھروں کی غلاظت اُٹھانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ زیادہ سمجھدار اور عالی ہمت لوگ صحیح معنوں میں تعلیم کی طرف آ رہے ہیں۔ اور محرّر بن رہے ہیں۔

قیام گاہیں

ہم گھوڑوں کی پیٹھ پر بیٹھے ایک سرسبز محر بدار راستے میں سے چلتے رہے یہانتک کہ اپنی آخری قیام گاہ تک پہنچے۔ جو گیہوں کے وسیع کھیتوں کے وسط میں بنی ہوئی تھی۔ اس ۱۹۰ میل کے سفر میں جن قیام گاہوں میں ہم نے آرام کیا۔ اور مختلف اقسام کی ہیں۔ بعض کے ساتھ باغات ہیں۔ اور اکثر ان سے محروم ہیں۔ چوکیدار سب میں ہیں (اس صورت میں ایک جنگ آزمودہ تمغوں والا سپاہی تھا) بہت سی قیام گاہوں میں بھنگی ہیں جو اپنی قسم کے لوگوں میں سب سے زیادہ معمّر ہیں۔ اور صرف چند ایک میں سقّے ہیں۔ سب میں ایک ایک یا دو دو اصطبل ہیں۔ لیکن جب سے گھوڑوں کا زمانہ ختم ہوا ہے۔ بعض بعض اصطبل گودام بن گئے ہیں۔ عمارتیں بذاتِ خود نہایت مضبوط بنی ہوئی ہیں۔ لیکن مجھے ایسی کوئی قیام گاہ یاد نہیں پڑتی جسمیں ذرا بھی کوئی خوبی یا خوبصورتی پائی جاتی ہو۔ اس پر بھی ان کے اندرونی حصّے کافی آرام دہ ہیں۔ اور بالکل نئی گاہوں میں جو نئی بار میں بنی ہیں پردے، کھونٹیاں، اینٹوں کے بنے ہوئے آتشدان اور آفتابہ و چلمچی کیلئے سنگ مرمر کی سلیں ہیں۔ اور یہ تقریباً باعث تعیش ہیں۔ سوتی دریاں سب جگہ ہیں۔ اور سب پر سپاہی کے بڑے بڑے دھبّے ہیں۔ اکثر قیام گاہوں کی دیواریں سفید ہیں۔ اور ضلع کے نقشے یا فیس و فاصلہ کی اطلاعات کے علاوہ اور کوئی چیز باعث زینت نہیں ہے۔ بعض میں نہایت حوصلہ مندی سے کام لیا گیا ہے۔ اور اس قیام گاہ میں آتشدان کے اوپر جاپانی چٹائی لگی ہوئی ہے۔ اور وہ اسجگہ تک پہنچتی ہے جہاں بادشاہ کی روغنی تصویر

متعلق ہے۔ بہت سی قیام گاہوں میں مختلف قسم کے رسالے اور باتصویر اخبارات بھی ہوتے ہیں۔ جن میں سے پنچ کے پرانے نمبر ان سب سے کہیں زیادہ اچھے ہیں بعض میں کتابیں بھی ہوتی ہیں۔ لیمپ تغیر پذیر شے ہے اور عقلمند بادیہ پیما اپنے ساتھ اپنا لیجاتا ہے۔ وہ نہایت ہی تکلیف دہ باتیں جو ہر شخص کو پیش آتی ہیں۔ سردی میں دھوئیں والی چمنی اور گرمی میں بھونکنے والا کتا ہے (یہ بار بار بھونکتا ہے اور نیند کا دشمن ہے) تمام میں یا تقریباً تمام میں لکڑی اور بید کی آرام کرسیاں ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر اس شخص کے لئے جو فوراً سوجانا نہیں چاہتا ضرورت سے زیادہ آرام دہ ہیں۔ سامان نہایت سادہ ہوتا ہے۔ اور میرا تجربہ ہے کہ چارپائیاں کبھی باعث پریشانی نہیں ہوتیں"۔

۲۶ مارچ۔ ندھوکی سے رایا (۹ میل)

کل رات اسقدر گرمی تھی۔ (شام کے وقت سایہ میں درجہ حرارت ۱۰۰ کے قریب قریب تھا) کہ میں آسمان کے نیچے کھلے میدان میں سویا۔ جب لیمپ گل ہوگیا۔ تو ایک ایسا خوشگوار نظارہ سامنے آیا۔ گویا کوئی معجزہ ہو رہا تھا۔ ستارے بنات النعش کے نمودار ہوئے جو اپنا سر نمایاں طور پر شمال کی طرف کئے ہوئے تھا۔ اور نیا نیا چاند اپنی روپہلی کشتی کو اپنے راستے کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اور اس سے زیادہ خوشگوار وہ بیداری تھی جب صبح گلگونہ لئے ہوئے تھی۔ اور فاختائیں حق سرہٗ کی ضرب لگا رہی تھیں۔ اور ساتھ ہی یہ احساس ہو رہا تھا کہ جس کام کے لئے آج سے چار ماہ پہلے نکلے تھے۔ اب تقریباً پورا ہو چکا ہے۔

بونے والا

ہم گیہوں کے کھیتوں میں سے گذر رہے تھے۔ اور سبزی میں سے ہوتے ہوئے سنہری کی طرف جا رہے تھے۔ کہ ہم ایک ایسے کھیت کے پاس پہنچے جہاں آدمیوں اور لڑکوں کی موجودگی سے زندگی کے آثار پائے جاتے تھے۔ ان سب کی تعداد اُنیس تھی۔ اور ان کے درمیان ایک لمبی سیاہ ریش صورت سفید لباس میں ملبوس تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ کوئی پروہت ہے جسے قربانی کی رسومات ادا کرنے پر

متفور کر لیا گیا ہے۔ اور پروہت وہ بڑی حدتک تھا بھی کیونکہ وہ ایک جاٹ تھا۔ اور اپنی زمین میں بیج ڈالنے کی قدیم رسم کو پورا کر رہا تھا۔ اس مرتبہ وہ میٹھے گنے بو رہا تھا۔ اس کے گرد چوڑے دائرے میں تین ہالی تھے۔ اور ہر ایک بیلوں کی ایک جوڑی کے ساتھ زمین کو پیداوار کے لئے تیار کرتا ہوا ایک دوسرے کے پاس سے اوپر اور نیچے کی طرف گذر جاتا تھا۔ اور ان کے پیچھے پیچھے ایک آدمی اور ایک لڑکا نہایت پھرتی سے گنے کے چھ انچ ٹکڑے کم گہری لیک میں ایک ایک قدم کے فاصلے پر (آدمی کا قدم) پھینکتے جا رہے تھے۔ تاکہ وہ اس وقت تک وہاں آسمان کے نیچے کھلے پڑے رہیں جبتک کہ گیلی کے آنے پر زمین انہیں ڈھک کر اپنے رحم میں جگہ نہ دے۔ اور آگے پیچھے چلتے ہوئے وہ مسرت خیز آواز سے اللہ۔ اللہ کہتے ہوئے اُس منعم حقیقی کی یاد کرتے تھے۔ جو تمام اچھی چیزوں کا دینے والا ہے۔ یہ لوگ مسلمان تھے۔ لیکن صرف مسلمان ہی بیج ڈالتے وقت اللہ کی یاد نہیں کرتے۔ بعد میں ہم سکھ اور ہندو جاٹوں سے ملے جنہوں نے ہمیں بتایا کہ ہم بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ اور جب میں نے اُن سے سوال کیا کہ کیوں؟ تو اُنکا جواب یہ تھا۔ اللہ اور خدا ایک ہی بات ہے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب کو اسی نے پیدا کیا ہے۔ اور ہم ہر کام اُس کا نام لیکر کرتے ہیں۔ جب ہم گیہوں بوتے ہیں تو دھرتی ماتا کو ہاتھ باندھ کر چھوتے ہیں۔ اور جب ہم ملشکر بوتے ہیں تو یہ نعرہ لگاتے ہیں " اللہ۔ اللہ "۔

اب کون ہے جو یہ کہے کہ دیہات شہروں سے سبق لینے کی نسبت انہیں زیادہ سبق نہیں دے سکتے؟"

باب چہاردہم

گاؤں کے کمین

مختلف جماعتیں

میرے دونوں دوروں میں سڑک پر، کھیتوں میں اور صحنوں میں گاؤں کے کمین اکثر میرے دیکھنے میں آئے۔ اور چونکہ وہ دیہاتی طبقے کا لازمی عنصر ہے ضروری ہے کہ اس کے لئے ایک علیحدہ باب لکھا جائے۔

ہندوستان میں ذات اور پیشے کا بہت گہرا رشتہ ہے۔ اور اس رشتے نے کام کو تقسیم کردیا ہے۔ یہ تقسیم گاؤں میں انتہائی سادہ صورت میں دیکھی جاسکتی ہے۔ واضح الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ زمیندار یا مالکان وہ زمین کے مالک ہیں اور اس کی کاشت کرتے ہیں اور اس کے علاوہ ہر کام نیچ کمین (جیسا کہ عام طور پر انہیں کہا جاتا ہے) کرتے ہیں۔ وسطی پنجاب میں ہر گاؤں میں خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا اپنا اپنا بڑھئی۔ لوہار۔ کمہار۔ موچی۔ تیلی۔ درزی۔ رنگریز اور غالباً سنار بھی ہوتا ہے۔ یہ لوگ کاریگر ہیں۔ اور وہ لوگ جو پورے کمین ہیں۔ حجام۔ سقہ۔ دھوبی۔ ڈوم۔ چمار۔ چوکیدار اور بھنگی ہیں۔ سب سے آخر میں مُلا یا پروہت کا نام ہے۔ پہلے دورے میں میں دو ایسے گاؤں میں پہنچا جو ابھی بسائے جارہے تھے۔ اور جہاں زمیندار آبادکاروں نے اپنے گرد گاؤں کے کمیوں کی چھوٹی چھوٹی جماعتیں اکھٹی کر لی تھیں۔ جن میں ایک جگہ تو ایک نجومی بھی شامل تھا۔ بارہویں باب میں ہم نے دیکھا کہ کاریگروں اور کمیوں نے آبادکاروں کی نیلی بار میں ان کے نئے گھروں تک کس طرح پیچھا کیا۔ برہمن سے لیکر دباغ تک اُن تمام لوگوں کے جو گاؤں کی خدمت کرتے ہیں اور اس کی ضروریات بہم پہنچاتے ہیں۔ باقاعدہ مؤکل (ججمان) ہوتے ہیں۔ دیہاتی طبقے میں انصاف پسندی کا اس قدر لحاظ رکھا جاتا ہے کہ جب کوئی کمین مرجاتا ہے تو

جس طرح زمیندار کے مرنے پر اسکی زمین اس کے بیٹوں میں تقسیم ہوتی ہے۔ اسی طرح یقینی طور پر اس کے مؤکل اس کے بیٹوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح سے اگر کوئی پروہت یا حجام ۱۰۰ کنبوں کی خدمت کرتا ہے اور دو بیٹے چھوڑ کر مرتا ہے تو ہر ایک کو پچاس پچاس مؤکل ملیں گے۔ اسباب میں کمین کو اپنے آقا پر فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ زمین نہیں بڑھتی اور وقت آنے پر ۵۰ کنبوں کے ۱۰۰ کنبے بن سکتے ہیں۔

جو لوگ گاؤں کی خدمت کرتے ہیں۔ ان کی تعداد اور قسم اُس کے جائے وقوع اور آبادی پر منحصر ہے۔ چھوٹے گاؤں میں ہر جماعت کے آدمی کے لئے کام بہم نہ پہنچ سکے گا۔ اسی لئے صوبے کے بعض حصوں میں خاص خاص قسم کی جماعتیں بالکل نہیں پائی جاتیں۔ مثلاً چمار یا کھٹیک دریائے بیاس کے جنوبی اضلاع میں ہزاروں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اور دریائے بیاس و چناب کے درمیانی علاقے میں اب بھی ایک دو ہزار دیکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس کے شمال اور جنوب میں وہ بالکل نہیں دیکھے جاتے۔ اور مردہ جانوروں کی کھال اُتارنے کا کام جوکہ دباغ کا نہایت ہی اہم کام ہے۔ بھنگی انجام دیتا ہے یا یہ ہی ممکن ہے کہ چمار کرتا ہے۔ اسی طرح سے مغربی پنجاب میں بہشتی اور دھوبی دونوں شاذ ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ حالانکہ دوسری جگہوں میں بہشتی کا ہونا لازمی سمجھا جاتا ہے۔ اور اسے گاؤں کے سب کمینوں میں اوّل درجہ دیا جاتا ہے۔ کسی حد تک ان کی تعداد گاؤں کے بڑے خرچ کے لحاظ سے بھی مختلف ہوتی ہے۔ جاٹ۔ اراعین یا سینی قوم کے لوگوں کی نسبت جنکی محنت اور کفایت شعاری (جو سب سے کم ہے) کا معیار بہت بلند ہے۔ راجپوتوں کے ہاں جن میں پردہ کی سختی اور اونچی ذات کے رسم و رواج ہیں۔ کمین زیادہ ہوتے ہیں۔

ہندوستانی سوسائٹی کی شاندار طریق پر وضع کی ہوئی عمارت میں ہر شخص اپنی اپنی جگہ رکھتا ہے۔ اور شاذ ہی دو جگہیں ایک ہی سیدھ میں ہوتی ہیں۔ وہ دبّاغ جنہیں ہم ہانسی میں ملے تھے اور جو بھیڑوں اور بکریوں کی کھالیں رنگتے تھے۔ اُن دبّاغوں سے جو بڑے مویشیوں کی کھالیں رنگتے تھے ذرا اونچے درجے کے شمار کئے جاتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کیونکہ ان میں مقدس گائے کی کھال شامل تھی۔ اور ایسے ہی امتیازی مدارج کانگڑہ کے اچھوتوں میں ہیں۔ گاؤں کے اُن کمینوں میں سے جو مُدتوں خدمت کرتے ہیں۔ سب سے اعلیٰ و اولیٰ مرتبہ حجام کا ہے۔ آمدنی کے لحاظ سے نہیں بلکہ عوام میں مقبول ہونیکی

وجہ سے۔ اور یہ مرتبہ اسے زیادہ قینچی یا اُسترا چلانے میں مہارت ہونے کی وجہ سے حاصل نہیں ہے بلکہ اس خدمت کی وجہ سے ہے جو وہ شادی کے اہم معاملہ میں بجالاتا ہے۔ چونکہ کوئی شخص اپنی حجامت خود نہیں بناتا اور یہاں تک کہ ناخن بھی نہیں تراشتا اس لیئے اسے تمام گھروں میں خوش آمدید کہا جاتا ہے اور وہ مانا ہوا بچولی (دو شخصوں کے بیچ میں آنے والا) ہے۔ اور تمام پنجاب میں وہ اب بھی وہی خدمت بجالاتا ہے۔ جو وہ کبھی ہند سے بغداد تک بجالاتا تھا۔ اس کا کام منگنی پر ہی ختم نہیں ہوجاتا بلکہ وہ شادی کے موقع پر مہمانوں کی خاطر تواضع میں بھی (مہمان نوازوں کا) ہاتھ بٹاتا ہے اور اکثر باورچی کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ اور اسکی بیوی عورتوں کے بال بناتی ہے۔ اور بعض اوقات گھر کے سامنے کے حصے کو نقش و نگار سے آراستہ کرتی ہے۔ وہ ختنہ کی رسم بھی ادا کرتا ہے۔ اور بطور جراح بھی کام کرسکتا ہے۔ سڑک پر وہ اکثر اپنے ولی نعمت کے رشتہ دار یا دوست کے نام پیغام یا دعوتی رقعہ لے جاتا ہوا ملے گا۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے کسی اور کمین کی نسبت اسے عورتوں سے ملنے جلنے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ لیکن اس کی یہ حیثیت زمانے کے ہاتھوں خطرے میں ہے۔ صوبے بھر میں اقتصادی پستی نے شادیوں کے اخراجات بہت کم کر دیئے ہیں۔ اور اس کا خمیازہ اُٹھانے میں وہ سب سے پہلا شخص ہے۔ ضرب المثل ہے کہ "بیاہ نائیاں تے چھنج بھرائیاں" یعنی شادی حجام کے لئے ہے اور کشتی ڈوم کے لئے۔ اب گذشتہ ایام کی نسبت بہت کم مہمانوں کو دعوت دی جاتی ہے۔ اور جو آتے ہیں وہ بہت تھوڑا عرصہ ٹھہرتے ہیں۔ بخشیش بھی بہت کم ہوگئی ہے۔ جوڑ ملانے والے کی حیثیت سے بھی اب اس کی چاہ عام نہیں رہی۔ انتشار تعلیم کے ساتھ ساتھ خاوند اور بیوی کے تعلقات زیادہ گہرے اور مساویانہ ہوتے جاتے ہیں۔ اور دُلہا و دُلہن کا انتخاب نہایت احتیاط سے کرنا پڑتا ہے۔ ایک نامہ نگار کا بیان ہے کہ لوگ عقلمند ہوگئے ہیں اور اسے اتنا اہم معاملہ خیال کرنے لگ گئے ہیں کہ اب اسے کسی حجام کی توہمات اور دغابازیوں کے سپرد نہیں کرتے۔ مختصر یہ کہ اندیشہ ہے کہ اس کے پاس گذارے کے لئے محض قینچی اور اُسترا ہی رہ جائیگا۔

لوہار، بڑھئی، کمھار اور جُلاہا

اس سے دوسرے درجے پر ہر دلعزیز اور عام طور پر آمدنی کے لحاظ سے ذرا اعلےٰ

مرتبے پر بڑھئی اور لوہار۔ بڑھئی اپنے سرپرستوں کے ہلوں، چارپائیوں، چرخوں، بلونیوں اور جوڑیوں کا ذمہ دار ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کے گھر کی چھتوں، دروازوں اور گاڑیوں کی مرمت بھی اسی کے ذمّہ ہے۔ لوہار ان کے ہلوں کی پھالیاں، درانتیاں، کلہاڑے، پھاوڑے، کڑنیاں اور تسلے تپاتا ہے اور دھات کا اور کوئی کام جس کی ضرورت ہوتی ہے کرتا ہے۔ اگر حجام اپنے مرتبے سے گر رہا ہے تو جنگ عظیم کے بعد سے بڑھئی کا درجہ بلند ہو رہا ہے۔ اس نے دولت کی اس درآمد سے بہت ہاتھ رنگے ہیں جو قیمتیں چڑھ جانے کے ساتھ ساتھ کچھ آئی۔ اور جہاں کہیں فوجی ملازمت نقل مکانی یا بڑی بڑی جائیدادوں نے لوگوں کو خوشحال بنا دیا۔ لاتعداد دیہاتی مکانوں کی تعمیر نو کا سبب بنی۔ وہ کمین جس نے جنگ عظیم کے بعد سے بہت زیادہ نقصان اٹھایا ہے کمہار ہے۔ ایک نسل پہلے تقریباً ہر جگہ اسے پہلے پانچ کمینوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اور دریائے ستلج کے جنوبی علاقے میں جہاں ہندوانہ رسومات مٹی کے بے شمار برتنوں کی فراہمی کا مطالبہ کرتی ہیں۔ اب بھی یہی صورت ہے۔ اور یہی کیفیت دریائے چناب اور جہلم کے مغربی علاقے میں ہے۔ جہاں کو بہت اہمیت دی جاتی ہے اور رہٹ میں مٹی کی ٹنڈیں لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور "مٹی" نمائش و استعمال دونوں لحاظ سے رکھی جاتی ہے۔ لیکن نہری بستیوں میں جہاں کنوئیں سے کام نہیں لیا جاتا اور وسطی پنجاب میں جہاں لوہے کے ڈولوں نے جگہ جگہ مٹی کی ٹنڈوں کی جگہ لے لی ہے۔ دھوبی اور سقّہ دونوں اس سے پہلے درجے پر آ جاتے ہیں۔ اور اب اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ روزی کمانے کی خاطر ایک یا دو گدھے پیداوار کو منڈی میں لے جانے کے لئے رکھے۔ قیمتیں گرنے سے صرف ایک کاریگر نے فائدہ اٹھایا ہے۔ اور وہ جلاہا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ اُن کفایت شعارانہ طریقوں میں سے جن پر عمل کرنے کے لئے کسان مجبور ہے۔ ایک یہ ہے کہ وہ بازار سے بہت کم چیزیں خریدے اور گھر پر سوت بہت کاتا جائے۔ اسکی وجہ سے جلاہے کے پاس کام زیادہ ہو گیا ہے۔ اور اسے اس کی زیادہ ضرورت بھی ہے کیونکہ قیمتیں گرنے سے پہلے کوئی مزدور پیشہ جماعت اُس سے کم نہ کماتی تھی۔ اور درحقیقت وہ محض ۵ یا ۶ آنے روزانہ کماتا تھا!!

مُلّا اور پروہت

محکمہ مال اور پنجاب کے اقتصادی تحقیقاتی بورڈ کی پیروی کرتے ہوئے میں نے مُلّا اور پروہت کو کمیّوں میں شمار کیا ہے۔ ممکن ہے بعض خیال کریں کہ یہ درست نہیں ہے۔ اور جب میں نے اس امر پر تعجب ظاہر کیا کہ سکھوں کے گاؤں میں ایک بنک جس میں ایک یا دو براہمن ممبر شامل تھے۔ "خادمانِ دہ کی انجمن امداد باہمی قرضہ" کے نام سے موسوم تھا۔ تو میرے شُبہے کو ایک ممبر کا (جو خود دیہاتی تھا) یہی خیال تھا۔ اس نے کہا کہ یہ الفاظ غیر واجب ہیں۔ لیکن حاضرین جاٹوں نے اس سے اتفاق نہ کیا۔ انہوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ براہمن کمین ہیں اور ہمارے جیسے زمیندار نہیں ہیں۔ باوجود اس کے کہ سکھ اور ہندو مت کا باہمی تعلق بہت گہرا ہے۔ سکھ جاٹ عام طور پر اسی خیال کے حامی ہوتے ہیں۔ ایک سکھ نامہ نگار لکھتا ہے کہ برہمن کو کمین سمجھا جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا جاتا ہے۔ اگر چاہو تو اسے اعلےٰ درجے کا کہہ سکتے ہو لیکن وہ ہے ایک کمین ہی اور اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔ اس کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ وہ اپنے سرپرست کے مہمانوں کا استقبال کرے۔ ان کی جائے رہائش کا انتظام کرے۔ ان کی خدمت خدمت بجالائے اور حقّہ پینے والوں کے لئے حقّہ بھروائے۔ اور یہی کام اسکی بیوی مہمان مہمان عورتوں کے لئے کرتی ہے۔ کبھی کبھی (حجام کی طرح) اس سے فاصد کا کام لیا جاتا ہے۔ اور کسی معاشرتی رسم کے انتظامات اور سودے سلف میں اکثر اس سے مشورہ لیا جاتا ہے۔ لیکن اب وہ پروہت کی حیثیت سے کام نہیں کرتا۔ اور اگر کسی رسم کو ادا کرنیکا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ تو گر نتھی کو بُلا لیا جاتا ہے۔ اور وہی پورنماشی اور چاند گرہن کا اعلان کرتا ہے۔ ہندوں کے گاؤں میں جو اکثر دریائے ستلج کے جنوب اور ہمالیہ پہاڑ کے دامن میں اور اس کے ساتھ ساتھ دریائے چناب تک پائے جاتے ہیں۔ صورت حالات مختلف ہے اور برہمن یا کنبے کا پروہت ہونے کی حیثیت سے اپنا قدیم فرض انجام دیتا ہے۔ اس صورت میں زمیندار اُسے اپنے برابر کا سمجھتے ہیں۔ اور کانگڑہ کے پہاڑی اضلاع میں جہاں ہندو آبادی ہے۔ راجپوتوں کی طرح سے اور تمام لوگوں پر فوقیت حاصل ہے۔ اور لوگ "ماتھا ٹیکنا" کہ بندگی کرتے ہیں۔ اس کے برعکس مُلّا کو ہر جگہ صاف طور پر گاؤں کے کمیّوں میں

شمار کیا جاتا ہے۔ تاوقتیکہ وہ کوئی مولوی اور آیاتِ قرآنی کا عالم ہو۔ جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے برہمن اور ملّا میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ دس میں سے نو صورتوں میں دونوں اَن پڑھ ہیں۔ لیکن برہمن ہندوستان کی سب سے اونچی ذات سے تعلّق رکھتا ہے۔ اور مُلّا اکثر نیچ ذات کا ہوتا ہے۔ مغربی پنجاب میں بالعموم وہ جلاہا ہوتا ہے۔ اور کہیں اور اگر وہ زمیندار ہے تو اکثر اس لئے ہے کہ کسی نہ کسی روگ نے اسے چلانے سے معذور کر دیا ہے"۔

چمار اور بھنگی

اس میزان کے دوسرے سرے پر جو برہمن اور حجام سے شروع ہوتی ہے۔ چمار اور بھنگی ہیں۔ بھنگی گاؤں کی صفائی کرنے والا ہے۔ اور جہاں کہیں پردہ پر عملدرآمد ہے اُسکے ذمہ ایک اور ضروری فرض بھی ہے۔ چمار دباغت اور چمڑے کا کام دونوں کرتا ہے۔ اور نہ صرف اپنے ولی النعمت کے مردہ مویشیوں اور جانداروں کی کھال اُتارتا ہے۔ بلکہ اس کے لئے جُوتے، سانٹے اور رسّے بہم پہنچاتا ہے۔ ایک بات میں دونوں برابر کے حصہ دار ہیں۔ جب بوجھ اُٹھانے کے لئے دو آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو خواہ یہ بوجھ کھیت در کھیت لگان کے کاغذات اُٹھا کر لے جانے کا ہو یا کسی معمولی افسر کا سامان ایک سے دوسرے گاؤں پہنچانا ہو۔ نمبردار دونوں میں سے ہر ایک کو اسی طرح حکم دے سکتا ہے جس طرح کہ سکول میں اعلےٰ جماعت کا لڑکا ادنےٰ جماعت کے طالب علم سے کام لے سکتا ہے۔ اور جب کھیتی باڑی کا کام زیادہ ہو تو ضروری ہے کہ وہ اسمیں اپنے ولی نعمت کو مدد دیں اور غلہ کاٹنے دگاہنے اور گڑ تیار کرنے میں اس کا ہاتھ بٹائیں۔ وہ صوبے کے سب سے بڑے زراعتی مزدور بھی ہیں اور جب (جیساکہ اکثر صورتوں میں دیکھا گیا ہے) وہ عیسائی، مسلمان یا سکھ ہو جاتے ہیں۔ اور یا آریہ سماج مذہب اختیار کر لیتے ہیں۔ تو یہ اُن کا سب سے بڑا پیشہ بن جاتا ہے۔

چھوت چھات

راسخ الاعتقاد ہندو کی نظر میں بھنگی اور چمار دونوں اچھوت ہیں۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ یہ میں نے اپنے پہلے دورے میں واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ عادت و پیشہ دونوں کے

ملاپ کا نتیجہ ہے۔ گرم ملک کے لوگ قدرتی طور پر سرد ملک کے لوگوں کی نسبت ایکدوسرے کی عادات سے جلد اثر پذیر ہوتے ہیں۔ اور یہ صورت دو چند ہو جاتی ہے جب وہ زمین پر چوکڑی مار کر بیٹھتے ہیں کیونکہ جیسا کہ ہم نے گذشتہ باب میں دیکھا۔ کرسیوں پر بیٹھنے کی نسبت اس صورت میں ایک دوسرے سے چھونے کا زیادہ امکان ہے۔ ایک مرتبہ چمار نسل کی ایک انجمن اصلاح رسومات کا معائنہ کرنے کے بعد میں نے انسپکٹر سے کہا کہ باوجود اس کے کہ وہ میرے چاروں طرف بیٹھے تھے مجھے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی ہے۔ اس نے کہا کہ دو مہینے پہلے یہ بات اس طرح نہ ہوتی۔ اس وقت سے انجمن نے انہیں دن میں ایکبار دانت صاف کرنے اور ہفتہ میں ایک مرتبہ کپڑے صاف کرنے سکھائے ہیں۔ لیکن ان میں سب سے گندی عادت یہ تھی کہ وہ مردار کا گوشت کھاتے تھے۔ البتہ بہت سے لوگوں نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ اور جہاں ایسا کر دیا گیا ہے چھوت چھات عنقا ہو گئی ہے۔ یا محض رسمی طور پر باقی ہے۔ اور جب آقا و نوکر کھیت میں پہلو بہ پہلو کام کرتے ہیں اور ایک مشترکہ کام کے رشتہ میں منسلک ہوتے ہیں تو بھی اس کا اسقدر زور نہیں ہوتا۔

ایک مرتبہ جب دریائے بیاس کو عبور کر لیا جائے اور ہندوستان کو پیچھے چھوڑ دیا جائے تو چھوت چھات صرف اُن پہاڑیوں میں اور اُن کے آس پاس دیکھنے میں آتی ہے جہاں ہندو آبادی ہے۔ امرتسر میں جہاں ۳۲۰۰۰ بھنگی ہیں جاٹ اور ارائیں دونوں انہیں کاشتکاری میں اکثر اپنا ساتھی بنا لیتے ہیں۔ اور بشرطیکہ وہ پاخانہ نہ اٹھاتے ہوں (جسکے لئے سوائے اُن جگہوں کے جہاں پردہ کیا جاتا ہے اور کہیں امکان نہیں ہے) وہ اپنے ہمجنسوں کو چھو سکتے ہیں۔ اور ان کی عورتیں دوسرے لوگوں کے گھروں میں داخل ہو سکتی ہیں۔ دریائے راوی کے شمال میں ان کی بہت بڑی تعداد مسلمان یا عیسائی بن گئی ہے اور اس سے اُن کی جبینِ اور وسعتِ نظر بدل گئی ہے۔ گذشتہ باب کے اختتام پر ہم نے دیکھا کہ اس سے اُن لوگوں میں جو عیسائی بن گئے ہیں۔ بہت بڑا فرق پیدا ہو گیا ہے۔ اور یہی بات بڑی حد تک مصلی پر (جیسا کہ اچھوت کو مسلمان بن جانے پر کہا جاتا ہے) اور اُن ہزاروں چماروں اور بھنگیوں پر صادق آتی ہے۔ جنہوں نے سکھ مذہب اختیار کر لیا ہے عرصہ نہیں گذرا کہ مسٹر گاندھی نے لکھا تھا۔ کہ ذات پات کی تمیز کرنے والے ہندوؤں کی کوئی توبہ بھی اس خیالی تنزل کا بدل ثابت نہیں ہو سکتی جو چھوت چھات کا نتیجہ ہے۔ اس لحاظ سے پنجاب

اپنے آپ کو مبارکباد دے سکتا ہے کہ یہاں تعلیم کے اثر اور نئے نظریوں کے قائم ہونے سے یہ برائی آہستہ آہستہ مٹ رہی ہے۔

معاوضہ

دیہاتی رسم و رواج اس قدر تغیر پذیر واقع ہوئے ہیں کہ گاؤں کے کمیئوں کے متعلقہ نتائج کو صرف وسیع پیمانے پر چسپاں کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ بات معاوضے پر بالخصوص صادق آتی ہے۔ عام طور پر (ہمیشہ نہیں) تیلی، جلاہے، درزی اور رنگساز کو اس کا معاوضہ حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے غلے یا نقدی کی صورت میں تھوڑا تھوڑا کر کے ادا کیا جاتا ہے اصطلاحی رو سے وہ گاؤں کے کمین نہیں ہیں۔ کیونکہ حقیقی معنوں میں کمین وہ ہے جو وقتاً فوقتاً اپنے مربی کی فصل کے ایک حصے کے بدلے مخصوص مقررہ خدمات بجا لاتا ہے۔ یہ حصہ رسم یا روایات پر مبنی ہے۔ اور یا تو غلے کا ایک خاص وزن یا فصل کا مقررہ تناسب یا دونوں کا مرکب ہوتا ہے۔

وہ خدمات بھی جو بجا لائی جاتی ہیں مقررہ حدود سے مشروط ہوتی ہیں۔ بعض گاؤں میں مرمت کے لئے بڑھئی کے کام کی حد اسکے ایک دن کا کام ہے۔ (دہاڑی) ہے۔ ضروری ہے کہ ان کاموں کے لئے جو ان حدود سے متجاوز ہوں علیحدہ اُجرت دی جائے۔ اس کے ساتھ ہی یہ کہ وہ اُجرت اس مروّجہ شرح کے مطابق ہو جو اکثر جنس کی صورت میں ہوتی ہے۔ اس طرح سے جالندھر کے گاؤں میں لوہار اپنے ہر دلی نعمت سے مندرجہ ذیل معاوضہ لیتا ہے:۔

اسکی گیہوں اور مکئی کی فصلوں کا ½ ۱ فیصدی۔

جب کبھی گیہوں یا مکئی بوئی جائے تو دو سیر فی جنس۔

روئی کی آخری دو اُترنوں میں سے ایک۔

چار گٹھر چارے کے۔

پانچ سیر گنے کا رس۔

جب کبھی رس نکالنے کی مشین کو اس کی توجہ کی ضرورت ہو تو ۴ گنے۔

جب نئے کنوئیں کا لکڑی کا ڈھانچہ نیچے اُتارا جائے تو دو روپے اور ½ سیر گڑ۔

اور شادی کے موقع پر ایک سیر گڑ۔ دو آدمیوں کا کھانا اور معمولی سا انعام نقدی کی صورت میں۔

نوآبادی میں سکھ جاٹوں کے گاؤں میں برہمن کی واجبات مندرجہ ذیل ہیں:۔
خاص خاص مقررہ موقعوں پر جب وہ اپنے سرپرست کے گھر آئے تو دو سیر یا اس سے زیادہ غلہ۔ سب سے بڑے لڑکے کے جنم پر ایک روپیہ (زیادہ خوشحال لوگ ۵ روپے یا ایک گائے بھی دیتے ہیں) بیٹے کی شادی پر دس روپے۔
جب کسی مُردے کی یاد میں خیرات بانٹنے کے لئے کسی مقدس جگہ جانا پڑے تو ایک روپیہ۔
جب دُلہا کے والدین شادی کی خبر پر آمنا کہیں تو ان کے بھیجے ہوئے دو روپے۔
خاص خاص رسموں کے موقع پر ۵ روپے۔
ایک روپیہ چار آنے ریہن پر آٹے سے مقدس اشلوک لکھنے کے لئے اور شادی کے موقع پر اُن تین دنوں میں (جبکہ عموماً شادی کی دھوم دھام باقی رہتی ہے۔) وہ خود اور اس کا تمام کنبہ مُفت کھانا کھاتا ہے "۔

آمدنی

اس صورت میں جبکہ دیہاتی کمین کو اتنے مختلف طریق سے ادائیگی کی جاتی ہو۔ اور پھر ایسے غیر یقینی موقعوں پر مثلاً پیدائش، شادی اور غمی۔ تو اس کی آمدنی کا تخمینہ لگانا مشکل ہے۔ نوآبادی کے ایک گاؤں میں برہمن کی آمدنی کا اندازہ ۱۱۲ روپے سالانہ سے زیادہ کا نہ تھا۔ لیکن چوکیدار کی آمدنی کا تخمینہ ۴۸ روپے کا یا اوسطاً ۴ روپیہ ماہوار تھا۔ یہ صورت قیمتیں گرنے سے پہلے تھی۔ اور یہ بات کہ اس وقت غریب سے غریب شخص معقول آمدنی پیدا کر سکتا تھا۔ اس ۴۰۰ روپیہ کی رقم سے ظاہر ہے۔ جو ہانسی کے تین چماروں نے بچائے تھے۔ اور ۱۹۳۰ء میں جب میں نے امرت سر میں بھنگیوں کی ایک انجمن کا معائنہ کیا تو میں نے دیکھا کہ ان کے بعض کنبے چالیس روپے ماہوار سے بھی زیادہ کما رہے تھے۔ لیکن یہ اعداد غیر معمولی ہیں۔ اور اقتصادی پستی کے ایام میں تو یقینی طور پر ہیں۔ گاؤں کے کمینوں کے متعلق میری تحقیقات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے وہ لوگ خوشحال ہیں اب ۲۰۰ روپیہ سے لیکر ۳۰۰ روپیہ سالانہ تک سے زیادہ نہیں کماتے۔ اور غریب لوگ ۱۰۰ روپیہ سے ۲۰۰ روپیہ تک (ادنٰے درجے کے اعداد کسی حد تک اُن اعداد سے مشابہت رکھتے ہیں جو گذشتہ صفحات میں (ایک مربعہ والے آباد کار کے لئے دئے گئے ہیں۔ اور نیز اُن سے جو ایک ہل والے زمیندار کے متعلق

درج کئے گئے ہیں۔ اگر آباد کار اور معمولی زمیندار خوشحال ہیں۔ تو اکثر صورتوں میں اس کی وجہ یہ ہوگی کہ ان کے پاس زمین کے علاوہ اور ذریعۂ آمدنی ہے۔ مثلاً فوجی ملازمت۔ اسپر بھی ممکن ہے کہ یہ شبہ کیا جائے کہ کیا وہ اعلےٰ درجے کے دیہاتی کمینوں کی نسبت بالعموم خوشحال ہیں۔

زراعتی اُجرت

ادنےٰ درجے والوں (کی آمدنی) کے معیار کا مقابلہ اُس اُجرت سے کیا جا سکتا ہے جو زراعتی مزدور کو ملتی ہے۔ اور یہ تقابل برمحل ہے کیونکہ (جیسا کہ پہلے بھی مفصل بیان بتایا جا چکا ہے) صوبے میں زراعتی مزدور کی حیثیت سے کام کرنے والے زیادہ تر چمار اور بھنگی ہیں۔ اپنے دورے کے دوران میں میں نے بے شمار زمینداروں سے دریافت کیا کہ تم اپنے مستقل مزدور کو کیا دیتے ہو؟ اس کے نتائج اس باب کے آخر میں) جدول کی شکل میں دئے ہوئے ہیں۔ اُن میں بہت زیادہ تغیر و تبدل پایا جاتا ہے۔ لیکن اُن سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ عام حالات میں مزدور ۹۰ سے ۱۲۰ روپے سالانہ تک کما سکتا ہے۔ بظاہر کم سے کم آمدنی ۸۰ روپے اور زیادہ سے زیادہ (سانگلا کے ایک اراعی کی مستثنےٰ امثال سے قطع نظر کرتے ہوئے) ۲۰۰ روپے ہو سکتی ہے۔ لیکن زیادہ اُجرت صرف دیرینہ ملازموں کو یا ایسی خدمت کے عوض دی جاتی ہے جو نیلی بار میں خاص حالات کے ماتحت کی جائے۔ یا مزدور کو سبزیاں کاشت کرنے میں مہارت حاصل ہو۔ اب پھر معمولی زمیندار اور ہنرمند مزدور کے مابین کوئی تمیز باقی نہیں رہتی۔ اور دونوں کا تقابل کرتے وقت ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ مزدور کے کنبے کے دوسرے جوان افراد کے کمانے میں بھی کوئی مزاحم نہیں ہے۔ جبکہ معمولی زمیندار ۱۵۰ سے ۲۰۰ روپیہ تک (متوسط درجہ کی آمدنی) پیدا کرنے کے لئے اپنی بیوی اور شائد بیٹے کی بھی امداد کا محتاج ہوتا ہے۔

دیہاتی کمینوں کی آمدنی اور زمین کی پیداوار کا تقابل

گذشتہ دو پیراگراف میں دئے ہوئے اعداد زیادہ واضح ہو جائیں گے۔ اگر انہیں نقشہ کی صورت دے دی جائے اور یہ ذیل کے طریق پر کیا جا سکتا ہے۔

نیلی بار کی بستی		سالانہ آمدنی
ا۔ وہاڑی کی گورنمنٹ فارم کے مزارعین منافع فی کیلہ سنہ ۱۹۳	۱۶۰ روپیہ	یہ تھوک منافع ہے اسمیں بیج آلات مویشیوں کو تندرست اور توانا رکھنے کے لئے اور سرکاری واجبات کے اخراجات شامل نہیں ہیں۔
ب۔ سنہ ۱۹۲۴ میں ایک کیلے کی تخمیناً آمدنی جبکہ گیہوں اور کپاس گاؤں میں بالترتیب دو اور چھ روپیہ فی من کے نرخ سے فروخت کیگئی ہو۔	۲۰۰ روپیہ	تھوک منافع جس میں مندرجہ بالا تمام اخراجات ماسوا آلات و مویشیوں کی تخفیف در کے شامل نہیں۔

سیالکوٹ اور گورداسپور کی ایسی جائیدادیں جن کے لئے ایک ہل کفایت کرتا ہے۔

ا۔ خوب سیراب شدہ (۶ ایکڑ) اسی بھاؤ پر جو مارچ سنہ ۱۹۳۱ میں ہے۔	۲۰۵ روپیہ	تھوڑی آمدنی۔ اس میں مویشیوں کے چارے اور خانگی استعمال کی روئی کی قیمت شامل نہیں۔
ب۔ بازاری (۱۰ ایکڑ) مندرجہ بالا بھاؤ پر۔	۱۲۶ روپیہ	تھوک آمدنی۔ اس میں بھی حسب سابق چارہ اور روئی کی قیمت شامل نہیں۔

دیہاتی کمینوں کی آمدنی

آمدنی کا تخمینہ	
ا۔ اعلےٰ درجے کی	۲۰۰ سے ۴۰۰ روپیہ تک
ب۔ ادنےٰ درجے کی	۱۲۰ سے ۲۰۰ روپیہ تک

اُن زراعتی مزدوروں کی آمدنی جو مستقل طور پر ملازم ہیں۔ (سنہ ۱۹۳۱)

ا۔ عام حالات میں	۹۰ سے ۱۲۰ روپیہ تک
ب۔ خاص حالات یا مہارت حاصل ہونے کی صورت میں۔	۱۳۰ سے ۱۹۲ روپیہ تک

ان میں ہم وہ اعداد بھی شامل کرسکتے ہیں جو صفحہ نمبر   پر اُن مزارعوں کے متعلق

وئے ہوئے ہیں۔ جن کے حسابات پنجاب کی مجلسِ تحققات اقتصادیات کی نگرانی میں رکھے جاتے ہیں۔

اوسط آمدنی فی ایکڑ
(اُن تمام اخراجات کو جن کے لئے
جیب سے کچھ نہیں خرچ کرنا پڑتا منہا
کرنے کے بعد۔ لیکن اسمیں کاشتکار
کی اپنی محنت شامل ہے۔)

	نہری	چاہی
۱۹۲۸ - ۹ اور ۳۰ - ۱۹۲۹	۰ — ۱۵ — ۲۸	۰ — ۵ — ۲۵
۱۹۳۰ - ۱ اور ۲ - ۱۹۳۱	۰ — ۹ — ۱۱	۰ — ۵ — ۹

ان اعداد و شمار سے صاف ظاہر ہے کہ معمولی زمیندار خواہ ایک ہل کے ساتھ گھر پر کاشتکاری کرتا ہے یا دو ہلوں کے ساتھ نیلی بار کی نو آبادی میں کاریگر یا اونچے درجے کے دیہاتی کمین سے کسی طرح زیادہ خوشحال نہیں ہے۔

دیہاتی تنور

پانی زندگی کی پہلی ضرورت ہے۔ خوراک سے بھی زیادہ اہم ہے۔ جو اس کے بغیر پیدا نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے یہ مناسب ہے کہ بہشتی کو گاؤں کے کمیّوں میں ایک باعزت اور بعض اوقات نہایت ہی باعزت جگہ دی جائے۔ اور اس کی مناسبت اس صورت میں دوچند ہو جاتی ہے۔ جبکہ اس کی بیوی گاؤں والوں کی روٹیاں تنوریں لگاتی ہو۔ یہاں ہمیں رواج کے اُن اختلافات سے سابقہ پڑتا ہے۔ جو پنجاب کی دیہاتی زندگی کی خصوصیات ہیں۔ اور اس کے دریا ان کی حدبندی کرتے ہیں۔ دریائے راوی کے جنوب اور دریائے جہلم کے شمال میں اکثر عورتیں اپنی روٹی خود تنوریں لگاتی ہیں۔ لیکن ان دونوں کے درمیان جیسا کہ فلسطین کے عربوں میں رواج ہے، اکثر گاؤں میں مشترکہ تنور ہے جہاں سقن کام کرتی ہے دوسری تمام باتوں کی طرح اس میں بھی خوبی و برائی دونوں ہیں۔ برائی یہ ہے کہ آنے جانے میں وقت لگتا ہے۔ اور بعض اوقات تنور پر دیر تک توقف کرنے سے ضائع ہوتا ہے اور وقتاً فوقتاً گاؤں کے جھگڑے انہی معمولی زنلوں سے پیدا ہوتے جن کا اَن پڑھ یا بیکار

عورتوں کے دل بیٹھنے پر پھر جانا یقینی امر ہے۔ خوبی یہ ہے کہ اس سے ایندھن بچ جاتا ہے اور چونکہ عام طور پر اُپلے بطور ایندھن استعمال کئے جاتے ہیں اس لئے اس بچت کے یہ معنی ہیں کہ زمین کے لئے زیادہ کھاد بہم پہنچتا ہے۔ مزید برآں یہ کہ ایک بڑے تنور میں ہر قسم کی جھاڑی جھنکاڑ استعمال کی جا سکتی ہے۔

دیہاتی تنور میں روٹیاں پکتے ہوئے دیکھنا گاؤں کے ایک نہایت ہی خوشگوار مناظر میں سے ہے۔ یہ کتنا خوشنما ہے! مجھے اس کا احساس اس وقت تک ہوا جب ایک دن اتوار کی شام کو ضلع گجرات کے ایک گاؤں میں میری نظر بہشتی کے گھر کے صحن پر اتفاقیہ طور پر پڑی۔ وہاں حسب معمول کیچڑ کی دیواریں تھیں۔ اور تنور (جو کہ زمین میں شراب کے پیپے کی شکل کا ایک کھلا سوراخ تھا) کے پاس سقے کی بیوی نصف درجن عورتوں میں گھری زمین پر بیٹھی تھی۔ سب کی سب مصروف تھیں۔ بعض آٹا گوندھ رہی تھیں بعض پیڑے کاٹ رہی تھیں۔ "پیتل کی ایک چھنتعلی رکابی میں کچھ آٹا ڈالو۔ اسے پانی سے تر کرو۔ مکھن سے ذرا نرم کرو۔ اور پھر دونوں ہاتھوں سے گوندھو" سادہ طور پر اس کی ترکیب اس طرح بتائی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ عورتوں کو بڑی بڑی گانٹھوں والی مٹھیوں کو بند کر کے آٹے کو روٹی کی شکل میں لاتی تھیں۔ کسی ترکیب کی ضرورت نہ تھی۔ نہ ہی اس کی ضرورت روٹیوں کو ہتھیلیوں میں چوڑا کرنے کے نازک کام میں تھی۔ آٹا پتلا ہی پتلا ہوتا جاتا ہے اور روٹی زیادہ ہی زیادہ پھیلتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بالآخر یہ اتنی چوڑی ہو جاتی ہے جتنی کہ کسی بھوکے کو اس کے چوڑا ہونے کی تمنا ہو سکتی ہے۔ پھر نہایت آہستگی سے ایک روٹی کو چنگیر میں رکھ دیا گیا اور ایک ایک کر کے انیس روٹیاں اور اس کے اوپر رکھ دی گئیں۔ یہ وقت تنور کی دبی ہوئی آگ کو بھڑکانے کا ہوتا ہے۔ اب بہشتی کے گھر والی اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اور لمبے جھاڑی دار تنوں کا ایک انگوچھا بھر کر اس میں جھونک دیتی ہے۔ شعلے اونچے اٹھتے ہیں اور اس لمحہ کے لئے جب چمکدار چنگاریاں اُڑتی ہیں تو عورتوں کے مٹیلے چہرے آگ کی روشنی میں سرخ ہو جاتے ہیں۔ پھر ہر طرف خاموشی چھا جاتی ہے اور تنور دہکتا ہے۔ وہ پھر بیٹھ جاتی ہے اور ہنسی خوشی کی باتیں کرتے ہوئے ایک روٹی اٹھا لیتی ہے۔ اور اسے اپنی گیلی انگلیوں سے چھو کر نمی دیتی ہے اور تنور میں لگا دیتی ہے۔ یکے بعد دیگرے سب روٹیاں اسی طرح لگا دی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کے

پہلو میں رکھا ہوا پانی دودھیا اور تنور روٹیوں سے سفید ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی کوئی روٹی نہیں ٹکتی اور پھسل کر آگ میں گر جاتی ہے۔ لیکن آن کی آن میں اسے پھیلا کر پھر اسکی جگہ پر لگا دیا جاتا ہے۔ گیہوں کی روٹیاں پہلے اُتر آتی ہیں۔ اور باجرے کی موٹی موٹی روٹیاں بعد میں یہ اتنی ٹھوس ہوتی ہیں کہ ایک روٹی ایک رکابی ساگ اور ایک گلاس لسی کے ساتھ کھا لینے سے آدمی سیر ہو جاتا ہے۔

نان پز تنور، ایندھن اور محنت بہم پہنچاتی ہے۔ اور اس کے عوض میں نقدی نہیں وصول کرتی بلکہ گاؤں کے صحیح رواج کے مطابق آٹھ روٹیوں میں سے ایک لیتی ہے۔ ریشمی کپڑے پہن کر وہ پھولی نہیں سماتی۔ لیکن کھدر کے سیاہ کپڑے پہن کر بھی اس میں زمینداروں کی اُن تمام بیویوں سے جو اُلٹو بنی اس کے گرد بیٹھی رہتی ہیں زیادہ پھرتی، سمجھ اور آن ہے میں نے اسے یہ کہہ کر گھر کا کہ تمہارا لباس اتنا صاف نہیں ہے جتنا کہ اس کام کے لئے درکار ہے۔ اس نے جواب دیا میرے اوپر کا کپڑا صاف نہیں ہو سکتا۔ یہ آٹے سے سفید ہو جاتا ہے لیکن نیچے کا لباس (یہ کہہ کر اس نے اپنا ٹخنوں تک کا کرتا اٹھایا) صاف ہے۔ اس پر میں نے کہا (مجھے اندیشہ ہے کہ میں دیہاتی آداب سے گر گیا) کہ اس سے زیادہ صاف وہ چنگیریں ہونگی جن میں روٹیاں رکھی جاتی ہیں۔ لیکن اس نے متبسم ہو کر کہا کہ چنگیریں ہر چوتھے یا پانچویں دن دھوئی جاتی ہیں۔ اس لمحہ ایک عورت آنکھوں میں مسکراہٹ لیئے ہوئے اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں نمدار گیہوں سے بھرا ہوا ایک پیتل کا برتن تھا۔ اور وہ اسے بھنانا چاہتی تھی۔ اس کا چہرہ معہ اپنی اُبھری ہوئی ہلکی ہلکی گول رخساروں کی ہڈیوں اور گداز دم ٹھوڑی کے اپنی اندرونی مسرت سے روشن تھا۔ اس نے ہمارے ہر سوال کا جواب نہایت زندہ دلی سے دیا۔ اور صرف اسوقت جب اس سے اس کی ذات کے متعلق استفسار کیا گیا۔ وہ ایک لمحہ کے لئے جھجکی اور پھر آہستگی سے کہا "میں مصلی ہوں"۔ میں بے خبری کے عالم میں راستہ روکے کھڑا تھا کہ ایک شخص نے مؤدبانہ الفاظ میں کہا "اور بھی ہیں جو انتظار کر رہی ہیں اور اندر نہیں آسکتیں"۔ تنور صبح و شام دونوں وقت گاؤں کی خدمت بجا لاتا ہے۔ چونکہ ایک وقت میں صرف چھ عورتیں آٹا گوندھ سکتی ہیں۔ ضروری ہے کوئی نہ کوئی انتظار کرے۔ اور اس خیال سے کہ کسی کی طرفداری نہ کی جائے ہر عورت کو وہاں پہنچنے پر ترتیب وار بٹھایا جاتا ہے۔

کمیں کا میلان طبع

کمیں اکثر اپنے آقا کی نسبت تیز فہم ہوتا ہے۔ اور سقّن وصلّی کا اپنی ہمجنسوں میں ممیز ہونا یا عورتوں کے اس جتھے میں جو ہم نے سیالکوٹ دیکھا تھا۔ میراسن کا نہایت ہی زود فہم ثابت ہونا کوئی اتفاقیہ امر نہ تھا۔ کسان اپنی زمین پر گذارہ کرتا ہے۔ لیکن خوشحال ہو نیوالا کمین اپنی تیز فہمی سے روزی کماتا ہے۔

کسان سوائے ہل، قلم اور تلوار کے کسی اور طرف ہاتھ ڈالنے سے جھجکتا ہے۔ اور یہاں تک کہ ہل چلانے سے بھی اس کی عزت پر حرف آتا ہے۔ لیکن کمیں ہر اس چیز کو جو اس کی دولت میں اضافہ کرتی ہے۔ خوش آمدید کہتا ہے۔ اپنے دورے میں میں ایسے لوگوں سے ملا ہوں جو دھوبی اور درزی دونوں ہیں۔ ایک باپ اور ایک بیٹا دونوں مل کر لوہار اور بڑھئی کا کام کرتے تھے اور ۵۰۰ روپیہ سالانہ کماتے تھے۔ ایسے دباغ اور دھوبی دیکھنے میں آئے جو ساتھ ہی جُلاہے بھی تھے۔ حجام اور بڑھئی جو دوپہیہ چلاتے تھے۔ اور سب سے عجیب بات یہ بھی دیکھی کہ رنگریزوں کو ۔۔ افٹ گہرا کنواں اُتارنے پر لگایا ہوا تھا۔ ہندوستان جیسے ملک میں جو ذاتوں سے بٹا پڑا ہے پیشوں کا یہ ردّ و بدل حیرت انگیز ہے۔ لیکن پنجاب کے اس حصّے پر جو دریائے ستلج کے شمال میں ہے (ہمالیہ کے پہاڑی حصّے کو چھوڑ کر) ہندوستان کے باقی حصّے کی نسبت ہندو مت کا بہت کم اثر ہوا ہے۔ اور ذات کی نسبت پیشہ اور قوم کو زیادہ اہمیّت حاصل ہے۔ البتہ انہیں اکثر اس کے ہم پلہ سمجھا جاتا ہے۔ ان تغیر پذیر ایّام میں اگر کسان یہ چاہتا ہے کہ کمیں اسے پیچھے نہ چھوڑے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ یا تو زراعت کو ترقی دے یا دوسرے مشاغل اختیار کرے۔ اور اسے اس بات کو بھی مدِّنظر رکھنا چاہیئے کہ کمیں تعلیم کا کس قدر شائق ہے۔ اور وہ اکثر اس کی نسبت زیادہ پڑھا لکھا ہوتا ہے۔

زمیندار اور کمیں کا رشتہ

پُرانے زمانے میں گاؤں کے کمیں اپنے آقاؤں کے پورے پورے تابع ہوتے تھے۔ اور اب بھی شمال اور مغرب میں جہاں زمینیں فیوڈل طریق کے مطابق دی ہوئی ہیں۔ یہی

صورت ہے۔ وہاں گاؤں بدر کر دینے کا ڈر ایک ایسا ہوّا ہے۔ جوان کی گردنیں خم رکھتا ہے۔ اور صرف وہی لوگ جن کے پاس اپنا گھر اور صحن ہوتا ہے کسی بات کو وثوق سے کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کمیں سے بُرا سلوک کیا جاتا ہے۔ اگر زمیندار کمیں کا آقا ہوتا ہے تو وہ اس کا سرپرست بھی ہوتا ہے۔ اور اگر وہ اس پر حکومت کرتا ہے تو سہارا بھی دیتا ہے۔ اور جب کبھی وہ دوسروں کے ساتھ لڑ پڑتا ہے تو وہ اس کی مدد کو پہنچتا ہے۔ اور ممکن ہے کہ اس کے معاملے کو اپنا لے۔ اور اگر وہ اس سے بدسلوکی کرتا ہے۔ تو بالکل ممکن ہے کہ دوسرے زمیندار اسے چھڑانے کے لئے آئیں صرف بڑے گاؤں میں جہاں کمینوں اور کاریگروں کی بڑی تعداد ذرائع آمدنی کے اعتبار سے بے نیاز ہے، تعلقات کشیدہ رکھنے کی طرف میلان پایا جاتا ہے۔ ورنہ عموماً لینے دینے کے دوستانہ تعلقات مراسم ہوتے ہیں۔ اور یہ بات ایک زمیندار کے جواب سے خوب واضح ہو جاتی ہے جسے میں نے اپنے پہلے دورے میں یہ پوچھا تھا۔ کہ کیا تم حجام جلاہے اور چمار سے کرایہ لیتے ہو جنہوں نے اس نئے کھیڑے کے گرد جو کھلے میدان میں بسایا۔ ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ اس نے جواب دیا تھا۔ توبہ توبہ۔ جب کسی شخص کے پاس کافی روپیہ ہو تو اسے غریبوں کی مدد کرنی چاہیئے۔

خدمات کا مبادلہ جو انسانی دوستانہ تعلقات کی جان ہے۔ شادی کے موقع پر نہایت نمایاں ہوتا ہے۔ اگر شادی سرپرست کے گھر ہو رہی ہے۔ تو کمیں کو مہمانوں کی بڑی تعداد کی خاطر تواضع میں مدد دینے کے لئے بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ لیکن وہاں نہایت کشادہ دلی سے دعوت دی جاتی ہے۔ جس میں وہ بھی حصہ لیتا ہے۔ اگر چہ (عورتوں کی طرح) اس کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ اس وقت تک انتظار کرے جب تک کہ زمیندار شکم پُری نہ کر لیں۔ اور اگر شادی اس کے اپنے گھر ہوتی ہے۔ تو اس کا سرپرست اسے بستر، قرضِ حسنہ اور غالباً کپڑے اور زیور وغیرہ بھی مستعار دیدیتا ہے۔

جاگیردار کی واجبات

مگر شمال میں ہوا کا رُخ اور ہے۔ اور جیسا کہ بغاوت فرانس کے ایّام سے پہلے

اُن واجبات کے متعلق باز پُرس ہونے لگی۔ جن کی ابتدا منفعت اور خدمت سے تھی اور جو صدیوں سے ادا ہوتی چلی آئی تھیں۔ حال ہی میں ایک گاؤں میں ایک جاگیردار کے اس حق پر کہ اس نے اُن کنبوں سے جو اپنی زمینوں کے مالک نہ تھے۔ ایک روپیہ چار آنے فی گھر چوکیدار کے لئے اور دو روپے سے لے کر ۱۰ روپے تک (حیثیت کیمطابق) بیٹی کی شادی پر اس حفاظت کے لئے جس سے وہ روزانہ زندگی میں فائدہ اُٹھاتے تھے۔ وصول کرنے پر طویل مقدمہ بازی رہی ہے۔

موجودہ نقطۂ نگاہ سے یہ بات بہت قابلِ اعتراض ہے۔ اگرچہ شاید یہ اس وقت سمجھ میں آجاتی ہے۔ جب ہمیں شاہ پور کی طرۂ بازخانی پگڑی اور یہ بات یاد آتی ہے کہ اس ضلع کے ایک گاؤں کے جاگیردار گاؤں کے ہرکمین سے ایک روپیہ اس بات کا لیا کرتے تھے کہ انہیں پگڑی باندھنے کا حق حاصل ہے۔ کچھ سال گذرے کمینوں نے اسے آئندہ دینے سے انکار کر دیا۔ ایک عدالت میں اس محصول کو قانونی رو سے جائز ٹھہرایا گیا لیکن قانون سے کسی بڑی شے کی بازی لگی ہوئی تھی۔ اور کمین اس انحراف پر مُصر رہے۔ اور جب اُن میں سے بعض پر ایک خاص رقم کی ڈگری ہوگئی۔ تو اس کی ادائیگی کے لئے سب نے چندہ دیا۔ پھر جاگیرداروں پر اور ان کی موٹی سمجھ اور موجودہ زمانے کا احساس غالب آیا۔ اور اُنہوں نے اپنا خرچ لینے کے عوض اپنا مطالبہ چھوڑ دیا۔

دھڑا بندی

وسطی پنجاب کی زیادہ نئی اور جمہوری فضا میں تعلقات کم اُستوار اور کم دوستانہ ہیں۔ امرت سر کے ایک بڑے گاؤں میں یہ دیکھ کر کہ زمینداروں اور کمینوں کے بنک علیحدہ علیحدہ تھے۔ میں نے یہ تجویز کی کہ انہیں چاہیئے کہ وہ زمینداروں کے ساتھ ملجائیں۔ اس پر اُن کے صدر نے کہا۔ خدا نے ہمیں ان کی حکومت سے بچایا ہے۔ ہم اپنے بنک میں سے ۲۰ روپے لینے بہتر سمجھتے ہیں۔ بہ نسبت اس کے کہ اُن کے بنک سے پچاس لیں۔ یہ ایک اقتصادی اور مجلسی کشمکش کی گونج تھی جو جنگ عظیم کے بعد ایک عام بے چینی کی صورت میں پیدا ہوئی۔ یہ امرت سر تک محدود نہیں ہے۔ میں نے اپنے پہلے دورے میں یہی بات ہوشیارپور میں دیکھی۔ اور اب (دسمبر ۱۹۲۴ء) میں مجھے اطلاع ملی ہے کہ اضلاع لاہور

گورداسپور اور سیالکوٹ کم و بیش سب اس کے زیر اثر ہیں۔ دوسرا باندی جسمیں مبالغہ سے کام نہ لینا زیادہ اہم ہے۔ چار وجوہات کی بنا پر ہے۔ جنگ عظیم کے بعد بھاؤ کا چڑھ جانا۔ آبادی میں بہت بڑا اضافہ ہونا۔ بڑے بڑے شہروں کی روز افزوں ترقی اور تعلیم کا وسیع ہونا۔ ان اسباب کا درمیانی رشتہ نہایت گہرا ہے۔ جب بھاؤ چڑھے تو ہوشیارپور میں بہت سے چماروں نے یہ کہہ دیا کہ ہم بغیر اُجرت کے دُلہن کی پالکی کو کندھا دیں گے۔ اور نہ مالیات کے سرکاری کاغذات ایک جگہ سے اُٹھا کر دوسری جگہ لیجائیں گے۔ اسی طرح ضلع امرتسر کے بہت سے گاؤں میں سرکاری کاغذات کے متعلق بھنگیوں نے اسی طرح کہا۔ اُنہوں نے یہ دلیل دی کہ گورنمنٹ اب بغیر اُجرت کے کام لینے کی توقع نہیں رکھتی۔ پھر زمیندار کیوں اُمید باندھیں؟ امرتسر میں جہاں یہ مشکلات زیادہ سخت تھیں۔ غالباً انہیں جلد ہی حل کر لیا جاتا۔ اگر آبادی کی ایزادی یہ احساس پیدا نہ کرتی کہ وہ اب کھیتوں کے کام میں دوسروں کی خدمات پر کم انحصار رکھتے ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ رغبت نہ دلاتی کہ وہ کبھی کبھی فصلی واجبات ضبط کر لیں۔ کمیّوں نے اس کا جواب یہ دیا کہ شہروں میں چلے گئے۔ اور امرتسر و لاہور کے بہت زیادہ قرب نے اس میں کوئی وقت نہ پیش آنے دی۔ اور چونکہ شہر سرعت سے بڑھ رہے تھے کام بھی آسانی سے مل گیا وسعت تعلیم نے حالات کو نہ کُند ہارا۔ کیونکہ ان ایّام میں سطحی علمیت بھی کسی شخص کو اسکے حقوق کے متعلق خیال پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں جبکہ اُن خدمات میں جو وہ بجا لاتا ہے فرمانبرداری کا چٹخارہ ہے +

بیگار

وہ خدمات جن سے سب حد درجہ ناراض ہوتے ہیں۔ عرف عام میں بیگار کہلاتی ہے اور یہ ایک ایسا لفظ ہے جسے جمہوریت پسند ہونٹ، حقارت اور نفرت آمیز لہجے میں ادا کرتے ہیں۔ درحقیقت کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ لفظ ان دونوں میں سے کسی ایک کی تحریک کیوں موجب ہو۔ اُن خدمات میں جن پر یہ لفظ حاوی ہے کوئی کسر شان بات نہیں ہے۔ اور انہیں اس کا معاوضہ مل جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی سرپرست اپنے اپنے رشتہ دار کو پیغام یا دعوت نامہ بھیجے۔ دہم سڑک پر ایسے بہت سے لوگوں سے

لے جو اس خدمت پر مامور تھے۔) یا کسی جرم کی اطلاع تھانہ میں بھیجی جائے۔ یا کوئی بوجھ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں لے جایا جائے۔ یا سفر میں عورتوں کی حفاظت کی جائے یا یہ کہ جب اس کے سرپرست کے پاس کام بہت زیادہ ہو تو وہ کھیتوں میں اسکا ہاتھ بٹائے۔ ان خدمات کے صلے میں کمیتوں کو اس بات کی اجازت ہوتی ہے کہ وہ اپنے سرپرستوں کے درختوں کی ایندھن کے لئے کاٹ چھانٹ کریں۔ ساگ کے لئے سرسوں کے پتے توڑیں۔ گوبر اکٹھا کریں۔ اور ان کی زمینوں میں ڈھیر لگائیں اور اپنے مویشی بھیڑیں اور بکریاں ان کی بنجر یا تازہ فصل کاٹے ہوئے کھیتوں میں چرائیں۔ ترنتارن کے نزدیک ہم نے ایک چوکیدار کو ان لوگوں کے کھیتوں میں جن کے مینامات وہ لے جاتا تھا۔ پندرہ بھیڑیں چراتے ہوئے دیکھا۔ اور اس کے قریب ہی ایک سقے کا لڑکا پہلا کرتا اور سیاہ پگڑی (اس کے سرپرست کا انعام تھی) پہنے ہوئے اپنے سرپرست کے سرسوں کے کھیت میں سے گھر کی بھینس کے لئے چارہ اکٹھا کر رہا تھا۔ اور حال ہی میں جب ضلع جالندھر میں ایک گاؤں کا ملاحظہ کیا گیا تو یہ دیکھا گیا کہ پچیس چماروں نے اُنیس گائیں رکھی ہوئی تھیں۔ جن میں سے ایک کے لئے بھی وہ نہ چارہ بوتے تھے اور نہ خریدتے تھے۔ گاؤں کی سادہ (خالص) زندگی کی تہ میں حق پسندی نہاں ہے جسے ممکن ہے موجودہ زمانے کا صنعتی شہر رشک کی نظر سے دیکھے۔

کیا دیہاتی کمیں کا ہونا اشد ضروری ہے؟

میرے دورے کے آخری دن یہ سوال اُٹھایا گیا کہ کیا دیہاتی کمیں کا ہونا ضروری ہے؟ اس کے وجود کو عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس پر بھی جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں دریائے چناب کے شمال میں چمار کا وجود نہیں ہے۔ دریائے جہلم کے مغرب میں سقہ اور دھوبی شاذ دیکھنے میں آتے ہیں۔ اور بھنگی سے صرف اس جگہ گھر کی صفائی کا کام لیا جاتا ہے۔ جہاں پردہ کیا جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ راجپوتوں، جاگیرداروں اور معزز لوگوں کے ہاں حجام بھی جس سے سب کام لیتے ہیں۔ معزبی نکتہ نگاہ سے ناگزیر نہیں ہے۔ اس لئے کسی قدر تخفیف ممکن معلوم ہوتی ہے۔ اور اسمیں زمیندار کا اقتصادی فائدہ ہوگا۔ کیونکہ اس کی خام پیداوار کا ۱۰ سے ۱۵ فی صدی حصہ رسمی واجبات کی شکل میں گاؤں کے کمیں کو پہنچتا ہے۔ اسکے برعکس

موجودہ نظم و نسق نے ایسے لوگوں کو ملازمتیں ملتی ہیں۔ جنہیں ممکن ہے دوسری صورت میں گذارہ کرنا بھی مشکل ہو۔ اور چمار اور بھنگی کا صوبے کی زراعتی اقتصادیت میں بہت بڑا ہاتھ ہے۔ جیسا کہ ایک نامہ نگار رقمطراز ہے کہ بال کترنا اور کھال اُتارنا دونوں کام یا تو اتنے ترقی یافتہ ہیں اور یا اتنی پست حالت میں ہیں کہ وہ عام دیہاتی نظر میں نہیں جچتے۔ فی الحال تخفیف سے زیادہ قابل عمل اور شاید زیادہ اہم یہ بات ہے کہ اُن مجلسی خامیوں کو دور کیا جائے جو دیہاتی خدمت کے ساتھ لگی ہوئی ہیں۔ خاص طور پر ایسے لوگوں کی خدمت کے ساتھ جو معمولی کام کرتے ہیں۔ صوبے کے حصّوں میں جہاں ہندو مذہب کا زور ہے۔ چھوت چھات باقی ہے۔ اور کسی جگہ بھی کوئی کاریگر یا کمین اسباب کا اہل نہیں ہے کہ وہ ایکٹ کی رو سے پنچ بن سکے تا وقتیکہ اس کے پاس اتنی زمین نہ ہو کہ وہ زمیندار کہلا سکے۔ اور ہر جگہ اسے کمین یا ادنےٰ خادم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہ آخری بات کم از کم تاریخی غلطی ہے۔ اور یقیناً اب وہ وقت آگیا ہے۔ کہ اسے سرکاری اطلاعات و مطبوعات میں استعمال نہ کیا جائے۔ کیونکہ اب وہ دن ہوا ہو گئے ہیں۔ جبکہ بقول شیکسپیر کاریگر اور خادم کو ان الفاظ سے یاد کیا جاتا تھا۔ "ایک جیبھڑے پوش جماعت اور اناڑی کاریگر"

کمیّوں کیطرف روّیہ

اس ضمن میں تعلیمیافتہ اور غیر تعلیمیافتہ دونوں کو کچھ نہ کچھ سیکھنا ہے۔ میرے دورے میں ایک موقع پر میرے تین خانگی ملازموں نے یہ شکایت کی کہ ہمارے لئے قیامگاہ میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہ موسم سرما کا وسط تھا اور وہ جگہ جو انہیں رات کو سونے کے لئے بتائی گئی۔ ایک کھلا برآمدہ تھا۔ کہا گیا کہ اور سب جگہیں ایک ہندوستانی افسر نے جو کہ اپنے محرروں اور نوکروں سمیت یہاں رہتا ہے۔ گھیر رکھی ہیں۔ میں اسے ملنے کے لئے گیا اور نہایت خوش اخلاقی سے اپنے نوکروں کی رہائش گاہوں میں سے مجھے ایک کمرہ دیا لیکن جب دروازہ کھولا گیا تو مجھے وہاں سوائے کوئلوں کے ڈھیر، شکستہ چارپائیوں اور کوڑا کرکٹ کے سوا اور کچھ نظر نہ پڑا۔ میں نے کہا کہ نوکروں کو ایسی جگہ رکھنا بالکل ناممکن ہے یہ سن کر اُن لوگوں نے جو اس کے ساتھ تھے یہ کہا کہ اصطبل میں ایک کمرہ خالی ہے۔ وہ کافی ہوگا۔ ایک اور دروازہ کھولا گیا۔ اور اس مرتبہ ہر زمانے کے پرندے جوش سے پھڑپھڑاتے

ہوئے نکلے۔ آخر کار ایک بڑا ہوا دار کمرہ جسے دفتر بنا لیا گیا تھا میرے حوالے کر دیا گیا۔ یہ واقعہ بذات خود نہایت ہی معمولی ہے۔ لیکن میں نے اس کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ یہ ایک مثال ہے اس طریق کی جس پر ایک ہندوستانی نوکر (جو اکثر اتنا نیک ہوتا ہے جتنا کہ کوئی دنیا میں ہو سکتا ہے) کے زندگی بسر کرنے کی توقع کی جاتی ہے۔ جو بات ایک اوسط درجے کا مالک مکان نہایت ہی ناراضگی سے کرتا ہے یہ ہے کہ اپنے بنگلے کے ساتھ نوکروں کے رہنے کے مکانات بنوائے۔ جن کو صفائی، روشنی اور وسعت وغیرہ کی ابتدائی خوبیاں موجود ہونے پر وہ زیادہ کرایہ پر بھی دے سکتا ہے ❊

کُتّا

گاؤں کا ایک مکین ایسا ہے کہ جس کا چلن شور مچانے والی عادات اور مکروہ صورت قابل پرسش ہے۔ جس کا ذکر نہیں کیا گیا اور جو اس کے باوجود دیہاتی طبقے میں خاص جگہ رکھتا ہے۔ میرا مطلب گلی کے اس کُتّے سے ہے جو ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ جس طرح ہر حجام (سقہ، بھنگی اور دباغ سرپرستوں کا اپنا اپنا گروہ رکھتا ہے۔ اسی طرح بے شمار گاؤں میں کُتّے کئی کئی گھر رکھتے ہیں۔ جن کی جائے آمد و رفت کی وہ رکھوالی کرتے ہیں۔ اور اس کے بدلے میں انہیں وہ ریزے اُٹھا لینے کی اجازت ہوتی ہے جو ان کے آقاؤں کے دستر خوان سے گر جاتے ہیں۔ اور اگر دوسرے گھروں کے کُتّے خوراک کی تلاش میں اُدھر نکل آئیں تو وہ انہیں مداخلت بیجا کا مرتکب خیال کرتے ہوئے بھونک بھونک کر نکال دیتے ہیں۔ یہ بات میں نے جنوب میں گوڑگاؤں اور شمال میں جہلم تک کے علاقے میں دیکھی ہے۔ لیکن یہ بات آدمی اور کُتّے میں کسی تعلق کے ہونے پر دلالت نہیں کرتی۔ ایسا تعلق جس سے کہ ہم مغرب میں آشنا ہیں۔ مشرق میں وہ تمام برتاؤ جو کُتّے کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ (مغرب سے، مختلف ہے۔ راسخ الاعتقاد مسلمان کے لئے وہ بالکل ناپاک اور اور چھونے کے قابل نہیں ہے۔ یہ ہیں گھروں میں اچھوت بھنگی کا ملازم رکھنا ضروری ہے تاکہ وہ اس کی دیکھ بھال کرے۔ سکھوں کا رویہ بھی کچھ اس سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اور اگر ہندو اس کی بہت دلدہی کرتا ہے تو اس کی وجہ مسئلہ تناسخ پر اعتقاد اور وہ ڈر ہے کہ ایسا نہ ہو کہ اجداد میں سے کسی کی روح اُن بُرائیوں کی سزا کے بدلے میں جو اس نے انسانی جامہ

میں کی تھیں۔ کتے کے جسم میں حلول کر آئی ہو۔ درحقیقت ہندوؤں کی نسبت مسلمانوں
میں تعلقات زیادہ استوار دیکھے جاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مسلمان ہندوؤں
کی نسبت جو بالعموم سبزی خور ہوتے ہیں شکار کو زیادہ جاتے ہیں۔ اور ہر وہ شخص جو اصلی
معنوں میں شکاری ہوتا ہے اپنا کتا رکھتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ شمالی علاقے میں جہاں
مسلمانوں کی آبادی ہے کسان اکثر آبادی سے دور کنوئیں پر یا ڈابر کی بنجر زمین میں اکیلی
ڈھوک میں رہتا ہے۔ اور اسے رات کو اپنی اور مویشیوں کی حفاظت کے لئے ایک اچھے
رکھوالے کتے کی ضرورت پڑتی ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے وہاں چور ہوتے ہیں لیکن
صوبے کے مشرق اور جنوب مشرق میں لوگ گاؤں میں رہتے ہیں وہاں سرپرستی کا وہ طریقہ
مروج ہے جس کی رو سے مزارعین کو آزادی حاصل ہوتی ہے جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔
یہ طریقہ انسانوں کے لئے مفید ثابت ہوتا ہے۔ لیکن کتوں کے لئے بدترین ہے۔ کیونکہ
اس طرح سے انہیں محض اتنی خوراک بہم پہنچتی ہے جس سے وہ زندہ رہ سکتے ہیں۔ بے گھر و
کس مپرسی کے عالم میں وہ نیچ اقوام کی طرح قابل تحقیر نیم گرسنگی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔
اصطلاحی رو سے تقریباً ریزوں پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور شکر شکر کرکے ایک چھوٹا سا
ٹکڑا ملتا ہے۔ اور وہ گندی سے گندی چیز کھا جاتا ہے۔ اور رات کو بھونکنے کی بھیمنی و
مکروہ آوازیں نکال کر انسان سے اپنا بدلہ لیتا ہے۔ سٹیون سن (ایک انگریز مصنف) کہتا
ہے۔ کہ جہاں تک گھریلو زندگی کا دائرہ ہے وہاں میں کتوں کو پسندیدہ نظر سے دیکھتا ہوں۔
لیکن شاہراہ پر یا کھیت میں سوتے ہوئے دونوں کتوں سے میں نفرت کرتا ہوں۔ اور ڈرتا ہوں۔
ہندوستانی گلی کے کتے سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن یہ مشکل ہے کہ اس سے
نفرت نہ کی جائے۔ گرمی کے موسم میں جو لوگ ستاروں کے سائے میں سوتے ہیں۔ انکے
لئے اس سے زیادہ دق کرنے والی اور کوئی شے نہیں ہے۔ اور ان راتوں میں جب چاند تقریباً
بدر کی شکل میں ہوتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بند لیکن نیند سے محروم آنکھوں میں سے
اس کی تیز روشنی پار ہوا چاہتی ہے۔ تو نصف درجن کتے اس گھڑی ایک دوسرے کو
زور زور سے بھونکتے ہیں اور نیند اچاٹ کر دیتے ہیں۔ اس کے باوجود مغرب میں کسان
اور چرواہے کے لئے کتا کس قدر بیش بہا خادم ہے۔ اور جب اس سے دوست اور ساتھی
جیسا سلوک کیا جائے تو وہ کتنا پیارا بن سکتا ہے۔ شمال اور مغرب میں بھی کوئی زیادہ پرواہ یا

محبت ظاہر نہیں کی جاتی۔ ایک مرتبہ ایک کتے کو چرخہ کاتتی ہوئی دو عورتوں کے قریب دھوپ میں لیٹا ہوا دیکھ کر میں نے اس کے مالک کو پوچھا "کیا تم اسے برش سے صاف کرتے ہو؟" اس نے کہا توبہ! توبہ! جب ہم اپنے آپ کو برش سے صاف نہیں کرتے تو انہیں کیسے کریں۔ اور اسی طرح اس سوال کے جواب میں کہ کیا تم اسے کبھی نہلاتے بھی ہو؟ اس نے کہا کہ جب ہم خود مہینے میں صرف ایک مرتبہ نہاتے ہیں تو ہم انہیں کیسے نہلائیں۔ کتا رکھنے کے لئے اس کی خوراک کا خرچ اٹھانا پڑتا ہے اور اس کی نگرانی کرنی پڑتی ہے۔ اور گذشتہ صفحات کے اعداد و شمار ذہن میں لاتے ہوئے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایک معمولی کسان کسی قسم کا خرچ خواہ وہ کتنا ہی کم کیوں نہ ہو۔ اٹھانے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس سے پیشتر کہ دیہاتی کتے کی اس سے بہتر تواضع ہو سکے۔ دیہاتی کی زندگی کا معیار بلند کرنا چاہیئے۔ اور کسی قدر کم درجے پر یہی بات گاؤں کے کمیّن پر صادق آتی ہے۔

زراعتی مزدور کی اجرت!

اپنے دورے کے دوران میں میں نے بے شمار زمینداروں سے اس امر کی تحقیق کی کہ تم اپنے مستقل مزدوروں کو کیا اجرت دیتے ہو۔ ان اطلاعات کے نتائج جو مجھے ملیں ذیل میں بطور خلاصہ درج کئے جاتے ہیں:۔

ضلع	تحصیل یا علاقہ	مزدوری
شیخوپورہ	نو آبادی	۸ سے ۱۰ روپے ماہوار۔ ساتھ دو دھوتی چادریں اور جوتے۔ نرخ گرنے سے پہلے نقد مزدوری ۱۰ روپے سے ۱۲ روپے تک تھی۔
	سانگلا	۱۵ اور ۱۶ روپے فی ماہ، ایک ارائیں ۲۰ (سبزی کاشت کیجاتی ہے) ۱۰ روپیہ ماہوار اور تین آنہ یومیہ (برائے خوراک) پر ملازم تھا یہ ایک مستثنیٰ صورت ہے۔
شاہ پور	نو آبادی	۲۰ من گیہوں یا چار روپے (نرخ گرنے سے پہلے ۷ سے ۸ روپے تک) ماہوار اسکے

		ساتھ ہی دو وقت کا کھانا، کپڑے، جوتے اور تمباکو۔"
جہلم	للہ سلسلہ نمک (ابوجہل کلاں) دریائی علاقہ	چار یا پانچ روپے ماہوار چار سے سات روپے ماہوار چار سے چھ روپے ماہوار معہ خوراک لباس
فیروزپور	موگا	۱۰ روپیہ ماہوار اور ساتھ ہی ہر روز دو وقت کا کھانا لیکن بالعموم پیداوار کا ۱/۵ حصہ۔ ایک زمیندار نے کہا کہ میں پندرہ روپے ماہوار دیتا ہوں۔ لیکن وہ شخص دس سال سے اسکے ہاں ملازم ہے۔"
حصار	ہانسی تحصیل	ایک ذیلدار اپنے گھر کے تین نوکروں کو ۵۰ روپے دیتا تھا۔ اور خوراک ولباس بھی دیتا تھا۔ اور اپنے تین مزدوروں کو ان کی کاشت کردہ زمین کی پیداوار کا ۱/۴ حصہ دیتا تھا۔"
منٹگمری	نیلی بار کی بستی	۷ یا ۸ روپے یا زیادہ سے زیادہ ۱۰ روپے (نرخ گرنے سے پہلے زیادہ سے زیادہ اُجرت ۱۳ روپے تھی) لباس و خوراک ان کے علاوہ ہے۔ لیکن اس گاؤں میں جسکا ۷ مارچ کو معائنہ کیا گیا فوجی پنشن خواروں نے کہا کہ ہم ۱۳۰ روپے سے ۱۸۰ روپے سالانہ تک ادا کرتے ہیں۔ ایک نے کہا کہ میں ۱۸۰ روپے دیتا ہوں لیکن اس سے کم اجرت

		والے آدمی کی تلاش میں ہوں۔ یہ بھی کہا گیا کہ ایک مزدور نے حال ہی میں گاؤں چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ اسے ملازم رکھنے والا شخص اسے ۱۳۰ روپے فی سال سے زیادہ نہ دیتا تھا۔
گورداسپور	شکار گڑھ (کوٹ ننتیاں)	ایک کھتری اپنے پانچ مزدوروں کو معہ خوراک و لباس سات روپے ماہوار دیتا تھا۔"

باب پانزدہم

دیہاتی عورت

جزوِ اوّل

رسم و رواج

میں نے اپنے پہلے دورہ میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ یہ بیان کیا ہے کہ کھیتوں کے کام میں دیہاتی عورت مرد کا کیا ہاتھ بٹاتی ہے۔ میں نے اپنے آخری دورہ میں اس سے زیادہ مشکل مسئلہ کا تذکرہ کیا۔ میں نے یہ بیان کیا کہ دیہاتی عورت گھر میں کیا کرتی ہے اور اس حقیقت پر یقین کرتے ہوئے کہ ہر ایک شخص کو اپنی کہانی اپنی زبانی بیان کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔ میں نے اس غرض کے لئے اندرون خانہ میں پہنچنے کی جرأت کی۔ یہ جسارت گفت و شنید کے ایک طویل سلسلہ کی صورت میں نتیجہ پذیر ہوئی۔ جسے میں نے اپنی سرگذشت میں حسب امکان پوری دیانتداری سے بیان کر دیا ہے۔ اس وقت میرا ارادہ اس امر پر مختصراً بحث کرنا ہے۔ کہ گاؤں میں عورت کی کیا حیثیت ہے۔ اور جوں جوں زمانہ تبدیل ہو رہا ہے۔ اس حیثیت میں کیا تبدیلی ہو رہی ہے۔ اگر میں اس مقام پر نیز گام نظر آتا ہوں۔ جہاں صرف فرشتے ہی غالباً قدمزن ہو سکتے ہیں۔ تو اس کے لئے میرا عذر یہ ہے کہ اس باب میں معلومات کی ازبس قلت ہے۔ اور پنجابی گاؤں کے متعلق اپنے تبصرہ کو مکمل کرنیکے لئے اس ضمن میں کسی قدر بحث و نظر مطلوب ہے۔ اپنی سیاحت میں اور ازاں بعد دو سال کے عرصے میں جو معلومات بھی مجھے حاصل ہو سکیں۔ میں نے اسے فراہم کرنے کی کوشش کی اور گذشتہ ۱۶ ماہ کے دوران میں میرے ان ہندوستانی احباب نے جنہیں

دیہاتی زندگی سے قریب کا واسطہ ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی ہے۔ کہ وہ صوبے کے تمام نمونے سے رقبہ جات کے نمائندگان ہیں۔ میرے لئے بیش از بیش تحقیق و تفتیش احوال کی جو کچھ سپرد قلم کیا گیا ہے۔ وہ تمام اس چھان بین کا نتیجہ ہے۔ لیکن جو خیالات ظاہر کئے گئے ہیں۔ سب کے سب تجرباتی نوعیت کے ہیں ‌•

شادی کی عمر

آؤ سب سے پہلے شادی کا تذکرہ کریں۔ عالمگیر طور پر نہیں بلکہ عام طور پر رواج کا حکم یہ ہے۔ کہ لڑکیوں کی شادی بچپن میں کرنی پڑے گی۔ اور شادی اسوقت تک پایۂ تکمیل کو پہنچے گی۔ جب قدرت اسے ممکن قرار دے یا اس سے تھوڑا عرصہ بعد برہمنوں کے کئی صوبوں تک یہ اعلان کیا ہے کہ اگر کنیا کی شادی بلوغت سے پہلے نہ کر دی گئی تو تمام متعلقہ اشخاص کو سخت خوفناک سزا ملے گی۔ اور یہ خیال اتنا جاگزین ہے کہ ۱۹۲۶ء میں مجھے بتایا گیا۔ کہ اکثر اشخاص کی نگاہوں میں ۱۶ سال کی غیر شادی شدہ لڑکی دلالت کرتی ہے کہ یا تو اس کے والدین کے دماغ میں کوئی نقص ہے یا یہ ہے کہ ان کی مالی حالت کمزور ہے اس زاویہ نگاہ کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ اس وقت ہندوستان میں قریباً ایک کروڑ ۰ ۴ لاکھ دیویاں (بیویاں) اور ۳۰ ہزار بیوائیں ایسی ہیں۔ جن کی عمر ۱۴ سال سے کم ہے۔ میں نے اپنے پہلے دورہ میں ایک ہائی سکول میں ایک سیزدہ سالہ ہندو لڑکے کو دیکھا جو ایک ۱۲ سالہ لڑکی کا شوہر تھا۔ اور ایک سولہ سالہ سکھ کو دیکھا جس کی بیوی اور ایک بچہ فوت ہو چکا تھا۔ اور میرا ایک اور مشاہدہ یہ ہے۔ کہ سکول کی چار اونچی جماعتوں کے ۱۹۰ طلباء میں سے ۴۴ شادی شدہ تھے۔ اور ۲۹ اپنی بیویوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔ آخری دورے میں جو پہلی عورت میرے دیکھنے میں آئی۔ ایک ہندو جٹنی تھی۔ جو چار سال کی عمر میں بیاہ دی گئی تھی۔ اور اسکے شوہر کی عمر ۹ سال تھی۔ اس عمر میں اس نے اپنی سب سے بڑی لڑکی کی شادی کی تھی۔ دوسری عورت بھی جو نظر سے گذری وہ بھی ہندو جٹنی تھی۔ وہ اتنی چھوٹی عمر میں بیاہی گئی تھی کہ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا۔ اُسے اپنے خاوند کے گھر آنا بھی یاد نہ تھا۔ ایک مسلمان عورت نے بھی جو مجھے سرحد کشمیر پر ملی یہی کچھ کہا۔ نیلی بار میں جن دو عورتوں سے میں نے ملاقات کی۔ ان کی حالت کچھ اچھی تھی۔ ان میں سے ایک مسلمان عورت تھی۔ جس کی

۱۱ سال کی عمر میں شادی ہوئی تھی۔ اور اسی عمر میں اس کی لڑکی کی بھی شادی ہوئی تھی بیلسری سکھ عثنی تھی۔ جس کی شادی ۱۲ سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ نیم پہاڑی علاقوں میں ہندو راجپوت عام طور پر اپنی لڑکیوں کی شادی ۵ یا ۶ سال کی عمر میں کر دیتے ہیں۔ اور مشرقی پنجاب میں جہاں ہندوؤں کا اثر یا روایات کا اثر زیادہ ہے۔ شادیاں عام طور پر ۱۳ یا ۱۴ سال کو پایہ تکمیل تک پہنچ جاتی ہیں۔ شمال اور مغرب کے اُجڑے ہوئے رقبوں میں جہاں ۹۰ فیصدی مسلمان آباد ہیں۔ شادیاں مذکورہ مدت سے تین یا چار سال کے بعد ہوتی ہیں۔ دریائے سندھ کے ساحلی ریگستانوں میں لڑکیوں کی شادیاں ۲۰ بلکہ ۲۵ سال تک نہیں کی جاتیں۔ یہی حال جانگلیوں کا تھا۔ یہاں تک کہ نہروں نے انہیں اپنی تعداد میں اضافہ کرنے کے سامان بہم پہنچائے۔ اب وہ لڑکیوں کی شادیاں چودہ یا پندرہ سال میں کرتے ہیں۔ سلسلہ کوہستان نمک میں ۱۲ یا ۱۳ سال کی عمر میں شادیاں کی جاتی ہیں۔ یہاں فوجی ملازمت نے ثروت پیدا کر دی ہے۔ ہم اس بحث پر گفتگو کر رہے تھے کہ ایک بوڑھے شخص نے کہا کہ اس سے پیشتر ہم غریب تھے۔ میں نے کسی دوسرے مقام پر کہا ہے کہ خوشحالی میں اضافہ آبادی میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔ اور اگر ثروت کیساتھ تعلیم نہ ہو۔ تو یہ بھی بچپن کی شادی کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔

جلدی پیدائش اور جلدی موت

جلدی شادی کے بعد قدرتاً پیدائش کا سلسلہ بھی جلدی شروع ہو جاتا ہے۔ پہلی ہندو عثنی جس سے ملا۔ چودہ سال دوسری پندرہ سال۔ اور مسلمان عورت ۱۶ سال کی عمر میں ماں بن گئی۔ یہ حقیقت اپنی نظیر آپ ہے۔ اور اس کا اثر ہے کہ صوبہ متوسط کو چھوڑ کر شرح پیدائش و اموات جس قدر پنجاب میں زیادہ ہے اُتنی ہندوستان کے کسی اور صوبے میں نہیں ہے۔ پہلی دو عورتیں آٹھ آٹھ بچوں کی مائیں ہیں۔ اور ۱۶ سال کی عمر میں جس کی شادی ہوئی تھی۔ اس کے صرف ۹ بچے زندہ ہیں۔ اور سخت رنج کی بات ہے کہ دسواں موت کی گود میں ہے۔ ایسے ہی گورداسپور میں ایک سارجنٹ کی بیوی کے ۸ میں سے ۳ بچے فوت ہو چکے ہیں۔ نیلی بار کی سکھ عثنی ۶ بچوں میں سے ایک کو ہاتھ سے کھو چکی ہے۔ اس نقصان کی ذمہ داری صرف بچپن کی شادی پر ہی عائد نہیں ہوتی۔ جب تک کہ گاؤں کی

دائیاں نا تعلیمیافتہ۔ ناتربیت یافتہ اور اکثر نیم اچھوت ہوں گی۔ اس وقت بچوں کی پیدائش کے وقت عظیم الشان نقصانات ہوتے ہی رہیں گے۔ صرف ایک علاقہ میں مجھے ایک تربیت یافتہ دایہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اور اس کے متعلقہ ۲۰ دیہات میں ۶۰۰ بچے پیدا ہوئے۔ اور صرف تین ضائع ہوئے۔ مردم شماری میں یہ اندازہ ۸ کا تھا۔ لیکن اگر بچہ بوقت پیدائش زندہ بھی ہو۔ پھر بھی اس کے بڑھنے اور پھولنے پھلنے کے امکانات بڑے غیر قطعی ہیں۔ اور ۱۹۳۲ء میں (جو ایک صحت نما سال تھا) ہر ہزار پیدا شدہ بچوں میں سے ۱۷۹ بچے ایک سال بھی پورا نہ کر سکے کہ اس جہان سے رخصت ہو گئے۔ اس سال انگلستان اور ویلز میں متناسب شرح صرف ۶۵ تھی۔ جس سے عیاں ہوتا ہے۔ کہ اس خصوص میں کیا کچھ ممکن ہے۔ لیکن دوسرے مغربی ممالک میں مثلاً ہنگری میں شرح اموات ۱۸۴ فی ہزار۔ اور رومانیہ میں ۱۹۷ فی ہزار تھی۔ بعض مقامات میں اس سے بھی زیادہ تھی۔ لہذا پنجاب کی حالت اگرچہ نہایت درجے کی اصلاح طلب ہے لیکن مایوس کن نہیں ہے +

لڑکا۔ لڑکی

ایک لحاظ میں یہ دیہاتی رواج اچھا ہے۔ بچہ پیدائش کے بعد ماں کو معقول آرام حاصل ہوتا ہے۔ جن عورتوں سے مجھے گفت وشنید کا موقع ملا۔ ان میں سے کسی ایک نے کہا کہ متذکرہ آرام کی کم سے کم مدت ۱۰ سے لیکر ۲۰ ایام ہیں۔ اور اکثر صورتوں میں از ۲۰ تا ۴۰ ہیں۔ اگر گھر میں کوئی لڑکی پکانے اور گھر کا کام کرنے کو ہو۔ تو اغلباً ۴۰ ایام سے بھی زیادہ ممکن ہیں۔ اور اس عرصہ کے ایک حصہ کے دوران میں ہلکا سا کام کیا جائے گا۔ اگر آرام کے دس دن بھی خیال کئے جائیں۔ تو یہ مدت اتنی ہے جس کی سکاٹ لینڈ میں ایک عورت توقع کر سکتی ہے۔ لڑکی کو دودھ دو سال تک پلایا جاتا ہے اور لڑکے کو ڈھائی سال بعض صورتوں میں لیکن ایسا بہت کم معلوم ہوگا کہ لڑکوں کو دو سال اور لڑکیوں کو دودھ ڈھائی سال تک پلایا جاتا ہے۔ سیالکوٹ کی ایک عورت نے کہا۔ کہ لڑکی اور لڑکے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس لئے کہ دونوں ایک ہی کوکھ سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک نے یہ اضافہ کیا۔ کہ ہم لڑکوں کو زیادہ پیار کرتی ہیں۔ گورداسپور میں سارجنٹ کی بیوی نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا۔ اور اس ضمن میں اس کے شوہر کا اظہار خیال قلب دہقان کا

آئینہ دار تھا۔ اس نے کہا کہ لڑکا وارث زمین ہوگا۔ ہندو کے نقطہ نگاہ میں بچہ کی پیدائش ایک مخفی مفہوم رکھتی ہے۔ اور جو لفظ پنجابی میں اس کے لئے مستعمل ہے۔ اس کا مطلب ہے نرک (دوزخ) سے نجات (مکتی) حاصل کرنا۔ اور اس باب میں بنیادی تصور یہ ہے۔ کہ لڑکیاں دوسرے کے گھر کا ایندھن ہیں۔ اس امر کے امکان کے باعث لڑکی کی آمد پر اطمینان کا سانس لیا جا سکتا ہے۔ کہ اس کی ٹھوس قیمت وصول ہوگی۔ لیکن یہ اضطراب بخش خیال ہمیشہ موجزن رہتا ہے۔ کہ لڑکی پر لڑکے کی نسبت زیادہ خرچ ہوتا ہے۔ جب لڑکی کی شادی کی جاتی ہے۔ تو ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اسے نہ صرف کافی پارچات ہی دئے جائیں بلکہ خاص تعداد میں قیمتی زیورات بھی دئے جائیں۔ تاکہ وہ خاوند کے گھر میں اپنا مراد بچا رکھ سکے اور اپنے والدین کی عزت کو قائم کر سکے۔ یہ صحیح ہے کہ لڑکے کی شادی پر بھی بہت سا روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ لیکن مردوں کے کام بابرکت تصور کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے دم سے کافی آمدن حاصل ہوتی ہے۔ لڑکی پر ہمیشہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ جب کبھی وہ اپنے والدین کے گھر جاتی ہے۔ اُسے اور اس کے بچوں کو ملبوسات بطور دان (تحفہ) دینے پڑتے ہیں۔ وسطِ پنجاب میں بھائی کے لئے بھی لازمی ہے۔ کہ جب بہن اس کے ہاں آئے۔ تو وہ اسے تحائف دے۔ اس لئے بہن کی آمد کو ہمیشہ مستحسن نہیں خیال کیا جاتا۔ اکثر خاندانوں میں یہ دستور ہے۔ کہ لڑکی کو پہلا بچہ میکے (والدین کے گھر) جننا ہوتا ہے۔ اور یہ دستور بھی خرچ کی ایک مد ہے۔

بچّے اور بچّی کا فرق ان کی پیدائش کے وقت ہی نمایاں ہو جاتا ہے۔ دایہ کو لڑکے کی پیدائش پر ایک روپیہ ملتا ہے۔ اور لڑکی کی پیدائش پر آٹھ آنے ملتے ہیں۔ اور آخر الذکر کبھی کبھی نہیں ملتا۔ جنوبی مشرقی اضلاع میں لڑکے کی پیدائش کا اعلان بذریعہ جھانجے کیا جاتا ہے۔ اور لڑکی کی پیدائش پر توا پیٹا جاتا ہے۔ مغربی اضلاع میں مبارکباد دینے کا فریضہ صرف عورتیں ادا کرتی ہیں۔ اور ہم کتاب ٹراڈیر نزادف ٹا فیٹا میں پردہ میں بسر شدہ زندگی کا قابل توجہ مطالعہ کرتے ہیں۔ اگر بلقیس کے ہاں بچہ پیدا ہوتا تو بوقت دعوت دو بکرے اظہار تشکر کے لئے ذبح کئے جاتے۔ لیکن لڑکی پیدا ہوئی۔ بھٹے ٹوکر نے کہا کہ راجہ یہ سُنکر مغموم ہُوا کہ لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ لیکن رانی کا دل شاد ہُوا۔ رانی نے کہا کہ آدمی خواہ اس کے گھر میں بچھڑا پیدا ہو۔ خوش و خرم ہوتا ہے۔ اس سے حالات کی

وضاحت ہوتی ہے۔ لڑکی اچھی ہے لیکن لڑکا مسرت اور فخر کا موجب بنتا ہے۔ پنجابی میں کہاوت ہے کہ لڑکوں اور بیلوں کو اچھی طرح کھانا پلانا چاہیئے۔ اس لئے کہ دونوں کمانے والے (کماؤ پتر) ہیں۔ اور اکثر گھروں میں اگرچہ شاید سکھوں میں ایسا نہیں ہے۔ لڑکی کی نسبت لڑکے کی زیادہ نازبرداری کی جاتی ہے۔ اس کی پوشاک لڑکی سے کسی قدر اچھی ہوتی ہے۔ اگر دونوں کے لئے کافی دودھ ہے۔ بلکتن نہ ہو۔ تو لڑکی کو نہ دودھ دیا جاتا ہے۔ نہ مکھن۔ شمالی علاقے میں ایک سپاہی نے مجھے یہ بتا کر اپنے نقطۂ نگاہ سے آگاہ کیا کہ لڑکے کو اگر فوج میں ملازم ہونا ہو تو ضروری ہے کہ شروع سے ہی مضبوط اور توانا ہو۔ اور ہل چلانے والی بھی اسی قسم کے احساسات رکھتا ہے۔ انگلستان میں بھی جب تک کہ لڑکیاں بھی روٹی کمانیوالے نہ ہوں گی۔ ان کی نسبت لڑکوں کو زیادہ عزیز سمجھا جاتا تھا۔ بخلاف ازیں یہودیوں کے مذہب پرست خاندانوں میں جن سے انگریز اور مسلمان بہت حد تک اثر پذیر ہیں۔ لڑکوں کو آج تک یہ سکھایا جاتا ہے کہ وہ خدا کا شکر ادا کریں کہ اس نے ان کو لڑکیاں نہیں بنایا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ شریعت اسلام کے رو سے عورت کی حیثیت بعض لحاظ سے اتنی بلند ہے کہ اتنی کسی بھی عیسائی ملک میں اس وقت تک بلند نہیں ہے۔ لیکن عورت کے حقوق (بالخصوص زمین کے متعلق) رواج نے حد درجے کے کم کر دیئے ہیں۔ اور رواج کو پنجاب میں قانونی قوت حاصل ہے +

تعلیم و تربیت

ایک بُرے امر میں لڑکے اور لڑکی سے بالکل یکساں سلوک کیا جاتا ہے۔ ماؤں کے درمیان صرف ایک یا ½ ۱ (بہ الفاظ نامہ نگار) اپنے بچوں کو امور خانہ داری کی کسی قسم کی تعلیم دیتی ہے۔ اور صرف اس وقت جب وہ اس امر پر پہنچ جاتے ہیں۔ کہ وہ دوسروں کو دیکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ تو انہیں ضبط نفس کے ابتدائی اصول سکھائے جاتے ہیں۔ رات کے وقت دو یا تین تہ والا کپڑا (پوتڑا) بچے کے نیچے رکھ دیا جاتا ہے۔ اور سارے داغ دھبے صبح کے وقت دھوئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ کپڑا ۱۰ یا ۱۵ دن تک بدلا نہیں جاتا۔ یہ صرف تعلیم کی بدولت ہے۔ کہ جو عورت سکول کی تعلیم حاصل کر چکی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کپڑے کو ہر دو یا تین دن کے بعد بدل دے۔ لیکن یہ محض اچھی خاصی تعلیمیافتہ شہری

خاتون کا دستور ہی ہو سکتا ہے کہ وہ اس کام کے لئے رومال بہم پہنچاتی ہے لیکن ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ بچپن کے زمانہ کی تعلیم آئندہ زندگی پر اتنا اثر پیدا کرتی ہے کہ ایک ہندوستانی خاتون نے ایکدفعہ کہا۔ "آپ یہ معلوم کئے بغیر کہ آیا اسے بچپن کے زمانے میں کچھ تعلیم دی گئی یا نہیں۔ ایک شخص کے ساتھ سات دن تک بھی گذارہ نہیں کر سکتے"۔

مذہبی تعلیم

چھ یا سات سال تک لڑکے اور لڑکیاں گاؤں میں وحشیوں کی مانند گھومتے اور دوڑتے رہتے ہیں بچے جب تک اتنی عمر کو نہیں پہنچ جاتا کہ وہ مویشی چرانے یا سکول جانے کے قابل ہو جائیں۔ اور لڑکیاں جب تک چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کرنے کے قابل نہیں ہو جاتیں یا گھر کے کام کاج میں مدد کرنے کے قابل نہیں ہو جاتیں ان کی تربیت کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا ان کا پہلا کام برتنوں کو دھونا ہے۔ زاں بعد آٹا گوندھنا۔ اور ہنڈیا پکانا ان لڑکیوں کو جو ابھی نیم وحشیانہ حالت میں ہوتی ہیں۔ ماں کے بالوں میں سے جوئیں نکالنا سکھایا جاتا ہے۔ ۹ یا ۱۰ سال کی عمر میں بچی کو چرخہ کاتنا اور سینا پرونا سکھایا جاتا ہے۔ سب سے آخر اور سب سے زیادہ مشکل کام لڑکی کے لئے چکی پیسنا اور لڑکے کے لئے ہل چلانا ہے۔ یہ کام ہو سکتا ہے کہ ۱۰ یا ۱۱ سال کی عمر میں شروع کر دیا جائے۔ لیکن اس فرض کی سر انجام دہی پورے طور پر ۱۶ یا ۱۷ سال میں ہوتی ہے۔ باضابطہ مذہبی تعلیم قریباً ناپید ہے۔ ہندوؤں میں ایک شخص کو دھرم (خدائی فرض) کی آگیا (تعلیم) سینہ بہ سینہ حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ بھی زیادہ تر ان قصوں کے ذریعے جو رات کو بستر پر سونے کے وقت متحیر آلودہ گھڑیوں میں سنائے جاتے ہیں۔

مسلمان مائیں اپنی بچیوں کو رسمی طریق پر نماز پڑھنا سکھاتی ہیں۔ اور گاہے گاہے جہاں کہیں گاؤں کے ملاں کو قابلِ اعتماد خیال کیا جاتا ہے۔ وہ اپنی بچیوں کو بچوں کے ساتھ قرآن مجید پڑھنے کے لئے مسجد میں بھیجتی ہیں۔ چند ایک مائیں بچیوں کو یہ تعلیم خود دیتی ہیں۔ لیکن ایک راجپوت نے مجھے بتایا۔ کہ اعلیٰ خاندان کی راجپوت مائیں اس چیز کو اپنی شان کے شایان نہیں سمجھتیں۔ اور اسے ملاں کا فریضہ تصور کرتی ہیں۔ مسجد میں صرف یہی سکھایا جاتا ہے

کہ قرآن مجید عربی میں پڑھ لیا جاتا ہے۔ چند ایک نفوس اسے ناکافی خیال کرتے ہیں لیکن اکثر اشخاص اسے مفید اور کارآمد تصور کرتے ہیں۔ لیکن یہ تعلیم واقعی مفید تر ہوتی۔ اکثر ملاں قرآن مجید کے صرف الفاظ ہی پڑھانہ سکتا بلکہ اس کے معانی کی تفسیر پر بھی قادر ہوتا۔ اس کی اہمیت کے متعلق میں نے اپنے پہلے دورہ میں لکھدیا ہے۔ اور اس میں صرف اسقدر اضافہ میں کرسکتا ہوں۔ کہ خواہ پورے تعلیمیافتہ کو باضابطہ مذہبی تعلیم کتنی ہی کم ضرورت کیوں نہ ہو۔ یورپ کے کسان کا تجربہ واضح کرتا ہے کہ ان پڑھ دہقان کے بچوں کو اس کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ روزی روٹی کی حاجت ہے۔ لیکن یہ تعلیم محض الفاظ تک محدود نہیں ہونی چاہیئے بلکہ ایسی ہونی چاہیئے کہ جس سے روح کو صفائی اور بالیدگی نصیب ہو۔

بہو اور ساس

ہر ایک سمجھدار ماں احتیاط کرتی ہے کہ اس کی لڑکی گھر کا کام کاج سیکھ جائے۔ تاکہ اس کی جہالت کے باعث اسے ساس کے گھر میں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ لیکن کامل تعلیم اس وقت آغاز پذیر ہوتی ہے۔ جب وہ سسرال میں پہنچ جاتی ہے۔ اس وقت کی تبدیلی اتنی عظیم الشان ہے۔ جتنی کہ ہمارے ہاں اس وقت ہوتی ہے۔ جب لڑکی بورڈنگ سکول میں جاتی ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ اس کی ساس ہی بورڈنگ ہاؤس کی ناظمہ ہو۔ اسوقت تک لڑکی اپنے گاؤں میں آزاد ہوتی ہے اور اسے لاڈ اور پیار سے رکھا جاتا ہے۔ لیکن اپنے خاوند کے گھر میں وہ اپنے آپ کو بالکل پردیسن خیال کرتی ہے۔ اس کی آزادی محدود ہوجاتی ہے۔ اور خواہ پردہ نہ بھی ہوں۔ اس کے جذبات دبائے جاتے ہیں۔ اور اس کی تمام زندگی نکتہ چین بزرگوں کے اشاروں اور حکموں کی پابند ہوجاتی ہے۔ لیکن اگر فضا محبت آلود ہو۔ اور بلاشک وشبہ اکثر صورتوں میں ہوتی ہے۔ پھر بھی اس میں کامل اجنبیت ہوتی ہے اور ایک حساس مخلوق جو گذشتہ زندگی کے ہر ایک رابطہ ہر نظارہ اور ہر آواز سے منقطع ہوجاتی ہے۔ وہ پوری تنہائی وعلیحدگی کی مایوسی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ بخلاف ازیں اگر فضا ناسازگار ہو جو ضروری ہے کہ اس ملک میں اکثر اوقات وقوع پذیر ہو۔ جہاں منادی ایک کٹھن سودے کے بعد ہوئی ہو۔ اس صورت میں ممکن ہے کہ ۱۲ یا ۱۳ سال کی دلھن اس پھول کی طرح مرجھا جائے جسے کسی اور گلشن میں لگادیا گیا ہو۔ اور بعد ازاں

پانی سے محروم کر دیا گیا ہو۔ پردہ کی مصنفہ جو ہندو گھرانہ کی خاص معلومات سے بہرہ اندوز ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہے۔ اس سے تجربہ کیا ہے کہ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ شادی شدہ زندگی کے پہلے ہفتے اور میکے کے گھر سے جدائی کی درد آمیز غمگین تنہائی کے انتہائی تصور۔ اضطراب انگیز حیا۔ اور جانکاہ احساس خودی میں گزرتے ہیں۔

ہر وہ شخص جو سکول میں افسردہ و پژمردہ رہا ہے۔ محسوس کر سکتا ہے کہ یہ عذاب جان کیا معنی رکھتا ہے۔ اور یہ احساسات عمر بھر کے ہیں۔ ۱۶ سو سال کی بات ہے۔ کہ شمالی افریقہ میں ایک مشہور مقدس انسان کی ماں نے جو بچپن کے زمانے میں بیاہ دی گئی۔ اس قسم کی تکلیف برداشت کی۔ اس کی ساس اگر دشمن نہ تھی تو ہمدرد بھی نہ تھی لیکن مستقل مزاجی۔ بردباری اور حلیمی رنگ لائی۔ اور ساس نے آخر کار اپنے بیٹے کو ان اشخاص کو سزا دینے پر آمادہ کیا۔ جنہوں نے اپنی کان پھوسیوں اور ریشہ دوانیوں سے اسے (ساس) کو گمراہ کیا تھا۔

مشترکہ خاندان کا نظام

جہاں ہر عمر کے بچے بوڑھے مرد و زن ایک مشترکہ چھتے میں زندگی بسر کرتے ہوں۔ وہاں فرمانبردار کا ہونا لازمی ہے۔ اور مشرق میں اس وقت تک بھی فرمانروا ہمیشہ مطلق انسان ہوئے ہیں۔ حصار کے ایک ذیلدار نے جو چالیس اشخاص کے ایک گھرانہ کا سردار تھا۔ اور جسمیں صرف ۸ نوکر تھے۔ کہا کہ ان تمام کو میرے حکم کے مطابق کام کرنا پڑتا ہے۔ اور شمالی پنجاب کے ایک سپاہی نے اپنے دوار کے گھر کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا۔ کہ ہم ہر صبح بگل کی آواز پر اُٹھتے ہیں۔ پردہ کی مصنفہ رقمطراز ہے کہ ایک بڑے گروہ کی صورت میں زندگی بسر کرنے سے تمام نوجوانوں کو ضبط و فرمانبرداری کی تعلیم حاصل ہو جاتی ہے۔ اور خواہ انکی اپنی خواہشات اور اپنے احساسات کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ انہیں سارے خاندان کے مفاد عمومی و مجموعی کو ضرور مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ اگر نوجوان لڑکوں کے لئے یہ ضروری ہے تو نوجوان لڑکیوں کے لئے یہ دُگنا ضروری ہے۔ مشترکہ خاندان میں ماں یا اس کی عدم موجودگی میں گھر میں سے سب سے بڑی عمر والے شخص کی بیوی کو سب سے زیادہ احترام حاصل ہوتا ہے۔ اچھے خاصے عمر رسیدہ لڑکے بھی اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے یا کسی معاملے میں رائے کا

اظہار نہیں کر سکے۔ بہو کی نسبت یہ خیال بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس کی رضا کے خلاف کچھ کر سکتی ہے۔ یہ ایسا ہے کہ جیسے کوئی نو وارد عورت خانقاہ خواتین میں داخل ہو۔ تو گویا گھر کی بڑی ماں کی اطاعت لازمی ہے۔ اس جابرانہ فضا نے خواہ وہ فیاضانہ ہو یا ظالمانہ میاں بیوی کے تعلقات پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان حقیقی رفاقت کو ناممکن بنا دیا ہے۔ مصنف پردہ کے الفاظ میں نوعمر بیوی بلا واسطہ سوال کے جواب کے علاوہ اور کسی وقت منہ کھولنے کی مجاز نہیں ہے۔ اور اگر اس کا جواب محض ہاں یا نہ ہو۔ تو مارے جھینپ کے رکھنا پڑتا ہے۔ صبح کے وقت اس کا کام یہ ہے کہ سب سے پہلے بیدار ہو۔ اور اپنے خاوند کے چرنوں کی مٹی لینے کے بعد بڑوں کے حکم کا انتظار کرے۔ اگر دن کے دوران میں وہ دوسروں کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہو۔ اور باہر سے اس کے قدموں کی آہٹ اس کے کان میں پڑے۔ تو اس کا فرض ہے۔ کہ یکدم اس جگہ سے واپس چلی جائے۔ اس ضمن میں اگر وہ ایک لمحہ کا توقف کرے تو اسے بسرعت تمام جھڑک اور سرزنش برداشت کرنی ہوگی۔ توقع کی جاتی ہے کہ گھر کا بھوجن پکائے۔ لیکن اسے اس کے تقسیم کرنے کی اجازت نہیں۔ یہ حق ساس کا ہے۔ اور اس کی بڑی احتیاط سے حفاظت کی جاتی ہے۔ ان تمام سے بڑھ کر سخت قاعدہ یہ ہے کہ وہ کسی بڑے کی موجودگی میں اپنے شوہر سے بات تک نہیں کر سکتی۔ اور ایک بڑے خاندان کی آس پاس نشست و برخاست میں کوئی نہ کوئی بڑا شخص قریباً ہر وقت موجود رہتا ہے۔

ہندوؤں کے مشترکہ خاندان میں عورت کی حیثیت وہی ہے۔ جس کا میں نے بہ تفصیل تذکرہ کر دیا ہے اور اس نظام حیات کے اصول و قواعد نے مشرقی پنجاب کے اکثر دیہاتی گھروں میں حد سے زیادہ اثر ڈالا ہے۔ اس باب میں پنجاب کے جنوب مشرق میں رہنے والے ایک مسلمان کا حسب ذیل بیان قابل توجہ ہے۔ جب دلہن اوّل اپنے شوہر کے گھر میں پہنچتی ہے اس سے ہر ایک محبت کرتا ہے۔ اور اسے بطور مہمان تصور کیا جاتا ہے۔ اس کی ساس اس کے خلاف نہیں کہتی اور اس کا سسر ہر ایک سے کہتا ہے۔ کہ بہو کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا جائے اور اس سے صرف ہلکا سا کام کرایا جائے۔ ایک مہینے یا دس سے کچھ زیادہ دنوں کے بعد وہ اپنے والدین کے ہاں جاتی ہے۔ اور اپنے نئے گھر کی تعریف میں نغمہ طراز ہوتی ہے۔ لیکن اپنی دوسری آمد پر وہ محسوس کرتی ہے کہ اس کے خاوند کے سوا باقی ہر ایک کا مزاج

تبدیل ہو گیا ہے۔ ساس کی محبت کم ہو جاتی ہے۔ اور اس کی نکتہ چینی بڑھ جاتی ہے۔ خسر بے پرواہ نظر آتا ہے۔ دو بچے اس کے خلاف باتیں گھڑنے کے مشتاق دکھائی دیتے ہیں۔ اب اس سے زیادہ کام کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے خاوند کی محبت اب بھی بدستور ویسی رہتی ہے۔ اس میں کمی نہیں آتی۔ ہر قسم کی نکتہ چینی بے پرواہی اور سرد مہری کو صبر و سکون سے برداشت کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اسے اپنے خاوند کے ساتھ اس بارے میں گفت و شنید کا موقع مل جاتا ہے۔ غالباً دو مہینے کے بعد اسے ایک دفعہ اور اپنے والدین کے گھر پہنچنا نصیب ہوتا ہے۔ اس دفعہ وہ اپنے والدین کے گھر سے جانے پر نسبتاً کم راغب ہوتی ہے۔ اور جب اس کی ساس کی طرف سے کوئی اسے لینے کے لئے آتا ہے۔ تو وہ بُرے دن کی زحمت سے محفوظ رہنے کے لئے سسرال کے ہاں جانے کو معرض التوا میں ڈالنے کے لئے بہانہ پر بہانہ تلاش کرتی ہے۔ لیکن اس کے بغیر چارہ نہیں کہ وہ ساس کے پاس نہ پہنچے اور یہ وقت ہے جبکہ اس کی زندگی کی نازک ترین گھڑیاں آغاز پذیر ہوتی ہیں۔ اب ساس یہ کام نہ کرنا اور وہ کام بگاڑنے کے لئے جھڑکنا شروع کر دیتی ہے۔ اور اسے زیادہ کھانے اور کام نہ کرنے کے ہی طعنے دیتی ہے۔ خسر اُس کے والدین کو گالیاں دیتے ہیں۔ بچے ستاتے ہیں۔ اور اس کا شوہر اپنی ماں کو خوش کرنے کے لئے اسے مارتا ہے۔ زاں بعد اسے اپنے ماں باپ کے گھر میں جانے کی ایسی ہی تڑپ ہوتی ہے۔ جیسی کہ ایک انگریز لڑکی جو بورڈنگ سکول سے تنگ آ گئی ہو۔ اپنے گھر جانے کے لئے مضطرب ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ اور اسے تھپکی دی جاتی ہے۔ اس کی ناز برداری کی جاتی ہے۔ اور شادی کے بھاری بھرکم پورے حاشیہ دار لہنگے کی جگہ دوشیزگی کے ایام کا آرام دہ پاجامہ نصیب ہوتا ہے۔ اگر وہ ماں بن جائے تو اسکی حالت بہتر ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ بے اولاد رہے۔ تو اس کے بڑے بزرگ اُسے بہ کراہت دیکھتے ہیں۔ اور دوسری شادی کے لئے کانا پھوسی شروع ہو جاتی ہے۔ اور نوجوان لاولد بیوی یہ کانا پھوسی ایک مخفی دہشت ہے۔

میاں اور بیوی

اس سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ کہ اس فضا میں جسے ابھی واضح کیا گیا ہے۔ ایک نوجوان عورت اپنے خاوند کی موجودگی میں کوئی سُکھ کا سانس نہیں لے سکتی۔ اور جب وہ اپنے

کام سے لوٹتا ہے۔ وہ بیوی بھی جس کی شادی کو کئی سال ہو چکے ہوتے ہیں۔ وہ بھی اس وقت تک آرام نہیں لے سکتی۔ جب تک کہ خاوند کی تمام ضرورتیں پوری نہیں ہو جاتیں۔ سیالکوٹ کی ایک عورت نے کہا کہ جب تک دوپہر کا کھانا کھیتوں کو نہیں لے جایا جاتا۔ ہمارا خون خشک رہتا ہے۔ اور انہوں نے اس میں یہ بھی ظاہر کیا کہ ہم عورتیں جب تک ہمارے مرد کھانا نہ کھالیں۔ کھانا کبھی بھی نہیں کھا سکتیں۔ ہمارا فرض ہے۔ کہ ان کا ضرور انتظار کریں۔

ہندوستان کا یہ ایک عام قاعدہ ہے۔ اور ایک چمار یا خاکروب کی بیوی بھی خاوند سے پہلے کھانا کھانے کو پسند نہیں کرے گی۔ لہذا میاں اور بیوی کبھی بھی اکٹھے مل کر نہیں کھاتے۔ مغربی دنیا میں جہاں مرد اور عورت کی ملاقات مساوی حیثیت سے ہوتی ہے۔ وہاں بھی کھانا مل کر نہیں کھایا جاتا۔ میں نے جہلم میں ایک سپاہی کی نسبت سنا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ مل کر کھانا کھاتا ہے۔ گاؤں والوں نے ان کا مل کر مسخر اڑایا اور کہا کہ وہ اپنے آپ کو نواب بنا رہے ہیں۔ لیکن یہ شمالی علاقے کا ایک سپاہی تھا۔ جسے غلطی سے مجھے یہ یقین دلایا کہ قرآن شریف میں مرد اور عورت کو اجازت نہیں دی گئی۔ کہ وہ مل کر کھانا کھائیں۔ اس لئے کہ عورت کمزور ہے۔ اور مرد کی نسبت اس کا ایمان ضعیف ہوتا ہے۔ اس لئے اگر وہ مرد کے ساتھ مل کر کھانا کھائے تو اسے بھی کمزور کر دے گی۔ شہری گاؤں میں رسم و رواج اسقدر پرانے ہیں کہ پوری مذہبی یا نیم مذہبی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ اگر عورت دیگر فرائض سے آزاد ہو اور گھر میں خود وہی ہو کوئی ساس نہ ہو۔ تو وہ مرد کے ساتھ جبوقت وہ کھانا کھا رہا ہو بیٹھ سکتی ہے۔ لیکن اگر وہ ایسا کر سکتی ہے۔ تو یہ غالباً اس لئے ہے کہ وہ مکھیوں کو اڑائے اور اکثر اوقات یا تو وہ اسکی سیوا میں مصروف رہتی ہے یا بچوں کی پرورش میں مشغول ہوتی ہے۔ وہ خود اس وقت کھاتی ہے۔ جب کہ اسکا خاوند اور بچے کھا چکتے ہیں۔ اور وہ بھی جو کچھ بچے رہے صرف اسی پر کفایت کرنی پڑتی ہے۔ اور اگر گھر میں مہمان آجائیں تو اسے بچا بچایا ٹکڑا بھی میسر نہیں آتا۔ دوسرے طور پر بھی اس کی پستی نمایاں ہے۔ اگر اسکا خاوند فرش پر بیٹھا ہوا ہو تو اسے چارپائی پر بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے۔ اور اگر وہ چارپائی پر بیٹھا ہو۔ تو شاذ و نادر ہی اسے چارپائی کے کسی حصہ پر اس کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت ہو سکتی ہے دیہاتی زندگی میں عورت کی حیثیت گھر کے منقولہ اسباب یا جانوروں سے کسی قدر اونچی ہے اگرچہ سلوک میں کئی ایک امور ملتے جلتے بھی ہیں۔ لیکن اس کی حیثیت قطعی طور پر ادنے ہے۔

عورت کی طاقت

اس نمایاں عدم مساوات کے باوجود عورت گھر میں حکومت کرتی ہے۔ ہندو عورت کی نسبت اظہار رائے کرتے ہوئے مسٹر ہربلاس شاردا نے کہا: "گھر کی زندگی میں جو اثر عورت ڈالتی ہے وہ قریباً اعلیٰ نوعیت کا ہوتا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ یہ اعلیٰ طاقت عورت کو ایک طویل عرصے سے میسر ہے جو حسب ذیل کہانی سے آشکارا ہے" ایک دن بوقت دوپہر جہانگیر بڑی غمناکی سے اس سوچ بچار میں تھا کہ آیا جس طرح اس پر اس کی ملکہ کی حکومت ہے کیا اسی طرح ہر ایک مرد پر عورت حکومت کر رہی ہے۔ اس راز کو معلوم کرنے کے لئے اس کے وزیر کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ وہ ایک سو بھورے گھوڑوں اور ایک سفید گھوڑے کے ساتھ ایک سو گھروں کا معائنہ کرے۔ اور ہر ایک گھر میں جا کر شوہر سے دریافت کرے کہ گھر میں کس کی حکومت ہے؟ اگر وہ کہے کہ اس کی بیوی کو حاکمانہ حیثیت حاصل ہے تو اسے ایک بھورے رنگ کا گھوڑا دیدیا جائے۔ اور اگر وہ کہے کہ گھر کا حاکم وہ ہے تو اسے سفید گھوڑا دے دیا جائے۔ جب وزیر سو دیں گھر پہنچا سفید گھوڑا اس وقت بھی اس کے پاس تھا۔ اور ایک گھوڑا بھورا تھا۔ جو شخص اس گھر میں تھا۔ وہ اپنے دروازے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے فوراً کہا: "گھر کا حاکم میں ہوں" یہ سنکر وزیر نے سفید گھوڑا اس کو دے دیا۔ واقعہ یہ تھا کہ بھورا گھوڑا بہتر تھا۔ اور باورچی خانہ سے عورت نے آواز دی۔ بھورا گھوڑا حاصل کرو۔ اس پر وہ آدمی بولا۔ ازراہ عنایت آپ مجھے بھورا گھوڑا عنایت فرمائیں؟ میں نے گاؤں میں کسی سے بھی اس دعویٰ میں شک کرتے ہوئے نہیں سنا کہ گھر میں راج عورت کا ہے اور اس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ مرد کی نسبت اپنی ناخوشی کا اظہار کئی ایک طریق پر کر سکتی ہے۔ اگر اس کے شوہر کی اراضیات گاؤں کے ارد گرد بکھری پڑی ہوں۔ تو وہ اس معقول بہانہ کی بنا پر دوپہر کا کھانا پہنچانے میں دیر کر سکتی ہے کہ وہ اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے کہاں گئی۔ اس لئے دیر ہو گئی۔ وہ کھانا کو پکاتے ہوئے بگاڑ سکتی ہے۔ وہ کھانے میں زیادہ نمک ڈال سکتی ہے۔ یا اُسے بالکل پھیکا رکھ سکتی ہے۔ جب مرد تھکا ماندہ گھر آئے تو وہ عین اسوقت جبکہ اسکا خاوند مزے سے بیٹھ کر حقہ پینا چاہتا ہے۔ بچے کے منہ پر خواہ مخواہ ایک دھپڑ لگا کر اور اسے رلا کر شوہر کو پریشان کر سکتی ہے۔ اور وہ جس وقت چاہے ہمسایوں سے لڑائی

چھیڑ کر شور و شر پیدا کر سکتی ہے۔ اس سے بدترین بات یہ ہے۔ کہ اس شخص کے سامنے جو اپنی عورت کے لئے مرتا ہو۔ عین اس وقت جبکہ اس کے ہاں مہمان وارد ہو۔ یہ بہانہ بنا سکیں کہ مہمان کی خاطر تواضع کے لئے گھر میں کوئی مناسب شے موجود نہیں ہے۔

ایک شخص نے جو عورت کی طاقت سے آگاہ تھا۔ پکار کر کہا۔ ہاں جناب یہ ٹھیک ہے لیکن اس سے لئے یہ شرط ہے کہ عورتیں مضبوط ہوں۔ یہاں تک دعویٰ کیا جاتا ہے۔ کہ مردوں کے ووٹوں کا فیصلہ بھی عورتیں ہی کرتی ہیں۔ اگر شادی شدہ عورت اپنے باپ کے پاس جائے۔ اور اسے کہے کہ اسے فلاں اُمیدوار کے حق میں ووٹ دینا چاہیئے۔ اور اس مطالبہ کے ساتھ اس امر پر زور دے کہ وہ اپنے شوہر کے گھر سے اتنے دور فاصلے سے چلکر یہ درخواست کرنے آئی ہے تو دنیا کی کوئی قوت اس شخص کو اس امیدوار کے خلاف ووٹ دینے پر مجبور نہیں کر سکتی۔
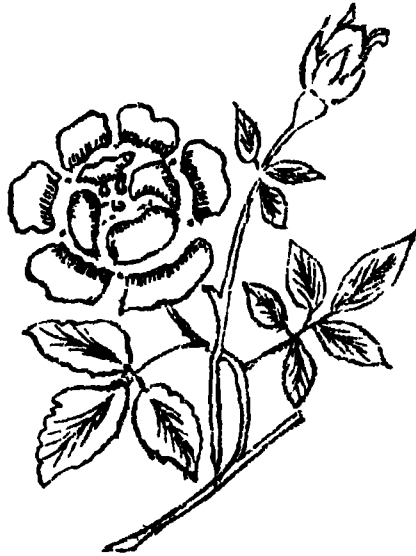
حصّہ دوم

حالات کا تغیّر

اس کتاب کے پڑھنے والے کو جو کچھ سکھایا گیا ہے۔ غالباً وہ اس باب میں کافی ہے۔ کہ جو اسے یہ تصور گو وہ سطحی ہی کیوں نہ ہو قائم کرنے میں مدد دے سکتا ہے۔ کہ گاؤں کے کس گھر میں عورت کی از روئے رسم و رواج کیا حیثیت ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ویدوں کے دنوں میں ہندو عورتوں کو اتنی ہی آزادی حاصل تھی جتنی کہ وہ آج قید غلامی میں ہیں۔ اور یہ کہ ان کی اس آزادانہ حیثیت میں تغیّر کا باعث زمانۂ تاریک کے برہمن شاستر نویس ہیں۔ خواہ اس کا سبب کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ آج اس کے خلاف ردّعمل ظہور پذیر ہے۔ اور گو اسکی محکومی کی کیفیت وقت کی تاریکیوں نے گم کردی ہے۔ لیکن محکومی سے بتدریج آزادی حاصل کرنے کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ اور اسے سپردِ قلم کیا جاسکتا ہے۔ میرے خیال میں اس باب میں جو اوّلین جدوجہد پنجاب کے دیہات میں ہے۔ اسکا حال یہ ہے ؛

لباس

یہ تبدیلی جو واقع ہوئی ہے۔ نہری نوآبادیات اور مرکزی پنجاب میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ لیکن کسی ایک رقبہ میں اس کی وسعت تعلیم اور معیار زندگی کے متناسب ہوگی۔ نیلی بار نوآبادی کی سِکھ جٹنی نے یہ خیال کیا کہ گذشتہ سال میں سب سے بڑی تبدیلی خوراک میں اصلاح ہوئی ہے۔ اور اس کی رائے میرے بیان کی تائید کرتی ہے ایسے ہی متعدد اضلاع میں لباس میں اصلاح کی صورت میں تغیّر رونما ہُوا ہے۔ ریشمی پارچات کے لئے زیادہ مطالبہ کیا جارہا ہے۔ خاص کر ارزاں جاپانی ریشم کی مانگ زیادہ ہے۔ یہ مانگ ضلع راولپنڈی میں جسے فوجی ملازمت سے بہت سی دولت حاصل ہوئی ہے۔ نمایاں ہے۔ ۱۰ یا ۱۵ سال کی بات ہے کہ اس ضلع کی عورتیں گاڑھے کی دس گز کی بھاری بھرکم

شلوار پہنا کرتی تھیں۔ اب وہ اس کی بجائے کا رخانے کا بنا ہوا پانچ گز کپڑا استعمال کرتی ہے۔ کرتیاں جو کبھی سارے بازوؤں کو ڈھانپنے کے لئے پہنی جاتی تھیں۔ اب یہ صرف کہنی تک آکر رہ جاتی ہیں۔ اور گاؤں میں اونچی ایڑیاں بھی دکھائی دینی شروع ہو گئی ہیں۔ عورتیں بھی "فیشن" اور "سوٹ" کی دلدادہ ہو رہی ہیں۔ اور زیادہ فیشن دار یک رنگ قمیص پاجامے اور دوپٹے کا رواج ہو رہا ہے۔ بری اور جہیز میں ایک دو کپڑے ریشم کے ہوتے تھے۔ لیکن آجکل ریشم ہر روز پہنا جا رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں رہتک کی کفایت شعور اور جفاکش جٹنی کا یہ قول کتنا مختلف معلوم ہو گا۔ کہ جس نے اپنے پرانے گھر کے بنے ہوئے شال کو دکھا کر کہا کہ "میرے ریشمی پارچات یہ ہیں"۔ اکثر اضلاع میں بھی اس وقت تک بھی سادہ پوشاک کا رواج ہے۔ اور ایک راجپوت افسر جو سیالکوٹ میں رہتا ہے۔ مجھے یہ بتایا کہ یہی وجہ ہے اس کی بیوی گاؤں کے مقابلے میں قصبے میں زندگی بسر کرنے کو اچھا خیال کرتی ہے۔ گاؤں میں بھی تک زرق برق لباس کو برا خیال کیا جاتا ہے۔ اور فوق البھڑک پوشاک کو کنجنی کی پوشاک سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جہاں گاؤں شہر کے اثر میں آچکا ہے۔ وہاں معزز عورتیں وہی لباس پہنتی ہیں۔ جو کبھی پیشہ ور عورتوں کے لئے مخصوص تھا۔ یہی کیفیت مغربی دنیا میں آرائش و زیبائش کے سامان کی ہے۔ یہ چیز کہ گاؤں پوشاک کے معاملے میں کتنا قدامت پسند ہے۔ اور کسقدر تغیر پسند ہے۔ اس کی کیفیت اس دوسرے افسر کے تجربے سے واضح ہو سکتی ہے جس نے مجھے بتایا کہ ۱۹۱۸ء میں جب وہ بی اے میں پڑھ رہا تھا۔ اس نے کالی سلیپروں کا ایک جوڑا خریدا۔ جب وہ اسے لے کر گاؤں میں گیا۔ تو گھر کے بڑے لوگوں نے اس کے متعلق باز پرس کی۔ کہا گیا کہ یہ تو بدچلن عورتوں کا پہناوا ہے۔ پانچ سال کے بعد اس نے اپنے ایک مقروض کو خود اس قسم کا سلیپر پہنے ہوئے دیکھا۔ اس نے کہا کہ یہ چیز بڑی آرام دہ ہے اس زمانے کے تغیرات کا بڑا سبب آرام کا تصور ہے ۔

کھیت کا کام

پنجاب کا ایک حصہ ایسا ہے۔ جہاں عورت کو کوئی آرام میسر نہیں ہے۔ جنوب مشرق میں اس کی زندگی کبھی ختم نہ ہونے والی جانکاہ محنت کا حکم رکھتی ہے۔ رہتک کے جاٹ نے اپنی بیوی کے مشاغل کا جو نقشہ کھینچا وہ اسکی ایک واضح مثال ہے۔ اس نے کہا کہ اسکی

بیوی صبح چار بجے اٹھتی ہے۔ ایک یا دو گھنٹہ تک چکی پیستی ہے۔ بھینس یا گائے کا دودھ دوہتا ہے
گھر کو صاف کرتی ہے۔ اور صبح کا کھانا تیار کرتی ہے۔ دن کے وقت مختلف اوقات پر وہ
سینے پرونے میں مشغول رہتی ہے۔ کنوئیں سے پانی کھینچتی ہے۔ اور اسے سر پر اٹھا کر
لاتی ہے۔ اسکے ساتھ ہی وہ کھیت میں کام کرتی ہے۔ اور شام کو کھانا پکانے اور کنبے کو
کھلانے کے بعد بچوں کو بستر پر سلاتی ہے۔ اور چھ گھنٹے کے رات میں دس بجے کے قریب
خود سوتی ہے۔ جو چیز اس بیان کو معنی خیز بنا رہی ہے وہ یہ حقیقت ہے کہ یہ قصہ ایک افسر کی
بیوی کا ہے۔ جسے وہ کام نہیں کرنے پڑتے جو دوسری عورتوں کو کرنے پڑتے ہیں۔ بطور
مثال گئوشالوں کی صفائی اور اپلے تھاپنے کے لئے مہترانی ملازم ہے۔ دس سال کی
بات ہے کہ اسکی بیوی بھی یہی کام کرتی تھی۔ لیکن جاٹ نے کہا "اب ہم تعلیمیافتہ ہو گئے
ہیں۔ اس لئے یہ کام اچھا نہیں ہے"۔ مرد کی تعلیم عورت کی بہترین رفیق ہے۔ اور
فوج بھی ایک مددگار ہے۔ بیری کے سپاہیوں نے کہا زمانہ جنگ کے بعد ہم اس کوشش
میں ہیں کہ عورت کو کمتر کام کرنے کو دیا جائے۔ مزید برآں اس نے کہا۔ کہ ہم نے بعض کھاد کا
کام مہترانیوں کو دے رکھے ہیں۔ اور ایندھن کے لئے کانٹے دار جھاڑیاں اور شاخیں کاٹ
کر لانا پنچائت نے ممنوع قرار دیا ہے۔ گوڑگاؤں جیسے ترقی ناپسند رقبہ میں بھی عورتوں سے
کھیتی باڑی کا کمتر کام لینا شروع ہو گیا ہے۔ لیکن صوبے میں بہ حیثیت مجموعی کوئی تبدیلی
نہیں ہوئی۔ اور بیاس کے شمال میں جہاں عورتوں سے بہت کم توقع کی جاتی ہے۔ اسکی
گنجائیش بہت کم ہے۔ تاہم بعض اوقات اس کام کو بھی گھٹا دیا جاتا ہے۔ اور شاہ پور
میں ثروت خوشحالی کے ایام میں بعض نو آبادکاروں کی بیویاں نہ کنوؤں سے پانی لائیں۔ اور
نہ وہ دوپہر کا کھانا لے گئیں۔ جنوب مشرق میں عورت سے بہت کام کی توقع کی جاتی ہے۔
لیکن یہ نقطۂ نگاہ افراط کی طرف جا رہا ہے۔ اور اگرچہ ان کی بیویوں کے لئے جو بڑے بڑے
قطعات اراضی کے مالک ہیں۔ زیادہ آرام دہ زندگی ممکن ہے۔ لیکن یورپ کے کسانوں کا
تجربہ ظاہر کرتا ہے کہ مختصر ملکیتوں پر اگر ان کو زندگی کا اعلیٰ معیار قائم رکھنا ہے۔ ضروری ہے
کہ مرد اور عورت ملکر کام کریں۔

گھر کا کام کاج

گھر کے اندر تغیر زیادہ نمایاں ہے۔ اور اس کی زیادہ تر وجہ زندگی کے معیار کی بلندی کا با

ہیں مشینوں کا رواج۔ اور کسی حد تک تعلیم اور شہری معاشرت کا اثر ہے۔ بے شمار گھروں میں آٹے کی مشین کے نقارخانے نے صبح کے وقت چلنے والی چکی کی طوطی کو خاموش کر دیا ہے۔ اور اکثر گھروں میں کارخانے کے بنے ہوئے پارچات نے چرخے کو نصف حد تک ناکارہ کر دیا ہے۔ کساد بازاری کی برکتوں نے نقد روپیہ میں عالمگیر کمی کر دی۔ اور نقدی کے فقدان کے باعث پھر اور چرخہ پھر رواں ہے۔ خوشحال گھرانوں کے نوجوانوں میں سخت کاموں کو ترک کر کے ہلکے مشاغل اختیار کرنے کا جذبہ روبہ فروغ ہے۔ ایک تجربہ کار سکھ جاٹ نے کہا کہ پرانے زمانے میں عورت بچہ جننے کے بعد چار سے لیکر سات تک آرام کرنے کے بعد گھر کا کام کاج شروع کر دیتی تھی۔ لیکن جب وہ ۲۰ دن تک آرام کرتی ہے۔ اگر حقیقت ایسی ہی ہے تو یہ تبدیلی خوشگوار ہے۔ زیادہ مشکوک بدعت تاش بازی ہے۔ جو دو باتیں دیہات میں کم و بیش تعلیم یافتہ عورتوں میں رواج پذیر ہے۔ اس معاملے میں شہر کا اثر صاف ظاہر ہے۔ مبارک تبدیلی جو میں نے اپنے پہلے دورے میں دیکھی اور سپرد قلم کی وہ یہ ہے کہ مرکزی پنجاب میں اکثر عورتیں صرف اپنے بستروں کے لئے توشکیں اور فرش کے لئے دریاں ہی نہیں بنتیں بلکہ میز پوش، تکیوں کے غلاف اور پھولوں جیسی نفیس چیزیں بھی تیار کر رہی ہیں۔ یہ کام اچھا ہے۔ بشرطیکہ اس کے لئے روزمرہ کے مشاغل ضروری ترک نہ کئے جائیں۔ روزانہ استعمال کی چیزوں کو اس قسم کی آرائشی و زیبائشی اشیاء پر جو خاص خاص تقریبوں پر درکار ہوتی ہیں۔ ترجیح حاصل ہے۔ لیکن خوبصورت گلکاری کو کسی وقت بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے۔ اس باب میں سکولوں پر خاص ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

بہو اور ساس

اب میں زیادہ اہم تبدیلی کا ذکر کرتا ہوں۔ جو اپنے نتائج کے لحاظ سے بہت ہی زیادہ اثر پیدا کرنے والی ہے۔ ساس کا تخت اب محفوظ نہیں ہے۔ اس کی شاہی کو بھی اسطرح چیلنج دیا جا رہا ہے۔ جیسے کہ گذشتہ ۲۵ سال میں پرانے مطلق السنان بادشاہوں کی شاہی کو چیلنج دیا گیا۔ اس کی مطلق السنانی کے دو سہارے مشترکہ خاندان کی نظام زندگی اور بچپن کی شادی ہے۔ اور مشرق کی روایاتی قدامت پسندی ان دونوں کو یکجا

اکٹھا کئے ہوئے ہے۔ مغرب کے اثرات ان تینوں کو تبدیل کر رہی ہے۔ بڑے بڑے خاندان رفت وگذشت ہو رہے ہیں۔ اور شادی کی عمر نا معلوم طریق پر بڑھ رہی ہے۔ اور حاکمانہ اقتدار ہر ایک جگہ رو بہ زوال ہے۔ مختصر خاندانوں اور عمر رسیدہ بیویوں کی صورت میں اس حاکم کی ضرورت نہیں۔ ہی کہ جسکا لفظ قانون ہے۔ اور ہدایت کرنے والی اور راہنمائی کرنے والی اُستانی بھی مطلوب نہیں ہے۔ اور اگر ایسا واقع ہے۔ کہ بہو تعلیمیافتہ ہو۔ اور ساس اَن پڑھ ہو۔ تو وہ ساس کے ہر حکم کی بلا چون وچرا اطاعت نہیں کر سکتی۔ پُرانے زمانے میں اور اس زمانے کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ وہ ساس کی موجودگی میں اپنے شوہر کے ساتھ ایک چار پائی پر بیٹھ نہیں سکتی تھی۔ اور جو کچھ اسے کہا جاتا تھا۔ اسکے جواب میں ہاں کہنے کے سوا کسی اور سخن کے لئے اسے لب کشائی کی اجازت نہ تھی۔ لیکن آجکل کے زمانے میں وہ بحث کرتی ہے۔ نکتہ چینی کرتی ہے اور جیسا کہ شمال کے ایک صوبے دار میجر نے کہا۔ اندنوں بہو اپنے شوہر کی موجودگی میں اپنے ساس کی گوشمالی کرتی ہے۔ اور خاوند کو اس پر معترض ہونے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اس تبدیلی نے قدرتی طور پر کشمکش پیدا کردی ہے۔ اور ایک نامہ نگار نے بتایا کہ بہت کم شوہر ایسے ہیں کہ جو گھر کا انتظام اس طریق سے کر سکتے ہوں کہ جس سے کوئی کشمکش پیدا نہ ہو۔ پُرانے رواج سے بالکل بے نیاز ہوئے بغیر اس زحمت کو کم کرنے یا دور کرنے کا بہترین طریق یہ ہے کہ نوجوان شادی شدہ جوڑے کا کمرہ علیحدہ ہو۔ ان کا باورچی خانہ علیحدہ ہو۔ لیکن گھر کا صحن اور خاندان کی زندگی مشترکہ ہونی چاہیئے۔ اس سے بہو کو کسی حد تک خود مختاری اور خلوت نصیب ہو سکتی ہے۔ اور اس سے وہ گھر کے مشترکہ کام میں مدد بھی دے سکتی ہے۔ جن خاندانوں میں رواج اتنا مضبوط نہیں ہے۔ وہاں تعلیم بالکل ایک علیحدہ نظام قائم کرنے میں ممد ومعاون ہو سکتی ہے۔ لیکن پنجاب کے بیشتر گاؤں میں علیحدہ مکان کی بجائے علیحدہ کمرہ آسان تر تدبیر ہے۔ اکثر خاندانوں میں مشترکہ انتظامات ابھی تک قائم ہیں۔ لیکن وہ تمام حضرات جنہوں نے مجھے ان امور میں اپنے معلومات سے مستفید کیا ہے۔ ان کا اتفاق ہے کہ اندنوں بہو سے بہتر سلوک کیا جا رہا ہے۔ اسے بہتر لباس پہنایا جاتا ہے۔ اور بہتر خوراک کھلائی جاتی ہے۔ یہ تبدیلی بلاشبہ معیار زندگی بلند ہو جانے کے باعث سے۔ اور اس کی وجہ سے نئی دُلہن کے ساتھ پہلے کی نسبت زیادہ اچھا سلوک کیا جاتا ہے۔

خاندان کے معاملات میں اس سے مشورہ بھی لیا جاتا ہے۔ یہ تبدیلی کم و بیش گوہ گاؤں اور انتہائی جنوب مغرب کے علاوہ تمام صوبے میں رونما ہے۔ اور یہ تبدیلی بلاشبہ خوش کن ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ کہنا بھی معقول ہے کہ شخصی رائے کو مفاد خاندان کیلئے وقف کر دینا۔ اور فرائض کی ادائیگی پر اصرار کرنا جو پرانے نظام کے لازمی اوصاف ہیں۔ اگر ان عمدہ اوصاف کو اچھے طریق سے نشو و نما حاصل کرنے کے قابل بنایا جائے۔ تو وہ آئندہ چل کر صبر و تحمل۔ وفاداری۔ محبت اور بے ریا خلوص کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور یہ اخلاقِ حمیدہ وہ ہیں۔ جن کی دنیا کو ہمیشہ ہی ضرورت رہے گی۔ دورِ حاضرہ کے ارباب تعلیم کو اپنی انتہائی توجہ متذکرہ اخلاق کے نشو و نما کی طرف مبذول کرنی چاہیئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کا مدعا یہ ہونا چاہیئے کہ وہ نئے تصورات کو پرانوں میں جذب کر دیں۔ اور جن لوگوں کو ہندوستان کی بہترین نمونے کی اعلےٰ تعلیمیافتہ خواتین سے واقفیت کا شرف حاصل ہے۔ وہ بلاشبہ جانتے ہیں کہ نئے تصورات کو پرانوں میں جذب کرنا بالکل ممکن ہے۔

میاں اور بیوی

انہی اسباب کی بنا پر جن کا ابھی تذکرہ کیا ہے۔ اور جزوی طور پر اس تبدیلی کے باعث جس پر بحث کی ہے۔ میاں اور بیوی کے درمیان نیا تعلق نشو و نما حاصل کر رہا ہے۔ ہندوؤں کے گھروں میں بچپن کی شادی اور مشترکہ خاندان کے نظام نے گھر کی زندگی میں ماں اور بیٹے کے رشتہ کو عظیم الشان بنا دیا ہے۔ اور اس کا قدرتی اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ بہو ہر لحاظ ساس۔ اور بیوی بہر نوع شوہر کے تابع ہے۔ فی الحال عورت بحیثیت ماں۔ بیوی یا خادمہ یا ان تینوں کے ایک مرکب طور پر اپنا فرض حیات پورا کرتی ہے۔ اور چند غیر یقینی سالوں کے لئے ممکن ہے کہ اسے مرغوب و مطلوب تصور کیا جائے۔ بہ حیثیت ماں ہو سکتا ہے کہ اس کا بیٹا اسے عزت کے انتہائی زینہ پر جگہ دے۔ لیکن پیشتر اس کے کہ وہ مقام احترام پر پہنچے اسے ضروری ہے کہ وہ نو آموز خادمہ۔ بیوی اور رفیقۂ کاشت کی حیثیت میں طویل عرصۂ حیات بسر کرے۔ اور اس مرحلہ پر نہ اس کا احترام کیا جاتا ہے اور نہ سے مساوی الحیثیت خیال کیا جاتا ہے۔ اور جنوب مشرق میں اسے اتنا سخت کام کرنا پڑتا ہے کہ اسے ہو سکتا ہے کہ ہمیشہ نوکرانی کا مقام ہی نصیب ہو۔ جہاں اسے خریدا اور بیچا جاتا ہے۔ وہاں اسکی

شان قیمتی اسباب سے زیادہ نہیں ہے۔ گویا گاؤں کی عورت کو مرد کی نسبت ملکہ سے لیکر خادمہ تک ہر ایک کا فرض ادا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن رفیق اور ہم شان معاون کا مقام شاذ و نادر ہی اسے نصیب ہوتا ہے۔ تاہم آثار نظر آرہے ہیں کہ آئندہ اسے گاؤں میں رفیقۂ حیات کا مقام حاصل ہونے کو ہے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ تغیر سب سے زیادہ مؤثر اور عمیق ہوگا۔ اس لئے کہ اس صورت میں تمام خاندان ماں اور بیٹے۔ آقا اور خادمہ کا طواف نہیں کرے گا۔ بلکہ ان کا مرکز توجہ میاں اور بیوی۔ رفیق اور معاون ہوگا۔ جو ایک دوسرے سے مختلف فرائض اور مساوی تعلقات سے مربوط ہیں۔

بیوی کو مارکٹائی

تبدیلی پر زور دیتے ہوئے ہم کو مبالغہ سے احتیاط کرنا چاہیئے۔ شہر کے زیرک طلباء پر جو مغرب کے اثرات کو بہت جلد قبول کر لیتے ہیں۔ اس کا اثر حد سے زیادہ بڑھ گیا ہے لیکن اکثر دیہات میں یہ تبدیلی اس سے زیادہ نہیں ہے کہ بیویوں سے پہلے کی نسبت قدرے اچھا سلوک کیا جارہا ہے۔ لیکن اس نے ایک معنی خیز تبدیلی پیدا کی ہے۔ ایک آگاہ راز فرماتا ہے کہ بیوی سے اب ایسا درشت سلوک نہیں کیا جاتا۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ بیوی کو مارنا پیٹنا اب متروک ہوگیا ہے۔ دس یا بارہ سال کا عرصہ گذرا کہ یہ چیز سارے صوبے میں عام تھی میانوالی کے ایک پٹھان نے کہا کہ اس کے علاوہ ہر ایک شخص اپنی بیوی کو جوتے سے لیکر پستول تک سے جو شے بھی ہاتھ میں آجائے۔ وقتاً فوقتاً زدوکوب کرنے کا عادی ہے۔ لیکن یہ فعل ضروری طور پر بدفہمی کی علامت نہ تھی۔ بلکہ اس کا سبب غصہ اور مزاج کی تیزی تھی۔ روس میں معاملات اس سے جداگانہ نہیں ہیں۔ اس وقت کہ میں یہ الفاظ کہہ رہا ہوں۔ میں نے روس کی ایک کاشتکار عورت کی نسبت سُنا کہ وہ اس شکایت کا اظہار کر رہی تھی۔ کہ اسکے داماد کو اس کی لڑکی سے الفت نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس نے اسے کبھی بھی نہیں مارا۔ "اگر میرا شوہر مجھے نہ مارے تو میں زندہ نہیں رہ سکتی"۔ یہ وہ الفاظ تھے جو اس روسی عورت نے کہے۔ ہندوستان میں مارنے کی اجازت منو جیسے محقق اعظم نے دی ہے۔ اس نے عورت کو چھوٹی رسی یا بانس کی چھڑی سے پیٹنے کی اجازت دی ہے۔ لیکن یہ شرط لگائی ہے۔ کہ عورت کے کسی عضو لطیف پر ضرب لگانے کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن ایک ہمعصر کا خیال یہ تھا کہ اپنی بیوی کو

پھول بھی نہیں مارنا چاہیئے۔ اس وقت تک گاؤں نے اس ہمعصر کے قول کی بجائے منو کی ہدایت پر عمل کیا ہے۔ لیکن زمانہ کا انسانیت آموز اثر قابل مبارکباد ہے کہ اس کے خیال میں آخر کار جیت متذکرہ ہمعصر کو ہوگی۔ ایک سکھ رقمطراز ہے کہ چھڑی اور جوتی دفن ہوگئی ہے۔ اور نیلی بار میں ایک صوبیدار میجر نے مسکراتے ہوئے مجھ سے یہ کہا کہ اگر زدوکوب کوئی چیز ہے تو وہ دوسری طرف ہے۔ ہر ایک جگہ یہ حال ہے کہ مارکٹائی میں کمی واقع ہوگئی ہے۔ اور اکثر حلقوں میں صرف چند ایک اشخاص اس حرکت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ لیکن یہ کہ اس باب میں ابھی کافی اصلاح کی گنجائش ہے۔ شاہ پور کے ایک زمیندار کے اس قول سے عیاں ہے کہ آجکل صرف بے اولاد بیوی کو مارا پیٹا جاتا ہے۔

کثرتِ ازدواج

عورت جتنا بے اولاد ہونے سے ڈرتی ہے۔ اُتنا کسی اور شے سے نہیں ڈرتی۔ اس کی ایک مخفی دہشت ہے جس کا میں نے تذکرہ کیا ہے۔ کہ اس صورت میں خاوند دوسری شادی کر لیتا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں جب تک پہلی بیوی بے اولاد نہ ہو۔ دوسری شادی نہیں کی جاسکتی۔ اس کا ہندو جاٹوں کے لئے ایک اور سبب بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر بھائی یا قریبی رشتہ دار فوت ہوگیا ہو تو بھائی کا فرض ہے کہ اپنی بھاوجہ یا متذکرہ رشتہ دار کی بیوی سے شادی کرے۔ مسلمانوں میں کثرتِ ازدواج کی کثرت ہے لیکن یہ چیز صرف چند مالکان اراضیات کی بستیوں میں دیکھی جاتی ہے۔ جہاں ضابطۂ اخلاق کی درشتی میں عام طور پر غلطی نہیں کی جاتی۔ لیکن پنجاب میں بحیثیت مجموعی یہ چیز اہم نہیں ہوسکتی۔ اس لئے کہ یہ صوبہ چھوٹے زمینداروں کا ہے اور چھوٹا زمیندار نہ دوسرے بیوی کے لئے علیحدہ مکان بنا سکتا ہے۔ اور نہ اسکی ضروریات بہم پہنچا سکتا ہے۔ نئی روشنی بھی اسکے خلاف ہے اور تعلیم یافتہ طبقوں میں اسکے خلاف نفرت روبہ فروغ ہے۔ اور بعض اسے بالکل نقصان دہ خیال کرتے ہیں۔ تاہم ہوسکتا ہے کہ کثرتِ ازدواج اس زاویۂ نگاہ کے موافق ہو کہ عورت زیادہ تر ایک ماں۔ خادمہ یا باندی ہے۔ اسے اس نقطۂ نظر سے کوئی مطابقت نہیں ہے۔ کہ وہ مرد کی رفیقۂ حیات اور زوجہ ہے۔

مساوات

گاؤں میں عورت مساوات کے مقام سے بہت دُور ہے۔ لیکن اسکی قدر وقیمت اضافہ پذیر ہے۔ اور زیادہ تعلیمیافتہ اشخاص میں اسے قریباً مساوات حاصل ہے۔ اس معاملہ میں سکھ سب سے آگے ہیں۔ اور اس باب میں ایک ادھیڑ عمر کے سکھ نے جو کچھ مجھے میرے دورہ میں کہا اس کا اعادہ ضروری ہے۔

"پرانے دستور کے مطابق جب کام سے واپس آتا ہوں۔ میری بیوی میرے پاؤں چھوتی ہے۔ لیکن میری بہو جو تعلیمیافتہ ہے۔ وہ ایسا نہیں کرتی۔ اور کھانے کے معاملے میں بھی دونوں کے طرز عمل میں قدرتی اختلاف عیاں ہے۔ میری ماں خواہ اُسے کتنا ہی انتظار کیوں نہ کرنا پڑے۔ میرے والد سے پہلے کھانا نہیں کھاتی۔ لیکن میری بہو اپنے شوہر کا مطلقاً انتظار نہیں کرتی۔" مشرقی پنجاب کا۔ ایک ہندو راجپوت جس کی روایاتی شان چار دیواری پردہ سے عیاں ہے۔ کہتا ہے کہ عورت سے اب تمام خاندانی امور میں مشورہ لیا جاتا ہے اور جب وہ کوئی کام کرتی ہے تو وہ اس میں اپنے شوہر کی حمائت حاصل کرنے کی اُمید کر سکتی ہے۔

خوراک اور پوشاک کے معاملے میں اسے کمتر نہیں سمجھا جاتا۔ اور اس کی صحت اور عافیت کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔ صوبہ پنجاب کے ایک نامور بہادر مسلمان نے جو راجپوت نسل سے تھا اور جو گذشتہ ۷۰ سال کی خبر دے سکتا تھا ۱۹۳۲ء میں مجھے کہا کہ جب میں جوان تھا۔ اُس زمانے کے مقابلے میں آجکل میاں بیوی ایک دوسرے کا زیادہ احترام کرتے ہیں۔ وہ آپس میں مشورہ کرتے ہیں اور عورت کو نگاہ حقارت نہیں دیکھا جاتا۔ مغربی دنیا میں بھی تغیر رونما ہے۔ اگرچہ وہاں کی عورت مشرقی عورت سے زیادہ آزاد ہے۔ سواحل سندھ کے رہنے والے ایک پٹھان نے میرے دورے میں مجھ سے یہ گفتگو کی کہ اگر مرد اپنی عورت کو ممنونِ احسان کیے تو اندنوں اسے "زن مُرید" نہیں کہا جاتا۔ اور گوڑگاؤں میں بھی جہاں تبدیلی کے آثار کمترین ہیں۔ وہاں بھی نئی روشنی کے نوجوان دوسروں کی موجودگی میں بوقتِ صبح اپنی بیویوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

بچہ کشی

مبالغہ سے بچنے کے لئے مجھے یہ بھی بیان کر دینا چاہیئے کہ ایک ہندو بی اے نے مجھے بتایا کہ "اگرچہ میری بیوی ہائی سکول میں پڑھ چکی ہے لیکن پھر بھی میں اس سے مشورہ نہیں کرتا"۔ اس نے اپنے نقطہ نگاہ تشریح کرتے ہوئے کہا کہ "مجھے اس کی فراست و ذہانت پر زیادہ اعتماد نہیں ہے"۔ اس نے اعتراف کیا کہ اس نے اپنے آپ کو مشکلات سے محفوظ رکھنے کے لئے گھر کا تمام کاج اس کے سپرد کر رکھا ہے۔ متذکرہ ہندو راجپوت نے تذکرہ کیا کہ بچہ کشی جو ہندوؤں اور سکھوں میں عام تھی وہ بھی کم ہو گئی ہے۔ اور یہ چیز اس حقیقت کا ایک بین ثبوت ہے کہ عورت کی عزت روبہ اضافہ ہے۔ کھتری قوم کے ایک ہندو بی اے نے اپنے خاندان کا حال سنکر متذکرہ دعوے کی تصدیق کی۔ اسکی دادی کے چار بچے اور تیرہ لڑکیاں تھیں۔ اس نے صرف ایک لڑکی کو زندہ رہنے دیا۔ باقیوں کو افیم مہلک مقدار میں دے دی گئی۔ اس کی ماں نے بھی اسی طرح دو لڑکیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ لیکن اس کے خاوند نے اسے مجبور کیا کہ وہ دو سال تک سچا تاپ (توبہ) کرے اس قسم کی حرکت صوبہ کے اس حصہ میں (بلاشبہ صوبہ کے کسی حصے میں) ابھی نہیں ہوتی۔ اور وہ خود اپنی بچیوں کو بڑا پیارا خیال کرتا ہے۔ یہ نظیر عورتوں کی آزادی کے ضمن میں ایک نمایاں انقلاب آشکار کر رہی ہے +

رفاقت

دیہات زادہ افسروں میں یہ عادت روبہ ترقی ہے کہ وہ اپنی مستورات کو گھر پر چھوڑ آنے کی بجائے اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ اور ان کا یہ طرز عمل اس حقیقت کا ایک نمایاں ثبوت ہے کہ مستورات کو نوکرانیوں کی بجائے رفیقہ ہائے حیات سمجھا جا رہا ہے۔ رہتک کے ایک جاٹ نے کہا "اگر میری بیوی خواندہ ہوتی تو میرے ساتھ رہنے پر اصرار کرتی اور یہ چیز زیادہ خوشگوار ہوتی"۔ مرکزی علاقے کے ایک پٹھان نے کہا۔ کہ وہ اپنے گاؤں میں سے پہلا شخص تھا جو اپنی بیوی کو ساتھ لے کر گیا۔ اس پر اس کے چچا نے اسے سخت زجر و توبیخ کی۔ لیکن اب خود اسکا چچا (جیسا کہ کالے سلیپروں کا قصہ تھا) یہ کام کرتا ہے اس طریق پر

ایک دوسرے کی قسمت میں شرکت آرا ہو کر میاں اور بیوی ایک نئی رفاقت کے طور پر آپس میں متحد ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے اثر پذیر ہو کر میاں قدرتاً اپنی بیوی سے مشترکہ امور میں وہ آزادی سے مشاورت کرتا ہے۔ اس ضمن میں بھی دیگر امور کی مانند گوڑ گاؤں استثنیٰ کا حکم رکھتا ہے۔ گھر کی اندرونی زندگی پر تمام طور پر بیوی کا تصرف ہوتا ہے۔ اور جو غلہ گھر کی ضرورت کے لئے الگ رکھا جاتا ہے۔ وہ بھی بالعموم بیوی کے اہتمام میں ہوتا ہے۔ اور جو غلہ فروخت کیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق بھی اس کو اپنی رائے کے اظہار کا حق ہوتا ہے۔ لیکن جب تک وہ فرد ان اقوام میں سے نہ ہو۔ یا مغرب میں نہ رہتی ہو۔ وہ بازار میں سودا سلف خریدنے کیلئے نہیں جاتی۔ لیکن خوراک اور پوشاک جو مقررہ وقفہ کے بعد مقررہ وقت پر خریدی جاتی ہے۔ اس میں اس کی اجازت کو بھی دخل ہے۔ گھی کی فروخت اس کا کام اور بالائی آمدن کا ذریعہ ہے۔ جہاں روئی کی کاشت کی جاتی ہے۔ وہ بنولے چننے کا انتظام کرتی ہے۔ اور بعض اشخاص کا خیال ہے کہ روئی کی کاشت کی وسعت نے اسے زیادہ ذمہ دارانہ مقام حاصل کرنے کے قابل بنا دیا ہے۔ معاشرتی تقریبوں میں خواہ منگنی ہو یا شادی یا ختنہ اس امر کے متعلق اس سے مشورہ لیا جاتا ہے کہ کس کس کو دعوت دی جائے۔ اور کیا کیا چیز بطور تحفہ دی جائے۔ انجمن اصلاح رسوم مستورات کی ہمدردی حاصل کئے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ میں نے کسی اور مقام پر بیان کیا ہے کہ سکھ عورتوں نے کہہ دیا کہ وہ زیورات پہننے سے صرف اس صورت میں کنارہ کش ہو سکتی ہیں۔ کہ ان کے میخوار شوہر شراب نوشی ترک کر دیں۔ مختصر یہ کہ جیسے کہ شمالی پنجاب کا ایک واقفکار تحریر کرتا ہے۔ کہ ان دنوں بیوی گھر کی ناظمہ، خزانچی اور تنخواہ بانٹنے والی افسر ہے۔

کفایت شعار بیوی!

ضلع راولپنڈی میں گھر کی بیوی اپنی بہترین سیرت میں جلوہ گر ہے۔ وہاں ملکیتیں صوبے کے دیگر مقامات کی مانند مختصر ہیں۔ تاہم لوگوں نے زندگی کا ایک خاص معیار قائم کر لیا ہے۔ اس کے لئے وہ فوجی ملازمت کے شرمندۂ احسان ہیں۔ لیکن اکثر صورتوں میں مستثنیات بھی ہیں۔ ان کی آمدنیاں ان کی بیویوں کی انتہائی دور اندیشی اور کفایت شعاری کے بغیر اخراجات کے لئے کافی نہیں ہو سکتیں۔ ایک ایسے شخص کی روایت ہے ...

رقبوں کو خوب جانتا ہے۔ کہ جہاں شاہ پور کے آبادکار کی بیوی ۲۰۰ روپیہ صرف کرتی ہے وہاں راولپنڈی کی عورت ایک سو روپیہ خرچ کرتی ہے۔ آخرالذکر اپنے شوہر کے خرچ کو اپنی نگاہ میں رکھتی ہے۔ اور غلہ جب گھر میں آجاتا ہے تو وہ اپنے شوہر کو اس غلہ کو چھونے کی اجازت نہیں دیتی۔ وہ جانتی ہے۔ کہ کتنی جنس گھر کی ضروریات کے لئے واقعی کافی ہے۔ چنانچہ وہ آٹے کو تولتی رہتی ہے۔ وہ اپنے پارچات خود تیار کرتی ہے۔ اور ان کو فوری مرمت کرتی ہے۔ ان کو زیادہ میلا نہیں ہونے دیتی۔ بلکہ ان کو دھوتی رہتی ہے۔ اور اس طرح ان کو زیادہ پائیدار بنالیتی ہے۔ خواہ مخواہ کے خرچ کو روکنے کے لئے وہ مہمانوں کا کھانا خود پکاتی ہے اور جیسا کہ دیگر مقامات پر اکثر کیا جاتا ہے۔ وہ میراثی یا نائی کو اس غرض کے لئے نہیں بلاتی۔ یہی وجہ ہے کہ اسکی چپاتیاں عام طور پر چھوٹی ہوتی ہیں۔ مجھے مری کی پہاڑیوں میں ایک خاندان کا حال معلوم ہے۔ جو ۳۰۰ ایکڑ اراضی کا مالک ہے۔ کہ اس کنبہ کی عورتیں پارچات خود تیار کرتی ہیں۔ ہاں جیسا کہ اس گھر کے کرتے دھرتے نے کہا۔ کہ صرف ایک دو کوٹ استعمال کا حکم رکھتے ہیں۔ جو افسروں کی ملاقات کے لئے رکھے جاتے ہیں۔ اگر لوگ افلاس سے بچنے کے لئے ضروری کوشش کریں۔ تو وہ بہت حد تک اس سے محفوظ رہ سکتے ہیں *

شادی باہمی رضامندی سے

جو شادی رفاقت پر مبنی ہو۔ وہ نئی اہمیت حاصل کر لیتی ہے۔ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ کثرت ازدواج اصولی طور پر اس تعلق کے منافی ہے۔ اور اگر صرف ایک بیوی ہو تو ضروری ہے کہ اسے احتیاط سے منتخب کیا جائے۔ اگر بیوی کو ہمیشہ اس کے ساتھ رہنا ہو۔ اور اس کی رفیقۂ حیات بننا ہو۔ تو پھر اسے چناؤ کی اہمیت اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ گاؤں میں نوجوانوں کے درمیان وہ چیز جسے محبت کی شادی کہتے ہیں ناپید ہے۔ شادیاں بلا تغیر والدین کے ذریعے انتظام پذیر ہوتی ہیں۔ اور بچپنے کی شادی میں اس کے بغیر اور کچھ ممکن بھی نہیں اور درمیانی شخص عام طور پر نائی ہوتا ہے زمانے کے تغیر کی ایک چھوٹی سی نشانی یہ ہے کہ بعض والدین اس معاملے کو خود اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں۔ اور چونکہ شادی کی عمر طفولیت سے بڑھ کر بلوغت ٹھہرائی جارہی ہے۔ اس لئے دلہن اور دولہا ایسے نووارد

نہیں ہوتا جیسا کہ کبھی ہوتے تھے۔ رسم ورواج کی سختی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ شادی سے بیشتر ایک دوسرے کو دیکھ تک نہیں سکتے۔ اور ایک اعلیٰ تعلیمیافتہ شہری نے جس نے جنگ کے زمانے میں شادی کی۔ مجھے بتایا کہ اس نے اپنی بیوی کو صرف شادی والے دن اوّل مرتبہ دیکھی۔ یہ قاعدہ ابھی تک گاؤں میں مروّج ہے۔ لیکن نوجوان اس رسم پر معترض ہو رہے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ دزدیدہ اشارات اور محبّانہ ملاقاتیں بھی سننے میں آتی ہیں۔ ایک ۲۲ سالہ نوجوان افسر نے مجھے بتایا کہ پردہ کی رکاوٹوں کے باوجود اپنی منسوبہ کو دو دفعہ دیکھ چکا ہے۔ وہ ایک اور نقطۂ نگاہ سے ایک اور خیال کا نوجوان تھا۔ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ جب تک اپنی بیوی کی ضروریات خانہ داری بہم پہنچانے کے قابل نہیں ہوگا۔ شادی نہیں کرے گا۔ یہ نیا طرزِ عمل ہے۔ اور اگر کسان میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے تو یہ بذاتِ خود ایک اعلیٰ درجہ کا اقتصادی تغیر ہوگا۔

مسلمانوں کے شمالی اور مغربی صوبہ میں زیادہ اُمید ترقی نمودار ہے۔ جہاں لوگ ۱۸ یا ۲۰ سال سے پہلے شادی نہیں کرتے۔ لیکن مشرقی اور مغربی اضلاع میں اُمید کم ہے۔ ان اضلاع میں ہندوؤں کی یہ رسم کہ شادی بچپن میں ہونی چاہیئے۔ ابھی تک رائج ہے ہندوؤں کا نقطۂ نگاہ وہ ہے۔ جس سے میرے ہندو دوست نے جس کا تذکرہ میں آگے بھی کر چکا ہوں۔ مجھے بتایا کہ کسی نہ کسی طرح سے یہ بات ہمارے کانوں تک پہنچائی جاتی اور ہمارے دل میں اُتاری جاتی ہے۔ کہ اگر ہم نے شادی نہ کی تو ہمیں اس دُنیا میں شرمندگی حاصل ہوگی۔ اور اگلی دُنیا میں نرگ بھوگنا ہوگا۔ اس نوعیّت کے خدشہ کو جلدی دور کرنا پڑتا ہے۔

شادی کی عمر

انگریزوں کو قدرتی طور پر ہندوستان میں شادی کی عمر کا اندازہ اپنے رسم ورواج کی بنا پر نہیں لگانا چاہیئے۔ ان کے رسم ورواج دیہاتی ماحول کے بجائے شہری فضا اور گرم کی بجائے ٹھنڈی آب وہوا کے زیادہ مناسب ہیں۔ کسان کے لئے کارخانہ میں کام کرنے والے مزدور کی نسبت بیوی کی زیادہ ضرورت ہے۔ اور گرم ملک میں ٹھنڈے ملک کی نسبت شگوفہ جلدی کھلتا اور کونپل جلدی پھوٹتی ہے۔ جنوبی یورپ میں جہاں دھوپ

زیادہ پڑتی ہے۔ لڑکیوں کی شادی کی عمر ۲۰ سال سے زیادہ ہونے کی بجائے کم ہے۔ اور زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ اس کا تناسب ہندوستان کے موافق تھا۔ لیکن وہ ایام وہ تھے کہ جب بچیوں کے لئے معمولی نوشت وخواند ضروری تصور کی جاتی تھی۔ لیکن اندریں جبکہ لڑکیوں کی خاص تعداد پرائمری سکول میں پڑھنے کے بعد بھی اپنی تعلیم کو جاری رکھتی ہیں تعلیمیافتہ لڑکیوں کی شادی عام طور پر دیر سے کی جاتی ہے۔ اور ناتعلیمیافتہ رشتہ دار اور ہمسائے [illegible] کی مثال کے اثر پذیر ہوتے [illegible] نے دوسری جگہ تحریر کیا ہے کہ یہ میلان روبہ فروغ ہے کہ شادی کی تقریب کو بلوغت تک ملتوی رکھا جائے۔ اور اس ضمن میں شاردا ایکٹ کی نسبت تعلیم سے زیادہ نفع بخش کی توقع ہے۔ شاردا ایکٹ ۱۴ سال سے کم عمر کی لڑکی کی شادی خلافِ قانون قرار دیتا ہے۔ یہ قانون اعلیٰ ترین جذبہ پر مبنی تھا۔ اور اس کا منشا ایک بُرائی کو بلا واسطہ طریق پر دور کرنا تھا۔ لیکن اس وقت ......

یہ قانون غیر مؤثر ثابت ہؤا ہے۔ اس لئے کہ اسے رائے عامہ کی تائید حاصل نہیں ہے پنجاب کے گاؤں میں رسم کے مقابلے میں اس کا زور نہیں چلتا اور قصبوں میں اصلاح کی بجائے یہ قانون زیادہ تر گرفتاریوں کا موجب ثابت ہؤا ہے ؀

تعلیم

اس حقیقت کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہ اس باب میں قانون کی بجائے تعلیم زیادہ اصلاح کن ہے۔ بہ تاسف کہنا پڑتا ہے۔ کہ صوبہ کی مستورات میں سے چار سال سے زیادہ عمر کی لڑکیوں میں سے ۲ فی صدی سے بھی کم خواندہ ہیں۔ ۱۹۳۳ء میں بھی ۸ فیصدی بچوں کے مقابلے میں نسوانی آبادی میں سے کل بہ مشکل دو فیصدی لڑکیاں سکول میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ اگرچہ لڑکی کی تعلیم سے نہ صرف اس پر اثر پڑتا ہے بلکہ تمام بچوں پر اثر پڑتا ہے۔ لیکن سکولوں میں پانچ لڑکوں کے مقابلے میں صرف ایک لڑکی پڑھ رہی ہے۔ اور جو ترقی بھی ہوئی ہے۔ وہ شہری رقبوں تک محدود ہے۔ لیکن میں شک نہیں کرسکتا کہ میرے گذشتہ دورہ کے بعد اور جب سے میں نے تحقیقات شروع کی ہے۔ گاؤں میں خاص کر نوآبادیات میں اس بارے میں کس قدر رغبت کا اظہار کیا جارہا ہے۔ کہ لڑکیوں کو کم از کم لکھنا پڑھنا ضرور سکھانا چاہیئے۔ اور یہ علامت حوصلہ افزا ہے۔ کہ

کساد بازاری کی وجہ سے جہاں سکول میں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی تعداد کم ہو گئی ہے۔ وہاں بچیوں کی تعداد میں اضافہ ہؤا ہے۔ سکھوں کے نزدیک تعلیم کا معاملہ زیادہ حد تک سکولوں اور استادوں کا معاملہ ہے۔ اور ان میں سے اکثر جیسا کہ ہوگا سے ظاہر ہوتا ہے۔ ابتدائی تعلیم پر مطمئن نہیں ہیں۔ ایک سکھ دوست اطلاع دیتا ہے کہ حال ہی میں اس نے دس متوسط الحال خاندانوں کے حالات معلوم کئے۔ پتہ چلا کہ ہر وہ بچی جو اپنی عمر کے لحاظ سے سکول میں پڑھ سکتی ہے۔ سکول میں پڑھ رہی ہے اور ان میں سے ایک وہ بھی ہے۔ جو ایک بچہ کو دودھ پلا رہی ہے۔ اس نے ایک ایسے جاٹ سکھ کا تذکرہ کیا۔ کہ جس کی تین لڑکیاں بی اے پاس کر چکی ہیں۔ اور ایک ایم اے پاس ہے۔ اور حال یہ ہے کہ وہ صرف ۰۔ ۴ ایکڑ اراضی کا مالک ہے۔ زنانہ تعلیم کے معاملے میں مسلمان بدقسمتی سے پچھڑی ہیں۔ تاہم کوہستان نمک جہلم علاقہ میں جب ایک سکول کھولا گیا اور ایک ذیلدار کی لڑکی سکول میں داخل ہو گئی۔ تو ۵۰ لڑکیوں نے اس کی تقلید کی۔ اور میں یقین کرتا ہوں۔ کہ اکثر سکول کھولے گئے۔ اور سر کردہ حضرات نے ابتدا کی۔ تو اکثر جگہ یہی ہوگا۔ جس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

رکاوٹیں

بچیوں کی تعلیم میں اس کمی سبب سرکاری طور پر استادوں کی کمی اور ڈسٹرکٹ بورڈس کی بے التفاتی ظاہر کیا گیا ہے۔ چند ایک کو مستثنٰے قرار دیتے ہوئے آخر الذکر میں سے زنانہ متوسط کے خیال والے تعلیم کو صرف ذریعہ معاش تصور کرتے ہیں۔ اور اسی لئے اپنے ذرائع صرف لڑکوں کی تعلیم پر صرف کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ نقطہ نظر اس روایاتی زاویہ نگاہ کے موافق ہو۔ کہ لڑکے اور بیل کی خوب اچھی طرح سے پرورش کرنی چاہیئے۔ لیکن اس خیال کے لوگ اس امر کو بالکل نظر انداز کر رہے ہیں۔ کہ دیہاتی زندگی میں تعلیمیافتہ استانیوں۔ زنانہ ڈاکٹروں۔ زنانہ کارکنانِ حفظانِ صحت۔ زنانہ کارکنانِ امداد باہمی کی ضرورت سختی سے محسوس کی جا رہی ہے۔ اور نا تعلیمیافتہ لڑکی کے لئے تعلیمیافتہ شوہر تلاش کرنے میں زیادہ دقت پیش آ رہی ہے۔ لیکن تعلیم نسواں کا جائزہ لیتے ہوئے اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ اس کے خلاف جو عمیق اور عالمگیر جذبہ آج سے ۱۰ سال

پہلے تھا۔ آج وہ نہیں ہے۔ جو چیز آج ممکن ہے۔ اس زمانے میں ناممکن تھی۔ ایسے ہی غیر متوقع مطالبہ کی فوری تکمیل ممکن نہیں۔ فنڈ کی بہم رسانی کی راہ میں مالی مشکلات ایک سنگ گراں ہیں۔ استادوں کی تربیت لازمی ہے۔ اور اگر روپیہ کو برباد کرنا منظور نہیں تو ان کی اچھی خاصی تعلیم لازمی ہے۔ اور اس غرض کے لئے مناسب اور موزوں دیہاتی مستورات کی جستجو ضروری ہے۔ اکثر استانیاں شہری ہیں۔ اور ۱۰ میں سے ۹ صورتوں میں شہری استانیوں کو دیہات میں بھیجنا بے فائدہ حرکت ہے۔ شہری استانی گاؤں میں اُکتا جائے گی۔ وہ دل سے کام نہیں کرے گی۔ اس کی تعلیم میں شہری رنگ نمودار ہوگا۔ اور اسے وہاں اجنبی خیال کیا جائے گا۔ اور اگر تعلیمیافتہ دیہاتی استانیاں کافی تعداد میں دستیاب ہو بھی جائیں پھر بھی ان حالات میں کہ ان کو اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا۔ ان کے لئے مکانات بہم پہنچانے اور ان کی حفاظت کی عظیم الشان تکلیف پیش آئے گی۔

یکجا تعلیم

ان مشکلات کا جزوی حل جس پر مسٹر برین صاحب نے خاص زور دیا ہے۔ لڑکیوں اور لڑکوں کی یکجا تعلیم کا وسیع نظام ہے۔ لیکن میں نے اپنے دورہ کے دوران میں یہ معلوم کیا۔ کہ لوگ اس امر کے خلاف ہیں۔ کہ بلوغت کے بعد بھی لڑکے اور لڑکیاں یکجا تعلیم حاصل کریں۔ بلوغت کے زمانے سے قبل بھی اس نوعیت کی تعلیم کے متفق آراو کا میں نے بکثرت اختلاف دیکھا۔ میانوالی میں جو پنجاب کا مغربی ضلع ہے۔ اور جہاں کے اکثر دیہات میں نام نہاد پردہ بھی موجود نہیں ہے۔ وہاں قریباً ۲۷ سو لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ پڑھ رہی ہیں۔ یا ایک ہی چھت کے نیچے ان کو تربیت دی جا رہی ہے۔ لیکن بعض اضلاع ایسے ہیں جہاں ایک ہزار بھی ہیں۔ عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملک یکجا تعلیم کے لئے تیار نہیں ہے۔ یورپ کا ہر ملک بھی اس کے لئے آمادہ نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی مدِ نظر رکھنا چاہیئے کہ ہندوستان جیسے مفلس ملک میں جس کی وسیع آبادی کو تعلیم دینا ہے۔ ابتدائی منزل میں یہ چیز خاص طور پر مطلوب ہے۔ اور میرا خیال یہ ہے کہ رغبت دلانے سے ممکن ہے کہ اکثر اشخاص یکجا تعلیم کی تائید پر مستعد ہو جائیں۔ لیکن یہ چیز انہی مدارس میں ممکن ہو سکتی ہے۔ جن کے عملہ کو پوری احتیاط سے منتخب کیا گیا ہو۔ گاؤں میں اگر موزوں شخص راہنمائی کیلئے

مل جائے تو ہر شے ممکن ہے +

تعلیم کا اثر

مستورات کی تعلیم کا سب سے بڑا محرک اُمر تعلیمیافتہ حضرات کی یہ روز افزوں خواہش ہے کہ ان کی بیویاں تعلیمیافتہ ہونی چاہئیں۔ جنگ سے پہلے یہ خواہش صرف چند اشخاص تک محدود تھی۔ لیکن شادی کے بارے میں نئے زاویۂ نگاہ کے باعث ایک اہم تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ اور کوئی تعلیمیافتہ شخص اَن پڑھ رفیقۂ زندگی کا طالب نہیں ہے۔ ایسے ہی اگر کوئی شخص واقعی تعلیمیافتہ ہے۔ وہ غیر تربیت بچوں یا گندے گھر کو پسند نہیں کر سکتا۔ اسکی تائید ہمارے رُہتک جاٹ کے اس قول سے ہوتی ہے کہ "تعلیمیافتہ عورت یہ دیکھے گی کہ لباس صاف ہو۔ برتن ہر قسم کے داغ سے پاک ہو۔ نیز وہ بچوں کو تھوڑی بہت تربیت قرار دے گی"۔ بچوں کی تربیت کی ضرورت کو ہر جگہ محسوس کیا جا رہا ہے۔ اور مشرقی اضلاع کو اپنے گھروں کی درستی کے باب میں ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔ اگر مغربی اضلاع اس ضمن میں نسبتاً بہتر ہیں۔ تو ان کی مستورات کو اپنی آزادی کا توازن قائم رکھنے کے لئے تعلیم کی ازبس ضرورت ہے۔ تعلیم کی ضرورت ہمیشہ بہ تناسب آزادی محسوس ہوئی ہے۔ جہلم کے شمال مغرب میں قتل کی وارداتیں عجیب و غریب طریق پر عام ہیں۔ اور کسی نہ کسی لحاظ سے ہر ایک قتل کی تہ میں عورت ہی کا ہاتھ ہوتا ہے۔ پولیس ان وارداتوں کو روکنا چاہتی ہے۔ ان میں اضافہ کو روکنا چاہتی ہے۔ لیکن میرے خیال میں اس کی انتہائی کوشش بھی عورتوں کی تعلیم کے بغیر اپنے مقصد میں بارآور نہیں ہو گی۔ تعلیم کا انسانیت خیز اثر مسلمہ ہے۔ عورتوں کی مارکٹائی میں کمی میں تعلیم کا اثر سب سے نمایاں نظر آ رہا ہے۔ اور شادیوں اور میلوں میں خاص قسم کے گیتوں کے رواج میں جو کمی رونما ہے۔ یہ کمی بھی جزوی لحاظ سے اثر تعلیم کے باعث ہے۔ شمال مغربی علاقوں میں شادی کے موقع پر متذکرہ نوعیت کے گیت مرد اور زن مل کر بلند سُروں میں گایا کرتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں اگر کبھی گائے بھی جاتے ہیں تو انہیں صرف مَرد گاتے ہیں۔ اور وہ اس وقت جبکہ عورتیں موجود نہ ہوں۔

کفائت شعاری

تعلیم کا ایک اثر ضرور بیان کرنا چاہئیے۔ روپے کی قدر و قیمت کے متعلق اس کے باعث ایک نیا احساس موجزن ہے۔ عورتوں کی اچھی خاصی معقول تعداد نے (جن میں سے اکثر سکھ عورتیں ہیں) اپنے زیورات فروخت کر دئیے ہیں۔ اور ان کی قیمتیں انجمن ہائے امداد باہمی میں بطور امانت جمع کرا دی ہیں۔ میرے دورے کے دوران میں ایک سکھ سردار نے مجھے بتایا کہ کس طرح اس نے اپنی شادی کے وقت ایک ہزار روپیہ کے زیور خریدے۔ اور بعد ازاں اپنی بیوی کی مرضی سے انہیں ۹ سو روپیہ کو فروخت کر دیا۔ اپنی بچت کا ایک سو روپیہ اس رقم میں شامل کر کے اس نے ایک ہزار روپیہ اپنے دیہاتی بنک میں جمع کرا دیا۔ اس نے واضح کیا کہ جب میں نے زیورات خریدے۔ اس وقت گاؤں میں کوئی بنک نہ تھا۔ جب بنک بن گیا۔ اس نے مجھے کچھ سکھا دیا۔ ان لوگوں کی تعداد جو ضرورت کے سوا اپنے زیورات فروخت کر دیتے ہیں۔ بلاشک وشبہ بہت تھوڑی ہے۔ لیکن اب لوگ شادیوں کے موقع پر زیورات پر اتنا خرچ نہیں کرتے جتنا کہ خرچ کیا کرتے تھے۔ اور عام دستور میں یہ تبدیلی کساد بازاری کے ایام سے پہلے کی آغاز پذیر ہے۔ جہاں تک کل خرچ میں کمی کا تعلق ہے یہ تغیر مفید ہے۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زیورات کے بنانے میں جو کمی کی جاتی ہے۔ اس کی کسر پارچات پر زیادہ خرچ کر کے پوری کر دی جاتی ہے۔ اندریں صورت متذکرہ کمی قابلِ اعتراض ہے۔ اس لئے کہ پارچات فرسودہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن زیورات نسبتاً دیر پا ہوتے ہیں۔ زیورات کی قدر و قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اور اگر کسان کے پاس زیورات نہ ہوتے تو کساد بازاری کے منحوس سالوں میں اس مصیبت سے عہدہ برا نہ ہو سکتے۔ جس سے ان کو دوچار ہونا پڑا۔ نہری علاقوں میں زیورات کی بہت بڑی مقدار حکومت کے واجبات ادا کرنے کے لئے فروخت کی گئی۔ اور اس فروخت کے لئے پنجاب کی مستورات قابلِ تحسین ہیں۔ اس لئے کہ اکثر نے زیورات اپنے رشتہ داروں کے حوالے کر دئیے۔ تاہم اہم سوال یہ نہیں ہے کہ آیا زیورات خریدے جائیں یا نہ۔ بلکہ اصل سوال یہ ہے۔ کہ کسانوں کو روپیہ کے دانشمندانہ استعمال کا ڈھنگ آنا چاہئیے۔ یہی سبق سب سے مشکل اور اہم ہے

جو امداد باہمی کو سکھاتا ہے۔ اور گذشتہ چند سال سے امداد باہمی نے عورتوں کو یہ سبق سکھانا شروع کر دیا ہے۔ ۱۹۲۳ء میں ۱۹۰ انجمنیں تھیں۔ ۴۰۰ ۳ مستورات اس میں شامل تھیں۔ اُنہوں نے بچت کا دو لاکھ روپیہ جمع کر لیا ہے۔ آغاز مبارک ہے۔ اور فنڈ کے نہ ہونے سے اس کام کو زیادہ وسیع پیمانہ پر نہیں کیا جا سکا۔ جہاں کہیں روپے کا تعلق ہے۔ سب سے پہلے مرد اس سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ مستورات کی یہ ۱۹۰ انجمنیں مردوں کی ۲۰ ہزار انجمنوں کے مقابلے میں ایسی دکھائی دیتی ہیں۔ جیسے کہ فاختہ ایک ہاتھی کے مقابلے میں نظر آتی ہے۔ تعلیم کے معاملے میں بھی کیفیت یہی ہے۔ ۱۹۱۳ء میں لڑکیوں کی تعلیم پر محض ۲۹ لاکھ نہیں لڑکوں کی تعلیم پر ۲ کروڑ ۱۴ لاکھ روپیہ صرف کیا گیا ہ

ایک پٹھان کی بیوی

صحیح قسم کی تعلیم و تربیت خواہ کند ترین ذہن کو کیوں نہ دی جائے وہ اثر دکھاتی ہے۔ جس کی کیفیت اس پٹھان عورت سے ظاہر ہے جو ایک سال ہوا مجھے پنجاب کی سرحد سے پرے ایک مشنری آبادی میں ملی۔ اس کا قد چھوٹا تھا۔ اسکا بدن لچکیلا اور پھرتیلا تھا۔ اس کی بھوری آنکھیں برچھی کی انی کی مانند چمکتی تھیں۔ وہ اپنی ناک پر سرخ ہندوستانی ربڑ کی ٹوپی پہنے ہوئی تھی۔ اس کی کہانی یہ تھی۔ اس کی شادی ایک سپاہی سے ہوئی۔ جب جنگ ہوئی سپاہی اپنی فوج کے ساتھ گیا۔ ایک رات اس کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ اس کے بعد ایک آواز آئی۔ جو یہ دعوے کر رہی تھی کہ وہ اس کے خاوند کی آواز ہے۔ عورت کو یہ آواز مشکوک معلوم ہوئی۔ اس نے تلوار سونت لی اور دروازہ کھول کر دیکھا کہ آواز نے جھوٹ بولا تھا۔ اُسے یکایک یہ دکھائی دیا۔ کہ اس بن بلائے مہمان کے پیچھے کوئی ہیں۔ بن بُلائے مہمان نے اس کی طرف دیکھا۔ جونہی اس نے ایسا کیا اس پر تلوار پڑی اور اس کا صفایا کر گئی۔ اس کے ہمسایوں نے اس شخص کو دفن کر دیا۔ اور کوئی تفتیش نہ ہوئی۔ وقت گذر گیا اور جنگ جاری رہی۔ ایک اور شخص نے قسمت آزمانے کی کوشش کی۔ لیکن اُس پر اس عورت کے دو کتوں نے حملہ کیا۔ اس شخص کو بارِ دیگر آنے کی جرات نہ ہوئی۔ اس کی مصیبتیں بڑھ گئیں۔ ایک دن وہ نو آبادی میں آئی اور اس نے

التجا کی کہ اسے عیسائی بنا لیا جائے۔ وہ اس قدر نا قابل اصلاح نظر آتی تھی کہ اسے عیسائی نہ بنایا گیا۔ بلکہ اسے گاؤں میں واپس بھیجدیا گیا۔ وہ دوبارہ آئی۔ اس نے ضد کی۔ اور اسکی ضد پوری ہوگئی اسے عیسائی بنا لیا گیا۔ وہ اس قدر نا قابلِ تربیت ثابت ہوئی کہ اسے پنجاب کی ایک نو آبادی میں بھیجدیا گیا۔ اور آخرکار اسے زیادہ جنوبی گوشے کی طرف بھیجدیا گیا۔ وہاں وہ ایک مشنری کے خلاف اسقدر غیظ و غضب میں آئی کہ اس نے ایک چاقو لیا اور صحن میں جاکر اُچھلنا کودنا شروع کیا۔ اور مشنری عورت کو دھمکی دی کہ وہ اسے قتل کردے گی۔ اپنے وقت پر پہنچ کر جنگ ختم ہوئی۔ اور اس پٹھانی کا خاوند واپس آیا۔ یہ معلوم کرنے کہ وہ کہیں چلی گئی ہے۔ وہ سرحدی پٹھان تھا۔ اس لئے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کی عورت کے چلے جانے کا سبب صرف ایک ہی ہوسکتا ہے۔ اس لئے پنجاب کی مشنری نو آبادی تک اس کا تعاقب کیا اور اپنی قوم کے دستور کے مطابق اپنی بیوی کی ناک کاٹ ڈالی۔ اس پر اس عورت نے صرف جو رائے ظاہر کی کہ "اس نے میری ناک اسلئے کاٹی ہے کہ اسے مجھ سے محبت ہے۔ روسی کسان کی بیوی جو اپنے شوہر سے مار کھانے کو پسند کرتی ہے۔ اسے ضرور اظہار ہمدردی کے ساتھ اسے ہسپتال میں داخل کردیا گیا تاکہ اس جبلی سے جو اس کے بازو سے لی گئی۔ اس کے لئے نئی ناک اُبھر آئے۔ اور یہ عمل مکمل ہونے کو تھا کہ کسی نے اُس کے دل میں ڈر پیدا کردیا۔ اور وہ ہسپتال سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس لئے اس کے ناک پر ربڑ کی ٹوپی تھی۔ جو اس مسئلہ کا حل ہے۔ اب آخرکار وہ تربیت یافتہ ہے۔ اس کا شوہر مر چکا ہے اور وہ ناڑے (ازار بند) فروخت کرکے اپنی روزی کماتی ہے۔ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ وہ آٹھ ناڑوں کو ایک روپیہ پر فروخت کرتی تھی۔ لیکن اب جب سے کساد بازاری شروع ہوئی ہے وہ ایک روپیہ کو چالیس ناڑے دیتی ہے۔ وہ یہ ناڑے ایک دن میں تیار کرلیتی ہے۔ اس کو خالص نفع ۶ سے ۸ آنہ حاصل ہوتا ہے۔ وہ اس ہُنر کے ذریعے اپنے بچے۔ ایک نوکر۔ اور دو اور رشتہ داروں کی پرورش کرتی ہے۔ ان ناڑوں کو فروخت کرنے کے لئے وہ ہمیشہ اِدھر اُدھر پھرتی رہتی ہے۔ اور وہ بنام "ناڑے والی مائی" مشہور رہے۔ اور وہ اتنی مشہور ہے کہ ایک خاص سیاسی جماعت نے اسے ایک سو روپیہ ماہوار اس غرض کے لئے پیش کیا کہ وہ ان کے باغیانہ خیالات کی دیہاتی مستورات میں اشاعت کرے لیکن وہ جماعت

اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکی۔ "تاڑے والی مائی" نے اس جماعت کی پیشکش ٹھکرا دی +

مذہب

یہ پٹھانی سرحد پنجاب سے باہر رہتی ہے۔ لیکن پنجاب کے اندر بھی اس نوعیت کی مستورات کثرت سے ہیں۔ ہمیں صرف کوہستانِ نمک اور بعض ان کہانیوں کو بار دیگر پیش نظر لانا ہے۔ جو فصل سوم میں بیان ہو چکی ہیں۔ وہاں اس خیال کو ظاہر کیا ہے۔ کہ اس علاقہ کی مستورات کو تعلیم ہی نا لمانہ انتقام اور خونخوارانہ اور وحشیانہ افعال کے تصورات سے بے نیاز کر سکتی ہیں۔ لیکن تعلیم سے مقصود محض یہ ہی نہیں ہے کہ نقاب ہائے نصاب کو رٹ لیا جائے۔ بلکہ تعلیم کا مقصد اس سے بڑھ کر ہے۔ پٹھانی کے دل و دماغ پر ان ہستیوں کی ہمدردانہ عنایتوں اور کرمفرمائیوں نے اثر کیا۔ جنہوں نے اس کی تربیت کی۔ اس پر اس مخفی دقت نے اثر کیا جو تمام سچے مذاہب میں خواہ ان کا نام کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ جلوہ ریز ہے۔ گذشتہ سال ایک آسٹردی دیہاتن نے مجھے کہا کہ "مذہب کے بغیر ہمارے بچے وحشی جانوروں کی مانند ہو جائیں گے۔" یہ مذہب ہی ہے جس نے مشترکہ خاندان کے نظام کو اس قابل کیا ہے۔ کہ اس نے ایسی شاندار مستورات پیدا کی ہیں۔ گاؤں میں اخلاق کا اونچا معیار بھی مذہب کا قائم کردہ ہے۔ اس لئے اگر جدید تعلیم میں اگر مذہب کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا اور اسے صرف دنیوی مفاد تک محدود رکھا گیا تو دنیا ایک نہایت ہی مؤثر قوت سے محروم ہو جائے گی۔ اس لئے نہایت ضروری ہے کہ مدرسہ کو یہ موقع نہ دیا جائے کہ وہ گھر کو نابود کر دے +

گاؤں کا اخلاق

میں نے گاؤں کے اخلاق کے معیار کا تذکرہ کیا ہے۔ پوچھا جا سکتا ہے۔ کہ یہ معیار کیا ہے؟ ایک صوبے کے متعلق تو اس کا جواب دینا بے حد مشکل ہے۔ اور جو شخص اس صوبہ میں پیدا نہ ہوا ہو یا جس نے وہاں پرورش نہ پائی ہو اس کے لئے تو یہ جواب دوسروں کی نسبت مشکل تر ہے۔ چونکہ اس سوال کا تعلق دیہاتی زندگی کے ایک نہایت ہی اہم پہلو سے ہے

اس لئے اس کے جواب کے متعلق کسی قدر کوشش ضروری ہے۔ میں نے ایک سے زیادہ مرتبہ کہا ہے کہ مغربی پنجاب میں معیار ہائے اخلاق قطعی طور پر ادنےٰ ہیں۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں عورتوں کو نسبتاً زیادہ آزادی حاصل ہے۔ آب و ہوا بھی غیر معمولی طور پر گرم اور خشک ہے۔ بارش ہر جگہ پر ۱۰ انچ سے کم ہے۔ اور مردانہ صفت انسانوں کے خون کی گرمی کا باعث بھی آب و ہوا ہے۔ لیکن صرف جنوب مغربی حصص میں ہی عام آوارگی نظر آتی ہے۔ اور یہ حصص وہ ہیں۔ جہاں مالک اراضی اپنی بدترین حیثیت میں ہے۔ اور عامۃ الناس کا اخلاق بوجہ افلاس تباہ ہو چکا ہے۔ مشرقی اور مغربی پنجاب میں عورت کو مذہب اور گاؤں کی رائے عامہ کی زبردست ڈھال نے بچا رکھا ہے لیکن مشرق میں اسے پردہ یا محنتِ شاقہ کی مزید حفاظت میسر ہے۔ میں نے اپنے پہلے دورے میں کام کی اہمیت پر خاص زور دیا۔ اور یہ امر معنی خیز ہے کہ اخلاق کے معیار جنوب مشرق میں بلند ترین ہیں۔ جہاں کی مستورات دوسرے مقامات کی نسبت زیادہ جفاکش ہیں۔ اخلاق کا معیار پہاڑیوں میں بھی اونچا ہے۔ جہاں چار دیواری کا پردہ عام ہے۔ اور ان دونوں رقبوں میں اخلاق اتنا ہی بلند ہے جتنا کہ یورپ کے کسی ملک میں ہے مرکزی پنجاب میں عورتوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اور یہ قلت ایک وقت کا باعث ہے۔ عورتوں کی خرید و فروخت کا سبب یہی ہے۔ اور بعض اوقات اس کی وجہ سے سکھوں کو بعض عورتوں کے کئی شوہر ہونے کے رواج کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی اخلاق کا معیار تسلی بخش طریق پر بہتر ہے۔ اور میرے اکثر باخبر احباب کے بیانات کیمطابق دیہات میں اخلاقی حالت شہروں کے مقابلے میں بہتر ہے۔ اس ضمن میں گاؤں کو شہر کے مقابلے میں دو فوائد حاصل ہیں۔ اس کی زندگی میں عام غور زیادہ ہے۔ اور اس کی رائے عامہ زیادہ مؤثر ہے۔ میرے ایک دوست نے بیان کیا۔ کہ اس نے اپنی جوانی کے عالم میں یہ دیکھا کہ گاؤں پر اس کے دادا کی حکومت تھی۔ اور اس کے زمانے میں ایک پٹھان کو عام آدمیوں کے روبرو اس لئے جوتے مارے گئے کہ اس نے ایک برہمن کی لڑکی کو گھور کر دیکھا تھا۔ جنوب مشرق میں رائے عامہ اس وقت بھی پنچایت کی وساطت سے اپنے آپکو مؤثر بنا سکتی ہے۔ اور مجھے بتایا گیا ہے۔ کہ اگر کوئی میو انتباہ کے باوجود اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا اور اگر وہ قتل کر دیا جائے تو خواہ اس کے قاتلوں کو ہر مرد۔ عورت اور بچہ جانتا ہی

کیوں نہ ہو۔ کوئی بھی ان قاتلوں کے خلاف شہادت نہیں دیتا۔ ان ابتدائی فطری جذبات کی روک تھام کے لئے بعض اوقات پُرانے طریقے زیادہ کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن ہر ایک زمانہ میں ان پر عمل پیرا ہونا مشکل تر ہوجاتا ہے۔ اسی اثنا میں عورت کی آزادی آغاز پذیر ہے۔ اور اگر آزاد ماحول میں پُرانے معیار ہائے اخلاق کو قائم رکھنا ہے تو اس کے لئے ایک نئی ڈھال کی ضرورت ہے۔ جو تعلیم کام اور مذہب کی تین دھاتوں سے ڈھالی گئی ہو ؎

شادی شدہ جوڑوں کی خوش باشی

اخلاق اور شادی شدہ جوڑوں کی خوش باشی میں قریبی تعلق ہے۔ اور اکثر جوڑے شاد کام دکھائی دیتے ہیں۔ اس امر کی تحقیق کے لئے دانا مبصر کی نگاہیں درکار ہیں لیکن ایک سکھ جاٹ جو مرکزی پنجاب کو غیر معمولی طریق پر جانتا پہچانتا ہے۔ اس کا اندازہ یہ ہے۔ کہ ۶۰ فی صدی جوڑے معقول طور پر خوشی اور اطمینان سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور ۱۰ فی صدی لڑجھگڑ کر دن کاٹ رہے ہیں۔ مانجھے جیسے آئین ناآشنا علاقہ میں بھی کہا جاتا ہے کہ بیویوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا ہے۔ اور اکثر جوڑے اطمینان کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جس کسی سے بھی مشورہ کیا گیا اُس نے ہی بتایا کہ صرف ۱۵ فیصدی جوڑے ایسے ہوں گے۔ جو قطعی طور پر ناخوشی کی زندگی بسر کر رہے ہیں ہاں آوارہ گرد رقبوں کی حالت جداگانہ ہے۔ اُن میں ناخوشی کی حالت کا اندازہ ۲۰ یا ۲۵ فیصدی تک ہے۔ جنوب مشرق میں اطمینان کی زندگی بسر کرنے والوں جوڑوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ اور اس باب میں ہمارے رُہتکی جاٹ کا بیان معنی خیز ہے۔ رہتک میں مرد اور عورت کی خوش باش زندگی کا راز اس حقیقت میں مضمر ہے۔ کہ عورتیں اپنے آپ کو اپنے شوہروں کی نوکرانیاں تصور کرتی ہیں۔ اور ان کے ہر حکم کو بجالاتی ہے یہ تصور غالباً اطمینان قلب کی دولت حاصل کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کیلئے جو قیمت ادا کی جاتی ہے وہ بہت زیادہ ہے۔ اور یہ چیز غالباً شادی کے نئے تصور کے خلاف ہے۔ اگر وہ ہستیاں جن کی آپس میں شادی ہوجاتی ہے اُن کو صلح و اتفاق کی جنس مساوی مقدار میں حاصل ہوجاتی ہے تو یہ کامیابی خوش کن اور نفع بخش ہے۔ اس لئے کہ

اس صورت میں جو خوشی ہوگی۔ اس کا پایہ بلند ہوگا۔ لیکن گھر کی موافقت اس صورت میں زیادہ آسانی سے نصیب ہوجاتی ہے۔ جب ایک شریک کار دوسرے کی مرضی کا تابع ہوجاتا ہے۔ اور اس صورت میں جیساکہ ہر ایک مساوی وزن سے بولتا۔ اور مساویانہ آزادی پر عمل پیرا ہوجاتا ہے۔ اس صورت میں گھر کی موافقت حاصل کرنا پہلی صورت کی نسبت مشکل تر ہوتا ہے۔ اس مرحلہ پر بھی تعلیم سند بڑا فرض عائد ہوتا ہے۔ اور ایک سکھ جاٹ کا بیان ہے کہ تعلیمیافتہ جوڑوں میں کشمکش اور تنازعات زیادہ دکھائی دے رہے ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ تعلیمیافتہ لڑکیاں زیادہ آزاد اور زیادہ خرّاج ہیں۔ جہاں مدرسہ نے گھر پر فوقیت حاصل کرلی ہو وہاں اچھے نتائج بمشکل نظر آسکتے ہیں۔ ایسا ہونا ہوسٹل سکول میں ناگزیر ہے۔ جہاں اکثر صورتوں میں حالت یہ ہے کہ اُستاد کم تعلیمیافتہ اور ادنےٰ خاندان کے ہوتے ہیں۔ جہاں اعلیٰ شخصیت والی مستورات کارفرما ہیں۔ جیساکہ ہم نے آسرا پور اور موگا میں دیکھا وہاں نتائج ضروری ہے کہ خوشگوار ہوں۔ اور اس قسم کی زیرک۔ فاضلہ اور مخلص خواتین کی پنجاب کو ہی نہیں بلکہ سارے ہندوستان کو حد سے زیادہ ضرورت ہے۔ بعض ملکوں کو اس کے مردوں نے بچایا ہے۔ لیکن ہندوستان کو ضروری ہے کہ اس کی مستورات آفاتِ زمانہ سے بچائیں +

پردہ اور برقعہ

ہندوستان کے شمال مشرقی حصّہ کو جن خرابیوں سے بچانا ہے۔ ان میں سے ایک خرابی چار دیواری کا پردہ ہے۔ جس کا میں نے اس سے کسی قدر پیشتر ذکر کیا ہے۔ میں نے اس کا اپنے دورہ میں بھی کئی مرتبہ تذکرہ کیا ہے۔ اور دوسرے دورے میں بھی اس پر بحث کی ہے۔ میں یہاں بھی اس کا مختصراً ذکر کرتا ہوں۔ اس کا مفہوم صرف ایک مثال سے واضح ہوسکتا ہے۔ کتاب . . . . (ٹراؤ برزاوف ٹافیٹا) میں جس رانی کے خاندان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہ رانی ایک مینار والے گھر میں رہتی تھی۔ جوان شاندار نظاروں میں سے ایک مؤثر منظر پیش کرسکتا تھا۔ جن سے پنجاب ان اشخاص کی بامروّ نوازی کرتا ہے۔ جو ہمالیہ کے محاذ میں رہتے ہیں۔ لیکن اس رانی کی بہو کو کبھی بھی اس ناممکن اجازت حاصل کرنے کا خیال نہ آیا۔ کہ وہ مکان کی بالائی منزل کا

خواہ وہ برقعہ پہنے ہوئے کیوں نہ ہوں نظارہ کریں۔
سچا راجپوت خواہ وہ ہندو ہے یا مسلمان ہر ایک جگہ اس قسم کے پردہ پر عامل ہے۔ اور تمام وہ اشخاص جن کا یہ دعوٰی ہے کہ وہ راجپوت نسل سے ہیں۔ اس کے قائل ہیں۔ بہ خلاف ازیں یہ برقعہ مسلمانوں کے بلند تر خاندانوں سیّدوں۔ مغلوں اور پٹھانوں میں یا ان اشخاص جو خواہ کسی قوم کے ہیں۔ لیکن جو اپنی حیثیت کے لحاظ سے اسے ضروری تصور کرتے ہیں۔ ان میں پردہ کا رواج ہے۔ خوش قسمتی سے جیسا کہ کثرت ازواج پر بھی صرف اہل ثروت ہی عمل کر سکتے ہیں۔ ایسے ہی اچھی حیثیت والے ہی پردے کے لئے ضروری جگہ اور دیگر ضروریات کا اہتمام کر سکتے ہیں۔ جو مختصر زمین کے مالک ہیں۔ ان کے پردہ کا خاندان کی اقتصادیات کے ساتھ بہت جلد تصادم ہو جاتا ہے۔ فیروزپور میں ہم نے ارائیوں کے ایک گاؤں کو دیکھا جو پردہ کی پابندی کے لئے انتہا درجے کی سعی کر رہے تھے۔ لیکن وہ ان اشخاص کی مانند تھے۔ جو ایک بازو سے محروم ہو گئے ہوں۔ حال یہ ہے کہ جونہی ایک شخص پہاڑیوں سے نیچے اترتا ہے اور راجپوتوں کے علاقے کو عقب میں چھوڑ جاتا ہے۔ تو یہ پردہ معمولی دیہاتی زندگی میں کم دکھائی دیتا ہے۔ راجپوتوں میں بھی اس کا رواج روبہ تنزل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک راجپوتی افسر کا یہ بیان بالکل صحیح نہ ہو کہ راجپوت بھی برقعہ سے بے نیاز ہو جانے پر غور کر رہے ہیں۔ لیکن یہ ایک واقعی حقیقت ہے کہ وہ خواتین بھی جو چاروں طرف سے سخت پردے سے محصور پالکیوں کے بغیر اپنے گھروں سے قدم باہر نہیں نکالتی تھیں۔ وہ اب برقعہ یا شال اوڑھ کر پیدل چل کر ایک دوسرے سے ملاقات کرتی ہیں۔ اور اپنے خاوندوں کے ساتھ بوقت شب تھوڑی دیر تک چہل قدمی بھی کرتی ہیں۔ بہ خلاف ازیں ایک مسلمان راجپوت افسر نے جو ہوشیارپور میں رہتا ہے میرے دورے میں مجھے بتایا کہ جب اس کے گھر کی مستورات رات کے دھندلکے میں اس گھر کو دیکھنے کے لئے گئیں۔ جو وہ گاؤں کے قریب تعمیر کر رہا تھا۔ تو انہیں دوسری مستورات طعنہ زن ہوئیں۔ اس سے ایک سال بعد ایک تعلیمیافتہ جاٹ مجھے گجرات میں ملا۔ اس نے کہا کہ "اگر عورت کو اپنی عصمت و شرافت کی حفاظت مطلوب ہے تو اس کے لئے بہتر یہی ہے کہ پردہ میں رہے۔" اس لئے نئی لہر کے اثرات کو جس قوت سے بیان کیا جاتا ہے۔ اس میں مبالغہ کی شان کو بہت جلد محسوس کیا جا سکتا ہے

راجپوتوں کے علاوہ چار دیواری نظام کلیتہً ایک مسلم ایجاد ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی جہالت کی بناء پر بروئے مذہب اس کو صحیح ثابت کرنے کے درپے ہوں۔ لیکن جیساکہ لیڈی عبد القادر صاحبہ نے فرمایا۔ اسلام نے اس چار دیواری پردے کا کوئی حکم نہیں دیا۔ اور دیگر اسلامی ممالک میں بھی اسکا کوئی رواج نہیں ہے۔ پنجاب میں اس رواج نے مذہب کی نسبت زیادہ قوت رواج سے حاصل کی ہے۔ اس لئے کہ رواج نے پردہ کو عزت اور حیثیت کی علامت قرار دیا ہے۔ اور انسان کو عزت سے زیادہ پیاری چیز کوئی معلوم نہیں ہوتی۔ لہٰذا واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ بعض راجپوت ایسے پیدا ہوگئے ہیں جو چار دیواری نقاب کے خلاف ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے اکثر دیہات میں حال ہی میں حاصل شدہ دولت یا حیثیت نمایاں کرنے کی غرض سے نئی دیواریں بننی شروع ہوگئی ہیں۔ لاہور سے صرف پانچ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں ہے۔ میں نے ۱۹۳۰ء میں اس کا معائنہ کیا۔ کہا گیا کہ جنگ سے لے کر اس وقت تک خاندان پردہ اختیار کرچکے ہیں۔ ان تمام کو بظاہر اس جذبۂ عزت نے اس چیز پر مائل کیا۔ عین اُسی زمانے میں ایک واقعہ میری کوٹھی کے احاطہ میں نمودار ہوا۔ بہشتی دماشکی جو ایک معمولی سے نوکر کے درجے پر مامور کیا گیا۔ اس پر اس میں اتنی تبدیلی پیدا ہوئی۔ کہ اس نے اپنے معمولی حیثیت کے جھونپڑے کے اردگرد ایک پرانے ٹاٹ کا پردہ کھڑا کردیا۔ بہشتی کی حالت میں اس نے اپنی بیوی کو بہت حد تک منظر عام میں زدوکوب کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہ کی لیکن اس معمولی سی ملازمت پر مامور ہوکر وہ یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ کوئی شخص اس کی عورت کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھ لے۔ کہا جاسکتا ہے کہ گاؤں میں مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ معیار زندگی میں تدریجے بلندی انہیں پردے پر مائل کردیتی ہے۔ مری کی پہاڑیاں اس دعوے کی عمدہ نظیر پیش کرتی ہیں۔ وہاں اجناس کی قیمتوں کے گر جانے سے اس رواج میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس لئے کہ وہاں آمدنی کا کام فوجی ملازمت ہے۔ اور روپیہ کی قیمت بڑھ جانے سے سپاہی نسبتاً بہتر زندگی بسر کرتا ہے۔ ایک بہادر سپاہی کا بیان ہے کہ اس نے طفولیت کے زمانے میں یہ دیکھا کہ عورتیں دوپہر کا کھانا لے کر جایا کرتی تھیں۔ گھاس کاٹا کرتی تھیں۔ مکی کی کٹائی میں مدد دیا کرتی تھیں۔ لیکن ان دنوں اعلیٰ خاندانوں کا حال یہ ہے۔ کہ ان کی مستورات گھر پر مقیم رہتی ہیں۔ اور اگر ان کو گاؤں کی

حدود سے باہر جانا پڑتا ہے تو برقعہ پہنتی ہیں۔ اور یہ لباس وہ ہے جو پرانے زمانے میں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک پرانے سپاہی نے کہا۔ یہ انقلاب بہتر ہے۔ اس کے باعث گھر میں صفائی ہے۔ بچوں کی تربیت زیادہ اچھے طریق پر کی جاتی ہے۔ اور عورتیں گھاس کاٹنے کی بجائے کشیدہ کاڑھتی ہیں۔ اس کے علاوہ حیا بھی ہے اس سے پیشتر ہر ایک شخص انکو دیکھ سکتا تھا لیکن اب صرف اپنے گاؤں کے رہنے والے انکو دیکھ سکتے ہیں۔ اس سے پیشتر ہمیں دنیا کا علم نہ تھا۔ ہم نے جنگ میں خدمت کی۔ ہم نے دوسرے ملک دیکھے۔ اب ہم میں تہذیب ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا پردہ واقعی تہذیب ہے؟ اس نے جواب دیا بیشک پردہ میں واقعی تہذیب ہے۔ اور قرآن مجید نے اسکا حکم دیا ہے۔ اگر کھیت کا کام حد سے زیادہ ہو۔ یا اگر خدشہ افلاس کے بغیر اس کام میں کمی کی جاسکتی ہو۔ تو کھیت میں کام کرنے کے بجائے کشیدہ کاڑھنا واقعی مفید ہے اور اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ اگر عورت کو گاؤں کی حدود سے باہر جانا ہو تو وہ برقعہ پہن لے۔ لیکن اس سے زیادہ صورت میں اس کا عامل ہوجانا وہ عمل ہے جسکی قطعاً سفارش نہیں کی جاسکتی۔ جہاں کہیں چکی پیسنے کا کام نہیں کیا جاتا۔ وہاں میں نے پردے کے مضر صحت اثر پر بحث کر دی ہے۔ ممکن ورزش صرف آٹا گوندھنا اور چرخہ کاتنا ہے۔ اور صرف یہی ورزش عورت کی صحت کے لئے کافی نہیں۔ اور اس کی کیفیت اس بات سے ظاہر ہے کہ ایک خاتون کی ٹانگیں قریباً قریباً ناکارہ ہوگئیں۔ اور جو راجپوت بھی مجھے رہتک میں ملے انہوں نے اقرار کیا کہ ان کی عورتیں روز بروز کمزور ہورہی ہیں۔ اس قسم کی زندگی بسر کرنے سے ہاضمہ کمزور ہوجاتا ہے۔ اور جیسا کہ ایک باسمجھ کارکن حفظ صحت کے تجربہ میں آیا۔ اس کمزوری کے باعث پاخانہ آور دوائیاں استعمال کرنی پڑتی ہیں۔ ورزش کے لئے پینگ کی رسی بھی مفید ہے۔ ایک اور تکلیف بھی ہے۔ ایک معمولی دیہاتی عورت رفع حاجت کے لئے دن کے جس وقت چاہے کھیتوں میں جاسکتی ہے۔ لیکن پردہ نشین عورت کے لئے لازمی ہے کہ شام کے دھندلکے کا انتظار کرے۔ ہاں اگر خاکروب ملازم رکھا جائے تو پھر اس انتظار کی زحمت سے نجات حاصل ہوسکتی ہے۔ لیکن پنجاب کے شمال اور مغرب میں یہ شے مشکل ہے۔ پردے کا اثر صرف بدن کے لئے ہی مضر نہیں۔ بلکہ دل پر اس کا اثر ناخوشگوار ہے۔ توجہ کو صرف چند ایک مشاغل تک محدود رکھنا صحت کے لئے

بہر صورت مفید نہیں ہے۔ لیکن اس کا اخلاقی اثر یہ ہوتا ہے کہ عورت زود رنج۔ تیز مزاج اور وہمی ہو جاتی ہے۔ اور اس سے وہ چیز پیدا ہو جاتی ہے جسے حجابی ذہنیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر محض اس لحاظ سے بھی غور کیا جائے تو بچیوں کی پردہ میں رکھکر تعلیم دینا جیسا کہ اندنوں رواج ہے، سودمند معلوم نہیں ہوتا۔ یہ حالات عام دیہاتی لڑکی کے ذہن سے ماورا ہیں۔ اور اکثر لڑکیاں جو ہی سکول جاتی ہیں۔ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ ان سے آگاہ ہو جاتی ہیں۔ ایک افسر نے بتایا کہ اس کی لڑکی جب تک پردہ سکول میں تھی پردہ کو پسند کرتی تھی۔ لیکن وہ ہائی سکول کی آزاد فضا میں گئی۔ تو وہ پردہ سے متنفر ہو گئی۔

انسانی شخصیت میں فطرتاً ایسی قدرت موجود ہے کہ بدترین حالات بھی اس قوت کو بالکل پامال نہیں کر سکتے۔ پردہ کی چار دیواری میں بھی قابل توجہ مستورات پائی جاتی ہیں اس شان کی ایک خاتون حال ہی میں بمقام جہلم فوت ہوئی ہے۔ وہ ۱۹۰۴ء میں بیوہ رہ گئی۔ لیکن اس نے اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں تک اپنے خاندان کی ایک جائداد کے ایک حصّہ کا جو کئی ہزار ایکڑوں پر مشتمل تھا۔ نہایت خوبی سے انتظام کیا۔ اس کا کوئی لڑکا نہ تھا۔ اور وہ اپنے داماد کو اپنے انتظام میں دخل دینے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اس نے نصف زمین کو اجارہ پر دے دیا۔ اور نصف کی کاشت خود کی۔ وہ اپنا تمام لگان وصول کرتی تھی۔ مالیہ بڑی احتیاط اور مستعدی سے ادا کرتی تھی۔ اور اس نے کبھی بھی اپنے کسی مزارع کو عدالت تک نہ پہنچایا۔ اس کے مزارعین اس سے ڈرتے تھے۔ اور تقسیم سے پہلے مٹھی بھر غلہ کو چرا لینے کا تصور تک نہیں کرتے تھے۔ اس نے ان کا انتظام ان کی بیویوں کے ذریعے کیا۔ عورتیں ہر وقت اس کے پاس پہنچ سکتیں۔ اور اس کی نصیحتوں اور ہدایتوں سے بہرہ اندوز ہو سکتی تھیں۔ وہ مزارعین کے بچوں کو وقتاً فوقتاً مٹھائیاں بطور تحفہ دیتی تھی۔ اس لئے وہ اس سے غایت درجے کے مانوس تھے۔ ہندوستان میں اس قسم کی مستورات۔ میرا گمان یہ ہے کہ بہت زیادہ نہیں ہیں۔

نصف پردہ اور گھونگھٹ!

گاؤں میں حقیقی پردہ اعلےٰ اقوام امراء یا جو امیرانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان تک

محدود ہے۔ اس کے علاوہ مشرقی پنجاب میں ایک معتدل قسم کا پردہ ہے۔ جس طرح اوّل الذکر مسلمانوں میں ہے۔ آخر الذکر ہندوؤں اور سکھوں میں ہے۔ جن مسلمان کی روایات ہندوانہ ہیں وہ بھی اسے ملحوظ رکھتا ہے۔ لیکن غربی پنجاب اور کوہستانِ نمک کے مسلم علاقہ میں اس کا رواج مطلقاً نہیں ہے۔ اس کی علامت "گھنڈ" ہے۔ جسے نصف پردہ کہا جا سکتا ہے۔ مکمل پردہ کی سختیاں گذشتہ حملوں کی دہشت ناکیوں کا نتیجہ ہیں لیکن معقول اور معتدل پردہ نظامِ مشترکہ خاندان کے قواعد اور ہدایات کی پیداوار ہے۔ ان کا منشا یہ ہے کہ عورت کو اپنے سے عمر میں بڑے درجہ میں اونچے یا اجنبی کی موجودگی میں پردہ کرنا چاہیئے۔ ان کے رو سے بہو اور سسر میں بھی گفت و شنید منع ہے۔ بیوی اور اس کا جیٹھ بھی باہمی میل جول کا مجاز نہیں ہے۔ ایک سکھ جاٹ بیان کرتا ہے۔ کہ اسکی بہن کا خسر غیر متوقعہ طور پر رات کو ایسے وقت آیا جبکہ اس کا شوہر باہر گیا ہوا تھا۔ اور نوکر سو چکے تھے۔ نہ خسر نے بہو سے بات چیت کی۔ اور نہ بہو نے خسر کو بلایا۔ خسر نے کھانا تک طلب نہ کیا۔ اور بہو نے پیش نہ کیا۔ سو اس کا خسر بھوکا ہی سو گیا تاہم اس کہانی کا تعلق اس زمانے سے ہے جو اب گذر رہا ہے۔ اندنوں اکثر بہویں اپنے سسروں کے سامنے بے نقاب چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ پارچات بھی ستر کی بجائے زیادہ تر آرام اور سکھ کے نقطۂ نگاہ سے بنائے جا رہے ہیں۔ تنگ قمیصوں کی بجائے کھلی قمیصوں کا رواج ہو رہا ہے۔ پاجامہ کے اوپر بھاری بھر کم گھگرے کا رواج ناپید ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ خود برقعہ میں تبدیلی ہو رہی ہے۔ برقعہ کبھی اتنا بھاری ہوتا تھا۔ کہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی شے نظر نہیں آ سکتی تھی۔ اور یہ اتنا مکمل ہوتا تھا۔ کہ سارے سر کو ڈھانک لیتا تھا۔ لیکن اب یہ نیم عریاں سا ہے۔ اور اگر چہرے کے سامنے ایک پلو نکال لیا جائے تو اسے کافی تصور کیا جاتا ہے۔

جہاں تعلیمیافتہ ہستیوں کی تعداد کم ہے اور سورج گرم ہے وہاں پردے کے حق میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ اور گاؤں کی مستورات کے لئے بہتر ہے کہ اسے زیادہ عریاں نہ ہونے دیں۔ چار دیواری پردے کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک زبردست ڈھال ہے۔ لیکن اس کا وزن پردے والی کو کچل سکتا ہے پیشگوئی خطرناک ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زندگی کے دن بہت تھوڑے ہیں۔

زمانہ کا رجحان اور بیرون ہند کے اسلامی ممالک کا میلان اس کے خلاف ہے دس سال کی بات ہے۔ کہ مشرقی ایشیا کے تاشقند اور سمرقند جیسے شہروں میں عورت کے چہرے کو دیکھنا مشکل تھا۔ لیکن اندنوں کہا جاتا ہے کہ برقعہ والی عورت لیمپ جلا کر ڈھونڈنے سے بھی دستیاب نہیں ہوتی۔ لاہور میں بھی صاحب حیثیت مسلم خواتین پبلک میں نمودار ہو رہی ہیں۔ اور تعلیمیافتہ سکھوں اور ہندوؤں میں تو پردہ نام کو بھی نہیں رہا۔

ضبط تولید

ایک چیز ایسی ہے جسے آئندہ عہد کی دیہاتی عورت آزادی سے بھی زیادہ پسند کرے گی اور وہ زندگی کا بلند معیار ہے۔ زمانے کے موجودہ ذرائع کو پیش نظر رکھتے ہوئے معیار زندگی کی بلندی کی عالمگیر وسعت ناممکن دکھائی نہیں دیتی بشرطیکہ اجناس کی قیمتوں میں اضافہ ہو جائے۔ لیکن اگر کسی قسم کا ضبط تولید اختیار نہ کیا گیا تو زندگی کے بلند معیار کو قائم رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ جب ثروت و دولت اپنی انتہائی بلندی پر تھی۔ اور صوبہ بھر میں زندگی کا معیار بلند ہو رہا تھا۔ میں نے لکھا تھا کہ اس ملک میں ہر مادی برکت آخر کار آبادی میں اضافہ کے باعث بے اثر ہو جاتی ہے۔ اور میں نے اس پیشگوئی کی بھی جرأت کی تھی۔ کہ نہری علاقہ جات بھی صوبے کے کسی دوسرے حصہ کی مانند مقروض ہو جائیں گے۔ دس سال کے عرصے میں یہ پیشگوئی قریباً پوری ہو چکی ہے۔ عرصہ دس سال مختتمہ ۱۹۳۱ء میں لائلپور کی آبادی میں بقدر ۱۸ فیصدی اضافہ ہوا۔ اور اس کے غیر مشکوک قرضہ رہنی ۹ سال میں بقدر ۴ ۱/۲ گنا اضافہ ہوا۔ اور قیمتوں میں کمی کے باعث اسے اپنی زندگی کے معیار میں سخت تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ جو حقیقت لائلپور کی ہے۔ وہی پنجاب کے ہر ایک صوبہ کی ہے جو کبھی فارغ البال تھا۔ ۱۰ سال (۳۱-۱۹۲۱ء) میں پنجاب کی آبادی میں بقدر ۱۴ فیصدی اضافہ ہوا ہے۔ اور شرح آبادی میں ہر سال ۳ لاکھ نفوس کا اضافہ ہو رہا ہے۔ اگرچہ انہار کے باعث بیش از پیش زمین زیر کاشت آ گئی ہے۔ اور بعض حصص میں کاشت زیادہ عمیق ہو رہی ہے۔ پھر بھی پیداوار آبادی میں اضافہ کے

برابر نہیں ہے۔ اور نہ ہی صنعت و حرفت میں اضافہ پذیر آبادی کی کھپت کا امکان ہے۔

صورت حالات کا اثر قصبات اور دیہات دونوں پر ہے۔ اور یورپ میں اسکا مقابلہ ضبطِ تولید اختیار کرنے سے کیا جا رہا ہے۔ میں نے اپنے پہلے دورے میں دیکھا کہ منڈیوں اور قصبوں میں اسپر بحث ہو رہی ہے۔ اور یہ چیز بحث کی حد سے نکل کر عمل تک پہنچ چکی ہے۔ اگر عورتیں تعلیم یافتہ ہوتیں تو یہ رواج زیادہ پھیل جاتا۔ لیکن جو امر ایک تعلیمیافتہ کے لئے ممکن ہے۔ وہ ناتعلیمیافتہ کے لئے ناممکن نہیں ایک سکھ کا بیان ہے کہ جب اس نے شادی کی۔ اس کی بیوی محض خواندہ تھی۔ اس وقت کچھ نشے ممکن نہ تھی۔ لیکن جب وہ دسویں جماعت کا امتحان پاس کر گئی۔ تو صورتِ حالات متغیر ہو گئی۔ اور اب آٹھ سال کے بعد اس کے دو بچے ہیں حالانکہ اس کے بھائی کے جس کی بیوی ان پڑھ تھی دس بچے ہیں۔ ایک اور ہندو جسکی بیوی ان پڑھ ہے بیان کرتا ہے کہ جب اس کے تین بچے ہو گئے اور اسے کوئی نوکری نہ ملی۔ تو اس نے عورت کو بعض تدابیر اختیار کرنے پر مائل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے ان کو آرام وہ خیال کیا۔ وہ ان پڑھ ہونے کے باعث ان تدابیر کی اہمیت کے سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس لئے وہ زیادہ عرصہ تک ایک دوسرے سے جدا رہے لیکن نوجوانوں کے لئے یہ چیز آسان نہیں ہے۔ برخلاف ازیں اس کے بھائی نے جو اس سے چھوٹا ہے (کی اپنی عمر ۳۳ سال ہے) قدرت کی پیروی کی ہے۔ اور اسکے آٹھ بچے ہیں۔

یہ چند مثالیں تعلیمیافتہ شہریوں کی ہیں۔ اور قریہ زادہ تعلیمیافتہ افسر بھی اس کا اثر محسوس کر رہا ہے۔ جسکی مثال میں پیش کر چکا ہوں۔ کسان کے نقطۂ نظر میں بڑی قدامت ہے۔ اور اس کا ذکر رہتک کی ایک جٹنی نے شاعرانہ انداز میں یوں کہا۔ کہ دھرتی ماتا برکھا (بارش) سے نہیں اکتاتی۔ ایسے ہی بچہ جننے والی ماں بچوں سے سیر نہیں ہوتی۔ ہندوستان کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے۔ جہاں یہی خیال ذہنوں میں سمایا ہوا نہ ہو۔ ایک سال کی بات ہے کہ میں نے مرکزی ہند کے ایک نمبردار کی بیوی سے کہا "ایک عورت کے ان کتنے بچے چاہئیں"؟ وہ دامن پھیلا کر بولی "جتنے خدا

اس جھولی میں ڈال دے" اور دو سال کی بات ہے کہ سیالکوٹ کی ایک عورت نے بھی یہی بات کہی۔ لیکن ان کے درمیان ایک میراثی کی بیوی تھی جس نے کہا کہ چار کافی ہیں۔ گورداسپور میں ایک سارجنٹ کی بیوی بولی۔ صرف دو کافی ہیں۔ لیکن اس کی لڑکی (جسے غالباً درد و کرب کی گھڑیاں یاد تھیں) گویا ہوئی۔ ایک بہت کافی ہے۔ ہندوستان کی دیہاتی زندگی میں یہ پہلی آواز ہے۔ اور یہ دو جذبات سے اثر پذیر ہے۔ پہلا قول عمیق جذبہ انسانی پر مبنی ہے۔ ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب عورت محسوس کرتی ہے کہ وہ زیادہ بچے نہیں جن سکتی۔ ایک نوکر کی بیوی نے کہا کہ میں چودہ بچے جن چکی ہوں۔ مجھ میں مزید بچے پیدا کرنے کی تاب نہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ عورت نے آغازِ عالم سے ہی اسے محسوس کیا ہے۔ اور اگر یہ جذبہ اندنوں اظہار پذیر ہے تو اسکی وجہ یہ ہے کہ امن و امان کے طویل عرصہ نے زمانے کو زیادہ شائستہ اور مہذب بنا دیا ہے۔ دوسرا جذبہ نئے زمانے کی جھلک لئے ہوئے ہے میراثی کی بیوی نے کہا کہ اگر بچے چار سے زیادہ ہو جائیں۔ ان کی اچھی طرح سے پرورش نہیں ہو سکتی۔ ان کے لئے قمیصوں اور جوتوں کا انتظام نہیں ہو سکتا۔ اور انہیں برہنہ رہنا پڑتا ہے۔ میں نے کسی مقام پر کہا ہے کہ بزود یا بدیر گاؤں میں ضبطِ تولید کے مسئلہ پر غور کرنا پڑے گا۔ میرے خیال میں متذکرہ غور کا وقت آگیا ہے۔ اجناس کی قیمتوں میں کمی نے زندگی کے معیار کو کم کر دیا ہے۔ اور قرضہ کے بوجھ کو دوگنا کر دیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں گذشتہ ۱۰ سال میں ۳ کروڑ ۴ لاکھ نفوس کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اگر قیمتوں میں اضافہ بھی ہو جائے۔ پھر بھی زندگی کا کوئی معیار نئی زندگیوں کے اس کثیر انبوہ سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔ زندگی کے معیار کے علاوہ دیگر امور بھی خطرے میں ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہر سال ۲۰ لاکھ مائیں بچہ جن کر فوت ہوتی ہیں۔ کیا یہ چیز تعجب خیز ہے کہ ان شائستہ تر ایام میں نئی آواز سُنی جا رہی ہے۔ اجناس کی قیمت میں کمی کے زمانہ سے پیشتر بھی مرکزی پنجاب کے کسان اس ضمن میں دائیوں اور ڈاکٹروں کی امداد حاصل کرنے کے درپے تھے اور ایک ایسا شخص جو بیاس اور ستلج کے درمیان جو خطہ اراضی ہے اس کے حال سے آگاہ ہے۔ جانتا ہے کہ اَن پڑھ اور جاہل لوگ بھی تولید میں کسی نہ کسی طرح کے ضبط کی

ضرورت کو محسوس کر رہے ہیں۔ مزید برآں جوڑ کا وہیں میرے ۳۰ سال سے پہلے ہندوؤں کے خاندانوں میں استعمال کی جا رہی تھیں۔ ان دنوں ان کا استعمال کم ہو رہا ہے۔ ان دنوں میں نوجوان جوڑوں کو دن کے وقت سخت کام کرنا پڑتا تھا۔ اور نہیں رات کیوقت الگ کمروں میں سونا نصیب نہیں ہوتا تھا۔ اور انہیں تھوم اور پیاز جیسی ہیجان خیز چیزوں کے کھانے کی اجازت نہ تھی۔ اور وہ گوشت اور مچھلی شاذ و نادر ہی کھاتے تھے۔ اور مصالحہ دار چیزیں تو وہ کبھی کھاتے ہی نہ تھے۔ لیکن مشترکہ نظام خاندان کے درہم برہم ہو جانے کے باعث ان پابندیوں کا اطلاق اس زمانے میں مشکل ہو گیا ہے اور ایک نقطہ نگاہ کو بھی پیش نظر لانے کی ضرورت ہے۔ اب جبکہ قصبات ضبطِ تولید سے بیش از بیش آشنا ہو رہے ہیں یہ صرف وقت کی بات ہے۔ کہ یہ علم بھی دیہات میں پہنچ جائے گا۔ ہر ایک جگہ لاری پہنچ رہی ہے۔ اور شہر تو گاؤں سے قریب تر کر رہی ہے۔ اور جب یہ علم آجائے اُس وقت گاؤں کو مشورے سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ دائیوں اور اناڑیوں کے ہتھے چڑھ جائے گا۔ اس ضمن میں غالباً روس سے سبق سیکھنا ہے۔ وہاں بھی کسانوں کی آبادی روبہ فروغ ہے۔ ۱۹۳۰ء میں ۱۹۱۴ء کے مقابلے میں ۲ کروڑ ہستیوں کا اضافہ ہوا۔ اور وہاں کی مستورات بھی اتنے بچے پیدا کرنے پر تیار نہ تھیں۔ جتنی کہ پرانے زمانے میں تھیں لیکن ان کو کوئی مشورہ دینے والا نہ تھا۔ سرکاری ڈاکٹر دیہات کا دورہ کرتے ہیں دیہاتیوں سے اس باب میں گفت و شنید کرتے ہیں۔ جابجا شفاخانے ہیں۔ مشوروں کے مرکز ہیں۔ ڈاکٹر ان مرکزوں میں پہنچ کر ضرورت مند کو اپنے مشوروں کے فائدہ پہنچاتے ہیں۔ اور اسقاطِ حمل کو از روئے قانون جائز قرار دیا گیا ہے۔ یہ چیز مجھے اپنی ایک اور سفارش پر لوٹ آنے کے لئے مجبور کرتی ہے۔

یہ تمام معاملہ ماہرانِ طب کے غور کرنے کا ہے۔ ضرورت ہے کہ تجربہ کار ڈاکٹروں کی مختصر سی کمیٹی اس پر غور کرے۔ اس کمیٹی میں زنانہ ڈاکٹر بھی چاہیئے۔ غور و خوض کے بعد ایک پالیسی وضع کرنی چاہیئے۔ تاکہ جو اشخاص دیہاتی زندگی کو بہتر بنانے دیہاتی خاتون کی فلاح و بہبود کے لئے کام کر رہے ہیں۔ انہیں معلوم ہو جائے کہ وہ اس مشکل ترین اور اہم مسئلہ کے متعلق کیا مشورہ دیں۔ سر دست بالکل اندھیرا ہے ؎

خلاصہ

دس سال کی بات ہے کہ اپنی تصنیف "پنجابی کسان" کو ختم کرتے ہوئے تحریر کیا۔ کہ گاؤں کے افق پر خود شناسی کا سورج طلوع ہو گیا ہے۔ میں نے اس وقت مردوں کا تذکرہ کیا تھا۔ اس وقت یہی بات تقریباً مستورات کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ جو تبدیلی میں ہم نے بیان کی ہیں۔ تین بڑے عناصر پر مبنی ہیں۔ (۱) معیار زندگی کی بلندی (۲) تعلیم کی اشاعت۔ جو صرف پڑھنے والے کو ہی اثر پذیر نہیں کرتی بلکہ دوسروں کو بھی اثر پذیر کرتی ہے۔ (۳) جنگ کے بعد لوگوں کا عام رجحان۔ ان میں اکثر تغیرات ایک عنصر کے باعث نہیں بلکہ ایک یا دو عناصر کے امتزاج کے باعث ہیں۔ پنجاب کے مختلف اضلاع میں ان کا اثر کم و بیش ہے۔ ہر ایک اثر کس تناسب سے کار فرما ہے۔ سب سے زیادہ غور طلب اور جاذب توجہ تبدیلی میاں اور بیوی کے تعلقات میں وقوع پذیر ہوئی ہے۔ ابھی تک یہ چیز صرف ایک امتحان کا حکم رکھتی ہے۔ اور اکثر اوقات زیادہ محسوس طور میں نمایاں نہیں ہوتی۔ لیکن ساس کی خدمت ہر ایک جگہ روبہ زوال ہے۔ اور تعلیمیافتہ گھروں میں بالخصوص سکھوں میں اس کی بجائے میاں اور بیوی کے درمیان زیادہ اور زیادہ مساویانہ تعلقات روبہ فروغ ہیں۔ اگر پُر امن حکومت قائم ہے۔ تو یہ شے انگریزی سلطنت کا سب سے زیادہ اثر ہے۔

نئی پود کے نزدیک مردوں اور عورتوں کی خصوصیات میں عدم مساوات بہت کم نمایاں ہے۔ پوشاک اور خوراک کے معاملے میں بیویوں کے ساتھ زیادہ اچھا سلوک کیا جا رہا ہے۔ اور گھر کے معاملات میں ان سے زیادہ آزادی سے مشورہ لیا جا رہا ہے۔ اور تعلیم اندنوں عورتوں کے لئے زائد از ضرورت تصور نہیں کی جاتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ شادیاں زیادہ عمر میں کی جا رہی ہیں۔ اور دولہا اور دلہن کے انتخاب میں زیادہ احتیاط برتی جا رہی ہے۔ کثرت ازدواج کم ہو رہی ہے۔ اور جنہوں نے چار دیواری کے پردہ کو مدتوں اختیار کیا ہے۔ ان میں بھی اس کا خیال کم ہو رہا ہے۔ نیم پردہ کا بھی جو سکھوں اور ہندوؤں میں رائج ہے۔ یہی حال ہے۔ بہ خلاف ازیں جن لوگوں کی مالی حالت بہتر ہوئی ہے۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں۔ اور ان میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی

ہے۔ جو خوشحالی کے باعث اپنی عورتوں کو دوبارہ پابند پردہ بنانے کو اپنی عزت کی علامت سمجھ رہے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی دیہاتیوں کے اخلاق اچھے ہیں۔ اور گھر کی زندگی کی عام خوش باشی کی سطح بلند ہے۔ متعدد قیود و حدود میں کمی کے باعث گھر کی زندگی کو جو مناسب دھمکیاں دے رہے ہیں۔ ان کو مدنظر رکھتے ہوئے ضروری ہے کہ بچیوں کو جو تعلیم دی جائے۔ وہ محض دنیوی نہ ہو۔ اور سکول کو کسی وقت بھی گھر سے سبقت لیجانے کی اجازت نہیں دینی چاہیئے۔ گھر کے اندر ضروری ہے کہ بچیوں کو عالم طفولیت میں زیادہ احتیاط سے تعلیم و تربیت دی جائے۔ لیکن بچوں کی متواتر تولید کی صورت میں یہ چیز مشکل ہے۔ اور جیسے جنوبی مشرقی رقبہ جات کی کیفیت ہے۔ جہاں کھیتوں میں بہت کام کرنا پڑتا ہے۔ وہاں اس تربیت کا اہتمام ناممکن ہے۔ یہ امر بھی ایک حد تک نمایاں ہے کہ کھیت کا کام اتنا شدید نہیں رہا جتنا کہ تھا۔ اور زیادہ کی بجائے تھوڑی اولاد حاصل کرنے کی رغبت بھی ظاہر ہو رہی ہے۔ ایک ایسے ملک میں جو زراعتی ملک ہے اور قدامت پسند ہے۔ جہاں امن و امان قائم ہے۔ اور لوگ قحط سالی کے ہاتھوں ہلاک نہیں ہوتے۔ اور امراض کا پیش از پیش نظام کے ساتھ علاج اور تدارک کیا جاتا ہے۔ آبادی قدرتاً اس قدر روبہ فروغ ہوتی ہے کہ کوئی موجودہ معیار زندگی کسی قسم کے ضبطِ تولید کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ گذشتہ دس سال کے حقائق ظاہر کرتے ہیں کہ پنجاب کے متعلق تذکرہ دعوے بہر نوع صحیح نظر آتا ہے۔ لہٰذا وقت آ گیا ہے۔ کہ ماہرین ضبطِ تولید کے مسئلہ پر خوب غور کریں۔ اور اس باب میں خاص لائحہ عمل (پالیسی) وضع کریں۔

اس باب میں کافی کہہ دیا گیا ہے کہ دیہاتی گھر میں نئی زندگی کے جذبات موجزن ہیں۔ جیسا کہ سیالکوٹ کی ایک عورت نے واضح کیا کہ "بیش نظر تبدیلی بہت بڑی تبدیلی ہے۔ اور نئی ہوائیں چل رہی ہیں" اور واقعی وہ ہوائیں بہت حد تیز ہیں جو دیہات میں چل رہی ہیں۔

سولھواں باب[۱۶]

تبصرہ اور سُدھار

اس آخری فصل میں کسی قدر تبصرہ ضروری ہے۔ محض اس لئے بھی کہ بیان کردہ حقائق گذشتہ تین سال سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور جو تحقیق شروع کی گئی تھی۔ اسکا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ بعض مضامین کے باب میں مثلاً نظام ائے پنچائیت تدفین زر۔ پرورشِ مرغیان۔ ایسے مختلف النوع موضوعات پر میں اپنے خیالات کا پیشتر ازیں اظہار کر چکا ہوں۔ اور اس ضمن میں مزید خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں لیکن بعض مطالب ایسے ہیں کہ ان پر بحث ونظر اور ان کا خلاصہ بیان کر دینے کیلئے چند صفحے درکار ہیں۔ اور جو رشتہ ان میں جاری وساری ہے اس کا تعلق تعمیر وتنظیم جیسے اہم مسئلہ سے ہے۔ میں اولاً نرخ ہائے اجناس میں کمی پر بحث کرنا چاہتا ہوں اس لئے کہ کم از کم سردست یہی وہ ڈھانچے یا قالب ہے کہ جس کے مطابق آئندہ تنظیم کی تصویر کا خاکہ تیار کیا جا سکتا ہے۔

نرخہائے اجناس میں کمی

عام حالات

اجناس کی قیمتوں میں کمی کے عام کوائف کافی سے زیادہ شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ جمعیت اقوام کی مجلسِ اقتصادیات کی رپورٹ کا ایک اقتباس یہ ہے کہ "سنہ ۱۹۳۰ء میں اجناس کے نرخ جو بعض اوقات یکایک حادثتہً گر جاتے ہیں۔ گر گئے۔ اور انکا اثر تمام پیداوار زرعی تک پھیل گیا۔ یہ کمی اتنی تیز تھی کہ سال کے اختتام پر (جب میں نے اپنا دورہ شروع کیا) جہاں بعض اجناس کی قیمتیں ایام قبل از جنگ کی قیمتوں کے

برابر ہوگئیں۔ بعض میں کمی اتنی ہوئی کہ وہ ½ حد تک گر گئیں۔ یا یہ کہ ۱۹۱۳ء کے پیمانۂ نرخ کے نصف سے بھی کم ہوگئیں۔

اس کمی کی اوّلین زد کاشتکار پر پڑی۔ اور آج تک دوسروں کی نسبت زیادہ دُکھ برداشت کر رہا ہے۔ بعض اوقات جہاں اسے اپنی پیداوار کی بہت کم قیمت ملتی ہے۔ وہاں اسے جو چیزیں خریدنی پڑتی ہیں۔ ان کے لئے پُرانے بھاؤ یا اس سے کسی قدر کم نرخ پر قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اور اگر آخر الذکر میں کوئی کمی ہوتی بھی ہے تو وہ اتنی نہیں ہوتی جتنی کہ زراعتی اشیاء کی قیمتوں میں ہوتی ہے۔ یہ حقیقت ہندوستان کے سالانہ نقشہ ہائے تجارت سے آئینہ ہو رہی ہے۔ جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہندوستان کی برآمد جو زیادہ تر اجناس خام ہیں۔ درآمد کے مقابلے میں جو زیادہ تر کارخانہ کی مصنوعات ہیں۔ بالکل گر گئی ہے۔ پنجاب میں اس کمی کو اس اثر سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ جو اس نے اس صوبہ کی دو قیمتی فصلوں میں گندم اور روئی پر ڈالا ہے۔ ۱۹۲۹ء میں لاہور میں گندم تھوک فروشانہ نرخ کا عام تخمینہ ۵ روپے ۳ آنے ۵ پائی تھا لیکن ۱۹۳۰ء کے خاتمہ پر یہ نرخ دو روپیہ سے بھی کم ہوگیا۔ اس سال روئی کی قیمت میں بھی ۵۰ فیصدی کی واقع ہوگئی۔ اور یہ قیمتیں اس وقت تک بحال نہیں ہوئیں اس کمی کا اثر کم و بیش ہر ایک جگہ ہوا ہے۔ نہری آبادیوں میں جو صوبے کے مرکز ہائے برآمد ہیں۔ اس کا اثر زلزلہ خیز ہے۔ اور ان اسباب کی بنا پر جن کا تذکرہ عنقریب کیا جائے گا۔ ان کے اثر نہر سے آبپاشی قطعات پر سب سے زیادہ شدید صورت میں جلوہ نما ہوا ہے۔ لیکن راولپنڈی اور کانگڑہ میں جہاں ملکیتیں اتنی مختصر ہیں کہ وہاں زراعت بہت حد تک ایک ضمنی صنعت کا حکم رکھتی ہے۔ اس کا اثر ہلکا ہے اور بعض رقبوں میں مثلاً کوہستانِ نمک اور کوہستانِ مری میں جہاں فوجی خدمت کے باعث نقد روپیہ بتدریج پہنچتا رہتا ہے۔ اور کھانے کے لئے غلہ باہر سے منگوانا پڑتا ہے۔ نرخوں میں کمی تباہی خیز ہونے کے بجائے مفید ثابت ہوئی ہے۔ جالندھر بھی زیادہ اثر پذیر نہیں۔ اس لئے کہ اس ضلع میں کاشتکاری زیادہ تر گذارے کے لئے ہے اور ایام گذشتہ میں اس ضلع کے کارکنانِ وطن نے روپیہ بہت سی رقوم یا تو ارسال کی ہیں یا وہ اپنے ہمراہ لائے ہیں۔ اور اس کا ایک معقول حصّہ کفایت شعار کاشتکار یا تو

کسی مفید کام پر لگادیا ہے یا بطور امانت جمع کرایا ہے۔ لیکن یہ نظائر مستثنےٰ ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی تمام صوبے کی نسبت ہم یہ کہنے میں بہت حد تک حق بجانب ہو سکتے ہیں کہ نرخ ہائے اجناس میں کمی نے پنجاب کی خوشحالی کو اس طرح یکایک تباہ و برباد کر دیا جیسے کہ ۱۹۲۶ء میں طوفانِ ریگ نے اسکی گندم کو پامال کر دیا۔"

زمیندار اور مزارع

اگر یہ حقیقت عیاں گیر نہ ہوتی کہ ادائیگیوں کا بہت سا حصہ جنس اور خدمت کی صورت میں ہوتا ہے تو اس کمی سے پیدا شدہ اثر نا قابلِ برداشت ثابت ہوتے۔ چالیس یا پچاس سال پہلے زمیندار یا مالک خود کاشت کی تعریف یہ کی جا سکتی تھی۔ کہ یہ وہ شخص ہے۔ جو جنس صرف اپنی پیدا کرتا ہے۔ جو ممکن طور پر اس کے لئے اپنے گذارہ کے لئے کافی ہو سکتی ہو۔ اور جو باقی کی تمام اشیاء دست بدست مبادلہ (بارٹر) سے حاصل کرتا ہے۔ ان ایام میں گاؤں میں نقد روپیہ بہت کم دکھائی دیتا تھا۔ اور اس وقت بھی کوئی ضلع ایسا نہیں ہے جہاں دیہاتی کاروبار نقدی کی صورت میں ہوتا ہو۔ اور بعض مقامات میں یہ تناسب ۲۵ فی صدی سے بھی کم ہے۔ گذشتہ زمانے میں اکثر مغربی داناؤں نے اس پر زور دیا ہے کہ روپیہ کے ذریعے اشیاء کا مبادلہ خدمت اور جنس کے مبادلہ کے مقابلے میں ترجیح اور برتری رکھتا ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے پنجابی کسان پرانے دستور کو ترک کرنے میں سہل انگار واقع ہوا ہے۔ لیکن جب کساد بازاری آئی۔ تو پرانا دستور نئے نظام سے زیادہ کارآمد ثابت ہوا۔ یہ حقیقت لگان کے معاملے میں زیادہ نمایاں ہوئی ہے۔ صوبہ ہائے آگرہ و اودھ میں لگانات زیادہ تر نقدی کی صورت میں ادا کئے جاتے ہیں۔ اس لئے ان میں بقدر چار کروڑ روپیہ کے کمی کرنی پڑی۔ اور حسابات میں یہ توازن بڑی دقت اور کافی کھینچا تانی کے بعد وقوع پذیر ہوا۔ برخلاف ازیں پنجاب میں (جنوب مشرقی اضلاع قدرے استثنےٰ کا حکم رکھتے ہیں) لگانات قریباً تمام کے تمام جنس کی صورت میں ہیں۔ اس لئے قیمت میں کمی کے باعث لگان میں بھی قدرتاً کمی ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح یہ معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو جاتا ہے۔ اس قدرتی کمی نے ایک کافی زیادہ حد تک اپنا اثر

پیدا کیا؛ صوبہ پنجاب میں ۲۰ لاکھ سے زیادہ مزارعین ہیں۔ جو مالکان اراضیات لگانات نقدی کی صورت میں وصول کرتے ہیں۔ وہ محض متذکرہ نظیر کی اثر اندازی سے مجبور ہو گئے کہ اپنے واجبات میں کمی کر دیں یا انہیں بالکل معاف کر دیں۔ وہ مالکان جنہوں نے کساد بازاری سے پیشتر نو آبادی میں اپنے مربعے ۲۰ روپیہ یا زیادہ فی ایکڑ لگان پر دیئے ہوئے تھے۔ وہ اس صورت میں جبکہ ان کے گرد و پیش جنسی لگانات گر رہے تھے۔ اس امر پر اصرار نہ کرتے کہ انہیں لگان کی رقم پوری کی پوری ادا کی جائے۔

میں جس دن دورہ پر روانہ ہوا۔ میں نے اس دن ہی اس اثر کو نمایاں دیکھا۔ اور جونہی میں دور کی منزلیں طے کرتا گیا۔ یہ امر بیش از بیش نمایاں صورت پکڑتا گیا۔ لہذا مالکان نے آغاز ہی سے نرخوں میں کمی کے بوجھ کو برداشت کیا۔ اس کی بعض مثالیں نقشہ حسابات میں مذکور ہیں۔ لیکن مزارع کی نسبت زمیندار کے کندھے زیادہ مضبوط ہیں۔ اور وہ مزارع جو صرف ایک ہل کا مالک ہے۔ اسکی کمزوری عیاں را چہ بیاں کی مصداق ہے ؛

زمیندار۔ کاریگر اور خدمت گار

صرف لگانات ہی جنس کی صورت میں ادا نہیں کئے جاتے۔ ہم نے فصل چودھویں میں پڑھ لیا ہے۔ کہ زراعتی مزدور اور دیہاتی خادم کی خدمت بھی زیادہ تر اسی طریق پر ادا کی جاتی ہیں۔ اور نقد اُجرتوں اور ادائیگیوں پر بھی وہی اثر ہوا ہے۔ جو نقد لگانات پر ہوا ہے۔ روپے کی قوت خرید میں اضافہ کے باعث زراعتی پیداوار کی قیمتوں میں کسی نے تمام ان اجرتوں پر جو نقدی کی صورت میں ادا کی جاتی ہیں۔ یہ اثر کیا ہے۔ کہ ان میں فوری اضافہ کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ان اشخاص کی آمدن کم کر دی۔ جو اپنی اُجرتیں جنس کی شکل میں حاصل کرتے تھے۔ اس لئے کہ جو کچھ انہیں وصول ہوا۔ اس کا کچھ حصہ انہیں متفرق اشیاء کی خرید میں صرف کرنا پڑا۔ گویا یہ ہوا کہ جولاہے کی آمدن (جسے عام طور پر نقدی کی صورت میں ادائیگی کی جاتی ہے)۔ بڑھ گئی اور اسکے ہمسائے لوہار کی آمدن (جسے بطور جنس ادا کیا جاتا ہے) گھٹ گئی۔ قصبہ میں جہاں بہت کم لوگ اپنے ہمسائے کو جانتے ہیں۔ وہاں اس عدم مساوات پر ممکن ہے توجہ نہ کی گئی ہو

لیکن دیہات میں یہ حقیقت زیادہ ابھری اور نمایاں ہوئی۔ ۱۹۳۰ء کے خاتمے پر الکان اراضیات کاریگر اور خادم واجبات میں تخفیف کے بارے میں اکٹھے بحث کرتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اور اپنے دورے کے خاتمے سے پیشتر میں نے ترکھانوں۔ معماروں اور زراعتی مزدوروں کو دیکھا۔ کہ وہ ۲۵ فی صدی تخفیف پر آمادہ ہو گئے ہیں قصابوں اور شیر فروشوں نے واجبی تخفیف منظور کر لی۔ ایک بڈھے کسان نے یہ کہا کہ" اب مُلاں بھی سوا روپیہ لے کر نکاح پڑھ رہے ہیں۔ اور اتنے پیسے وہ اندنوں لیتے تھے۔ جب میرے منہ پر داڑھی نہ تھی"۔ پیر عام طور پر ایک روپیہ وصول کیا کرتے تھے۔ لیکن اب آٹھ آنے اور بارہ آنے پر اکتفا کر رہے ہیں۔ بعض مقامات پر درزیوں نے اپنی سلائی میں اس عذر پر کمی منظور نہ کی کہ ان کو اس وقت بھی سینے پرونے والی مشینوں کی قیمت وہی دینی پڑتی ہے۔ جو وہ پہلے دیا کرتے تھے۔ جولاہوں نے یہ کہا کہ چونکہ گذشتہ ایام میں کم اُجرت ملتی رہی ہے۔ اس لئے وہ کمی قبول نہیں کر سکتے۔ تاہم کھلے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ جہاں زمیندار اور مزارع نے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ وہاں زمیندار۔ کاریگر۔ اور خدمت گار نے بھی سمجھوتہ کو پوری مستعدی اور صفائی سے قبول کر لیا ہے۔ ان تمام امور سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ دیہات کی نسبت کم از کم یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہاں کاروبار کا وہ طریق رائج ہے۔ جس کی نسبت عام طور پر فرض کر لیا گیا ہے۔ کہ وہ ازمنہ وسطیٰ میں رواج پذیر تھا۔ اور ان کا طریق مبادلہ وہ ہے۔ جو روپیہ کی بجائے اجناس اور خدمت پر مبنی ہے۔ روپیہ کے ذریعے اشیاء کے مبادلہ کا نظام وہ ہے کہ جس پر دُنیا کا تصرف نہیں رہا۔

قارض اور مقروض

سب سے زیادہ مشکل سمجھوتے وہ ہیں۔ جن کا تعلق قارض اور مقروض۔ زمیندار اور سرکار سے ہے۔ اس لئے کہ ان دونوں صورتوں میں ادائیگیاں ضروری ہیں۔ کہ نقدی کی صورت میں نقدی کی شرائط کی صورت میں ہوں۔ اگر ایک سو سال پیشتر اس قسم کا واقعہ پیش آتا۔ تو سمجھوتہ بہ آسانی ہو جاتا۔ اس لئے کہ اندنوں ہر کاروبار جنس کی شکل میں تھا۔ اور پچاس سال پیشتر بھی قارض اور مقروض کے مابین مناسبت مشکل نہ تھی۔ اِسلئے

کہ زیادہ تر کاروبار جنس کی صورت میں ہوتا تھا۔ اور حسابات بھی کھاتوں میں درج کرلئے جاتے تھے۔ لیکن اس وقت صورت حال یہ ہے۔ کہ جو کچھ وہ لیں اور جب سے کساد بازاری کے باعث جنس کی صورت میں ادائگیاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ صرف چند ایک رقبے ایسے ہیں جہاں یہ قرضہ جات نقدی کی شکل میں لئے اور دئے نہیں جاتے۔ اس کا عام اثر یہ ہے کہ زراعتی قرضہ کا بارگراں دوگنا ہوگیا ہے۔

بطور مثال جہاں ۱۹۲۹ء میں کسان ۱۰۰ من پیداوار کو فروخت کرکے اپنا قرضہ اُتار سکتا تھا۔ اب اسے اس غرض کے لئے ۲۰۰ من یا اس سے زیادہ پیداوار درکار ہے۔ اس باب میں استثنیٰ وہ سود ہے جو رہن یا قبضہ پر ادا کیا جاتا ہے قیمتوں کے گر جانے کے باعث اس قسم کے رہن کا سود بقدر نصف کم ہوگیا ہے۔ اور صوبہ کے مالکان میں سے قریباً نصف کا قرضہ ۱۹۳۵ء میں اس طریق پر رُکا رہا۔ یہ چیز زاں بعد کے رہنوں پر عائد نہیں ہوتی۔ یہ امداد معقول ہے+

وصولیاں

اگرچہ ساہوکار نے حسابات کے زیادہ جدید طریقے اختیار کر رکھے ہیں۔ خوش قسمتی سے ابھی تک وہ اپنے دلی خیالات کے باعث قدامت پرست ہے۔ میں نے اپنے دورے میں ہر ایک ممکن موقع پر اس کے متعلق بحث کی۔ اور ان میں سے تین مکالمے اس کتاب میں درج بھی کئے ہیں۔ ان مکالمات سے ساہوکار کا عام رویہ جو اس نے نرخ اجناس میں کمی کے بعد اختیار کر رکھا ہے۔ نمایاں ہوتا ہے۔ اس کا مسلک یہ ہے۔ کہ جو کچھ وصول ہوجائے اسے قبول کرلیا جائے اور بقایا واجبات کے لئے اجناس کے نرخ میں تیزی خاص وسکون سے انتظار کیا جائے۔ کسان جو کچھ بھی پیش کرتا ہے ساہوکار اس کے لینے سے انکار نہیں کرتا۔ اور ردی سے ردی مویشی بھی ممکن انتہائی قیمت پر قبول کرلئے جاتے ہیں۔ اگر مقروض کچھ بھی ادا نہیں کرسکتا۔ اور تمسک ختم ہونے کو ہوتا ہے۔ تو ہر ممکن تدبیر اختیار کرکے کوشش کی جاتی ہے۔ کہ مقروض نیا تمسک تحریر کردے۔ اور اس کے لئے سود میں معقول تخفیف بھی گوارا کرلی جاتی ہے۔ ایک قصبہ میں ساہوکار گاؤں والوں کے متفقہ فیصلہ کے باعث عارضی طور پر مجبور ہوگئے۔ کہ پُرانے

قرضہ جات پر اب سود شماری نہ کریں۔ یا یہ کہ سود کی شرح کم کر دیں اور تنازعات دیہاتی پنچائت کے سپرد کر دیں۔ عام حالات میں بھی وہ اپنے موکلوں کو عدالت میں پہنچانا نہیں چاہتے۔ اس لئے وہ جانتے ہیں کہ قانون کے طور طریقے بڑے تکلیف دہ۔ گراں خرچ اور غیر قطعی ہیں۔ قیمتوں میں کمی نے اخراجات کو زیادہ گراں اور وصولی کے امکانات کو زیادہ مخدوش کر دیا ہے۔ لہذا عام حالت یہ ہے کہ وہ ایک خراب کام کے لئے اپنے اچھے روپے کو خرچ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ وہ صرف ایسے مقروض کے خلاف مقدمہ دائر کرتے ہیں جو کسی سمجھوتے پر مائل نہیں ہوتا۔ اور اس صورت میں بھی جبتک انہیں یقین نہ ہو جائے کہ انہیں کچھ نہ کچھ وصول ہو جائے گا۔ وہ ڈگریوں کا اجرا نہیں کرتے نتیجہ یہ ہوا ہے کہ قرضوں کی ادائیگی رکی پڑی ہے۔

کشیدگی اور تصفیہ

یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ اتنا بڑا طوفان مقروض اور قارض کے درمیان کوئی کشیدگی پیدا کئے بغیر گذر جائے گا۔ ہمیں موقع بہ موقع کشیدگی تعلقات کا علم ہوتا ہے لیکن کسی جگہ بھی کشیدگی اتنی زیادہ نہیں ہے۔ البتہ رہتک کے بعض حصص استثنے کا حکم رکھتے ہیں۔ تاہم یہ بات ہے کہ ان رقبوں میں تعلقات اجناس کے نرخ میں کمی سے پہلے بھی کشیدہ تھے۔ لیکن نو آباد علاقہ جات میں کسی قدر تکلیف رونما ہوئی۔ لیکن نو آباد دیہات میں کشیدگی کا باعث دیرینہ تعلقات کا نہ ہونا ہے۔ جہاں یہ تعلقات موجود ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جہاں کہیں بھی دیہاتی جماعت میں پرانے روابط یا دیرینہ میل ملاپ موجود ہے۔ یا قطعہ ایسا ہے کہ جہاں صرف ایک قوم آباد ہے۔ وہاں ساہوکار مقامی مصالحت روئیہ اختیار کرنے سے پرہیز کرتا ہے۔ قارضان کے دعاوی کو کم کرنے کیلئے اقساط کی ادائیگی کے معاملے میں بھی پنچائت اور انجمن ثالثی مفید ثابت ہوئی ہیں۔ اور بعض صورتوں میں قسطوں کی ادائیگی کئی سال تک پھیلا دی گئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گاؤں کے ساہوکار کے منافعہ جات میں بہت سی کمی واقع ہو گئی ہے۔ اجناس کے نرخوں میں کمی سے پیشتر یہ منافع جات ۱۲ سے ۱۳ فی صدی تک تھے۔ لیکن یہ امر مشکوک ہے کہ آیا وہ اس وقت سے شروع کر کے ۵ فیصدی سے بڑھتے ہیں یا نہیں۔ لیکن اس امر کو

عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ کہ اس پر بھی ایسی ہی زد پڑی ہے۔ ایک لحاظ سے اسے زیادہ نقصان ہوا ہے۔ آڑھتی کے ساتھ ہی ساہوکار بھی موجود ہے۔ وہ صوبے کی وافر گندم ذخیرہ میں جمع رکھتا ہے اور ۱۹۳۰ء میں جبکہ منڈی مصیبت میں مبتلا ہوئی۔ اسے زیادہ نقصان برداشت کرنا پڑا ؂

قرضے دینے میں کمی

کسان قرضہ دینے کے قابل نہیں رہا۔ اور اس کی ناقابلیت کے باعث ساہوکار کی حیثیت قرضہ دہی میں بڑی کمی واقع ہوئی ہے۔ وصولی میں کمیابی کی وجہ سے ساہوکار کے پاس قرضہ دینے کو کچھ نہیں رہا۔ اور جتنا اس نے قرضہ دینے میں پس وپیش کیا ہے۔ اتنی ہی وصولی میں کمی ہوئی ہے۔ جہاں تک ممکن ہے وہ قرضہ جات صرف ان اشخاص کو دے رہا ہے۔ جو اس کے نزدیک قابل اعتماد ہیں۔ اور دوسروں کو وہ صرف اتنا دیتا ہے جتنا کہ وہ انہیں اپنی دکان سے چلتا کرنے کے لئے کافی خیال کرتا ہے۔ اکثروں سے وہ ضامن طلب کرتا ہے اور زیورات رہن رکھنے کی صورت میں بھی وہ عام شرح ۱۲ فیصدی کی بجائے ۱۵ یا ۱۸¾ فی صدی شرح چارج کرتا ہے۔ وہ اب غیر کفول قرضہ جات جو گذشتہ زمانہ میں عام تھے۔ دینے سے بالکل انکار کر دیتا ہے۔ اتنا وہ قابل اعتماد اشخاص کو اس وقت بھی قرضہ دے رہا ہے۔ یا یہ کہ مختصر رقمیں زیادہ گراں شرح سود پر دے رہا ہے۔ انجمنہائے امداد باہمی نے اگرچہ شرح ہائے سود میں کمی نہیں کی لیکن وہ اپنے قرضہ جات میں کمی کر دینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اور ۳۳-۱۹۳۲ء میں انہوں نے صرف ۱۶ روپے فی ممبر کے حساب سے دئے۔ ان رکاوٹوں اور بندشوں کو کسان نے بہ سختی محسوس کیا ہے۔ اس لئے کہ وہ مدتوں جب کہ زمین کی قیمت بتدریج روبہ اضافہ ہوتی ہے۔ وہ قرضہ بڑی آزادی سے لیتا رہا ہے۔ اور اتنی آزادی سے قرضہ لیتا رہا ہے۔ کہ جو مال و دولت جو اسے ساہوکار سے بے نیاز کر سکتی تھی۔ اسی لئے مقروضیت میں زیادہ پھنسا دیا ہے۔

مالیہ گذار اور حکومت

آخر الامر حقیقت یہ ہے کہ قارض اور مقروض کے درمیان مفاہمت سخت کٹھن ثابت ہوگی۔

لیکن اس سے بھی مشکل ترین مفاہمت حکومت اور مالیہ گزار کے درمیان ہے حکومت یہ نہیں کرسکتی کہ ساہوکار مثل ایک روپیہ میں سے کچھ آنے لیکر مطمئن ہو جائے۔ وہ بھی اپنے واجبات میں سے ساہوکار کی مانند کمی پر راضی ہو جائے۔ اس لئے کہ حکومت کی ذمہ داریاں زیادہ اور غیر منقسم ہیں۔ اور ضروری ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو بروقت ادا کرے۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ گورنمنٹ مفلس و نادار کسان سے پورے سولہ آنے وصول کرے۔ ۱۹۳۳ء تک بہت بڑی معافیاں منظور کیں۔ گویا حکومت نے قریباً ۴۵ لاکھ پونڈ معاف کئے۔ بقایا کی وصولی میں واجبی سختی سے زیادہ سختی برتی گئی۔ جسکی ایک وجہ ایک طرف ارباب نظم و نسق جن کے حاکم اعلےٰ گورنر ہیں مہارت اور قابلیت ہے۔ جو کسانوں کی افتاد طبیعت اور ان کے اطوار و ظروف کو خوب جانتے ہیں۔ اور دوسری جانب عامتہ الناس کا صبر و تحمل اور ان کا نیک احساس ہے +

زیورات

عامتہ الناس نے جن اطوار و طرق سے اپنے عمدہ احساس کا ثبوت دیا۔ ان میں سے ایک زیورات کی فروخت ہے۔ اجناس کا بھاؤ جن دنوں گراں تھا۔ اُن دنوں ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ پنجاب پانچ دریاؤں کی نگری نہیں بلکہ چھ دریاؤں کی نگری ہے۔ اور چھٹا دریا سونے کا دریا ہے۔ صوبے میں سونا ہر سال ۴ سے لے کر ۵ کروڑ کے عام تخمینی حساب سے پنجاب میں آیا۔ جس میں سے ½ ۳ کروڑ یا اس سے کچھ زیادہ روپیہ کا زیورات کی صورت میں تبدیل کر لیا گیا۔ اس میں اکثر سونا نوآبادیات میں آیا۔ اور کہا جاتا ہے کہ فقط لائلپور نے ۴۰ لاکھ فی سال کے حساب سے اسے زیور بنانے میں لگایا۔ اس وقت نوآباد کار کو سونا زمین میں دفن کرنے کے عام عادت کے باعث مطعون قرار دیا گیا۔ اور جہاں تک اس امر کا یقین ہے۔ کہ وہ سونے کے زیورات بنانے کے لئے قرضہ اُٹھاتا تھا۔ اس کو مطعون گرداننا صحیح تھا۔ لیکن اپنی آمدن سے سونا کو زیورات کے لئے خریدنے میں اس نے کسی حد تک دور اندیشی کا ثبوت دیا۔ بلا شک و شبہ اگر اسے روپیہ کے استعمال کا زیادہ علم ہوتا تو وہ اپنے زائد از ضرورت روپے کو اس سے زیادہ اچھے مصرف میں لگا سکتا تھا۔ لیکن اگر وہ اسے مقدمات میں ضائع کر دیتا یا اس سے زرق برق ملبوسات بنا لیتا

تو اس صورت میں اس کا یہ استعمال زر زیادہ قابلِ رنج و ملامت ہوتا۔ بوقتِ ضرورت زیورات گالے جاسکتے ہیں اور زاں بعد کہ انگلستان نے معیار طلا ترک کر دیا۔ یہ زیورات ایسی صورت میں کہ جن مدّات یا سرکاری کاغذات وغیرہ کی خرید میں روپیہ لگایا جاسکتا تھا۔ ان مصروفات (انوسٹمنٹس) میں روپیہ لگا نا نقصان دِہ تھا۔ زیورات کو فروخت کر دینا زیادہ نافع تھا۔ زیورات کے فروخت کرنے میں زیادہ وقت یہ تھی کہ ان پر مستورات کا بعض تھیں۔ لیکن اگرچہ یہ تصرف اکثر حالات میں زیورات کو فروخت کر دینے کے بجائے انہیں رہن رکھ دینے کی صورت میں اثر پذیر ہوا ہے۔ پھر بھی یہ امر واقعہ ہے کہ زیورات کی کافی تعداد بیچ ڈالی گئی۔ یہ فروخت بجائے خود اس حقیقت کا ایک ثبوت ہے کہ گاؤں میں میاں اور بیوی کے تعلقات خوشگوار ہیں۔ حکومت کا یہ مطالبہ ناانصافی پر مبنی نہیں تھا۔ کہ حکومت کا مطالبہ متذکرہ سرمایۂ محفوظ میں سے ایک حصّہ کو فروخت کر دینے سے ادا کر دیا جائے۔ اس لئے کہ گورنمنٹ جب تک کہ اجناس کا نرخ چڑھ نہ گیا آبیانہ میں اضافہ نہ کر سکی۔ اور اگرچہ یہ زمانہ فارغ البالی اور خوشحالی کا تھا۔ پھر بھی حکومت نے زمین کی اصل پیداوار میں سے ۵ یا ۱۰ فی صدی سے زیادہ نہ لیا۔ حالانکہ سکھ ۳۰ یا ۴۰ فی صدی لیا کرتے تھے۔

سونے کی فروخت

بعض اشخاص یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ کسان سونے کی فروخت پر صرف اس گھڑی آمادہ ہوا۔ جب اس کی قیمت اسلئے بڑھ گئی۔ کہ انگلستان معیار طلا سے دست بردار ہو گیا۔ میرا خیال یہ ہے کہ اصل حقیقت نہیں ہے۔ بلکہ سونا ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء کے موسم سرما میں سرکاری واجبات کی ادائیگی کے لئے فروخت ہونا شروع ہو گیا۔ اس سرما کے بعد موسم گرما میں منڈی میں گندم کا بھاؤ ایک روپیہ چھ آنے فی من تک گر گیا اور نہری آبپاشی رقبوں میں سونے کی فروخت بہت تیز ہو گئی۔ اندازہ لگایا گیا ہے۔ کہ اس سال کے ماہ جولائی اور اگست میں جب حکومت اپنے وہ واجبات فراہم کر رہی تھی۔ جو اسے موسم گرما میں اکٹھے کرنے تھے۔ تو امرت سر کے صرّافوں نے سنٹرل پنجاب سے ۶۹ لاکھ روپے کا سونا خریدا۔ حالانکہ اس سے پہلے ۱۲ مہینوں میں انہوں نے صرف

۱۷ لاکھ روپے کا سونا خریدا تھا۔ اور کہا جاتا ہے۔ کہ اس سونے کا ۳/۴ حصہ دیہات سے آیا۔ اور جب سونے کی قیمت میں ۵۰ فیصدی اضافہ ہُوا۔ تمام سونا جو منڈی میں آیا گاؤں سے آیا۔ اور اس کا اکثر حصہ زیورات کا تھا۔ اور یہ وہ سونا تھا جو کسان نے مالیہ ادا کرنے کے لئے مجبوراً فروخت کیا تھا۔ اور جو لوگ سونا فروخت کرنے پر مجبور نہیں تھے مثلاً بڑے بڑے مالکانِ اراضیات اُنہوں نے ایسا نہ کیا۔ قصبات میں بھی متوسط الحال لوگ صرف بوقت ضرورت اپنے زیورات فروخت کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ ہندوؤں میں اسکا احساس انتہا قوی ہے۔ کہ ان میں سے ایک نے کہا کہ عورت صرف اپنے خاوند کی جان بچانے کے لئے زیورات فروخت کر سکتی ہے۔ اور ایک سرکاری افسر نے بتایا کہ جب اُنہوں نے اپنی بیوی کو زیورات فروخت کرنے کو کہا تو بیوی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔ کہ ان کے پاس ضروریات کی کفالت کے لئے کافی روپیہ موجود ہے۔ اس لئے زیورات کو بطور آخری وسیلہ کے اپنے پاس ضرور رکھنا چاہیئے۔ بلاشک وشبہ واقعہ یہ ٹھیک ہے۔ زیور گھر کی آخری بلکہ واحد متاع ہے ؎

زندگی کا معیار

ہم نے دیکھ لیا ہے۔ کہ جب اجناس کا بھاؤ گرا تو مالک اراضی اور مزارع۔ زمیندار اور اس کے نوکر۔ قارض اور مقروض۔ مالیہ گذار اور سرکار میں کس طرح توافق پیدا ہُوا۔ حالات زمانہ کے ساتھ ایک اور تطابق ضروری تھا۔ اور وہ تطابق یہ تھا۔ کہ زندگی کے معیار کو بھی کم کر دیا جاتا۔ جو صوبہ بھر میں بلند ہو گیا تھا۔ اس چیز کی نہری علاقوں میں زیادہ ضرورت تھی۔ جہاں زندگی کا معیار بہت بڑھ گیا تھا۔ اور نقد روپیہ کا مطالبہ حد سے زیادہ تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ اجناس کی قیمت میں کمی روپیہ کے استعمال میں محسوس ہوئی اسکا تناسب کم ہو گیا۔ روپیہ اتنا کمیاب ہو گیا کہ اکثر دیہات میں دس روپیہ کا نوٹ تڑوایا نہ جا سکا اور اس کمی کا اطلاق سیالکوٹ کی حدود سے دور تک تھا۔ نہری علاقوں میں آبیانہ اور مالیانہ ادا کرنے کے لئے بہت بڑی رقوم کی ضرورت تھی۔ نو آبادی میں رہنے والے کو ایک اور نقصان بھی ہُوا۔ اسکا گذارہ صرف اپنے کھیت پر ہے۔ برخلاف ازیں غیر آبپاش شدہ قطعات میں کسان ضمنی ذرائع آمدن سے بھی بہرہ ور ہے۔ مثلاً فوجی خدمت۔ تجارت۔

مویشیوں کی خرید و فروخت۔ گاڑی بانی۔ اور محنت مزدوری سے بھی روپیہ کمالیتا۔

اخراجات کم کر دئے گئے

سب سے عمدہ نوآباد کار لائل پور میں پائے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے ان
نے ہی اپنے آپ کو زمانہ کے مطابق بنا لینے کی کوشش کی۔ شاہ پور اپنی نسبتاً مُ
مسرفانہ عادات کے باعث بعد میں جنبش میں آیا۔ لیکن وہاں بھی یہ حرکت عمل ۱۹۳
اختتام سے پہلے پہلے شروع ہوگئی۔ مالکِ اراضی اور مزارع نے بہ اختلافاتِ حالا
کم و بیش جو کفایت شعاری اختیار کی اُس کی کیفیت یہ ہے کہ گندم کی بجائے مکی او
کو خوراک بنایا۔ کارخانوں کے بنے ہوئے کپڑوں کی بجائے گھر کا بنا ہوا کپڑا پہننا شرو
کیا۔ موٹر کی بجائے ٹانگہ کی سواری کو ترجیح دی۔ ٹرین میں درمیانی درجہ میں سفر کی بجا
سواری پر چلنے کے بجائے جوتیاں ہاتھ میں لے کر پیدل چلنے کو اختیار کیا۔ نوکر برطر
کر دئے گئے۔ چکی سے آٹا پیسنے کا رواج از سرِ نو زندہ ہوگیا۔ چرخہ کاتنے کی جانب مُ
بیش توجہ کی گئی۔ اور صبح کے وقت جو دودھ یا چائے پکائی جاتی تھی۔ اس میں کھانڈ کی بجا
نمک استعمال کیا۔ ایک کفایت تو ہمارے صوبے بھر میں عام ہے۔ اور وہ یہ ہے
شادیوں پر کم خرچ کیا جاتا ہے۔ اور کم تسلی بخش کفایت یہ ہے کہ ۱۹۳۳ء میں ۱۹۳
کے مقابلے میں سکول کے طلباء کی تعداد میں بقدر ۲۴ ہزار کمی ہوگئی۔

مصیبت کی سبق آموزی

۱۹۳۳ء میں گذشتہ زمانہ اور قیمتوں میں کمی پر بحث کرتے ہوئے میں۔
تحریر کیا کہ اجناس کے نرخوں میں اضافہ کے باعث جو ثروت کسان کو حاصل ہو
اس نے اس کی حقیقی دولت میں بہت کم اضافہ کیا۔ بلکہ اس سے اس کی مقروضیت
اور تعداد خوفناک حد تک بڑھ گئی۔ کہا جا سکتا ہے کہ جس مصیبت یا افتاد سے اسے دوچ
ہونا پڑا۔ اس نے اسے روپیہ کے معقول استعمال سے آگاہ ہو جانے کا موقع بہم پہنچ
گویا جو چیز سرِدست مصیبت دکھائی دیتی ہے۔ وہ درپردہ ایک برکت ثابت ہو سکت
جو کساد بازاری کے باعث سے نمودار ہوئی ہے۔ اور آثار دلالت

کرتے ہیں کہ یہ اُمید پوری ہو جائے گی۔ اسمیں کچھ شک نہیں جیسا کہ حال ہی میں ایک رپورٹ میں واضح کیا گیا ہے۔ کہ اس تنگی کے وقت نے جسمیں کسان اپنی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اسے قرضہ کے بوجھ کو حقیقی معنوں میں سمجھنے کے قابل بنا دیا ہے۔ اور اس میں یہ عزم پیدا کر دیا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح آہستہ آہستہ قسطوں کے ذریعے مسلسل مصیبت برداشت کر کے بھی قرضہ ادا کرنے کی کوشش کرے۔ گذشتہ زمانے میں کسان جو بے پروایانہ طریق سے قرضہ لیتا رہا ہے۔ موجودہ مصیبت اور کساد بازاری نے اس کی راہ میں ایک روک کھڑی کر دی ہے۔ اس کی اس روش پر کہ وہ قرضہ لینے کا عادی ہے۔ کافی مرتبہ سختی سے بحث کی گئی ہے۔ لیکن اس کا یہ وصف بھی قابل داد ہے کہ جس مضبوط تر دل۔ شگفتہ تر روح اور پابند تر احساس سے پنجابی کسان نے مصائب اور مشکلات کا مقابلہ کیا ہے۔ وہ اسی کا حصّہ ہے۔ اور اس باب میں وہ اپنی مثال صرف آپ ہے۔

امداد باہمی

لیکن اگر اس دور ابتلا نے کسان کو درس دیا ہے۔ تو اسمیں حکومت کے لئے بھی سبق موجود ہے۔ مجلس اقوام کی اقتصادی کمیٹی کی رائے میں یہ رجحان ہر ایک جگہ روبہ فروغ ہے۔ کہ حکومت کو قوم کے زراعتی مفاد کی نشوونما کے لئے مؤثر مدد کرنی چاہیئے ہندوستان میں اس مدد کی قرضہ بہم پہنچانے کی شکل میں زیادہ تائید مطلوب ہے۔ کساد بازاری نے قرضہ کو دُگنا کر دیا ہے۔ اور اگر ساکھ کی کمزوری نے بلا تامل قرضہ گیری کے طوفان کو کم کر دیا ہے۔ تو اس کے ساتھ ہی اس کے باعث بعض رقبوں میں تازہ قرضوں پر شرح سود اضافہ پذیر ہو گئی ہے۔ اور پُرانے قرضوں پر ادائیگی میں مشکلات کے باعث سود بڑھ رہا ہے۔ اور مرکب سود کی روز افزوں شکل اختیار کر رہا ہے۔ پُرانے قرضہ جات کے لئے کسی تدبیر کا اختیار کرنا ہو سکتا ہے۔ کہ سراسر لبعد از وقت کا مصداق بن جائے۔ اور ضروری ہے کہ اس کا فیصلہ قارض اور مقروض کی اپنی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے۔ لیکن مستقبل کے لئے کسی نہ کسی سامان کا بہم پہنچانا لازمی ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ ان حالات کا جن اشخاص کا جائزہ لیا ہے۔ ان میں سے بہترین دل و دماغ کی رائے یہی ہے کہ

کسان کے قرضہ کو اگر آئندہ کم نہیں کیا جا سکتا ۔ تو اسے ضبط و نگرانی میں ضرور لے آنا چاہیئے ۔ بعض مقامات پر اس غرض کو بذریعہ قانون پورا کر لیا گیا ۔ اور متعدد صوبوں میں اس مقصد کی تکمیل کے لئے متعدد تجربے کئے جا رہے ہیں ۔ ان پر غور کیا جا رہا ہے اور بہترین رائے ان کی ہے ۔ جو یہ کہتے ہیں کہ مطلوبہ ضبط و نگرانی کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ قرضہ امداد باہمی کے طریق پر بہم پہنچایا جائے ۔ جس طریق پر یہ انضباط و تصرف کام میں لیا جاتا ہے ۔ میں نے کسی اور مقام پر اس کا ذکر کر دیا ہے ۔ اس کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس نے جو کچھ کیا ہے کسی بیرونی ایجنسی کی مدد سے نہیں بلکہ خود لوگوں کی مدد سے کیا ہے ۔ اس سے شرح سود میں کمی ہو جاتی ہے ۔ یہ مرکب سود کو منسوخ کر دیتا ہے اور کسانوں کو روپیہ کے جائز اور ناجائز استعمال سے آگاہ کر دیتا ہے ۔ بعض حضرات اس انداز سے بولتے اور لکھتے ہیں ۔ کہ گویا ان کے خیال میں کسان کی راہ میں روک یہ ہے کہ اس کے پاس استعمال میں لانے کیلئے کافی روپیہ نہیں ہوتا ۔ ہر وہ شخص جس نے کسان کو بہت بڑی رقم کو جو اس کے ہاتھوں میں جاتی ہے صرف کرتے ہوئے دیکھا ہے ۔ اس کا خیال ایسا نہیں ہو سکتا ۔ کسان کی راہ میں روک صرف یہی ہے کہ اسے اپنے روپیہ کو فائدہ مند طریق پر خرچ کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا ۔ بہت عرصہ تک یہ حال رہا ہے ۔ کہ پنجاب میں تحریک امداد باہمی کے پاس اتنا روپیہ رہا ہے کہ وہ اس ضرورت سے زیادہ تھا ۔ جسے وہ دور اندیشانہ طریق پر خرچ کر کے پورا کر سکتی تھی ۔ اس لئے نسبتاً بہت کم آدمی ایسے ہیں جن کی نسبت یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ وافر روپیہ کو دور اندیشی سے صرف کر سکتے ہیں ۔ مطالبات اور سیرت میں چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ اور میں نے اپنے دورہ میں اسپر بار بار زور دیا ہے ۔ اس بحث کا فیصلہ یہ ہے کہ سب سے بڑی اقتصادی ضرورت کسان کو روپیہ کا جائز استعمال سے باخبر کرنا ہے ۔ اور غالباً یہ مقصد صرف امداد باہمی کی وساطت سے ہی پورا کیا جا سکتا ہے ۔ یہی وہ اعتقاد تھا کہ جس نے انجمن تحقیقات بنک ہائے پنجاب ۱۹۳۰ء کو اس پر راغب کیا کہ وہ امداد باہمی کے قرضہ کی تحریک کی وسعت کو اپنی سب سے بڑی سفارش قرار دے ۔ اور اس نے اندازہ لگایا ہے کہ اگر اس سکیم کو اختیار کر لیا جائے تو پندرہ سال کے عرصہ میں صوبے کے ہر ایک موزون گاؤں میں ایک انجمن امداد باہمی کا قیام عمل میں لایا جا سکتا ہے ۔ بدقسمتی یہ ہے کہ مالی مشکلات

کے باعث گذشتہ چار سال ضائع کر دئے گئے۔ اور ضروری عملہ میں سے بہت ہی کم بہم پہنچایا گیا +

تعلیم!

پڑھائی لکھائی

اگر کسان کی زمانہ حال میں سب سے زیادہ ضرورت امداد باہمی ہے تو اس کی ترقی کے لئے سب سے بڑی ضرورت ابتدائی تعلیم ہے۔ اس زمانہ سے کچھ پہلے پڑھ سکنے اور لکھنے پر قادر نہ ہونا قابلیت اور سیرت کے مکمل اظہار کی راہ میں کوئی روک نہ تھی۔ شہنشاہ اکبر اپنی زندگی کے آخری ایام تک اَن پڑھ رہا۔ گذشتہ زمانے کے معروف ترین پنجابیوں میں سے ایک مشہور شخصیت نواب بہرام خاں صاحب مرحوم کی تھی۔ آپ ایک بلوچ سردار تھے۔ آپ کا ایک ایک لفظ اور مشورہ بلوچستان کے اس سرے سے لیکر اس سرے تک بطور ایک حجت کے تسلیم کیا جاتا تھا۔ لیکن آپ اپنا نام تک لکھنا نہیں جانتے تھے۔ لیکن جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ اس زمانہ میں جن لوگوں کو نئے حالات کا مقابلہ کرنا ہے۔ علم سے محرومی ان کی راہ میں ایک سنگِ گراں ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔ پُرانے زمانے میں دیہاتی جماعت مضبوط اور قوی تھی۔ اور لوگ اپنی ضروریات کے باعث امداد باہمی پر قدرتاً مجبور ہو جاتے تھے۔ لیکن آج یہ چیز موجودہ دنیا کے مختلف اغراض و مقاصد اور متعدد ضرورتوں کی تکمیل کے لئے کافی نہیں ہے۔ جبکہ علم سے محرومی عام حیثیت اختیار کئے ہوئے ہے ۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں پنجاب کی دس فیصدی سے کم آبادی پڑھی ہوئی تھی۔ اور سنہ ۱۹۳۰ء میں ہماری زراعتی انجمنہائے امداد باہمی کے صرف ۱۳ فیصدی ممبر خواندہ تھے۔ یہ امر معنی خیز ہے کہ جالندھر جہاں خواندہ آبادی ۳۰ فیصدی ہے۔ امداد باہمی غایت درجے کی ترقی پر ہے لیکن میانوالی میں اس کی ترقی بہت کم ہے۔ وہاں یہ ہے کہ وہاں صرف ۲ فیصدی آبادی لکھی پڑھی ہے۔ حیران کن امر یہ ہے کہ اس نے کسی قدر ترقی بھی کی ہے۔ اس لئے کہ کئی کئی بستیوں تک ایک آدمی بھی خواندہ نہیں ملتا۔ کہ اسے بنک کا سیکرٹری بنا دیا جائے +

امداد باہمی کی راہ میں روک

لیکن اسکا مفہوم یہ نہیں ہے کہ کسی انجمن کی خوبی کا تناسب اس کے خواندہ ممبران کی تعداد سے لگاؤ رکھتا ہے۔ لیکن اس قدر واضح ہے کہ گاؤں کی انجمن جیسے سیدھے سادھے نظام کے لئے بھی کم ازکم چند ایک ایسے ممبران کی ضرورت ہے کہ جو پرونوٹ پڑھ سکتے ہوں۔ اور حسابات سمجھ سکتے ہوں۔ یہ ایک اعجاز ہے کہ کئی ایک سال تک ہزار ہا روپے اَن پڑھوں کو بطورِ قرضہ دیئے گئے۔ لیکن ان میں سے کچھ نقصان بھی نہیں ہوا۔ اندنوں ۷ کروڑ کے قریب روپیہ تقریباً ۵ لاکھ اشخاص کو قرضہ دیا گیا ہے۔ اور ان میں سے صرف ۳ فیصدی خواندہ ہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں۔ جو گنتی بھی نہیں کرسکتے۔ ۱۹۳۱ء میں ایک افسر شاہ پور کے ایک بڑے گاؤں میں ایک بنک کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے ایک ممبر سے جو ۲۹۲ روپیہ کا مقروض تھا۔ یہ پوچھا کہ باسٹھ کسے کہتے ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ اگر ۲ کو دو دفعہ گنا جائے اور پانچ اس میں شامل کئے جائیں تو ۶۲ بنتے ہیں۔ انسپکٹر نے ایک ایک کر کے ہر ایک ممبر سے یہ دریافت کیا۔ ۱۶ ممبران میں سے صرف ۲ یہ بتاسکے کہ ۶۲۔ ساٹھ کی جمع دو ہے۔ محسوس کیا جاسکتا ہے کہ جب امداد باہمی کے طریق پر خرید و فروخت کرنے کا موقع پیش آتا ہے تو اس کاروبار میں سب سے بڑی روک یہی ثابت ہوتی ہے۔ کہ ممبران نہ پڑھ سکتے ہیں نہ لکھ سکتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے لئے جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں۔ ان میں اس ایک دلیل کا اضافہ کرسکتے ہیں۔ جس کی ہر ایک کواپریٹر تائید کرے گا۔ اور جسے متعدد کواپریٹر پیش بھی کرچکے ہیں۔ کہ امداد باہمی کی ترقی کے لئے ممبران کا نوشت و خواند سے بہرہ ور ہونا لازمی ہے۔ اور اگر کوئی شخص اس کی اہمیت سے انکار کرتا ہے۔ تو اسے شاہی زراعتی کمیشن کا یہ عام مقولہ یاد کرنا چاہئے کہ اگر امداد باہمی سے قاصر ہوگئی تو دیہاتی ہند کی بہترین اُمید ناکام ہوجائے گی +

رُوس

زمانہ کی رفتار ایک اور دلیل پیش کرتی ہے۔ گذشتہ جنگ نے دُنیا کو ہلا دیا ہے۔

اور اکثر معاملات عامہ میں مشترکہ معیارات عمل پذیر ہیں۔ تعلیم کے میدان میں مہذب ممالک کا مقبولہ معیار یہ ہے کہ ہر ایک شخص کو نوشت و خواند پر قادر ہونا چاہیے اور اگر ہندوستان سے اپنی سرحد سے پرے نظر دوڑائیے۔ تو روس کی مثال کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یورپ میں روس ایک ایسا ملک ہے کہ جس کا حال ہندوستان سے ملتا جلتا ہے۔ جنگ کے زمانے سے پیشتر بھی تعلیم کے میدان میں روس ہندوستان سے آگے بڑھا ہوا تھا۔ لیکن سنہ ۱۹۲۰ء میں بھی روسیوں کا عالم یہ تھا کہ ان میں سے ۶۰ مرد اور ۷۰ فیصدی عورتیں اَن پڑھ تھیں۔ لیکن اس زمانے میں ان پڑھوں کی تعداد صرف ۱۰ فیصدی سے کم ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اسمیں مبالغہ ہو۔ اور یہ چیز بھی واضح نہیں ہے کہ علمیّت سے مقصود کیا ہے؟ بعض چیزیں ایسی سکھائی جاتی ہیں۔ جنہیں نہ انگریز کے جذبات قبول کرسکتے ہیں۔ اور نہ انہیں ہندوستانی پسند کرسکتا ہے لیکن اس دعوے کو روس کے حق میں قابل فخر خیال کیا جاسکتا ہے۔ کہ وہاں تمام بچے تین یا چار سال سکول میں ضرور پڑھتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ہندوستان کا حال ملاحظہ ہو کہ جس کی دس فیصدی سے کم آبادی اَن پڑھ ہے۔ گویا اس میدان میں ہندوستان روس سے بے حد پیچھے ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستان کی آبادی روس کی آبادی سے دوچند ہے۔ لیکن نہ آبادی اور نہ آب و ہوا کا اختلاف اس تفاوت کی توضیح کرسکتا ہے۔ روس جہالت کو ایک مرض تصور کرتا ہے۔ اور وہ ہر ممکن طریق سے اس بیماری کے ازالہ کے درپے ہے۔ اور چاہتا ہے کہ کم سے کم وقت میں یہ روگ دور اور کافور ہوجائے۔ لیکن ہندوستان اسے ایک موروثی کمزوری تصور کرتا ہے اور اگر ہر دس سال کے بعد کسی قدر اضافہ ہوجاتا ہے تو ہندوستان اسے کافی سمجھ لیتا ہے۔ اور بددلی کا اظہار نہیں کرتا۔ گذشتہ دس سال میں ہندوستان نے صرف ایک فیصدی ترقی کی +

پنجاب

اس ملک میں سنہ ۱۹۳۲ء میں آبادی میں ۳ لاکھ کا اضافہ ہوا۔ لیکن سنہ ۱۹۳۲-۳۳ء میں سکول میں پڑھنے والے بچوں کی تعداد میں ۲۴ ہزار سے زیادہ کمی واقع ہوگئی۔

حکومت پنجاب اس کی دو وجہیں بیان کرتی ہے۔ اقتصادی پستی و درماندگی اور عام دیہاتی کی علمیت سے ناقابل علاج نفرت۔ کساد بازاری کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ نیلی بار اور رہتک میں کساد بازاری ہے۔ لیکن میں اپنے دو مرتبہ کے دورہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں۔ کہ اس کا باعث اقتصادی درماندگی نہیں ہے۔ جہاں تعلیم ناقص ہے اور مدرس گاؤں سے یکسر الگ تھلگ رہتا ہے۔ وہاں تعلیم سے نفرت بھی ہے۔ لیکن ۱۴ اسو سیل کا جو چک میں نے کاٹا اس نے میرے دل پر یہ اثر پیدا کیا۔ کہ اندلوں کسان اپنے بچوں کی تعلیم کا شائق ضرور ہے۔ اس کا یہ اشتیاق محض اس تصور پر مبنی نہیں کہ تعلیمیافتہ ہو کر اس کے بچے کو سرکاری ملازمت مل جائیگی۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ سرکاری ملازمت بجائے خود ایک جاذب التفات شے ہے۔ لیکن ضروری ہے کہ کسانوں کو اس امر کی حاجت ہے کہ ان کے بچے تعلیم و تربیت کے زیور سے آراستہ و پیراستہ ہو کر شائستہ گفت و شنید، اور مہذبانہ نشست و برخاست کے قابل ہو جائیں۔

زمین اور مدرسہ

تاہم اگر تعلیم نے بچوں کو کھیتوں اور گھروں سے بے نیاز کر دیا۔ تو اس اجنبیت کے باعث ان کو تعلیم سے صحیح فوائد حاصل نہیں ہو سکیں گے۔ یہ ایک عام حقیقت ہے اور میں اس کا اعادہ بدیں وجہ کر رہا ہوں کہ میری سیاحتوں نے مجھے اس واقفیت سے پورے طور پر روشناس کر دیا۔ اور میں اس ضمن میں ایک یا دو تجویزیں پیش کرتا ہوں۔ ان کو بیان کرنے سے پیشتر انصاف کا تقاضا یہ ہے۔ کہ اسے بیان کر دیا جائے کہ پنجاب کے محکمہ تعلیم نے گاؤں کی تعلیم کو دیہاتی رنگ میں رنگنے کے لئے بیش از بیش کوشش کی ہے۔ ان میں سے ایک اور بہترین تدبیر یہ ہے کہ کئی ایک مدارس میں ایک چھوٹا سا کھیت یا قطعۂ باغ مہیا کیا گیا۔ تاکہ وہاں بچے کاشت اور تخلبندی کریں۔ اگرچہ کسی جگہ ان سے زیادہ فوائد حاصل ہوئے ہیں۔ اور کسی جگہ مقابلتہً کم۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ ان کا وجود مدرسہ کی زندگی میں ایک گران قدر اضافہ کا حکم رکھتا ہے۔ اور یہ چیز ہے۔ جسکا

ہم نے ترن تارن کے قریب نظارہ کیا۔ اس ضمن میں تازہ ترین تدبیر یہ ہے۔ کہ ورنیکلر مڈل سکولوں میں زراعت۔ حفظانِ صحت۔ دیہاتی اقتصادیات یا دیہاتی سائنس کے عنوان کے ماتحت سادہ ترین طریق پر تعلیم دی جارہی ہے۔ مزرعہ اور قطعہ باغیچہ کے باوجود میں نے اس پر عام اتفاق آرا دیکھا۔ اور مدبرین مدارس بھی اس سے متفق ہیں کہ اگرچہ ابتدائی اور اینگلو ورنیکلر مڈل سکول کے نصاب سے کوئی بُرا اثر نہیں پیدا ہو رہا۔ لیکن ہائی سکول تو زمین کے مقاطعہ کا حکم رکھتا ہے۔ اسلئے میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ اس کی بنا پر میری اوّلین رائے یہ ہے کہ اگرچہ کسان کے لئے تعلیم کا وجود ناگزیر ہے۔ لیکن اکثر کسانوں کو ورنیکلر مڈل سے زیادہ تعلیم نہیں چاہیئے بعض اچھے مبصر اس سے بھی زیادہ حد مناسب خیال کریں گے۔ یہ تصور کرتے ہوئے کہ زمین سے علیحدگی کا عمل چھٹی کلاس سے شروع ہوتا ہے۔ وہ صرف پانچویں جماعت کی تعلیم پر کفایت کرینگے۔ اور ایک عام دیہاتی بچے کے لئے تعلیم کی قدرتی مدت یہی قرار دیں گے۔

ذہنی غلامی

سر جارج اینڈرسن اور ڈاکٹر وائٹ ہیڈ نے اپنی ایک تازہ ترین تصنیف میں ہندوستانی طالب علم کی ذہنی غلامی کا تذکرہ کیا ہے۔ انہیں تعجب ہے کہ بہت سے طلباء جو کبھی روشن دماغی۔ فہم و ادرک۔ ذہانت و ذکاوت ظاہر کیا کرتے تھے۔ اب انکے دماغ پست ہو گئے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ انہیں پروفیسر لوٹ سکھا دیں۔ اور تمام قسم کی معلومات کو صرف یاد کر لینا چاہتے ہیں۔ ان کی زندگی کا مقصد اتنا محدود اور اتنا مادی ہو گیا ہے۔ کہ ان میں سے اکثروں کا نصب العین یہی ہے۔ کہ ان کو یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کر کے کوئی چھوٹی موٹی سرکاری نوکری مل جائے۔ اگر محض ایک مبتدی اس انقلاب ذہنی کا جائزہ لے۔ تو وہ اس کے تین اسباب بیان کر سکتا ہے۔

پہلا یہ ہے۔ کہ تمام تعلیم بذریعہ زبان انگریزی دی جاتی ہے۔ یہ ذریعہ تعلیم شہری طلباء کے لئے اچھا ہے یا بُرا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ دیہاتی طالب علم کے لئے یہ چیز بہر نوع ناموزون ہے۔ اور جن کو اس کا تجربہ ہے۔ وہ اس کو خوب

سمجھ سکتے ہیں۔

دوسرا سبب وہ ہے کہ جو لنڈاں سے کمیشن منعقدہ ۳۱-۱۹۳۰ء میں ایک گواہ نے بیان کیا۔ عام طالب علم کا افلاس اسے مجبور کرتا ہے۔ کہ وہ امتحان کو کم سے کم وقت صرف کرکے پاس کرے۔ ہندوستان میں تعلیم ارزاں ہے۔ لیکن جس قسم کا دباؤ ایک دیہاتی طالب علم پر پڑتا ہے۔ اسکو مدِنظر رکھتے ہوئے اس دلیل کی قوت میں اضافہ نظر آتا ہے۔ کہ دیہاتی طالب علم کو اگر وہ خاص ذہانت کا مالک نہ ہو۔ تو اسے ورنیکلر مڈل کی حد سے زیادہ تعلیم کے درپے نہیں ہونا چاہیئے۔

تیسرے سبب پر خاص زور دینا چاہیئے۔ اس لئے کہ اگرچہ وہ اہم ہے۔ لیکن اس کی اہمیت کو غالباً کافی طور پر سمجھا نہیں گیا۔

میرا روزنامچہ ظاہر کرتا ہے کہ ہائی سکول کے عام لڑکے کو اکثر اوقات کام حد سے زیادہ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن خوراک کم میسر آتی ہے۔ امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے ضروری ہے۔ کہ وہ ہر روز تین یا چار گھنٹہ تک کام کرے۔ اور تعطیلات کا کام اتنا سخت ہوتا ہے کہ وہ لڑکا ہمیں ملا۔ جسے کرسمس کی دس چھٹیوں میں قریباً ۵۰ گھنٹے کام میں بسر کرنے پڑتے ہیں۔ اور یہ تمام زحمت اس وقت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ جبکہ بچہ اوائل عمر میں ہوتا ہے۔ اور شباب کی منزل میں قدم دھرنے کو ہوتا ہے۔ اس صورت میں تعجب کیا ہے کہ طالب علم کالج میں تھکا ماندہ یا غلام شدہ دماغ لے کر آتا ہے۔ اور یہ کہ نہ اُن کے پاس اتنا وقت ہوتا ہے۔ نہ ان کے عقب کوئی میلان ہوتا ہے۔ کہ جس سے اثر پذیر ہوکر ان کے لئے کھیتوں میں کام کرنا ممکن ہوجائے۔ اور ان کے لئے شاذ ونادر ہی ممکن ہوتا ہے۔ کہ وہ زمین کی طرف رخ کریں۔ بلکہ آٹھ سال تک مدرسہ کی تعلیم اور گھر میں ناز بردارانہ زندگی بسر کرنے کے باعث وہ گرم سورج کے سایہ میں کاشتکاری کی محنت و زحمت برداشت کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ رُہتک میں ایک شخص نے ازراہ طنز کہا کہ جب انہیں اپنی صحت کے متعلق کوئی خطرہ ہوتا ہے تو وہ دلی میں بھاگ جاتے ہیں۔ آسٹریا جیسے دیہاتی ملک میں حالات پنجاب سے بالکل علیحدہ نوعیت کے ہیں۔ وہاں طالب علموں کو جو تعطیلات دی جاتی ہیں۔ وہ حقیقی معنوں میں تعطیلات ہوتی ہیں۔ اور وہ کھیت میں اپنے والدین کی مدد کرتے ہیں +

وہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر۔

ثانوی سکول اور زمین کے درمیان اس عدم تعلق کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ جن اضلاع میں ایسے سکول کثرت سے ہیں۔ وہاں نیم تعلیمیافتہ اور بیکار زمینداروں کی از بس کثرت ہے۔ یہ چیز میرے پہلے سفر میں بیان کی گئی۔ اور اس ضمن میں چند مزید مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں مجھے ایک زمیندار ملا۔ اس نے بتایا کہ اس کے نو بچے ہیں۔ جن کو اس نے کچھ نہ کچھ تعلیم دی ہے۔ دو مڈل پاس ہیں۔ دو انٹرنس پاس ہیں۔ اور ایک بی اے ہے۔ ان میں سے صرف دو ملازم ہیں۔ صرف ایک کاشتکاری میں مصروف ہے۔ حالانکہ اس کا والد اپنی گاؤں کی زمین کے علاوہ ایک نو آبادی میں ۵۰ ایکڑ زمین کا مالک ہے۔ جیسا کہ بی اے پاس لڑکے نے کہا۔ ہماری خواہشات حد سے زیادہ بڑھی ہوئی ہیں۔ تین دن کے بعد میں ایک بی اے سے ملاقی ہوا۔ جس نے مجھ سے بیان کیا کہ اس کا والد صوبیدار میجر ہے۔ نو آبادی میں اس کے پاس ۱۴۰ ایکڑ زمین ہے۔ اور یہ کہ وہ اپنے والد کا ساتواں بیٹا ہے۔ اور تمام بھائی کم و بیش تعلیمیافتہ ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ملازم نہیں۔ اور نہ ہی کوئی کھیتی باڑی کر رہا ہے۔ اس نے خود بھی کہا کہ اس کے دل میں کشت کاری سے کوئی رغبت نہیں ہے۔ یہی کیفیت اسکے دوسرے بھائیوں کی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اتنا معزز خیال کرتے ہیں۔ کہ انہیں کھیتی باڑی سے نفرت ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ صوبیدار میجر کو صرف اپنے سات لڑکوں کے خورد و نوش کی کفایت نہیں کرنی پڑتی۔ بلکہ ان کے آٹھ بچے بھی اس کے دستِ نگر ہیں۔ ایک اور واقعہ لیجیئے۔ میں نے دریائے سندھ کے قریب ایک ڈاک بنگلہ کے ایک نوکر کو دور سے دیکھا۔ وہ میری طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اور اپنے ہاتھ میں کوئی سکڑی ہوئی چیز لئے ہوئے تھا۔ وہ میری طرف آنے سے خائف تھا۔ وہ زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ کہ میں نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے اسے متوجہ کیا۔ وہ بھاگ کر میری طرف آیا۔ وہ پوشاک پہنے ہوئے تھا۔ لیکن اس کے تمام کپڑے پرانے۔ پھٹے ہوئے۔ گھسے ہوئے اور داغدار تھے۔ اس کے نامصاف سر پر ڈھیلی ڈھالی ایک پگڑی تھی۔ اس نے بزبان انگریزی مندرجہ ذیل درخواست مجھے دی۔

"میں ایک غریب باشندہ ہوں۔ میں نے اپنی عزت کے باوجود اپنے لڑکے کو بی اے تک تعلیم دلوائی۔ میں آپ کی خدمت میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ اسے نوکری دلائیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ ہم غریبوں کے لئے کچھ نہ کچھ کریں گے۔ اور ہمیں اس گندی زندگی سے نجات دلائیں گے" یہ درخواست انسانی حقائق کا مرقع ہے۔ لیکن یہ اس حقیقت کا ایک اور ثبوت ہے۔ کہ تعلیم بابرکت نہیں ہے۔ یہ تمام مثالیں اس بات کی توضیح کرتے ہیں۔ جو حال ہی میں ایک تعلیمی رپورٹ میں بیان کی گئی ہے کہ مڈل اور ہائی سکولوں میں طالب علموں کی تعداد میں کمی کا باعث کسانوں میں اس امر کا روزافزوں احساس ہے۔ کہ جو تعلیم بچوں کو سکولوں میں دی جاتی ہے۔ وہ انہیں کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ یہ امر کسی قدر اطمینان بخش ہے۔ کہ ان کی تعداد میں ۵/۴ ملکی تعلیم کی ثانوی منزل میں جلوہ نما ہوتی ہے۔

ثانوی اور کالج کی تعلیم میں کمی

اگرچہ پرائمری کی تعلیم کسان کے لئے ناگزیر ہے۔ اور اعلےٰ تعلیم اسے قابل نہیں رہنے دیتی۔ تو کیا ان اکثر اشخاص کے لئے جن کے نزدیک کوئی سکول نہیں ہے۔ یا ان چند ایک کے لئے جو ہائی سکول اور کالج کی تعلیم پر بھاری خرچ کرتے ہیں۔ کیا یہ معقول ہے یا یہ کہ حکومت کے لئے یہ مناسب ہے۔ کہ پرائمری کی تعلیم کے بجائے ثانوی اور کالج کی تعلیم پر اتنا روپیہ خرچ کیا جائے؟ ۱۹۳۳ء میں ۱۸۶ لاکھ روپیہ اول الذکر پر اور صرف ۳۸ لاکھ آخر الذکر پر صرف کیا گیا۔ یہ معقول نہیں ہے کہ سارا روپیہ یعنی ۱۸۶ لاکھ روپیہ ہی ابتدائی تعلیم پر صرف ہونا چاہئے تھا۔ لیکن اگر حقیقتاً ایسا ہوجاتا تو قریباً ۲۰ لاکھ بیش از بیش بچے کی تعلیم سے بہرہ ور ہوجاتا۔ اس لئے کہ پرائمری سکول میں ایک بچہ کا سالانہ خرچ صرف ۱۰ روپے ہیں۔ اس کے مقابلے میں غور کرو ۴۴ لاکھ روپیہ ہائی سکول۔ ۱۷۷ لاکھ روپیہ آرٹس کالج اور ۱۷۵ لاکھ روپیہ پروفیشنل کالج پر صرف کیا گیا۔ ایسے صوبے میں جہاں ۱۰ فی صدی سے کم آبادی خواندہ ہے۔ یہ اعداد و شمار عدم تناسب پر دلالت کرتے ہیں۔ روس کی اس وقت پالیسی یہ ہے۔ کہ جہاں تک ذرائع آمدن اجازت دے سکتے ہوں

عوام کو تعلیم سے بہرہ ور کیا جائے۔ اور عوام میں سے جو اعلیٰ تعلیم کے قابل ہوں۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے صرف ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ جرمن ایک قدم اور آگے ہے۔ وہاں یونیورسٹی کے طلباء کی تعداد ۱۹۱۱ء میں ۶۳ ہزار تھی۔ اور وہ ۱۹۳۱ء میں ایک لاکھ ۲۳ ہزار تک بڑھ گئی۔

ہندوستان میں اس اضافہ کے ایک سبب والدین کی معاشرتی تمناؤں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ جو اس غرض کے لئے ہر قسم کی قربانی کرتے ہیں۔ کہ ان کے بچے سرکاری افسر یا وکیل وغیرہ بن جائیں۔ اور معمولی کام کے بدنما داغ سے بچے جائیں۔ اس سال لہذا یونیورسٹی میں داخلوں کی تعداد ۱۵ ہزار تک محدود کردی گئی۔ اور اس کے ساتھ یہ تجویز کی گئی ہے کہ اکثر طلباء کا رجحان ثانوی سکول سے عملی تجارتی مدارس کی طرف کیا جائے۔ اس ضمن میں ہندوستان اور جرمنی میں پوری مشابہت نظر آتی ہے۔ اور اگر جرمنی کے طریق پر عمل کیا گیا تو ابتدائی تعلیم کی وسعت کے لئے بہت بڑی رقم دستیاب ہو سکے گی۔

دیگر بچتیں

اسکی وسعت ایک بہت بڑے پیمانہ پر ایک اہم مسئلہ ہے۔ کہ اس کے لئے ہر ایک نوعیت کی بچت پر غور کرنا چاہیئے۔ ایک تجویز فوراً سامنے آجاتی ہے۔ جس ملک میں لوگ اپنے مکانات خود بناتے ہیں۔ اور ان کی تعمیر بھی خود کرتے ہیں۔ وہاں یہ امر ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ مدارس بنانے اور ان کی مرمت کرنے کا کام حکومت کے سپرد ہو۔ فلسطین میں اگر کسی گاؤں میں سکول بنانا ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ تو اس کے لئے زمین اور عمارت کا مصالحہ خود گاؤں والے بہم پہنچاتے ہیں یا یہ کہ اسکا سارا خرچ گاؤں والے خود برداشت کرتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی اسی مسلک پر گامزن ہونا چاہیئے۔ اور جب ایک شخص یہ خیال کرتا ہے کہ رہتک میں بے شمار روپیہ ایک مسجد اور کلب پر صرف کر دیا گیا۔ اور یہ کہ اس قسم کے مصارف سارے پنجاب میں ہوتے رہتے ہیں۔ تو پیش نظر تجویز عجیب وغریب معلوم نہیں ہوتی۔ سکھوں میں پیشتر ازیں یہ دستور موجود ہے کہ جب کوئی خالصہ سکول بننے کو ہوتا ہے۔ تو

قرب وجوار میں رہنے والے سکھ اپنی محنت و مزدوری بطور چندہ پیش کرتے ہیں
وہ زمین کھودتے ہیں۔ گارا تیار کرتے ہیں۔ مٹی ڈھوتے ہیں۔ اور اینٹیں اٹھاتے
ہیں۔ اور حال ہی میں ایک سکھ نامہ نگار نے تحریر کیا۔ عین اس وقت جبکہ ایک
ہوسٹل زیر تعمیر ہے۔ میں نے دور دور کے دیہاتیوں کو کام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔
ہر ایک گاؤں باری باری تین دن تک کام کرتا ہے۔ اور اپنے لنگر کا خود انتظام کرتا
ہے۔ ہر ایک گروہ اپنی ذات میں مکمل تھا۔ اس میں بڑھئی۔ ترکھان۔ معمار اور مزدور
شامل تھے۔ ان میں ہر عمر کے مرد بھی تھے۔ اور عورتیں بھی۔ یہ وہ جذبہ ہے جسے صوبے
کی تعلیم و تربیت کے مقاصد کی نشر و تکمیل کے لئے کام میں لانا چاہیئے ؛

ایک اور نئی بچت

ایک اور بچت جو میری سیاحتوں میں مجھے دکھائی دی۔ میں اس کا بھی ذکر کردینا
چاہتا ہوں۔ میں یہ دیکھکر حیران ہوگیا ہوں۔ کہ سکولوں میں بہشتی (سقے) مقرر ہیں۔
حالانکہ پانی قریب ہی سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کی توجیہ یہ بیان کی گئی کہ پانی
نکالنے یا بھرنے کو منافیٔ عزت خیال کیا جاتا ہے۔ اور یہ بھی ایک ایسے ملک میں
جہاں پانی زندگی کی ایک اہم ضرورت میں سے ہے۔ ایک شخص ان ایام کو ذہن
میں لاسکتا ہے۔ جب ایک شخص کو ڈھلوان سیڑھیوں پر گرم پانی کی یا مٹی بعض
بڑی عمر کے بچوں کے غسل کے لئے پہنچانی پڑتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک شخص مغربی
پنجاب کا خیال کرتا ہے۔ جہاں دیہات میں سقوں کا وجود عنقا ہے۔ ٹریننگ سکول موگا
کو پیش نظر لانا بھی ضروری ہے۔ جہاں ۱۵۰ بچوں کے لئے دو مالیوں کے علاوہ صرف
ایک خاکروب ملازم ہے ؛

فوج کا اثر

گاؤں میں تین اہم تعلیمی اثرات جلوہ نما ہیں۔ ان میں سے دو انجمن امداد باہمی
اور مدرسہ کا ہم نے تذکرہ کردیا ہے۔ اب ہمیں تیسرے اثر فوج کا ذکر کرنا ہے اور زندگی
کے تمام مقاصد کے لئے اس کا تعلیمی اثر غالباً سب سے بڑھ کر ہے۔ ہمارے اگر

اجتماعات میں سب سے زیادہ بالغ نظر اور باخبر انسان فوجی سپاہی تھے۔ فوجی کا زاویہ نگاہ اپنے گاؤں اور جنگ کے زمانہ سے شروع کر کے ہندوستان تک محدود نہیں ہے۔ اور اب ہمیں ہر آن پڑھنا اور لکھنا سکھایا جاتا ہے۔ اگر تمام نوجوانوں کو فوج میں جانا پڑے، تو جہالت (لاعلمی) کا بہت جلد خاتمہ ہو جائے لیکن فوج کسان کو نوشت وخواند کے علاوہ اور بھی بہت کچھ سکھلا دیتی ہے۔ سپاہگری اس کے دل میں اعزاز نفس کے احساس کو بلند کر دیتی ہے۔ اسے اپنے فرائض اور دیانت وصداقت کی برکتوں سے آگاہ کر دیتی ہے۔ وہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کی ہدایت کرتی ہے۔ اکثر اوقات دیکھنے میں آیا ہے کہ قتل وغارت کی وارداتوں میں فوجی بہت کم ملوث ہوتے ہیں۔ انہیں ہر روز غسل کرنے۔ ستھرا کپڑا پہننے اور چست وچالاک رہنے کی عادت ہوتی ہے۔ روس کی فوج کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ وہ کسانوں کی یونیورسٹی ہے۔ اور یہی کیفیت ہندوستانی کسانوں کی ہے۔ اس کا مادی فائدہ بھی نمایاں ہے۔ جس کا ہم نے وقتاً فوقتاً تذکرہ کیا ہے۔ اسکے باعث تمام قطعاتِ ملک میں اتنی ثروت و دولت ہے۔ کہ اس نے اجناس کی قیمتوں میں کمی کے اثرات کو کم کر دیا ہے۔

پنجاب کے لئے پہلا اور آخری فائدہ یہ ہے کہ ہندوستانی فوج کا ½ حصّہ پنجاب سے حاصل کیا جاتا ہے۔

عزت اور کفایت شعاری

لیکن کوئی شے مکمل نہیں ہے۔ فوج کے اثر میں بعض خامیاں بھی ہیں۔ ایک خامی یہ ہے کہ اعزاز نفس کے پیدا کرنے میں اس نے عزت کے مفہوم کو بہت بڑھا چڑھا دیا ہے۔ اور ہندوستان میں عزت کا تخیل ایک خاص شان اور کیفیت رکھتا ہے۔ اور یہ تخیل انسان کو اس جذبے سے سرشار کر دیتا ہے۔ کہ وہ تمام معاملات و ماحول کو صرف اپنی روشنی میں دیکھے۔ ایک خیال کے آدمی محنت و مزدوری کی ان اقسام کو قطعاً پسند نہیں کرتے کہ جنہیں دوسرے بڑی خندہ پیشانی سے اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً گھوڑوں کو کرایہ پر چلانا۔ دکانوں میں کام کرنا یا بحیثیت معمار

باہر جانا یہ وہ مشاغل ہیں جو بعضوں کو پسند ہیں اور بعضوں کو نہیں۔ اور یہ تفاوتِ نظر محض ضرورت کی وجہ سے نہیں ہے۔ ان کے مقابلے میں زیادہ فوجی قبائل زیادہ معاف گو نہیں۔ ایک دوسرے کی محتاجی کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ ان میں فضول خرچی کی عادت نسبتاً کم ہے۔ وہ تیز رفتار ہیں۔ ان کے مکانات ستھرے ہیں۔ اور وہ کفایت شعار ہیں۔ کفایت شعاری وہ سبق ہے جو فوج انہیں سکھا رہی ہے اور یہ احساس موقع اور ضرورت کے لئے نافع اور موثر ہے۔ موقع کا مفہوم یہ ہے کہ فوجی ملازمت کمانے کا ایک عمدہ موقع ہے۔ اور ضرورت کے لئے کفایت شعاری اس لئے مفید ہے کہ فوجی ملازمت زندگی کے معیار کو بلند کر دیتی ہے۔ اور کسان جب ملازمت سے واپس آتا ہے۔ اگر وہ کفایت شعار ہوتا ہے تو گھر میں بھی اپنی زندگی کے معیار کو بہت حد تک قائم رکھ سکتا ہے۔ کسان کو کفایت شعاری کے جذبہ سے سرشار کرنیکی بہترین ترکیب اسے انجمن امداد باہمی سے بہرہ ور کرنا ہے۔ بعض فوجی دستوں میں انجمنہائے کفایت شعاری قائم کر دی گئی ہیں۔ اور ان کے نتائج ایسے تسلی بخش نمودار ہوئے ہیں۔ کہ دوسرے فوجی اگر ان سے بہرہ اندوز ہوں۔ تو یہ چیز حیران کن ہوگی +

سپاہگری اور کشت کاری۔

ایک اور کمزور پہلو یہ ہے کہ جب سپاہی گاؤں کو واپس آتا ہے۔ وہ گرم موسم میں دھوپ کی تیزی میں کاشت کے کٹھن کام میں عام کسان کا مقابلہ نہیں کر سکتا ہم دن اور رات کام کرتے ہیں۔ لیکن وہ کام کرتے ہوئے روتا ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں۔ کہ جو گاؤں میں بلا خوف تردید کہی جاتی ہیں۔ اغلباً ان باتوں میں کسی قدر جذبۂ رشک بھی کارفرما ہے۔ اس لئے کہ وہ دیکھتے ہیں کہ سپاہی کا معیار زندگی ان سے بلند۔ لیکن اسکے کام کی نوعیت ان سے پست ہے۔ ان مصائب و مشکلات کے باوجود جو اس نے خیمہ ہائے جنگ اور میدان ہائے جنگ میں برداشت کی ہوتی ہیں۔ فوجی اپنی سات سالہ جنگی خدمت کے خاتمہ پر اس امر پر راغب نظر آتا ہے۔ کہ کسی دوسرے شخص کو اپنے ماتحت کام کرنے پر لگانے کو یا وہ افسر اور اس نے مزارعین کو اپنی زمین اجارہ پر کاشت کرنے کی اجازت دی ہے۔ یہ معلوم کرنے میں دقت محسوس ہوئی کہ آیا ایک سپاہی ترقی یافتہ

طریقہ ہائے کاشت کو اختیار کرنے میں عام کسان کی حیثیت زیادہ مستعد ہے یا نہیں میرا تجربہ یہ ہے۔ کہ اگرچہ عام کسان اور سپاہی میں کوئی خاص امتیاز نہیں ہے۔ بلکہ اس قسم کے فوجی افسران بھی ہیں۔ جو زیادہ مستعد زیرک اور کفایت شعار ہیں۔ اور انہوں نے اکثر مرتبہ سفر کیا ہے۔ اور وہ اپنی کھیتوں کی ترقی اور تجربات کے زیادہ شائق ہیں۔ میری ڈائری میں تین ایسے فوجیوں کا تذکرہ ہے۔ ان میں سے دو مسلمان اور تیسرا ایک سکھ جاٹ ہے۔ جو اس صوبے کا ایک بہترین کواپریٹر اور تمام ترقی نما سرگرمیوں کی قیادت کر رہا ہے۔ ایسے لوگ دیہاتی زندگی کے جسم میں روح رواں کا حکم رکھتے ہیں۔ اس قسم کے انسانوں میں جاٹ سکھوں کا ایک گروہ وہ بھی تھا۔ جو ترنتارن کے قریب مجھ سے ملاقی ہوا۔ یہ جاٹ دو ایسے کام کر رہے ہیں۔ جن کو زمیندار اکثر اوقات خلافِ شان تصور کرتا ہے۔ یعنی یہ لوگ مرغیاں پال رہے ہیں۔ اور سبزیوں کی کاشت کر رہے ہیں۔ ہم نے فرانس میں نہایت ہی اچھے زمیندار کو سبزیوں کی کاشت میں مصروف دیکھا۔ اس وقت مجھے یہ خیال آیا کہ پنجاب کے لوگ اس کام کو باعثِ شرم گمان کرتے ہیں۔ جنگ نے پنجاب کے اکثر شاندار آدمی ہلاک کر دئے۔ لیکن اس نے ان اشخاص کے سینے کشادہ کر دئے۔ جو بیرونی ممالک میں جا کر نبرد آزما ہوئے۔ یہ اشخاص اپنے وسیع سینے اور اپنے تجربے لیکر وطن میں واپس آئے۔ انہوں نے پنجاب کو بعض ایسی چیزیں دیں۔ کہ جنہوں نے پنجاب کے متذکرہ نقصان کی کسی قدر تلافی کر دی۔ ایک سفید وسیاہ کپتان نے جو مجھے بمقام بیری لا۔ کہا۔ کہ جنگ سے پہلے عورتوں کی کوئی عزت نہیں تھی۔ اور ان کے شوہر ان کو جوتوں سے مارتے تھے۔ لیکن یہ زدوکوب بند ہو گئی ہے۔ اور عورتوں کو روپے میں سے دو آنے عزت ضرور حاصل ہے۔

عورتوں پر اثر

شادی شدہ احاطوں کی موجودگی ایسے مواقع بہم پہنچاتی ہے۔ کہ اگر ان کو پورے طور پر استعمال میں لایا جائے۔ تو فوج کا اثر جتنا مردوں پر ہوتا ہے۔ اتنا ہی عورتوں پر ہو سکتا ہے۔ ان احاطوں کا باضابطہ معائنہ کیا جاتا ہے۔ اور جو ان میں رہتے ہیں۔ ان کو

مجبور کیا جاتا ہے۔ کہ وہ انہیں صاف اور ستھرا رکھیں۔ جو عورتیں پنجاب کے مشرقی نصف سے آتی ہیں۔ ان کے لئے یہ مفید سبق ہے۔ لیکن اس سے زیادہ ہدایات صحت کے متعلق حاصل کی جاسکتی ہیں۔ یہ کام شروع ہوگیا ہے۔ اور سپاہیوں کی بیویاں اوّل مرتبہ یہ محسوس کر رہی ہیں کہ نفیس قابلہ گری کیا مفہوم رکھتی ہے۔ اور انہیں اپنی حفاظت اور اپنے بچوں کی حفاظت کے باب میں کیا کرنا ہے۔ یہ امر کہ اس حقیقت کو ان کے شوہر محسوس کر رہے ہیں۔ دو مثالوں سے بالکل واضح ہے۔ سکھوں کی ایک رجمنٹ میں سپاہیوں نے اپنی بیویوں کو فوجی صفوں میں بھیجدیا۔ تاکہ وہاں ان کے بچوں کو ماہرانہ طبّی امداد حاصل ہو۔ اُنہوں نے اپنی بیویوں کو گاؤں میں نہ بھیجا۔ اس لئے کہ انہیں اپنے بچوں کو ناتربیت یافتہ ائیوں کے سپرد کرنا منظور نہ تھا۔ اور سابق افسران فوج جب دوبارہ رجمنٹ کو دیکھنے کے لئے گئے۔ جو کچھ اُنہوں نے دیکھا اس سے وہ اتنے اثر پذیر ہوئے۔ کہ اُنہوں نے اس کام کے لئے ایک سو روپیہ چندہ دیا۔ ایک اور چھاؤنی میں ہندوستانی توپچیوں نے پہلے تو اپنی بیویوں کے لئے شفاخانہ پسند نہ کیا۔ لیکن دوسرے فوجیوں سے اس کے فوائد کا حال سُنکر اُنہوں نے اس کے مصارف کو باضابطہ طریق پر برداشت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ان تمام فوجیوں نے اپنے بچوں اور اپنی بیویوں کے لئے کسی نہ کسی طرح کی طبّی امداد بہم پہنچانے کا اہتمام کر لیا ہے۔ اور عام طور پر یہ انتظام ایک مختصر سے شفاخانہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جسکو طبّی تربیّت حاصل کردہ عورت کی خدمات سے بہرہ ور ہونے کا موقع ملتا ہے۔ اور چھاؤنی کے تمام افراد اس میں حصہ لیتے ہیں۔ تاہم چونکہ گورنمنٹ اپنے سپاہیوں کی بیویوں کی صحت کی کوئی ذمہ واری قبول نہیں کرتی۔ اس لئے اس قسم کے جو فنڈ اکٹھے کئے جاتے ہیں۔ انہیں خیر و عافیت کے کام پر صرف کرنے کے بجائے طبّی امداد کی بہم رسانی پر لگانا چاہیئے۔ اور ۱۹۳۲ء میں صرف پانچ چھاؤنیوں میں محافظانِ صحّت کارفرما تھے۔ ان میں سے دو جھانسی اور ملتان ان کے فوائد کے متعلق خاص جوش و خروش کا اظہار کرتے ہیں۔ اور ان کا جوش و خروش بہ آسانی سمجھا جاسکتا ہے اسلئے کہ آخر کار خیر و عافیّت کا کام علاج معالجہ سے زیادہ ضروری اور اہم ہے +

روپیہ

لیکن یہ کام دیہات سدھار کے دیگر امور کی مانند روپیہ کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اور روپیہ کہاں سے آتا ہے۔ اس وقت تو روپیہ فوجی فنڈوں اور سپاہیوں کے چندوں اور اس سے کسی قدر کم مقدار میں انجمن صلیب احمر ہند سے حاصل کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ تمام رقوم پیش نظر مقصد کی سرانجام دہی کے لئے کافی نہیں ہیں۔ محکمہ فوج سے زیادہ توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے کہ اس پر ہمیشہ دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ کہ وہ اپنے مصارف کم کرے۔ دوسری جانب یہ کیفیت ہے کہ صوبائی حکومتیں اصلاح دیہات کی متمنی ہیں۔ اور یہ صداقت روز بروز نمایاں ہو رہی ہے۔ کہ حقیقی ترقی گھر سے شروع ہونی چاہئیے۔ تعلیم اس کے لئے بہترین ذریعہ بہم پہنچاتی ہے۔ لیکن تعلیم صرف بچوں کو اپنے آغوش میں لیتی ہے۔ اگر بالغوں کا کوئی انتظام نہ کیا گیا۔ تو یہ خطرہ ہے کہ بچوں اور عمر رسیدہ حضرات کے درمیان اختلاف کی خلیج حائل ہو جائے گی۔ اور ایسے سکول کا وجود تو اس خلیج کو اور زیادہ کشادہ کر دے گا۔ کہ جو گھر سے بے نیاز کر دینے والا ہو۔ گاؤں میں حفظان صحت کا کام کرنے والا ایک اور ذریعہ بہم پہنچاتا ہے۔ لیکن چھاؤنی میں کام کرنیوالی دائی کے مقابلہ میں گاؤں کی عام قابلہ کو بہت کم فوائد حاصل ہیں۔ آخر الذکر کو ان گھروں میں جانا پڑتا ہے۔ جو تمام تحصیل یا ضلع میں پھیلے پڑے ہیں۔ اور اسے ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچنے میں بہت سا وقت اور روپیہ صرف کرنا پڑتا ہے۔ لیکن چھاؤنیوں میں جن چند دنوں کی امداد مطلوب ہوتی ہے۔ وہ آس پاس رہتے ہیں۔ اور فوجی ضبط و نظم اور نئے خیالات کی آمیزش کے باعث وہاں گاؤں کی نسبت فضا زیادہ خوشگوار اور موزوں ہے۔ جو بیج چھاؤنیوں میں بویا جاتا ہے۔ اس کے پھلنے اور پھولنے کی زیادہ امید ہے۔ اور جب عورتیں اپنے گھروں کو واپس جاتی ہیں تو وہ اپنے ہمسایوں میں ان باتوں کو اس شان اور ترکیب سے پھیلاتی ہیں کہ کوئی سلیقہ ور کران کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ میں یقین کرتا ہوں کہ جو روپیہ اس امر پر خرچ کیا جائے گا۔ وہ اس سے دُگنا مفید ہوگا۔ جو رسوم و رواج پر صرف کر دیا جاتا ہے۔ لہذا میں تجویز کرتا ہوں۔ کہ تمام صوبائی حکومتوں کو اس تناسب سے کہ لوگ ان کے صوبوں میں فوج میں کام کرتا ہوں۔ فوج کے

خیر و عافیت کے کام میں چندہ دینا چاہیئے۔ اور خود فوجیوں کو ابھارنا چاہیئے کہ وہ فراخدلی سے اس غرض کے لئے چندہ دیں۔ جو رقم جمع کی جائے۔ اس کے کسی نہ کسی تناسب کے مطابق سرکار کو گو عطیہ جات دینے چاہیئں۔ اور مقاصد میزانیہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس مد پر جس قدر زیادہ خرچ کرسکنا ممکن ہو خرچ کرنا چاہیئے*

سیاسیات

پنجاب

ارسطو کا قول ہے۔ کہ جبتک بذریعہ تعلیم نوجوانوں کو آئینی زندگی بسر کرنے کا خوگر نہیں بنایا جاتا۔ بہترین قوانین بھی فائدہ بخش ثابت نہیں ہوتے۔ جہاں تعلیمیافتہ حضرات کی تعداد ۱۰ فیصدی سے بھی کم ہے۔ وہاں کسان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ آئین و قوانین حکومت کے متعلق زیادہ کچھ سمجھ جائے گا۔ اپنے دوروں میں جو کچھ میں نے دیکھا۔ اس سے تو یہی عیاں ہوتا ہے۔ کہ کسان کی معلومات کا دائرہ اس کے اپنے ضلع کی حد سے زیادہ وسیع نہیں ہے۔ جو لوگ عام طور پر گاؤں میں کسی مقام پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ کر گاؤں کے کسی اکٹھ میں شامل ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک یا ½ فیصدی ہوں گے۔ جنہیں اعلےٰ اختیارات اور اعلےٰ مناصب والوں کی قوتوں کا کچھ علم ہو۔ ان میں سے شائد ہی کسی نے کوئی شے ایسی عجیب و غریب سُنی ہو کہ جسے "وزیر" کہتے ہیں۔ اور بہت کم ایسے ہیں۔ جنہیں یہ علم ہو۔ کہ کن فرائض کی سرانجام دہی وزیر کے لئے لازم ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ وزیر ہمارے ووٹوں سے بنتے ہیں۔ لیکن ہم کو اس کا کچھ علم نہیں۔ کہ وہ کیا کرتے ہیں؟ کونسل اور اسمبلی کے متعلق دل بالکل کورے اور لاعلم ہیں کہ جب میں نے اپنا دوسرا دورہ شروع کیا۔ اس وقت اصلاحات کو عمل پذیر ہوتے ہوئے ۱۰ سال ہوئے تھے۔ ووٹ شخصی یا قبائلی تعلق کی بنا پر دئے جاتے ہیں سیاسی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر نہیں دئے جاتے۔ عورتوں کا اثر اس معاملے میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ اور چونکہ یہ ضروری ہے کہ اُمیدوار کافی سے زیادہ مالدار ہو۔ پنجاب کونسل کی ایک نشست پر ۱۰ ہزار یا ۲۰ ہزار روپیہ بھی صرف ہوجائیگا۔ اس لئے

یہ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ مزارع کے لئے انتخاب میں کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ کہ مزارعین کے حقوق و مفاد کی نگہداشت مزارعین کا خاص فرض ہونا چاہیئے تین سال پیشتر صورت حالات یہی تھی۔ اور میری تازہ ترین تحقیقات ظاہر کرتی ہیں کہ اس میں کوئی بڑی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ زیادہ مفلس علاقوں میں سیاسیات سے کوئی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا جاتا۔ اور یہ دعوے اس علاقہ کے متعلق بھی کیا جا سکتا ہے۔ جو دہلی کے ارد گرد واقع ہے۔ ایک آگاہ و راز کا بیان ہے۔ کہ ۹۰ فیصدی یا اس سے بھی زیادہ اشخاص جو دھوتی پہنتے ہیں۔ اور جو شہر میں شاذ و نادر ہی جاتے ہیں انہیں سیاسیات کا کوئی علم نہیں ہے۔ اور جو قمیض پہنتے ہیں۔ اور گاہے ماہے شہر میں جاتے ہیں۔ انہیں بھی اتنی ہی واقفیت ہے کہ جتنی کہ ان کی ضروریات کے لئے کافی ہے۔ مرکزی پنجاب میں جہاں ہائی سکول کثرت سے ہیں اور آمد و رفت کا سلسلہ عمدہ ہے اور غیر ملکوں سے اپنے وطن میں واپس شدگان کی تعداد کثیر ہے۔ وہاں لوگوں نے سیاسی باتوں کو سننا شروع کر دیا ہے۔ بعض اوقات یہ دلچسپی ان کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے امرتسر میں دیکھا جہاں ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی کی تحریک زوروں پر تھی۔ سکھوں کے پانچ یا چھ دیہات کو مالیہ اراضی ادا نہ کرنے کے باعث تکلیف میں مبتلا ہونا پڑا۔ بہت کم اخبارات گاؤں میں پہنچتے ہیں۔ لیکن یہ امر موجب تاسف نہیں۔ لیکن ان کے مضامین اکثر اوقات ان اشخاص کو جو پڑھ نہیں سکتے۔ پڑھ کر سنائے جاتے ہیں۔ اور جوں جوں دلچسپی روبہ فروغ ہوئی۔ یہ عمل پھیلتا جائے گا۔ اسی اثنا میں موٹر لاریاں جو بعض اوقات اخبارات سے زیادہ مداخلت حاصل کر رہے ہیں۔ وہ ذہنی بلکہ طبعی رکاوٹوں کو دور کر رہے ہیں۔

مسٹر گاندھی

اگرچہ دہقان بحیثیت قوم سیاسیات سے بے نیاز ہے۔ لیکن اگر کوئی سوال ایسا پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کا تعلق اس سے ہوتا ہے تو ہو سکتا ہے کہ اس کی دلچسپی چمک اٹھے یا برافروختہ ہو جائے۔ مالیانہ اور آبیانہ عالمگیر دلچسپی پیدا کر دیتے ہیں۔

اور اجناس کی قیمتوں میں کمی متواتر موضوع بحث میں ہوئی ہے۔ اور اکثر اوقات اس سے احساسات میں تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ جب میں نے دریائے سندھ کے کناروں پر زمینداروں کے ایک مجمع سے پوچھا کہ کیا اُنہوں نے مسٹر گاندھی کا نام سُنا ہے! یا تو اُنہوں نے گولیوں کی بوچھاڑ کی طرح جواب دیا۔ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ ہمیں اس شخص کا نام معلوم نہ ہو جس نے ہمیں تباہ کر دیا ہے۔ یہ وہی شخص ہے جو ہمیں غلّہ فروخت کرنے سے روکتا ہے۔ اگر ہم ساہوکار کا روپیہ ادا نہیں کر سکتے تو اس کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے۔ ہمیں گاندھی جی سے کسی بھلائی کی تمنا نہیں۔ مغربی اور شمالی پنجاب کے مسلمان کا یہ تصور اپنی مثال آپ ہے۔ ان کے علاوہ اکثر اشخاص اور بھی اس خیال کے ہیں۔ کہ اقتصادی پس ماندگی کا باعث سول نافرمانی کی تحریک ہے۔ اور اس امر کو ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ ۱۹۳۰ء میں جب یہ رنج دہ تحریک بلندی پر تھی۔ تو اس تصور کی کسی قدر مقبولیت نمایاں تھی۔ اکثر مسلمان دیہات مسٹر گاندھی کی شخصیت کا ادب کرتے ہیں۔ مشرقی پنجاب میں اس کی ذات پر فخر کیا جاتا ہے۔ ہندو اور سکھ اس کو محترم تصور کرتے ہیں۔ اور ایک باخبر نامہ نگار کے الفاظ میں مسٹر گاندھی کا نام دُور دراز گاؤں اور چھوٹے سے چھوٹے خاندان میں لیا جاتا ہے۔ حصار کے ایک ساہوکار نے عام خیال کی یہ کہہ کر ترجمانی کی کہ "ہمارا دماغ اسکی سمجھ کو نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن مسٹر گاندھی کا احترام سیاسی لیڈر کی حیثیت سے نہیں بلکہ مہاتما یا دیوتا ہونے کے لحاظ سے کیا جاتا ہے"۔

ہندوستان

ان رپورٹوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جو ۱۹۳۲ء میں راقم الحروف کے مطالعہ میں آئیں۔ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کے دیگر حصص کے حالات پنجاب سے مختلف نہیں ہیں۔ مدراس میں ۱۰ فی صدی سے کم کسان ایسے ہیں۔ جو سول نافرمانی یا اُن تدابیر سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ جو اس تحریک کو روکنے کے لئے اختیار کی جاتی ہیں بنگال اور مرکزی صوبہ جات کے کسانوں کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ انہیں سیاسیات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اور وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ انہیں امن و امان کی زندگی

بسر کرنے کا موقع دیا جائے۔ اسی وقت ہی سر ڈنیل ہملٹن صاحب (جنہوں نے مزارعین بنگال کے ساتھ خصوصی عملی ہمدردی کا اظہار اس صورت میں کیا ہے کہ ان کے لئے کئی ہزار ایکڑ اراضی کی ایک جاگیر امداد باہمی کے طریق پر منظم کی ہے) تحریر فرماتے ہیں کہ میں موسم سرما کے ایام بنگال کے ان کھیتوں میں بسر کرتا ہے۔ جن میں دھان کی کاشت کی جاتی ہے۔ لیکن جن ۹ ہزار اشخاص کو اچھی طرح سے جاننے کا موقع مجھے ملتا ہے۔ ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے کہ دھان کے ایک تنکے کے برابر بھی ووٹ کی قدر کرتا ہو۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ اخبارات اور کونسل میں جن مسائل پر جوش و خروش کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ان کا کسان کی حیات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یا اگر بلا واسطہ طور پر ان کا تعلق ہے بھی تو ان کا ارتباط ایک ان پڑھ شخص کے لئے اتنا واضح نہیں ہے۔ ایک اور شخص زیادہ عمیق بات بیان کرتا ہے۔ ۱۹۰۶ء میں اپنے تجربات سپرد قلم کرتے ہوئے سودس ڈکنسن نے بیان کیا کہ جمہوریت کے مطالعہ نے اسے یقین دلا دیا ہے کہ جمہوریت کا وجود امیر کی نسبت مفلس کے لئے ایک زحمت کا باعث ہے۔ اس لئے کہ امیر میں اتنا دماغ ہے اور اسے اتنی فرصت میسر ہے کہ وہ سیاسیات سے دلبستگی کا اظہار کر سکتا ہے۔ لیکن غریب کے پاس تجربہ اور عقل و خرد کی اتنی پونجی نہیں ہے۔ اور نہ اس کو اتنی فرصت نصیب ہے۔ کہ ان سیاسی جھمیلوں میں الجھ سکے۔ اس کی تمام تر توجہ اپنی ہستی کے بقا کی جد و جہد یا دہقان کے الفاظ میں پیٹ بھرنے کے دھندے میں مصروف رہتی ہے۔ یہ فیصلہ کرنا اسباب سیاسیات کا فریضہ ہے کہ آیا جمہوریت کے باب میں متذکرہ تصریحات درست ہیں یا غلط۔ لیکن معاملہ اس قدر صاف ضرور ہے کہ اس پر ان اشخاص کو ضرور غور کرنا چاہیئے۔ جو ہندوستان کے آئین و قوانین کو نئی شکل میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ اور جو مزارعین کے مفاد سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ میں ان اشخاص میں سے ہوں۔ جنہیں فلاح مزارعین سے دلچسپی ہے۔ میں یہ تجویز پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ وہ اکثر حضرات جو اپنے مفاد و حقوق کی حفاظت و حمایت کے لئے کوشاں ہیں۔ ان میں کسی کا دعوے کسان کے دعوے سے زیادہ مضبوط اور پائیدار نہیں ہے۔

تعمیر جدید۔ راہیں اور ذرائع

کسان کے دعاوی

کسان کے مالی مفاد خاص تحفظ چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں تین شرائط پیش کی جاسکتی ہیں۔

(۱) حکومت کو چاہیئے کہ نظم و نسق سلطنت میں جہاں تک ہو سکتا ہے کفایت شعاری اختیار کرے۔

(۲) جو روپیہ بذریعہ ٹیکس وصول کیا جائے۔ اس میں سے کسان کو اتنا پورا حصّہ دیا جائے کہ جس کا وہ اپنی تعداد اور ضروریات کے لحاظ سے حقدار ہے۔

(۳) کہ جب تک اجناس کی قیمتوں میں اضافہ نہ ہو۔ اسے بلا واسطہ یا بل واسطہ طریق پر حکومت کے اغراض کے لئے اس سے زیادہ ادا کرنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ کہ جتنا وہ گذشتہ تین سال میں سے کسی ایک سال میں ادا کیا ہے۔

ان میں سے کوئی شخص بھی پہلی شرط پاس معترض ہونے کو تیار نہیں۔ تاہم کون ایسا ہے کہ جسے دیہاتی زندگی کا کچھ علم ہے۔ اور وہ بعض ایسی معقول تجاویز نہیں کر سکتا کہ جو عام مفاد کو نقصان پہنچائے بغیر کسانوں کے حق میں مفید ہو سکتی ہیں؟ ایک یا دو مثالیں پیش کی جاچکی ہیں۔ اور بھی پیش کی جا سکتی ہیں لیکن جن حالات کے ماتحت یہ کتاب لکھی جا رہی ہے۔ وہ انہیں بیان کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ تاہم ایک مسلمہ عام حقیقت پر زور دیا جا سکتا ہے۔ کہ مغربی طرز کا جمہوری نظام حکومت ایک خرچیلا نظام ہے۔ اگر اس نظام کو ہندوستان جیسے مفلس ملک میں رائج کرنا ہے تو اس سے تعلق رکھنے والے تمام اشخاص کا اہم فرض ہے کہ جہاں کہیں خرچ میں کمی کی جاسکتی ہو۔ کمی کر دی جائے۔ اور جو اشخاص اتنے خوش قسمت ہوں کہ انہیں کسی منصبِ مفاد عامہ پر تقرر حاصل ہو۔ خواہ ان کی اسامی بلند ہو یا پست انہیں اپنی خدمات کے لئے مروّجہ بازاری نرخ کے مطابق اُجرتیں قبول کر لینی چاہئیں۔ اور اس کے معاوضے میں جن کی انہیں خدمت کرنا ہے ان کی خدمت کا انہیں پورا حق ادا کرنے چاہئیں۔ مشترکہ مفاد کی خدمت کرنے کا

نصب العین ہندوستانی تخیل بھی ہے۔ اور برطانی بھی ہے۔ لیکن اکثر خادمانِ عامہ انکو یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ وہ "پبلک سرونٹس" ہیں۔ اگر اکثر حضرات اسے فراموش نہ کریں۔ اور اپنے فرائض اس تصور کے مطابق سرانجام دیں۔ تو اس سے سب سے زیادہ فائدہ دہقانوں کو میسر آسکتا ہے ؁

کسان

کسان جن طریق سے فوائد حاصل کر سکتا ہے۔ ان میں سے ایک کا ہیں نے تذکرہ کر دیا ہے۔ دوسری تدبیر مندرجہ ذیل گفت و شنید سے واضح ہو سکتی ہے۔ جو زیادہ مدت کی بات نہیں۔ میری ایک نوجوان سب اسسٹنٹ سرجن سے ملاقات ہوئی۔ جو پہاڑیوں میں ایک دیہاتی شفاخانہ کا انچارج ہے۔ میں اسے اس لئے دہراتا ہوں۔ کہ اس سے اس مشترکہ ذہنی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ جو کسان کو ان ٹیکوں سے پورا فائدہ کرنے سے روکتا ہے۔ جسے وہ اس قدر مشکل کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ بلاشک و شبہ بے شمار افسران اسی ذہنیت کا حکم رکھتے ہیں۔

میں نے استفسار کیا" کیا آپ ان پہاڑیوں میں زیادہ دورہ کرتے ہیں؟"

اس نے جواب دیا" جب تک کوئی مجھے ان پہاڑیوں میں نہ بھیجے۔ میں کبھی بھی دورہ پر نہیں جاتا"

میں نے پوچھا" کیا آپ کو اکثر مرتبہ دورہ کرنے کا حکم دیا جاتا ہے؟"

اس نے جواب دیا" مجھے کبھی کبھار ہی دورہ کا حکم دیا جاتا ہے۔ لوگ بے حد مفلس ہیں۔ اور صرف ایک آدمی اتنا امیر ہوتا ہے۔ کہ جو فیس ادا کر سکتا ہے"

میں نے پوچھا" لیکن کیا آپ صرف اُس وقت جاتے ہیں۔ جب آپ کو کچھ دیا جاتا ہے؟"

اس نے جواب دیا" ہاں قاعدہ یہی ہے"

میں نے کہا" بلاشک و شبہ ان پہاڑیوں میں کئی ایک مریض ایسے بھی ہوں گے۔ جو بوجہ علالت شدید شفاخانہ میں نہیں پہنچ سکتے ہوں گے؟"

وہ بولا" آپ نے صحیح فرمایا ہے۔ لیکن اس صورت میں کوئی نہ کوئی شخص دوائی لینے کو

آتا ہے۔ اور وہ اپنے ساتھ ان اشخاص کی فہرست لاتا ہے۔ جن کو دوا درکار ہوتی ہے۔ اور میں دوائیاں بھیجدیتا ہوں۔"

میں نے پوچھا:" کیا آپ وہاں کبھی بھی نہیں جاتے اور دیہات میں پہنچ کر ان کا حال نہیں معلوم کرتے؟ اس کا جواب یہ تھا۔ کہ اسکے کوئی حکم نہیں ہے۔

اسپر میں نے سوال کیا۔ گویا آپ صرف انہی کو دیکھتے ہیں۔ جو آپ کے پاس آتے ہیں؟"

اُس نے کہا:" ہاں قاعدہ یہی ہے۔ دورہ کبھی بھی کوئی نہیں کرتا۔"

میرا سوال یہ تھا:" کہ اگر آپ دیہات میں جائیں۔ ان کا دورہ کریں۔ تو کیا انکو زیادہ فائدہ نہیں پہنچا سکتے؟ جب ہم سفر کرتے ہیں تو ان میں سے اکثر اپنی بیمار رفیقۂ حیات کو لاتے ہیں۔"

وہ بولا:" ہاں بیمار تو اکثر ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی قاعدہ نہیں ہے کہ کسی شخص کو ضرور دیکھنا چاہیئے۔"

مجھے پوچھنا پڑا:" ان حالات میں جب آپ اپنے قواعد اور طریقہ ہائے کار پر نظر دوڑاتے ہوں گے۔ تو آپ کو معلوم ہوتا ہوگا۔ کہ اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ آپ بالکل بیکار ہوتے ہیں اور آپ کو کوئی کام نہیں ہوتا؟"

اس نے جواب دیا:" ہاں ایسا اکثر ہوتا ہے۔ پچھلے سال میں نے رخصت حاصل کر لی لیکن اس سال مجھے ٹھہرنا پڑیگا۔"

میں نے کہا:" کیوں تم ہر روز یا ہر دوسرے دن کسی گاؤں کی سیر کر کے اپنے لئے دلچسپی کا سامان نہیں پیدا کرتے۔ اس سے تمہاری ترقی ہو جائے گی؟ کیا تم قدرے فربہ نہیں ہو رہے؟ گاؤں کی سیر تمہاری صحت کو چار چاند لگا دے گی۔ تمہارا وقت نہایت عمدگی سے جلد بسر ہوگا۔ اور تمہارا دل غائت درجے کا خوش و خرم ہوگا۔"

اس پر وہ یوں گویا ہُوا:" یہ اچھی ہدایت ہے۔ اور میں اس پر عمل پیرا ہوں گا۔"

میں نے کہا:" اگر آپ ایسے کریں گے۔ لوگ آپ کو دعائیں دیں گے۔ اور آپ جب ان سے رخصت ہوں گے۔ تو آپ کے فراق میں آنسو بہائیں گے۔

اس کہانی پر صرف ایک تنقید درکار ہے۔ اگرچہ اس سب اسسٹنٹ سرجن نے

دورہ تو نہ کیا۔ لیکن اسے ہر دلعزیزی حاصل ہو گئی۔ اور لوگ اسے اچھا ڈاکٹر کہنے لگ گئے۔ گاؤں کو ایک معمولی سرکاری ملازم کی اتنی کم توقع ہوتی ہے۔

مالیہ میں کسان کا حصہ

دوسری شرط بھی بحیثیت اصول فوراً قبول کر لی جائے گی۔ لیکن میں اس کی نسبت تغافل برتنے کا خدشہ زیادہ ہے۔ ایک شخص خیال کر سکتا ہے۔ کہ گذشتہ زمانہ میں صنعت فولاد کے لئے بے شمار عطیہ جات دئے گئے۔ ایک وقت کو اتنا روپیہ دیا گیا۔ کہ اتنا روپیہ تمام صوبائی حکومتوں اور مرکزی حکومت نے زراعتی ترقی پر صرف نہیں کیا تھا۔ ثانوی تعلیم اور کالج کی تعلیم پر بے شمار روپیہ صرف کر دیا جاتا ہے۔ دیہاتیوں کی نسبت شہری اس سے زیادہ فائدہ گیر ہوتے ہیں۔ اگر ملکی آبادی میں صرف کسانوں کی تعداد کو ہی مدنظر رکھا جائے۔ تو اگر ملک کی تمام آمدن کا ¾ حصہ ان پر صرف کر دیا جائے۔ تو اس خرچ کو معقول تصور کیا جائے گا۔ لیکن جو مشکلات انہیں درپیش ہیں۔ انہوں نے تو ان کے دلوں کو مضبوط تر بنا دیا ہے۔ ہندوستان کو چاہئیے کہ سلطنت ترکی کے اس جدید اصول کو قبول کرے **"ملک کا اصل مالک دہقان ہے"**

ٹیکس کی حد

اگر ایسا کیا جائے تو شہری شرط کی پامالی کا کوئی خدشہ نہیں رہتا یعنی جتنا روپیہ کسان نے حکومت کے اغراضِ عامہ کے لئے گذشتہ تین سال میں سے کسی ایک سال میں آیا ہے۔ اس میں سے ایک آنہ زیادہ بھی اس سے وصول نہیں کرنا چاہئیے۔ اگر کسی کو اس دعوے میں شک ہو۔ تو اسے ان اعداد و شمار کو پیش نظر لانا چاہئیے۔ جو اسی کتاب میں دئے گئے ہیں۔ اگر کسان اقتصادی تباہی درماندگی سے بالکل تباہ نہیں ہو گیا۔ بلکہ ابھی تک زندگی قائم رکھنے کے لئے جدوجہد کر رہا ہے۔ تو اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنے سرمایۂ محفوظ سے مدد حاصل کی ہے۔ اس نے اپنی زندگی کے معیار کو بہت کم کر دیا ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے۔ کہ حکومت نے مالیانہ اور آبیانہ کی بہت سی رقوم معاف کر دی ہیں۔ اور ساہوکار نے اسے قرضہ کی ادائیگی کے لئے ناواجب طور پر

تنگ نہیں کیا۔ لیکن اب اس کا سرمایۂ محفوظ ختم ہو چکا ہے۔ اس کا معیار زندگی اتنا کم ہو چکا ہے۔ کہ اس میں زیادہ کمی اسکی قوتِ کار پر بہت بڑا اثر پیدا کر سکتی ہے۔ ان ٹیکسوں پر غور کرتے ہوئے۔ یہ حقیقت بھی ضرور پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ زراعت پیشہ لوگ جو بار ان پر رکھدیا جائے۔ اسے انہیں مجبوراً اٹھانا پڑتا ہے۔ وہ اسے دوسرے کے کندھوں تک پہنچا دینے کے عادی نہیں ہیں۔

لوگوں کی ضروریات

تاہم کسانوں کی ضروریات ہیں۔ لیکن ان کی زبانیں شور کرنے والی نہیں ہیں پنجاب میں طبقہ ذکور میں سے (پانچ سال اور ان سے زیادہ عمر کے اشخاص) صرف ۱۰ فیصدی اتنے ہیں۔ جو نوشت و خواند پر قادر ہیں۔ اور صنفِ اناث میں صرف ۲ فی صدی پڑھی لکھی ہیں۔ بچوں کا حال یہ ہے کہ سکولوں میں ان کی تعداد میں اتنا اضافہ نہیں ہو رہا جتنا کہ آبادی میں ہو رہا ہے۔ بلکہ اوّل الذکر میں کمی ہو رہی ہے۔ یہی کیفیت زراعتی انجمنہائے امداد باہمی کی ہے۔ زراعت کے میدان میں جب تک کہ ملکیتوں کا اشتمال نہیں کیا جائے گا۔ کسی ترقی کی اُمید نہیں۔ اور اگرچہ ہم نے امداد باہمی کے معجزانہ اثرات کو دیکھ لیا ہے۔ لیکن ۱۹۲۱ء سے شروع کرکے اس وقت تک صرف ۵ ایکڑ اراضی کا اشتمال ہوا ہے۔ اور ابھی تک لاکھوں ایکڑ اراضی کا اشتمال باقی ہے۔ صحت کے کے متعلق ایک شخص کو اس حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ۲ لاکھ مائیں ایسی ہیں جو ہر سال بچہ جن کر فوت ہوتی ہیں۔ اور پنجاب میں ایک ہزار میں سے ۱۷۹ بچے ایسے ہیں۔ جو ایک سال کے بھی نہیں ہوتے کہ موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔

ملک کی ایک سب سے زیادہ توجہ طلب مسئلہ بیش از پیش تعداد میں زنانہ ڈاکٹروں کی ضرورت ہے۔ لیکن پنجاب میں طبّی طالبعلموں کے لئے مکانیت کی اس قدر تنگی ہے۔ کہ ہر سال زیادہ سے زیادہ اُمیدوار خواتین کو داخلہ کے لئے تکالیف برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ گورنمنٹ پنجاب تسلیم کرتی ہے کہ عورتوں کیلئے ایک علیحدہ میڈیکل سکول کی اشد ضرورت ہے لیکن وہ فنڈ کی بہم رسانی کے متعلق کچھ نہیں بیان کرتی۔ اور عورتوں کی ایک اور مساوی حیثیت کی اہم ضرورت کے باب میں حکومت رقمطراز ہے کہ ہر ایک ضلع کے صدر مقام میں عورتوں کیلئے ایک ہسپتال کی بہم رسانی

اور تحصیل کے صدر مقامات میں جو ہسپتال ہیں۔ ان میں مستورات کے لئے علیحدہ انتظام نہایت ضروری ہے۔ لیکن یہ تمام چیزیں روپیہ کے نقدان کے باعث رُکی پڑی ہیں۔ اور اُمید نہیں کہ کافی طویل عرصہ سے پیشتر یہ سکیم عمل پذیر ہو جائے +

روس کا چیلنج

جب سے اجناس کی قیمتوں میں کمی واقع ہوئی ہے۔ یہ مالی مشکلات ہی وہ اسباب ہیں جنہوں نے تمام تعمیری کارروائیوں کو روک رکھا ہے۔ اور سر رشتہ سرکار مالیات کے قواعد وضوابط کے الفاظ میں تدابیر نشوونما کی راہ میں سب سے بڑی روک مالی دقت ہے۔ تاہم اگر ہندوستان کو قبل از جنگ کے معیار تک واپس پہنچاتا ہے۔ تو اس عظیم الشان نشوونما کی خاص ضرورت ہے۔ جو اطالیہ۔ ترکی اور روس میں ہو رہی ہے۔ روس کی مثال قابل غور ہے۔ اس لئے کہ اکثر حالات میں روس اور ہندوستان کا حال مماثل ہے۔ اور خواہ کسی کے سیاسی خیالات کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ ہر ایک شخص کو اعتراف کرنا پڑیگا۔ کہ وہاں میں ایک ارب سے زائد دہقان کی فلاح و اصلاح کیلئے اتنی کوشش کی جارہی ہے کہ تاریخ اسکی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ روس کا تجربہ کامیاب ہوگا یا ناکام۔ یہ امر ابھی تک واضح نہیں ہوا لیکن اس اثنا میں روس نے تمام اُن حکومتوں کو چیلنج دیدیا ہے کہ جو جہالت افلاس اور بہت بڑی حد تک ضیاع ذرائع آمد کے مسائل کا حل کر رہی ہیں۔ میں یہ کہ روس کے طریق کار اور رفتار کار کی تائید نہیں کر رہا۔ کوئی سچا کوآپریٹر خیر و تشدد کے اس زبردست طریق کو بنظر استحسان نہیں دیکھ سکتا کہ جسے روس نے ان اشخاص کے متعلق استعمال کیا۔ جو اپنے دل پسند طریق کار پر عمل پیرا ہو کر اصلاح احوال میں کوشاں تھے۔ ایسے ہی جو شخص بھی دہقان کی نفسیات سے آگاہ ہے یا فطرت انسانی کو سمجھتا ہے۔ بہت جلدی سے یہ تسلیم کرسکتا ہے کہ انسانوں کی جماعتیں انبوہ در انبوہ حیثیت میں کسی پانچسالہ سکیم پر عمل کر کے اصلاح پذیر ہو سکتی ہیں۔ ہندوستان کو جس شے کی ضرورت ہے۔ اسکے لئے اوّلاً ایسی بست و پنجسالہ سکیم مطلوب ہے۔ کہ جسکی تائید و حمایت پر وہ اشخاص ہوں جنہوں نے گاؤں کا مطالعہ کیا ہے۔ اور وہ نتائج کا بہ صبر و سکون انتظار کرسکتے ہیں۔ ثانیاً یہ ہے کہ اس سکیم کیلئے روپیہ کے کافی اور مسلسل خرچ کی ضرورت ہے۔ ہمارا واسطہ آخر الذکر سے ہے۔ کساد بازاری کا عرصہ طوالت پذیر ہے۔ کسانوں کی ضروریات فوری توجہ کی محتاج ہیں۔ ان دونوں کا امتزاج ایک ایسے وقت میں جبکہ سیاسی اصلاحات حد سے زیادہ مصارف کی طالب ہیں اس سکیم کو

مالی مدد پہنچانے میں خاص دقت پیدا کر رہا ہے۔ جو سکیم کہ عامۃ الناس کی ضروریات کی کفیل ہے۔ تاہم جو چھوٹے یا بڑے ذریعے اختیار کئے جا سکتے ہیں۔ ان سے استفادہ ضروری ہے۔ میں ایسا کرنے میں اپنے آپ کو زیادہ تر پنجاب تک محدود رکھوں گا۔ اسلئے کہ میرے نصب العین اور میری محدود معلومات کا مرکز پنجاب ہی ہے۔ جو دوسرے صوبوں کے حالات سے آگاہ ہیں۔ یہ دیکھنا ان کا کام ہے کہ جو بیان کیا جا رہا ہے۔ اسکا ان کے اپنے اپنے صوبوں پر کہانتک اطلاق ہو سکتا ہے ؛

مدد ذاتی

میری پہلی تجویز وہ ہے۔ جو میری سیاحتوں نے مجھے سجھائی۔ ہمیں بار بار اسباب رفاہ عامہ دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ جن پر بعض اوقات ان پر ۱۰ ہزار روپیہ سے زیادہ صرف ہو جاتا ہے۔ اور جنہیں دیہاتیوں نے اپنی مرضی اور اپنے خرچ سے تیار کیا ہوا ہے۔ ان میں کنوئیں۔ تالاب۔ مسجدیں۔ مندریں۔ کلیسیں اور گاؤں کی گلیاں شامل ہیں۔ جنہیں پختہ بنایا گیا ہے۔ کسان ان چیزوں کو بخوشی کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ ان کو ان کی ضرورت ہے۔ اس سے یہ سبق حاصل کیا جا سکتا ہے۔ کہ جب دہقان کسی چیز کو اپنے لئے ضروری خیال کرتا ہے۔ تو وہ اس کے لئے روپیہ خرچ کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اگر گذشتہ زمانے میں کسان نے سرکار کی ان سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیا۔ جن کا تعلق مفاد عامہ سے ہے۔ تو اس کا سبب یہ ہے۔ کہ سرکار نے از خود ان امور پر خرچ کرنا پسند کیا ہے۔ یا یہ کہ ان کا قیام دیہاتیوں کی ضروریات کے مطابق نہ تھا۔ معاملات کی صورت جداگانہ ہو سکتی ہے۔ اگر ایک طرف حکومت بعض چیزوں کے لئے عطیہ دینے سے انکار کر دے مثلاً وہ مدارس کی تعمیر کیلئے کچھ نہ دے۔ یا ان کی تعمیر پر جو کچھ صرف آتا ہے۔ اس لئے اب حصہ سے زیادہ نہ دے۔ اور دوسری طرف یہ کیا جائے۔ کہ دیہاتیوں کو صرف ان سکیموں کے لئے کچھ دینے کو کہا جائے۔ جنکو وہ خود چاہتے ہوں۔ ان میں سے ایک امر ملکیتوں کا اشتمال ہے۔ زراعتی ترقی کے لئے یہ چیز نہایت درجے کی کارآمد ہے۔ اور صرف ایک سال کی بات ہے۔ کہ اسکا تمام خرچ حکومت برداشت کرتی تھی۔ جب قیمتیں گر گئیں حکومت نے مجبوراً محکمہ اشتمال اراضیات کو کم کر دیا۔ اور اس وقت بعض دیہاتیوں نے جو اشتمال کے

طالب تھے۔ یہ محسوس کیا۔ کہ اگر انہوں نے استعمال کے اخراجات کا ایک حصہ خود نہ ادا کیا۔ تو انہیں اپنی مطلوبہ شے کے لئے غیر معینہ وقت تک انتظار کرنا پڑے گا نتیجہ یہ ہوا کہ گذشتہ سال انہوں نے ۶۰ ہزار از خود خرچ کیا۔ امداد باہمی کی تحریک متذکرہ دعوے کی ایک اور مفید تر مثال ہے۔ اس تحریک کے کل سالانہ خرچ میں سے ½ حصہ ½ ۱۵ لاکھ روپیہ کوا پریٹروں نے برداشت کیا۔ ایک اور مثال پیش کر دیتا ہوں۔ ۱۹۳۲ء میں انجمن صلیب احمر پنجاب کے جونیئر (چھوٹے) ممبروں نے جیبی خرچوں کی قربانی سے ایک لاکھ روپیہ فراہم کیا۔ اس روپیہ سے غریب طبقوں میں دوائیاں تقسیم کی گئیں۔ اور عوام کو حفظان صحت کے اصول سے آگاہ کرنے کے لئے پرچار کیا گیا۔

گندم۔ روئی وغیرہ پر محصول

میری دوسری تجویز ٹیکس ہے۔ اس تجویز کا تعلق حکومت کی اغراض عامہ سے نہیں ہے۔ بلکہ دیہات سدھار کے خاص مقصد سے ہے۔ مجوزہ ٹیکس یہ ہے کہ تمام گندم روئی۔ سرسوں اور چنے جو پنجاب کی منڈیوں سے بذریعہ ریل بھیجے جاتے ہیں۔ ان پر ایک مختصر سا محصول لگایا جائے۔ ایک نظیر اس محصول میں پائی جاتی ہے۔ جو روئی کی پیداوار میں ترقی کے لئے روئی پر عائد کیا جاتا ہے۔ اگر گندم۔ سرسوں اور چنے کی ایک بوری اور ایک من صاف شدہ روئی پر ایک آنہ فی من کے حساب سے محصول لگایا جائے۔ تو اس سے ہر سال غالباً ۱۰ لاکھ روپیہ سے زائد روپیہ اکٹھا ہو سکتا ہے۔ اس رقم کو اس کی فراہمی کا خرچ نکال کر دیہات سدھار کے مصارف پر خرچ کیا جائے۔ اور اس کے خرچ کا انتظام اس بورڈ کے سپرد کیا جائے کہ جس کی نیابت مزارعین اور زمینداروں کو حاصل ہو۔ مجوزہ محصول اتنا مختصر ہے کہ اسے غالباً دیہاتی اشخاص وصول کر سکتے ہیں۔ اور اگر وصول کرکے وہ کاشتکاروں کے حوالے کر دیں۔ تو وہ اس محصول ادا کرنے کو قطعاً محسوس بھی کریں گے۔

سونے پر ٹیکس

میری تیسری تجویز بھی ٹیکس ہے۔ لیکن اس کے اثرات کا تعلق سارے ہندوستان سے ہے

یکم اکتوبر ۱۹۳۱ء سے لیکر ۳۰ جون ۱۹۳۴ء تک ۲۰۰ کروڑ روپیہ کا سونا ہندوستان سے باہر بھیجا گیا۔ اگر اس ایک فی صدی محصول لگایا جاتا۔ تو ۲ کروڑ روپیہ وصول ہوتا۔ اور بہترین انتظام یہ ہوتا کہ اس تمام روپیہ کو دیہات سدھار کیلئے وقف کر دیا جاتا۔ اس لئے کہ اگر اس باب میں پنجاب کے حالات کی صحیح راہنمائی کر سکتے ہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ زیادہ سونا دیہات سے باہر گیا۔

کیا اس ندی کی روانی رُک گئی ہے ؟

نہیں۔ یہ نہر ابھی تک جاری ہے۔ گذشتہ ۱۲ مہینوں میں ۵۸ کروڑ روپیہ باہر گیا اور یہ سلسلہ ممکن ہے کہ ایک یا دو سال کے لئے جاری رہے گا۔ اگر حالت یہی ہے۔ تو ایک یا دو فی صدی ٹیکس سے ایک کروڑ یا دو کروڑ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر اس ٹیکس کو اس نسبت سے تقسیم کیا جائے کہ جتنا جس صوبے سے آیا ہو۔ اُتنا اسے دیدیا جائے۔ تو پنجاب کو کئی لاکھ روپیہ حاصل ہوگا۔ دہقان پر اس ٹیکس کا بار بہت خفیف ہوگا اس لئے کہ بار دیگر پنجاب کو معیار قرار دیتے ہوئے اس کے پاس بہت تھوڑا سونا ہے۔ جسے وہ فروخت کرسکتا ہے۔ اور جہاں تک اس ٹیکس کا تعلق شہری سے ہے۔ تو یہ ٹیکس ان بڑی رقوم کے مقابلے میں جو گذشتہ زمانہ میں ان پر صرف ہوتی رہی ہیں۔ بہت ہلکا معلوم ہوگا۔

تعمیر دیہات بذریعہ قرضہ

میری آخری تجویز زیادہ جدّت کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ اور مختصر ترین الفاظ ہی میں واضح کی جا سکتی ہے۔ میں نے ۱۹۳۱ء میں یہ رائے ظاہر کی کہ اگر حکومت انجمن تحقیقات بنکہائے پنجاب کی اس سفارش کو عملی جامہ نہیں پہنچا سکتی۔ کہ امداد باہمی کی تحریک کو بیش از بیش وسیع کیا جائے۔ تو اسے قرضہ لینا چاہیئے۔ یہ تجویز ان حضرات کو جو قدیم دستور مالیات کے شناسا اور حامی ہیں۔ پسند نہیں آئے گی۔ لیکن وہ ارباب اقتصادیات جو مسٹر جے۔ ایم کینس (J. M. Keynes) کے مقلد ہیں۔ ان کی روش کے عین مطابق ہے۔ قدیم خیال کے علمبرداروں کے نزدیک اس قرضہ کو علیحدہ قرار دیتے ہوئے جو ضروریات جنگ کے لئے اُٹھایا جائے۔ سلطنت کا قرضہ حاصل کرنا صرف

ان مفید اغراض کے لئے جائز ہوسکتا ہے۔ کہ جن سے بلاواسطہ طریق پر اتنی آمدن ہوجائے کہ جس سے
متذکرہ قرضہ کا سود بھی ادا ہو جائے۔ قرضہ بھی بیباق ہو جائے اور ایک مقررہ تاریخ تک کم و بیش بچت یا
منافع بھی ہو جائے۔ لیکن جدید خیال کے حامیوں کا نقطۂ نگاہ ہے کہ جو قرضہ ان مفید سکیموں کیلئے لیا جائے
کہ جن سے ملک کی عام دولت میں اضافہ کی اُمید ہو۔ وہ اضافہ قرضہ کی رقم جمع سود سے زائد ہو
یہ نقطۂ نگاہ اس عام وصول پر مبنی ہے کہ جبتک حکومت کافی خرچ نہ کرے کسی ملک کے ذرائع آمدن
میں اضافہ نہیں ہوسکتا۔ اور یہ کہ جو مصارف حکومت عام فلاح و بہبود اور ترقی کیلئے کرے۔ اس کی
کفالت حکومت کے سر نہیں بلکہ رعایا کی آمدن پر ہونی چاہیئے۔ سود اور قرضہ کی ادائیگی کیلئے اگر
مقررہ تاریخ پر مقررہ اقساط کے ذریعے ادائیگی کو لازمی خیال کیا جائے تو یہ چیز کافی ہے کہ زیادہ تر
انحصار اس روبہ اضافہ آمدن پر رکھا جائے۔ جو نئی پیدا کردہ دولت کے زیر اثر و عمل موجودہ ٹیکسوں سے
حاصل ہوگی۔ اور اس سے کم درجہ پر عامۃ الناس کی روز افزوں استطاعتِ ٹیکس دہندگی پر بھروسہ
کیا جائے۔ یہ امر کہ آیا وہ سکیم جس کیلئے قرضہ لینا تجویز کیا گیا ہے اس سے اس نوعیت کی دولت میں بیشی ہوگی
ایک ایسا معاملہ ہے کہ جسے ماہرین کا وہ تجربہ بتائے گا جو سکیم سے جو توقعات وابستہ ہیں۔ ان کی گہری تحقیق
پر مبنی ہوگا۔ آؤ ہم اپنے مفہوم کو ایک ٹھوس مثال سے واضح کریں۔ پنجاب میں جب سے اشتمال کا کام شروع
کیا گیا ہے۔ ۱۴۷۱ نئے کنوئیں کھودے جاچکے ہیں۔ ۳۵۲ برباد شدہ کنوؤں کو دوبارہ قابلِ استعمال
بنایا گیا ہے۔ اور ایک گاؤں میں زیر کاشت رقبہ ۵۱۶ سے بڑھکر ۱۳۷۲ ایکڑ تک پہنچ گیا ہے۔
اور سالانہ معاملہ اراضی ۲۰۹۵ روپیہ سے بڑھکر ۲۹۳۸ روپیہ ہوگیا ہے۔ اس گاؤں کے لئے
قدیم خیال کے حضرات بھی وہ رقم قرضہ لینا مناسب تصور کرینگے جو اشتمال کے لئے درکار ہے۔ لیکن
اکثر صورتوں میں اس خرچ کا فائدہ نمایاں ہے۔ اور اسپر نظر رکھتے ہوئے جدید خیال کا اقتصادی اپنی
نگاہ مالیہ میں اضافہ سے بہت دُور تک لیجائیگا۔ وہ اشتمال کے مادی اثرات اس گاؤں کے لحاظ سے نہیں
بلکہ قرب و جوار کے علاقوں کی بنا پر خیال میں لائیگا۔ وہ لگانوں اور اُجرتوں پر جو لوگ کنوئیں کھودتے ہیں انکی
کمائیوں پر گاہکوں کی استطاعتِ خرید میں اضافہ کے باعث مقامی دُکانداروں کی بیش از پیش بکریوں پر
انکم ٹیکس میں بیشی اور ان محصولات پر نظر دوڑائیگا۔ جو کپڑوں کی زیادہ پیمانہ پر خرید و فروخت سے حاصل
ہوں گے۔ ایک گاؤں سے جو فوائد حکومت کو ہونگے۔ انکا اندازہ لگانا تو خورد بینی ہے۔ اگر ایک
کروڑ ایکڑوں کا اشتمال کردیا جائے تو انکے فوائد و عوائد مختلف نوعیت کے ہونگے۔ اندنوں اشتمال کے
فوائد کا اس وسعت سے اعتراف کیا جاتا ہے کہ ضروری سرمایہ جات کو تسلیم کرتے ہوئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ

اس رقبہ کا ۲۵ سال میں استعمال نہ کیا جائے۔ اور یہ سب کچھ ایک کروڑ روپیہ میں کیا جا سکتا ہے جسکا ایک حصہ متعلقہ دیہات برداشت کرینگے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ صوبے کا مشرقی حصہ زندگی ایک مختلف نظام پر قیام پذیر ہوگا۔ اس سے اسکی کایا پلٹ جائیگی۔ اسلئے کہ پھلوں کی کاشت میں بیشمار اضافہ ہو جائیگا جس کیلئے یہ علاقہ خاص طور پر موزون ہے۔

زراعتی تحقیق کیلئے حاصل کردنی قرضہ کیلئے بھی یہی دلائل دئے جا سکتے ہیں۔ اندازہ لگایا جاتا ہے۔ کہ محکمہ زراعت نے کماد اور گندم کی جو ترقی یافتہ اقسام معلوم کیں۔ انکی کاشت سے بڑھے زرخیز اجناس مروجہ بھی پنجاب میں کاشتکاروں کی آمدن میں ۵۰ لاکھ روپے کا اضافہ ہوا۔ اور اگر روئی کو بھی شامل کر لیا جائے تو یہ رقم ایک کروڑ سے بڑھ جائیگی۔ امداد باہمی کیصورت میں یہ ثابت کرنا زیادہ آسان نہیں کہ اس کے لئے قرضہ لینے میں دولت میں کافی اضافہ ہوگا۔ لیکن پنجاب میں تمام ماہرین امداد باہمی کو ایک بہترین قدر و قیمت والی سرمایہ آفرین قوت اور جائداد خیال کرتے ہیں۔ عام دلائل و اسباب کی بنا پر امداد باہمی کی تائید و حمایت میں مضبوط ترین اور معقول ترین مطالبہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ اسلئے کہ ہم نے دیکھ لیا ہے۔ کہ امداد باہمی ہی صرف وہ حقیقی اور قطعی طریقہ ہے کہ جس سے گراں شرح ہائے سود میں کمی کیجا سکتی ہے۔ مرکب سود کو اڑایا جا سکتا ہے۔ اور قرضہ کو ایک خاص ضبط و تصرف میں رکھا جا سکتا ہے مزارعین کو روپیہ کے بہترین استعمال کا طریق سکھانے کا بہترین ذریعہ یہی ہے۔ اور روپیہ کا بہترین استعمال ہی ایک وہ حقیقت ہے کہ جسکے بغیر دولت میں ہر متوقعہ اضافہ عارضی ثابت ہوگا۔ موجودہ صورت حالات یہ ہے کہ مجلس تحقیقات بنکہائے ہند اس سفارش پر عمل کرنیکی بجائے کہ جسے اس نے اسے تمام سفارشات میں سے اہم ترین قرار دیا ہے۔ اور جسکا مفاد یہ ہے کہ ہم ایک ایسے گاؤں میں اتنی کم سے کم مدت میں کہ جو فوائد اور حفاظت و صیانت سرمایہ کے نقطہ نگاہ سے لگاؤ رکھتی ہو۔ جو امداد باہمی کیلئے موزون ہو۔ اور جو انجمن کے قیام کا طالب ہو۔ وہاں کواپریٹو نظام قرضہ رائج کرنے کیلئے ہر ایک کوشش کام میں لانی چاہیئے۔ حکومت نے یہ کیا ہے کہ تحریک امداد باہمی کیلئے مالی امداد کو بقدر ۲۰ فیصدی کم کر دیا ہے۔ اسے قرضہ کے مشکل مسئلہ کا حل نہیں کہا جا سکتا۔ دیہات سدھار کیلئے قرضہ حاصل کرنیکی تجویز پر غالباً اسلئے اعتراض کیا جائیگا کہ وہ ایک نئی تجویز ہے۔ اور اس سے پیشتر اسباب میں کوئی مثال نہیں ہے۔ لیکن ہندوستان کی حالت بھی اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ ہندوستان کی ۳۶ کروڑ آبادی جسکا دس فیصدی سے کم حصہ خواندہ ہے۔ جمہوریت اور حکومت خود مختاری کی لبریز خطرات پہاپیما گامزن ہونے کو ہے۔ اور اس اثنا میں کساد بازاری نے قرضہ کے بوجھ کو دگنا کر دیا ہے۔ اور زندگی

کے معیار کو زمانہ قبل از جنگ کے برابر کر دیا ہے۔ ایک لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ نظیر بھی موجود ہے۔ جنگ کے خطرناک ایام میں ہندوستان نے ۔ اکروڑ پونڈ چندہ فراہم کیا۔ اور اس تصور سے بے نیاز ہو کر فراہم کیا۔ کہ یہ قرضہ کس طرح اور کب ادا ہوگا۔ یہ ایام بھی خالی از خطرات نہیں ہیں۔ اس لئے کہ دُنیا اشتعال انگیز مواد سے بھری پڑی ہے۔ اور عوام الناس کے قلوب میں ایسے جذبات موجزن ہیں کہ ایسے کبھی بھی نہیں تھے۔ تعمیری و اصلاحی قرضہ جنگی قرضہ سے بدرجہا مفید ہے۔ اول الذکر قرضہ کی اہم اور قابل ترجیح حقیقت یہ ہے کہ یہ قرضہ نفع آور ہے۔ ثانیاً یہ قرضہ داخلی نوعیت کا ہوگا۔ اسے ملک کے اندر خرچ کیا جائیگا۔ ثالثاً یہ ہے کہ یہ قرضہ ۴ فیصدی سے بھی کم شرح سود بھی حاصل کیا جائے گا۔ اور آخری بات یہ ہے کہ اس سے اکثر بے کار انٹرنس پاس اور بی اے پاس نوجوانوں کے لئے ملازمت کا اہتمام ہو سکے گا۔ ایک اور مزید امر پر بحث مفید نظر آتی ہے۔ موجودہ وقت بڑے بڑے تعمیری کاموں کے لئے خاص طور پر موزوں ہے۔ سیاسی دائرہ میں زیر غور تبدیلیوں کے ساتھ معاشرتی اور اقتصادی مرکزوں میں بھی تغیرات کا ہونا لازمی ہے۔ اور اگر ان باتوں کے لئے اچھے لیڈر کی خدمات حاصل ہو جائیں۔ تو اس کے ذریعے مقصد کی سرانجام دہی کے لئے کافی قوت عمل حاصل ہو سکتی ہے +

تعمیری پروگرام کے بعض عام پہلو

تعمیری پروگرام کے عام پہلوؤں پر زیادہ خامہ فرسائی درکار نہیں۔ اہم نکات نمایاں ہیں۔ بطور مثال یہ ہے کہ گاؤں کو بہ حیثیت مجموعی ایک سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ دیہات میں ابتدائی تعلیم کی نشر و اشاعت لازمی ہے۔ ہر دیہاتی کے گھر کی زندگی کو بہتر بنانا لابدی ہے۔ ضروری ہے کہ ان امور کے متعلق پالیسی اور کوشش کے سلسلے کو ٹوٹنے نہ دیا جائے۔ کسی سلسلے کو جاری نہ رکھنے کا نتیجہ کوائف جہلم سے نمایاں ہے۔ اور اگر موگہ میں کامیابی ہوئی۔ تو اس کا باعث یہ ہے۔ کہ کام اسقدر مختصر سے پیمانہ پر تھا۔ کہ ہر ایک سب ڈویژنل افسر کے لئے اپنے فرائض کی سرانجام دہی کے ساتھ ساتھ اس کام کیطرف متوجہ ہونا اور اسے جاری رکھنا ممکن تھا۔ تنظیم دیہات کے لئے کمشنر کا تقرر چاہیئے کہ اس تکلیف کو کم کر دے۔ دیگر اغراض کے متعلق یہ بات ہے کہ

قرضہ کے لین دین کے متعلق امداد باہمی کی اہمیت پر کافی روشنی ڈال دی گئی ہے۔ دوسرے امور میں بھی اس کی اہمیت عیاں را چہ بیاں کی مصداق ہے۔ اس لئے کہ مثلِ ماضی زمانۂ مستقبل میں بھی دیہاتی زندگی کی یک جہتی کو قائم رکھنے کے لئے کسی نہ کسی نوعیت کی وحدت عمل کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے لئے پنچائت کے نظام کا نشو و نما بھی ضروری ہے۔ اور اسکی بھی کافی وضاحت کر دی گئی ہے +

پرچار اور تعلیم

دو نکات کے متعلق زمانہ کے رجحان کا تقاضا یہ ہے کہ احتیاط کو ملحوظ رکھا جائے۔ میں نے اپنے پہلے دورہ میں پروپیگنڈا کے خطرات کے متعلق لکھا ہے۔ اس دنیا میں جس نے ایک تیسری عظیم الشان پر دپیگنڈا کرنے والی سلطنت کو دیکھا ہے۔ آج اس کے خطرات بیش از پیش ہیں۔ اشتہار بازی کی بجائے زیادہ زور تعلیم پر دینا چاہئیے اور محض نمائش کو کبھی اختیار نہیں کرنا چاہیئے۔ رسالدار قبلہ کا یہ قول بالکل درست ہے۔ کہ تبدیلی وہی دیر پا ہوگی جو دلوں میں پیدا ہوگی۔ اس کے لئے تعلیم درکار ہے۔ اور تعلیم کا موثر طریق یہی ہے کہ عوام کی تعلیم کی بجائے انفرادی تعلیم کا اہتمام کیا جائے وقت اور روپیہ کو جتنا مفید طریق پر صرف کیا جائے۔ اتنا ہی کارآمد ہے۔ ہر ایک رقبہ سے قدرتی لیڈروں کا انتخاب کرنا چاہیئے انہیں نئی روشنی کا قائل کرنا چاہیئے۔ اور پرانی روشنی کے باب میں اس سے مشورہ لینا چاہیئے۔ میں نے اپنی دونوں سیاحتوں میں ان میں سے اکثر سے ملاقات کی۔ اور ان کے کاموں کو دیکھنا مستقبل کو محسوس کرنا ہے اگر ان کو تعلیم و تربیت سے بہرہ ور کیا جائے۔ ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ تو وہ پرانی بنیادوں پر نئی عمارت کو کھڑی کرنے کے لئے عمدہ معماروں کا کام دے سکتے ہیں۔ اس لئے کہ [illegible] چل کر حکومت و اختیار نہیں بلکہ شخصیت زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے۔ یہی باعث ہے کہ دیہات سدھار میں فوج کو ایک اہم فریضہ سرانجام دینا ہے۔ تعلیم و تربیت اور شخصیت کے نشو و نما کے لئے فوج دیہاتیوں کے لئے ایک مدرسہ ہے۔ اگر وہ اس سے فائدہ حاصل کرنے کا طالب ہو۔ تو ہر ایک سپاہی کو جہالت۔ تعصب اور اسراف کی قوتوں کی پامالی پر آمادہ کیا جا سکتا ہے +

رفتارِ اصلاح

دوسرا نکتہ ترقی کی رفتار ہے۔ میں نے ایک سے زیادہ مرتبہ روس کی مثال پیش کی ہے۔ اور اگر میں اسے بار دیگر پیش کرتا ہوں۔ تو اس سے مقصود انتباہ ہے۔ وہاں قدم ہیبت ناک طریق پر اُٹھایا گیا۔ اور اسی لئے بہر لحاظ غایت درجے کا نقصان نمودار ہُوا ہے۔ میں نے جو پنجسالہ کی بجائے پچیس سالہ پروگرام تجویز کیا ہے۔ تو اسکی وجہ یہی ہے جسکا تذکرہ کیا ہے۔ پچیس سال کا بہترین حصہ پنجاب میں امداد باہمی کے قیام پر صرف ہو گیا۔ مجلس تحقیقات بنکہائے ہند کی تجاویز پر عمل پیرا ہونے میں مزید ۱۵ سال صرف ہو جائیں گے۔ اگر قدم مجبوراً اُٹھایا جاتا۔ تو جو کامیابی حاصل ہوئی ہے حاصل نہ ہوتی۔ ایکدفعہ سے زیادہ یہ قدم زیادہ تیزی سے اُٹھایا گیا۔ اس صورت میں ہر ایک وقت لغرض اصلاح قدم پیچھے ہٹانا پڑا۔ ہندوستان کے بعض حصص میں اس طرز کی دانش سے کام نہ لیا گیا اسکے نتیجہ میں جزوی تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ دیہات سُدھار کیلئے بڑی دور اندیشی اور بڑا صبر درکار ہے۔

شہر اور گاؤں

میں نے اپنے گذشتہ دورے میں اکثر دیہات نژاد تعلیمیافتہ اشخاص سے پوچھا کہ وہ گاؤں میں رہنا چاہتے ہیں یا قصبہ میں۔ زیادہ دبیل بازوں نے مدارس کے لئے اعلےٰ سہولتوں۔ ڈاکٹروں اور سوسائٹی کی بنا پر شہر کو ترجیح دی۔ لیکن سادگی پسندوں نے دیہات کو ترجیح دی۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ دیہات کی آب و ہوا مفید صحت ہے۔ اور اہلِ دیہات اگرچہ روکھے پھیکے ہیں لیکن راست گو اور دیانتدار اور سادہ مزاج ہیں۔ گاؤں میں مذہب بھی اِتنا فرقہ داری پر مبنی نہیں جتنا کہ شہروں میں ہے۔ اور وہاں اپنی اصلی شان میں منودار ہے۔ ایک شخص نے (جسے اپنا گھر محبوب تھا) کہا کہ گاؤں میں سادگی ہے، ہمدردی ہے۔ اور ایک شخص کو اپنے ہمسایوں کے ساتھ رہنے سہنے کا موقع میسر آتا ہے۔ مجھے اپنے بچوں کو گھر پر چھوڑنا پڑتا ہے۔ اور مجھے یقین ہوتا ہے۔ کہ ان کی اچھی طرح سے حفاظت اور عذر دپرداخت کی جائے گی۔ مجھے چوکیدار رکھنے کی بھی

ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ شہر میں یہ چیز ممکن نہیں ہے۔ وہاں صرف پولیس اور آگ بجھانے کا انجن ہی آپ کی حفاظت کر سکتا ہے۔ اور ہمسایئے بھی آپ کی شادیوں میں شامل نہیں ہوتے۔ اور جب آپ مر جاتے ہیں تو اس کا علم صرف ڈاکٹر کو ہوتا ہے۔ گاؤں میں ہمسائے ہر ایک چیز میں حصہ لیتے ہیں۔ اس شخص پر شخصی تعلقات کی اہمیت عیاں ہے۔ اور کہ یہ چیز شہر کے محض معاشرتی تعلقات سے زیادہ موثر ہے۔ شہر چھوڑے ہیں۔ یہ پڑتے ہیں۔ لوگ ایک دوسرے سے ملنے کے لئے اتنی تیز روی سے کام لیتے ہیں کہ اپنے آپ کو فراموش کر دیتے ہیں۔

دھڑے بندی اور غلاظت

لیکن دو چیزیں ایسی ہیں۔ کہ جن سے دیہات کی زندگی تعلیمیافتہ شخص کے لئے خواہ کتنا ہی سادہ مزاج وہ کیوں نہ ہو۔ قابل پسند نہیں۔ وہ دونوں چیزیں دھڑے بندی اور غلاظت ہے۔ ان دونوں امور کے لحاظ سے مختلف دیہات کی حالت مختلف ہے۔ مشرقی اضلاع کے گاؤں مغربی اضلاع کی نسبت غلیظ تر ہیں۔ اور بعض اوقات ان کی حالت بالکل گوبر کے ایک ڈھیر کی سی ہوتی ہے۔ بخلاف ازیں مغرب میں جہاں مویشی باہر باندھے جاتے ہیں۔ وہاں مکانات اکثر اوقات صاف اور بعض اوقات بے داغ ہوتے ہیں۔ مشرق میں بھی غلیظ دیہات کے ساتھ ساتھ صاف اور ستھرے دیہات بھی پائے جاتے ہیں۔ اس لئے اس مسئلہ کو حل کئے بغیر نہیں چھوڑ دینا چاہیئے۔

دھڑے بندی کا سوال زیادہ ٹیڑھا اور دشوار طلب ہے۔ یہ دھڑے بندی کہاں تک طول پکڑ سکتی ہے۔ ہم نے اس کا نظارہ امرت سر اور کوہستان نمک سے گذرتے ہوئے کیا۔ وہاں لوگ اپنے دشمنوں کو دن دہاڑے جب وہ اپنے کنوؤں پر سوتے ہیں یا کھیتوں میں ہل چلاتے ہیں قتل کر دیتے ہیں۔ خوش قسمتی سے چند بدقسمت قطعات کو چھوڑ کر صرف ۵ سے لے کر ۱۰ فی صدی دیہات ایسے ہیں جہاں کہ رہنے والے کھلے طور پر ایک دوست کو کاٹتے اور کھا جاتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی کھوپریاں توڑتے ہیں اور ۲۰ سے ۲۵ فی صدی ایسے ہیں جہاں کوئی دھڑے بندی نہیں ہے۔ باقی اضلاع کا

حال ان چھوٹی چھوٹی جماعتوں جیسا ہے۔ جن میں تعلیم یا فیاضی کم ہو۔ ان میں پس پشت ایک دوسرے کی بُرائی کرنے اور چغلی کھانے کی عادت بکثرت ہے لیکن کھلے کھلا لڑائی جھگڑے کم ہیں۔ چھوٹے چھوٹے دیہات کا حال بڑے دیہات سے اچھا ہے۔ بڑے دیہات میں اکثر ایسا ہوتا ہے۔ کہ خود غرض حریف اپنے ہمسایوں کی پارٹیاں بنا لیتے ہیں۔ جس گاؤں کا مالک اراضی اچھا ہے وہاں کا حال اچھا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ مالک اراضی کا ایک بہت بڑا فریضہ مقدمات کا تصفیہ ہے۔ بدترین حالت ان دیہات کی ہے۔ جہاں پُرانی دشمنیاں متواتر واردات قتل و غارت کا موجب بنتی ہیں۔ اور ہر ایک جماعت کو ہر وقت اپنی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ یہ کہ کوہستان میں اسی خرابی کا تدارک کیسے کیا جائے۔ میں نے تجویز کیا کہ بہترین تدبیر تعلیم کی وسعت بالخصوص لڑکیوں کی تعلیم ہے۔ لیکن اس کے لئے وقت درکار ہے۔ چونکہ مسئلہ اہم ہے اس لئے مزید تجویز یہ ہے کہ پُرانی دشمنیوں کی تحقیقات کیلئے ایک مختصر سی کمیٹی قائم کرنی چاہیئے۔ اور ایسی شرائط یا معاوضے (خون بہا) تجویز کرنا چاہیئے کہ جو دیرینہ خصومتوں کو ملیامیٹ کردیں۔ یہ تدبیر فلسطین میں اختیار کی گئی۔ اور جہاں لڑائیاں بھڑائیاں کوہستانِ نمک سے بھی زیادہ تباہ کن صورت اختیار کی ہوئی تھی۔ وہاں ان کمیٹیوں نے اچھا اثر پیدا کیا۔ اور کہا جاتا ہے۔ کہ جھگڑوں کی تعداد بتدریج کم ہوگئی +

گاؤں ایک زندہ نظام ہے

میں نے اس فصل میں دیہات شدہ معار کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن دیہات کو تعمیر جدید کی بجائے تجدید حالات کی زیادہ ضرورت ہے۔ میری یہ کوائف نگاری بیکار ثابت ہوتی۔ اگر اسلئے یہ آئینہ نہ کر دیا ہوتا کہ پنجاب میں گاؤں ایک زندہ نظام ہے۔ پنجاب کے دیہات میں دور اندیشی کی متاع بھی بکثرت موجود ہے۔ اور اسراف و کوتاہ اندیشی کے عناصر بھی بتعداد کثیر ہیں۔ دیہات میں نئی روشنی بھی جلوہ نما ہے۔ اور پُرانی بھی اپنی جھلک دکھا رہی ہے پیپل کے درخت کی مانند جو اکثر اوقات اپنے تک پہنچنے والی راہوں کی حفاظت کرتا ہے یہ متذکرہ دُور اندیشی ماضی کی زمین میں عمیق طور پر پھیلی ہوئی ہیں۔ اور اگر اس دور اندیشی کے نخل کو رسم و رواج کے کیڑوں نے کھا نہ لیا ہو۔ یا دھڑے بندی کی باد مخالف نے پژمردہ نہ کر دیا ہو۔ تو یہ نعمت گاؤں کی بہترین محافظ ہے۔ اسکے مقابلے میں نیا زمانہ محض ایک

نوخاستہ پودا ہے۔ جسے ابھی یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ اپنی جڑیں مضبوط کرسکتا ہے۔ اور خشک سالی۔ طوفان باد اور سیلاب کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ اس کی کمزوری یہ ہے کہ ابھی تک اس کا گھر شہر بنا ہؤا ہے۔ لیکن شہر کی زمین اور شہر کے طریقے گاؤں سے بہت مختلف واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے اس کی نئی زندگی کے لئے ہمیں گاؤں اور کسان کی طرف نظر دوڑاتے ہیں۔ ہمیں گاؤں میں جانا چاہیئے۔ اور دیہات اور اہل دیہات کی ضروریات اور خواہشات سے آگاہ ہونا چاہیئے۔ اور کسان ہی وہ ہستی ہے۔ جسے ہمارا فرض ہے کہ ہم دوسروں کی بھلائی کے لئے تدبیریں سوچنے اور راہنمائی کرنے پر آمادہ کریں۔ ہوسکتا ہے کہ شہری دیہاتی سے زیادہ سریع الفہم۔ زود رو۔ ہوشیار تر۔ اور امیر ہو۔ لیکن دیہاتی ایک ایسا وصف رکھتا ہے۔ کہ جو متذکرہ تمام محاسن سے زیادہ وزنی اور دقیع ہے۔ وہ کھلی ہؤا میں زندگی بسر کرتا ہے۔ کھلی ہؤا میں کام کرتا ہے۔ ایسے قدرت کے عظیم الشان ساتھیوں سے متواتر اور گہرا واسطہ پڑتا ہے۔ زمین۔ آسمان۔ اور فلک کی روشنی سے اس کا ازلی تعلق اور اسکی سیرت ان خوبیوں کا مرقع ہے۔ جو کھلی ہؤا۔ کھلی فضا۔ زمین۔ آسمان اور فلک کی روشنی سے ہمیشہ کا گہرا تعلق رکھنے سے پیدا ہوسکتی ہیں ٭

ختم شد

کتبہٗ منشی فقیر اللہ قریشی خوش نویس دفتر پی سی لیہ

لاہور

پنجابی کسان

ضخامت ۴۵۰ صفحات

مصنفہ ایم۔ ایل ڈارلنگ صاحب بہادر

زیب عنوان کتاب مسٹر ایم۔ ایل ڈارلنگ آئی سی ایس کی غیر معمولی مشہور و معروف مستند تصنیف "دی پنجاب پیزنٹ" کا اردو ترجمہ ہے مسٹر موصوف کی شخصیت محتاج تعارف اور آپکی یہ تالیف محتاج حاشیہ نہیں پنجابی کسان حالات پنجاب کا مرقع اور اقتصادیات دیہات کا آئینہ ہے پنجاب پانچ دریاؤں کی نگری ہے۔ پنجابی کسان پانچ اشیا کے متعلق خاص نقطہ نگاہ رکھتے ہیں۔ اوّل انہیں اپنے مذہب یا دھرم سے فہایت درجے کی محبت ہے مذہب ان کا اوڑھنا اور بچھونا ہے۔ مذہب ان کی ہر رگ میں سمایا ہوا ہے۔ اندنوں اقتصادی ضروریات کے باعث اگرچہ انکا جذبہ مذہبی کسقدر رو بہ زوال ہے۔ لیکن اس وقت بھی جتنا جوش مذہبی پنجاب میں ہے۔ ہندوستان کے کسی دوسرے صوبے میں نہیں۔ دوسری چیز زمین ہے۔ جس سے پنجابی کو خاص لگاؤ ہے۔ پنجابی بہادر ہے۔ مسلّح عالم ہے جفاکش محنتی ہے۔ جفاکش ہونے میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ روزی کمانے کے لئے دنیا کے ہر گوشہ میں پہنچ جاتا ہے۔ ان میں سے پانچ لاکھ جوان یورپ کے میدان ہائے جنگ میں پہنچے۔ اور انہوں نے سارے جہان سے اپنی بہادری کا لوہا منوایا۔ بایں ہمہ اسے اپنی زمین سے جو الفت ہے وہ عشق کے درجہ تک پہنچی ہوئی ہے۔ یہی باعث ہے کہ پنجابی کسان قانون انتقال اراضیات کو اپنے لئے نعمت اور رحمت اور خیر و برکت کا چارٹر تصور کرتا ہے تیسری شے جسکے لئے پنجابی دنیا بھر کی مصیبتوں کو برداشت کرتا ہے اور اسکی ابرو پر ہمت پڑ جائے تو اسکا کی شکن تک نہیں پڑتی۔ وہ چیز خاندان ہے۔ پنجابی کنبہ پروری میں اپنی مثال آپ ہیں۔ سیاست وہ چوتھی شے ہے جسکی طرف پنجابی کسان بمشکل آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے۔ اگرچہ نئی اصلاحات کے باعث پنجابی کسان سیاسی امور خاص کر دلچسپی لینے لگ گیا ہے۔ لیکن سیاست سے اسے اتنا تعلق نہیں۔ یا اسکی توجہ سیاست کی جانب اتنی نہیں جتنی کہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے ساکنوں کی ہے۔ ساہوکار وہ پانچویں چیز ہے جس سے پنجابی کسان کا بہت قدیمی تعلق ہے فاضل مصنف نے ان پانچ چیزوں کے متعلق پنجابیوں کے خیالات اور تصورات کو بہت عمدہ پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ پنجابی کسان میں ان حقائق پر نہایت ہی اچھوتے اور دلپذیر انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایسے ہی مقروضیت کے مسئلہ پر بصیرت افروز طریق پر بحث کی گئی ہے اصلاح دیہات سے دلچسپی رکھنے والے کیلئے **پنجابی کسان** کا مطالعہ لازمی ہے اس کتاب میں "امداد باہمی" کی ضرورت اور اہمیت کو بھی ٹھوس دلائل سے واضح کیا گیا ہے یہ نادر تصنیف ۲۲ × ۲۹ سائز کے ۴۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب قیمت صرف عہ

ملنے کا پتہ :- **پنجاب کوآپریٹو یونین لاہور**

امداد باہمی و دیہات سدھار پر

نادر کتابیں

نام کتاب	نام مصنف	حجم	قیمت	علاوہ محصولڈاک
داستان دہقان مجلد	ڈارلنگ	۳۵۰ صفحات	۲ روپے	؍؍
مالیات دیہات مجلد	ہیرک	۵۹۶ ؍؍	۳ ؍؍	؍؍
آئینہ پنجاب مجلد	کیلورٹ	۴۴۰ ؍؍	۱۲ر	؍؍
جمہوریت امداد باہمی مجلد	ہو	۱۹۲ ؍؍	۴ر	؍؍
امداد باہمی اور برہما مجلد	بریٹو	۱۷۳ ؍؍	۴ر	؍؍
معاشیات دیہات مجلد	کارور	۴۴۰ ؍؍	۱۲ر	؍؍
مناظر امداد باہمی مجلد	ڈارلنگ	۳۰۳ ؍؍	۲ روپے	؍؍
امداد باہمی اور ہندوستان مجلد	مکرجی	۶۴۴ ؍؍	۳ ؍؍	؍؍

ملنے کا پتہ:- پنجاب کوآپریٹو یونین لاہور۔

ضخامت ۵۰۳ صفحات

داستانِ دہقان

قیمت صرف دو روپے ہے

مصنفہ ڈارلنگ صاحب بہادر

پنجاب میں اقتصادیات دیہات کے مطالعہ کا بیش از بیش ذوق و شوق پیدا کرنے اور دیہات سدھار اور امداد باہمی کے فروغ کی غرض سے **پنجاب کواپریٹو یونین لاہور** مشرق و مغرب کے متعدد فضلاء کی انگریزی تصانیف کا بزبانِ اردو ترجمہ کر چکی ہے۔ طرازِ عنوان کتاب **"داستانِ دہقان"** اس سنہری زنجیر کی ایک تازہ و درخشاں کڑی ہے۔

داستانِ دہقان **ایم۔ ایل ڈارلنگ** صاحب سی۔ آئی۔ ای۔ آئی۔ سی۔ ایس۔ فائینشل کمشنر و وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کی مشہور تالیف "رسٹیکس لوکیوٹر" کا اردو ترجمہ ہے۔

داستانِ دہقان مذکورہ فاضل کے ان چشم دید اور خود شنید حالات کا نچوڑ ہے جن کیلئے آپ نے کئی ماہ تک تمام اضلاع پنجاب کے متعدد دیہات کا گھوڑے کی پشت پر سوار ہو کر دورہ کیا۔ آپ نے کسانوں کی کہانی انکے جھونپڑوں اور انکے کھیتوں میں پہنچکر خود انکی زبانی سنی۔ آپ نے پیروں۔ پنڈتوں۔ مہنتوں۔ فقیروں۔ پجاریوں۔ نمبرداروں۔ سفید پوشوں۔ زمینداروں۔ کاشتکاروں۔ کاریگروں۔ خدمتگاروں۔ کمیوں۔ عورتوں۔ بچوں۔ مردوں۔ ڈاکٹروں۔ حکیموں۔ انجمنہائے امداد باہمی کے ممبروں۔ ساہوکاروں۔ مہاجنوں۔ آڑھتیوں وغیرہ سے گفت و شنید کی اور جو کچھ دیکھا یا سنا اسکی تحقیق کیلئے بیشمار کتب کا مطالعہ کیا اور اپنی تحقیق کا اپنے کئی ایک دیہاتی احباب کی ذاتی معلومات سے موازنہ کیا اور اس تمام چھان بین کے بعد اپنی دیکھی سنی۔ جانچی۔ تلی باتوں کو سپردِ قلم فرمایا۔

داستانِ دہقان کی قبولیت کا عالم یہ ہے کہ رورل کمیونٹی بورڈ نے اسکی پانچسو جلدیں خریدی ہیں۔

داستانِ دہقان کی کتابت عمدہ۔ طباعت نفیس۔ ضخامت ۵۰۳ صفحات۔ کاغذ نہایت اچھا اور کتاب مجلد ہے باایں محاسن قیمت صرف دو روپے علاوہ محصول ڈاک ہے۔ امید ہے کہ آپ داستانِ دہقان کی کئی ایک جلدیں خرید فرمائیں گے۔"

ملنے کا پتہ:۔ پنجاب کواپریٹو یونین لاہور۔

س

آئینۂ پنجاب

ضخامت ۴۰۴ صفحات

قیمت ۱۲ آنے مجلد

مصنفہ کیلورٹ صاحب بہادر

کیلورٹ صاحب کی معرکۃ الآرا کتاب "ویلتھ اینڈ ویلفئر آف دی پنجاب" ایک لاجواب تصنیف ہے پہلی کتاب ہے جس نے ملک کے دماغ کے سامنے اس حقیقت کو بے نقاب کیا کہ پنجاب کی خوشحالی وفارغ البالی میں مضمر ہے یہ کتاب انگریزی زبان میں ہونیکے باعث انگریزی نہ جاننے والوں اردو دانوں کیلئے ایک گنج مخفی کا حکم رکھتی تھی۔ پنجاب کوآپریٹو یونین نے آئینہ پنجاب کے نام سے اسکا ترجمہ شائع کرایا ہے۔ ترجمہ نہایت عمدہ اور سلیس زبان میں ہے۔ پنجاب میں ہر تعلیمیافتہ کو بالعموم اور پڑھے لکھے کوآپریٹر کو بالخصوص اسکا ضرور مطالعہ کرنا چاہئیے۔ طباعت۔ کتابت اور جلد نہایت دیدہ زیب ہے۔ اس کتاب کے ۴۰۴ صفحے ہیں۔ کثرت اشاعت کی غرض سے کتاب کی قیمت صرف ۱۲ آنے مقرر کیگئی ہے۔

ملنے کا پتہ: پنجاب کوآپریٹو یونین لاہور۔

مالیات دیہات

ضخامت ۵۹۶ صفحات

قیمت ۳ روپیہ مجلد

مصنفہ ہیرک

زیب عنوان کتاب امریکہ کے ایک فاضل ایم۔ ٹی ہیرک کی ایک عالمانہ تصنیب "رورل کریڈٹس" کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب بیش بہا معلومات پر مشتمل ہے۔ فاضل مصنف نے واضح کیا ہے۔ کہ جرمنی۔ آسٹریلیا۔ فرانس۔ اطالیہ۔ بلجیم۔ برطانیہ۔ آئرلینڈ روس۔ رومانیہ۔ بلغاریہ۔ ٹرکی سوئٹزرلینڈ ڈنمارک۔ ہالینڈ۔ سویڈن۔ ناروے۔ ہسپانیہ۔ پرتگال۔ مصر۔ ٹیونس۔ امریکہ وغیرہ ممالک میں امداد باہمی کی تحریک کس طرح پھیلی۔ اس کے بانیوں کو کیا مشکلات پیش آئیں۔ پنجاب کوآپریٹو یونین نے اس پیچیدہ مشکل کتاب کا ترجمہ کرانے میں خاص دقتیں برداشت کیں۔ صفحات ۵۹۶۔ قیمت ۳ روپیہ

ملنے کا پتہ:۔ پنجاب کوآپریٹو یونین لاہور